خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
مارچ 2014
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 6000 روپے

مارچ 2014
جلد 41 شمارہ 11
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کہی ان کہی

مارچ کا شمارہ پیش خدمت ہے۔
مارچ کا مہینہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک تاریخ ساز موڑ لے کر آیا۔ 23 مارچ ۱۹۴۰ء کو ایک قرارداد پیش کی گئی جس کی منظوری کے بعد پاکستان وجود میں آیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن۔
بعد کے حالات اور آج بھارت میں مسلمانوں کی جو حالت زار ہے، اس نے ثابت کیا کہ یہ قرارداد جس سوچ اور نظریے کے تحت پیش کی گئی، وہ بالکل درست تھا۔
پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اس کے خلاف سازشیں شروع کر دی گئیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ افسوس کہ ہمارے اہل اختیار کو اس کا ادراک نہیں ہے۔

سالگرہ نمبر،

اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر کی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ سالگرہ نمبر میں پرانی مصنفین کے ساتھ ساتھ نئی مصنفین کی تحریریں بھی شامل ہوں گی۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شامل ہو سکیں۔

سالگرہ نمبر، قارئین سے سروے،

سالگرہ نمبر میں حسب روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سوالات یہ ہیں۔
1۔ وہ کون سی تحریر تھی جس نے آپ کو باقاعدہ خواتین ڈائجسٹ کا قاری بنا دیا؟
2۔ مطالعہ ہماری شخصیت پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے؟ خواتین ڈائجسٹ کے مطالعہ نے آپ کی شخصیت پر کیا اثر ڈالا؟ کوئی واقعہ؟
3۔ خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی تحریروں میں کوئی ایسا کردار جس کو پڑھ کر آپ کو اس سے نفرت محسوس ہوئی۔

عہد الست،

بہن تنزیلہ ریاض نے جب جب لکھا، قارئین نے بے حد پسند کیا۔ مثبت سوچ، گہرا مشاہدہ اور وسیع مطالعہ ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ نہایت باریک بینی سے حالات و واقعات کی گہرائی میں جا کر تجزیہ کرتی ہیں۔ تنزیلہ ریاض نے ہمیشہ عام موضوعات سے ہٹ کر خاص اور منفرد موضوعات کا انتخاب کیا اور ان پر عام فہم انداز میں لکھا اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے دلچسپی کا عنصر قائم رہتا ہے۔
اس ماہ ان کا مکمل ناول "عہد الست" شائع کر رہے ہیں۔
تنزیلہ ریاض نے کافی عرصہ بعد لکھا ہے۔ اسے پڑھ کر اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

اس شمارے میں،

- تنزیلہ ریاض اور سارا ادریس کے مکمل ناول، ، آمنہ ریاض، سدرۃ المنتہیٰ اور صدف آصف کے ناولٹ،
- سمیرا حمید، شاہین ملک، سعدیہ عزیز آفریدی اور مصباح قریشی کے افسانے،
- عنیزہ سید اور عفت سحر طاہر کے ناول، ، باتیں مصطفیٰ چوہدری سے،
- ٹی وی فنکارہ جویریہ اجمل سے ملاقات، ، میری خاموشی کو بیاں ملے۔ قارئین سے سروے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، نفسیاتی اِزدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

یتیموں، لڑکیوں اور خستہ حال لوگوں کے ساتھ تواضع

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور اپنے بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔"

(سورہ حجر 88)

اور فرمایا۔ "اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں، وہ اس کی رضا چاہتے ہیں اور دنیوی زندگی کی رونق کی تلاش میں تیری آنکھیں ان سے تجاوز نہ کریں۔"

(سورہ کہف 28)

اور فرمایا۔
"چنانچہ جو یتیم ہو، اسے مت دبا اور جو مانگتا ہو، اسے مت جھڑک۔"

(سورہ الضحیٰ 10،9)

اور فرمایا۔
"کیا دیکھا تو نے اس شخص کو جو جزا (کے دن) کو جھٹلاتا ہے، تو یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔"

(الماعون 1-3)

نیک لوگوں کی صحبت

حضرت سعد بن ابی وقاص بیان فرماتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھ افراد تھے۔ مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔
"انہیں اپنے سے دور کر دیں، یہ ہم پر جری نہ ہو جائیں۔"
(حضرت سعد فرماتے ہیں۔) میں، ابن مسعود، قبیلہ ہذیل کا ایک آدمی، بلال اور دو اور آدمی تھے جن کے نام مجھے معلوم نہیں۔
(مشرکین کے مطالبے پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جی میں جو اللہ نے چاہا، آیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے جی میں کچھ سوچا، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت (سورہ انعام۔ 52) نازل فرما دی۔
ترجمہ:۔ (اے پیغمبر) تو ان لوگوں کو اپنے سے دور

مت کر جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے صبح و شام اسے پکارتے ہیں۔(مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں صرف ان لوگوں کی قدر و قیمت ہے جو ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہوں' چاہے اہل دنیا کی نظروں میں وہ اپنی غربت و ناداری کی وجہ سے حقیر اور کم تر ہوں اور جو ایمان و عمل سے محروم ہوں' چاہے دنیوی اعتبار سے وہ کتنے ہی بلند مرتبہ ہوں' اللہ کے ہاں پر کاہ کے برابر بھی ان کی وقعت نہیں۔

2۔ اس میں اہل ایمان کو بھی تنبیہہ ہے کہ ان کے ہاں بھی عزت و شرف کا معیار دین ہی ہونا چاہیے نہ کہ حسب و نسب اور مال و جاہ۔

نیک لوگوں کی ناراضی

حضرت ابو ہبیرہ عائذ بن عمرو مزنی (یہ اہل بیعت رضوان میں سے ہیں۔) فرماتے ہیں۔

حضرت ابو سفیانؓ حضرت سلیمان' صہیب اور بلالؓ کے پاس چند افراد کی موجودگی میں آئے تو انہوں نے (ابو سفیان کو دیکھ کر) کہا۔

"اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمن (یعنی ابو سفیان) سے اپنا حق وصول نہیں کیا۔"

"حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "تم یہ بات قریش کے بزرگ اور ان کے سردار کے متعلق کہہ رہے ہو؟"

پھر حضرت ابو بکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کو یہ بات بتلائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابو بکر! شاید تو نے انہیں ناراض کردیا (یاد رکھ) تو نے اپنے رب کو ناراض کردیا۔"

(یہ سن کر فوراً) ابو بکرؓ ان کے پاس آئے اور ان سے کہا۔

"بھائیو! کیا میں نے تمہیں ناراض کردیا ہے۔" (یعنی میری بات تمہیں ناگوار گزری ہے؟)

انہوں نے کہا۔ "نہیں۔۔۔ اے ہمارے بھائی! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔"(مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ آپس میں پیار و محبت کے ساتھ رہو اور ایک دوسرے کے بارے میں اپنے دلوں کو صاف رکھو اور اگر کوئی بات' غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ایسی نکل جائے جس سے دوسرے مسلمانوں کے دلوں کو ٹھیس پہنچے یا ان کے جذبات مجروح ہوں تو فوراً" اس کا ازالہ کرنے کی سعی کرو۔

2۔ دنیاوی حیثیت سے کمزور لوگ اگر متقی اور پرہیزگار ہوں تو اہل ایمان کو ان کی کسی صورت بھی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے' کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

یتیم کی کفالت

حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا' جنت میں اس طرح ہوں گے۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت اور درمیان والی انگلی کے درمیان کشادگی فرمائی۔ (یعنی قریب ہوں گے' لیکن درجات میں فرق و تفاوت ہوگا۔)(بخاری)

فوائد و مسائل

جنت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور آپ کا قرب بہت بڑا اعزاز ہے جو یتیم کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے کو ملے گا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گھر کو سب سے بہترین گھر قرار دیا۔ جس میں یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہو اور اسے بدترین گھر کہا ہے جس میں اس کے برعکس یتیم کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ روا رکھا جاتا ہے۔

مسکین کون ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسکین وہ نہیں ہے جسے کھجور اور دو کھجوریں' لقمہ اور دو لقمے لوٹا دیں' بلکہ مسکین تو وہ ہے جو (غربت کے باوجود) سوال سے بچتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

اور صحیحین (بخاری و مسلم) کی ایک اور روایت میں الفاظ اس طرح ہیں۔

"مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں (کے گھروں) کے چکر لگائے اور لقمہ' دو لقمے اور کھجور' دو کھجوریں اسے واپس لوٹا دیں۔ لیکن مسکین تو وہ ہے جو اتنی دولت بھی نہ پائے جو اسے (لوگوں سے) بے نیاز کردے۔ اس کی (غربت کی) بابت احساس بھی نہ کیا جائے کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ (وہ خود دست سوال دراز کیے) کھڑا ہو کہ لوگوں سے مانگے۔"

فوائد و مسائل

اس میں ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے اور وہ یہ کہ گھر گھر جاکر مانگنے والے زیادہ ضرورت مند (مسکین) نہیں ہوتے' کیونکہ وہ تو قطرہ قطرہ حاصل کرکے دریا جمع کرلیتے ہیں۔ اصل ضرورت مند تو وہ ہوتے ہیں جو تونگر بھی نہیں ہوتے' نہ ان کا لباس اور ہیئت ہی ایسی ہوتی ہے جو ان کی غربت کی چغلی کھاتی ہو اور نہ ان کی خودداری اور غیرت ہی انہیں سوال کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیشہ ور گداگروں کے مقابلے میں ایسے سفید پوش لوگوں کی امداد کی جائے کہ یہ اصل مسکین ہیں نہ کہ وہ جنہوں نے مسکینی کا روپ دھار رکھا ہو۔

خبر گیری کرنے والا

"بیواؤں اور مسکین کی خبر گیری کرنے والا' اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔"

(راوی حدیث کہتے ہیں۔) میرا گمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا۔

"وہ اس عبادت کرنے والے کی طرح ہے جو سست نہیں ہوتا اور اس روزے دار کی طرح ہے جو ناغہ نہیں کرتا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ بیوہ اور مسکین کا نام بطور تمثیل کے ہے۔ مراد معاشرے کے ضرورت مند' نادار اور معذور افراد ہیں۔ ان کی کفالت' خبر گیری اور ان کے لیے دوڑ دھوپ کو اجر میں جہاد فی سبیل اللہ کے برابر قرار دے کر اسلام نے اس کام کی اہمیت کو کتنا واضح کردیا ہے۔ مسلمان اس کو نہ سمجھیں تو اور بات ہے' ورنہ اسلام نے معاشرے کے بے سہارا افراد کی مدد اور خیر خواہی کا حق ادا کردیا ہے۔

2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت صرف نماز پڑھ لینا یا روزہ رکھ لینا ہی نہیں ہے' بلکہ ہر عمل صالح عبادت ہے اور ضعفاء و مساکین کی خبر گیری بھی عبادت ہے۔

بدترین کھانا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بدترین کھانا ولیمہ کا وہ کھانا ہے۔ جس میں جو (ضرورت مند) آنا چاہے اسے تو روک دیا جائے اور جو انکار کرے اسے بلایا جائے اور جس نے دعوت قبول نہیں کی' اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔" (مسلم)

اور صحیحین کی ایک اور روایت جو حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے مروی ہے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اس طرح روایت کیا گیا ہے۔

"بدترین کھانا ولیمہ کا وہ کھانا ہے' جس میں مال داروں کو بلایا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے۔"

1۔ طبقہ امراء نے ولیمہ کی دعوت کو جس طرح پر تکلف اور اپنی دولت و امارات کے اظہار کا ذریعہ بنالیا ہے' اس کے متعدد دینی' اخلاقی اور معاشرتی نقصانات ہیں۔ دینی نقطہ نظر سے یہ اسراف و تبذیر

ہے جو شیطانی عمل ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والے شیطان کے بھائی۔ یہ اتنا بڑا نقصان اور سخت عید ہے کہ ہمارے طبقہ امراء میں اگر ایمان ہو تو وہ اس اسراف سے باز آجائے جس کا دائرہ روز بروز بڑھتا اور پھیلتا ہی جارہا ہے۔ اس کا اخلاقی نقصان یہ ہے کہ انسان اس میں اپنے ہی ہم مرتبہ لوگوں کو دعوت دیتا ہے اور انہیں بہ اصرار اس میں شریک کرتا ہے' جبکہ معاشرے کے غریب اور مسکین قسم کے لوگوں کی اس میں شرکت کو وہ سخت ناگواری اور آداب کے خلاف تصور کرتا ہے۔ در آں حالیکہ دعوت کے مستحق' اپنی ضرورت مندی کی وجہ سے مساکین ہی ہوتے ہیں نہ کہ اہل ثروت' اور مکارم اخلاق کا تقاضا بھی ہے کہ ضرورت مندوں کو اولیت و فوقیت دی جائے نہ کہ ان کو جو سرے سے ضرورت مند ہی نہیں ہیں۔

2۔ اس کا معاشرتی نقصان یہ ہے کہ اس قسم کے مظاہروں سے معاشرے کے کمزور طبقات میں احساس محرومی پیدا ہوتا ہے' حالانکہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ محروم طبقات کی دلجوئی' دلداری کا اہتمام اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے نہ کہ ان کے اندر احساس محرومی پیدا کرکے انہیں اذیت اور اضطراب سے دوچار کیا جائے۔

3۔ اگر مسلمان ولیموں اور دیگر تقریبات میں انواع و اقسام کے پرتکلف کھانوں کے بجائے ایک دو قسم کے سادہ کھانوں کا اہتمام اور اس میں قرابت داروں اور دوست احباب کے ساتھ غرباء و مساکین کو بھی شریک کریں تو مذکورہ تینوں خرابیوں سے بچ سکتے ہیں۔ جس کے معاشرے پر بہترین اثرات پڑ سکتے ہیں اور آخرت کی بازپرس سے بھی وہ بچ سکتے ہیں۔ ورنہ "خسر الدنیا والآخرۃ" ہی کے وہ مصداق ہوں گے۔

4۔ حدیث میں دعوت ولیمہ کے قبول کرنے کی جو تاکید کی گئی ہے اس سے مراد وہی دعوتیں اور ولیمہ ہیں جن میں اسلامی تعلیمات کا احترام اور سادگی وغیرہ کا اہتمام کیا جائے۔ مذکورہ قسم کے ولیمہ جو مذکورہ خرابیوں کے مظہر ہوں' ان میں شرکت نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ ان کا بائیکاٹ ضروری ہے' تاکہ ان برائیوں میں شرکت کے جرم سے وہ بچ جائے۔

بیٹیوں کی پرورش

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے دو بچیوں کی پرورش و تربیت کی حتی کہ وہ بالغ ہوگئیں۔ قیامت والے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ میں اور وہ ان دو انگلیوں کی طرح (قریب قریب) ہوں گے۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیاں ملا کر دکھایا کہ اس طرح ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوں گے۔ (مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ زمانہ جاہلیت میں لڑکیوں کی پیدائش پر جس ناگواری کا اظہار اور عورت کی قدر و منزلت کا انکار کیا جاتا تھا۔ شریعت اسلامیہ نے ان کی عزت و توقیر کی بحالی کے لیے جو ہدایات دیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچیوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کو حصول جنت کا ذریعہ قرار دیا' تاکہ لوگ بیٹوں کی ولادت اور ان کی پرورش پر ہی خوشی محسوس نہ کریں' بلکہ لڑکیوں کی ولادت اور ان کی تربیت پر بھی مسرت بہ کنار ہوں۔ اس لحاظ سے اسلام ہی وہ پہلا دین ہے۔ جس نے عورت کے حقوق کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ اس کی عزت و تکریم کا بھی خوب خوب اہتمام کیا۔ مثلاً" اسے مردوں کے اختلاط سے منع اور پردے کا پابند کیا' اسے بیرونی سرگرمیوں اور معاشی جھمیلوں سے فارغ رکھا' تاکہ کوئی بدباطن اسے بری نظر سے دیکھے نہ اسے اپنی ہوس ناکی کا نشانہ بنا کر اس کی ردائے تقدس و عصمت کو تار تار کرسکے' جیسے مغرب کی بے پردہ اور مردوں کے دوش بدوش کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

2۔ برا ہو اس کج فکری اور ذہنی عدم بلوغت کا کہ مغرب کی یہ آزادی نسواں' جس نے عورت کو ذلیل اور بے آبرو کردیا ہے۔ بہت سے لوگوں کو بہت اچھی لگتی

ہے اور وہ مسلمان عورت کو بھی اسی حیا باختگی کی راہ پر ڈال رہے ہیں اور اسلامی تعلیمات' جس میں عورت کے تقدس و احترام کا تحفظ ہے۔ وہ انہیں غلامی کا طوق نظر آتی ہیں جنہیں وہ اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔

تین کھجوریں

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

میرے پاس ایک مسکین عورت اپنی دو بیٹیاں اٹھائے ہوئے آئی۔ میں نے اسے کھانے کے لیے تین کھجوریں دیں۔ پس اس نے دو کھجوریں تو اپنی دو بیٹیوں کو دے دیں اور ایک کھجور اس نے کھانے کے لیے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تو وہ بھی اس سے اس کی بیٹیوں نے کھانے کے لیے مانگ لی۔ چنانچہ اس نے وہ کھجور بھی جسے وہ خود کھانا چاہتی تھی' دو حصے کرکے اپنی دونوں بیٹیوں میں تقسیم کردی۔ مجھے اس کی یہ بات بڑی اچھی لگی۔

میں نے اس واقعے کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی وجہ سے اس کے لیے جنت واجب فرمادی ہے۔ (یا یہ فرمایا) کہ اس کی وجہ سے اسے جہنم کی آگ سے آزاد کردیا ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

اس میں لڑکیوں کی پرورش کی فضیلت کے علاوہ اس بات کا بھی بیان ہے کہ اگر عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے صدقہ و خیرات کی عمومی اجازت حاصل ہو تو وہ صدقہ کرسکتی ہے۔ اس کے ثواب میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔ عورت کو صدقہ کرنے کی وجہ سے اور مرد کو اس پر رضامند ہونے کی وجہ سے اجر ملے گا۔

کمزور

حضرت ابو شریح خویلد بن عمرو خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے اللہ! میں لوگوں کو دو ضعیفوں کے حق سے بہت ڈراتا ہوں (کہ ان میں کوتاہی مت کرنا) ایک یتیم اور دوسری عورت۔" (یہ حدیث حسن ہے' اسے امام نسائی نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل

انسانی معاشروں میں کمزور طبقات کے ساتھ عام طور پر ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ بالخصوص عورتیں اور یتیم اس کا خاص نشانہ بنتے ہیں۔ ان کو جائیدادوں میں ان کے شرعی حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ بلکہ ان کی جائیدادوں کو ہتھیا لیا جاتا ہے اور ان سے ہر طرح کی بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ نے ایسے لوگوں کے لیے سخت وعید بیان فرما کر مسلمانوں کو ان کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے سے روکا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمان اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے اور مسلمان معاشروں میں بھی یہ مذکورہ طبقات ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسلام بدنام ہو رہا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس بارے میں اسلام کی تعلیمات تو واضح ہیں۔ مسلمانوں کا طرز عمل' اسلام سے مختلف چیز ہے۔ اس کا الزام ان کے مذہب پر عائد نہیں کیا جاسکتا۔ کاش! مسلمان اس بات کو سمجھیں کہ ان کے غلط طرز عمل کی وجہ سے اسلام کی بدنامی ہو رہی ہے اور یوں وہ دو گونہ جرم کا ارتکاب کررہے ہیں۔ ایک حق تلفی اور ظلم اور دوسرا دنیا کی نظروں میں اسلام کی تذلیل اور اس کا استخفاف۔ گویا وہ اسلام کی تبلیغ کے بجائے اسلام کی طرف لوگوں کے آنے میں رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔

غزل

انشاء جی

شام غم کی سحر نہیں ہوتی
یا ہمیں کو خبر نہیں ہوتی

چاند ہے، کہکشاں ہے تارے ہیں
کوئی شے نامہ بر نہیں ہوتی

ہم نے سب دکھ جہاں کے دیکھے ہیں
بے کلی اس قدر نہیں ہوتی

اک جاں سوز و نامراد خلش
اس طرف ہے، اُدھر نہیں ہوتی

نالہ یوں نارسا نہیں ہوتا
آہ یوں بے اثر نہیں ہوتی

رات آکر گزر بھی جاتی ہے
اک ہماری سحر نہیں ہوتی

بے قراری سہی نہیں جاتی
زندگی مختصر نہیں ہوتی

حسن سب کو خدا نہیں دیتا
ہر کسی کی نظر نہیں ہوتی

ایک دن دیکھنے کو آجاتے
یہ ہوس عمر بھر نہیں ہوتی

دل پیالہ نہیں گدائی کا
عاشقی در بہ در نہیں ہوتی

مصطفیٰ چوہدری سے باتیں

شاہین رشید

1 "پورا نام؟"
"چوہدری محمد مصطفیٰ۔"

2 "پیار کا نام؟"
"مصطفیٰ ہی کہتے ہیں زیادہ تر لوگ۔ بھائی اور ایک بہت اچھا دوست ہے عمیر جو کہ دبئی میں رہتا ہے وہ مصیف کہتا ہے مجھے۔"

3 "تاریخ پیدائش/ شہر؟"
"13 مئی 1982ء/ کشمیر۔"

4 "قد/ ستارہ؟"
"5 فٹ 10 انچ/ اور ثور اسٹار ہے مگر میں یقین نہیں رکھتا ستاروں کی چال پہ۔"

5 "بہن بھائی/ آپ کا نمبر؟"
"دو بہنیں اور دو بھائی/ تیسرا نمبر ہے میرا۔"

6 "تعلیمی قابلیت/ شادی؟"
"گریجویٹ ہوں/ شادی بھی بس جلدی ہو جائے گی۔"

7 "شوبز میں آمد؟"
"اپنے بھائی کی وجہ سے آیا۔ مرتضیٰ چوہدری اس کا نام ہے۔"

8 "وجہ شہرت؟"
"فورمین شو سے شہرت ملی۔"

9 "پہلی کمائی / کہاں خرچ کی؟"

"پانچ ہزار ملے تھے فور مین شو میں کام کرنے کے / اور بس خرچ کردیے تھے۔"

10 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

"کہیں جانا ہو یا کسی سے کوئی کمٹمنٹ ہو تو پھر جلدی اٹھ جاتا ہوں۔"

11 "رات کب ہوتی ہے؟"

"قہقہہ" "صبح کے وقت۔"

12 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"ڈٹ کے ناشتا کرتا ہوں اور پھر کام کے لیے نکل جاتا ہوں۔"

13 "گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"

"گھر والوں کی ساری باتیں پیاری لگتی ہیں۔"

14 "اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟"

"قانون تو سب اچھے ہیں مگر اپلائی نہیں ہو رہے۔"

15 "کون سے تہوار شوق سے مناتے ہیں' قومی یا مذہبی؟"

"ہمارے تو قومی تہوار بھی مذہبی تہوار والی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ عیدین رمضان اور پھر 14 اگست ـــ 14 اگست کی صبح اس لیے نہیں بھول سکتا کہ ہم صبح صبح اسکول جایا کرتے تھے۔"

16 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟"

"الحمدللہ! اللہ نے بہترین بنایا ہے۔"

17 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"

"ہاتھ پاؤں تھوڑے کانپنے لگتے ہیں مگر پھر جلدی نارمل بھی ہو جاتا ہوں اور کئی بار تو میں کھانا کھانا بھول بھی جاتا ہوں۔"

18 "کس دن کا شدت سے انتظار ہے؟"

"موت کا۔"

19 "شدید تھکن میں کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟"

"جم ـــ چاہے کتنا ہی تھکا ہوا کیوں نہ ہوں۔ جم ضرور جاتا ہوں۔"

20 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟"

"بہت کھل کر' چیخ کر' ہلا گلا مچا کر۔ خوشی پر بھی منحصر ہے کہ وہ کس طرح کی ہے۔"

21 "بیرون ملک کس بات سے متاثر ہوتے ہیں؟"

"وہاں کے قوانین سے۔"

22 "آپ کا ذریعہ معاش؟"

"یہی شوبز اور اپنا ایک پروڈکشن ہاؤس ہے۔ اس کا ابھی نام نہیں رکھا اور پھر چوہدری بھی ہوں تو بس اللہ کا کرم ہے۔"

23 "میٹر کب گھومتا ہے؟"

"بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ میٹر گھومے اور مجھے غصہ آئے' کنٹرول کرتا ہوں۔"

24 "غصے میں آپ کی کیفیت؟"

"گالیاں نکلتی ہیں مگر پھر وہی بات کہ کنٹرول کرتا ہوں۔"

25 "ضدی طبیعت ہے یا۔۔۔؟"

"ضدی طبیعت کوئی کوالٹی نہیں ہے' ہمارے ایک دوست ہیں ان کو اپنی اس کوالٹی پہ بڑا ناز ہے حالانکہ اس پہ فخر نہیں کرنا چاہیے۔"

26 "خواتین میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

قہقہہ "خواتین کی ہر بات اچھی لگتی ہے' کیونکہ خواتین ہوتی ہی اچھی ہیں۔"

27 "کوئی لڑکی اگر مسلسل گھورے تو؟"

"میں مسکرا دیتا ہوں' کیونکہ یقیناً" وہ مجھے پہچان کر ہی گھور رہی ہوگی۔"

28 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"والدین کے' اسے غصہ نہیں کہہ سکتے' پیار بھرا رعب کہہ سکتے ہیں۔"

29 "پرائز بانڈ نکلنے کے منتظر رہتے ہیں؟"

"نہیں جی۔ پریکٹیکل لائف میں رہ کر کمانا چاہتا ہوں۔ شارٹ کٹ نہیں کرتا۔"

30 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ جو دیتا ہے' وقت پر ہی دیتا ہے یہ تو ہم لوگ کہتے ہیں کہ لیٹ ہو گئے یا جلدی مل گئی۔"

31 "جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟"

"یہ آپ کی میوچل انڈر اسٹینڈنگ پہ منحصر ہے۔"

32 "جب شاپنگ کے لیے جاتے ہیں تو سب سے پہلے کیا خریدتے ہیں؟"

"مجھے جوتوں کا بہت شوق ہے اور میرے پاس جوتوں کی ایک بڑی کلیکشن موجود ہے۔"

33 "آپ کے دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟"

"یہ تو سوچنے اور کھوج لگانے والا سوال ہے۔ پتا نہیں کیا مقصد ہے۔ اللہ نے کچھ سوچ کر ہی بنایا ہوگا۔"

34 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتے ہیں؟"

"زیادہ نہیں سوچتا ـــ بس خرچ کرنا ہے تو کرنا ہے۔"

35 "کبھی برا وقت گزارا؟"

"بالکل گزارا ہے' دوستوں کی وجہ سے' لیکن برا وقت کچھ نہ کچھ سکھا کر ہی جاتا ہے۔"

36 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"

"پھولوں سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہے اور اگر بندے یا بندی کی پسند سے تحفہ دے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔"

37 "کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟"

"کوئی خوب صورت جملہ' کوئی خوب صورت میوزک' کوئی اچھا شعر' کوئی اچھی خبر ہو ملک کے حوالے سے۔"

38 "پسندیدہ پروفیشن؟"

"جس سے اللہ تعالیٰ رزق باندھ دے۔ وہی پروفیشن اچھا لگنے لگتا ہے۔"

39 "اپنے لیے تعریفی جملے جو بھول نہیں سکتے؟"

"جن لوگوں کا میں فین تھا' ان کے منہ سے یہ جملہ کہ "یار! میں آپ کا فین ہوں" سن کر بہت اچھا لگا۔ ان میں ٹی وی کے فنکار اور کھلاڑی شامل ہیں۔"

40 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے پرائے؟"

"جو آپ سے مخلص ہو گیا' وہی آپ کا اپنا ہے۔"

41 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟"

"گھر پر ہی' گھر والوں کے ساتھ۔"

42 "ملبوس میں کیا پسند ہے؟"

"جینز' ٹی شرٹ اور شلوار قمیص تو آپ کی شخصیت کو اٹھا دیتے ہیں۔"

43 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"رات کو چھت پہ بیٹھنا بہت مزے دار لگتا ہے۔ چھت پر پڑھنا' انٹرنیٹ یوز کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

44 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"

"بس ہیں کچھ لوگ دنیا میں جن کے جواب فوراً" دینے پڑتے ہیں۔"

45 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"

"اکثر لوگ سگریٹ پیتے ہیں مگر میں نہیں' میں میوزک سے دل بہلاتا ہوں۔"

46 "کوئی ایسی شخصیت جس کی پیروڈی نہ کی ہو آج تک؟"

"کافی لوگوں کی کر چکا ہوں اور ایسے بھی لوگ ہیں کافی جن کا گیٹ اپ مجھ پر فٹ نہیں آتا مگر میں ان کی آواز نکال لیتا ہوں۔"

47 "کوئی ایسی شخصیت جس کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"

"نہیں نہیں جی' ایک نمبر تو ایسا ہے جو آدھے پاکستان کے پاس ہے۔"

48 "مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟"

"اچھی لگتی ہے۔ دنیا میں کچھ برا نہیں ہے۔ سب اچھا ہے۔"

49 "خود مہمان بن کے جانا کیسا لگتا ہے؟"

"بہت اچھا لگتا ہے' دوستوں' رشتے داروں میں مہمان بن کے جاتے ہیں ہم بھی۔"

50 "کون سی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"جوتے۔"

51 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"ایک وقت تھا کہ مجھے نصیحت بری لگتی تھی، لیکن اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنی ضروری تھی۔ ویسے انسان کو وقت پر سمجھ آجاتی ہے۔ نصیحت کرنی ہی نہیں چاہیے۔"

52 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"
"کوشش کرتا ہوں مگر کامیاب نہیں ہو پاتا۔"

53 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟"
"جو اپنے ہیں۔"

54 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"گھڑی اور جوتے۔"

55 "عشق کا بخار کتنی مرتبہ چڑھا؟"
"عشق کا بخار تو چڑھا ہی نہیں۔"

56 "ایک ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟"
"بہت جگہوں پر کھانا کھایا ہے مگر پھر بھی کوئی ایسا نہیں ہے کہ جو بہت پسندیدہ رہا ہو' جہاں دوست کہتے ہیں وہاں چلے جاتے ہیں۔"

57 "کھانے کے لیے بہترین جگہ ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟"
"ڈائننگ ٹیبل پہ چٹائی کے اوپر۔" قہقہہ۔ "کیسا؟"

58 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گے؟"
"عموماً" جب میں جاگ رہا ہوتا ہوں تو ساری دنیا سو رہی ہوتی ہے۔ ویسے میرا یقین ہے کہ میرا کوئی نہ کوئی دوست ضرور جاگ رہا ہو گا اور اس کا ایس ایم ایس ضرور آجائے گا کہ یار تو بھی جاگ رہا ہے۔"

59 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"بہت کم۔ نہ ہونے کے برابر۔ ابھی تھوڑے دن پہلے میں نے Twiter (ٹوئٹر) پہ اکاؤنٹ بنایا ہے۔"

60 "فیوچر پلاننگ؟"
"شاپچہ کے ساتھ مل کر پروڈکشن کرنے کا ارادہ ہے۔"

61 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"میرے خیال میں عورت' کیونکہ اس کے اندر ایموشنز زیادہ ہوتے ہیں۔"

62 "اگر آپ کو کوئی اغوا کرے تو گھر والوں کا کیا رد عمل ہو گا؟"
"گھر والے کہیں گے کہ رکھو اسے اور تاوان بھی لے لو مگر واپس نہیں کرنا۔"

63 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"جانوروں کا مجھے بہت شوق ہے مگر کیڑوں سے معاملات ٹھیک نہیں ہیں۔ دیکھ کر ہی عجیب سی کراہیت سی محسوس ہوتی ہے۔ پرندوں کو دیکھ کر پیار آرہا ہوتا ہے مگر کیڑوں کو دیکھ کر تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یقیناً "لال بیگ بھی یہی سوچتا ہو گا ہمارے بارے میں۔"

64 "خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"
"کوئی ہلکا کام نہیں ہے اپنی جان دینا تو بہادر ہی ہوا نا۔"

65 "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"
"اپنے دوستوں سے بہت تجربے حاصل کیے ہیں' کچھ غیر ضروری لوگوں کو اہمیت دے کر بہت دکھ اٹھائے۔"

66 "شادی کی رسومات میں کون سی رسم پسند ہے؟"
"مہندی کی رسم اچھی لگتی ہے۔"

67 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"
"میرا خیال ہے تحفہ دینا چاہیے۔ یادگار رہتا ہے۔"

68 "ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"والدہ کا۔"
"کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"بہت سی شخصیات ہیں۔ فہرست لمبی ہے۔"

69 "اپنا نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کیا؟"
"ایک نمبر تو ایسا ہے جو مستقل ہے اور ایک ایسا ہے' جو کئی بار تبدیل کیا ہے۔"

70 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"گاڑی کی چابی اور موبائل وغیرہ۔"

71 "آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟"
"ہماری زندگی بھی بس اور طرح کی ہی ہے۔ ہمارا نائن ٹو فائیو والا کام نہیں ہے۔ تھوڑی لمبی ہوتی ہے مگر قید تو ہم بھی ہوتے ہیں۔"

72 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"بالکل کر لیتا ہوں اور معافی بھی مانگتا ہوں۔"

73 "آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت ہے؟"
"اچھی عادت ہی بری عادت ہے۔ بعض لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں عزت دی جائے' میں ان کو بھی عزت دے دیتا ہوں۔"

74 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"نہیں جی۔۔۔ غصہ اپنی جگہ ہے' کھانا اپنی جگہ ہے۔"

75 "کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"
"جب غصے میں ہوتا ہوں۔"

76 "مارننگ شو کے لیے آپ کے تاثرات؟"
"بہت برے ہیں۔ پہلے تو بہتر ہوتے تھے' مگر اب جو ہوتے ہیں ان کے لیے تو گالیاں بھی چھوٹی پڑ جاتی ہیں۔ میلوں (گندے) کی ایک دوڑ ہے اب دیکھیں کہ اس میں کون جیتتا ہے۔"

77 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"
"زیادہ تر فائدہ ہی دیتی ہے عزت اور اہمیت ملتی ہے۔"

78 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتے ہیں؟"
"زیادہ تر تو لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے۔"

79 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتے ہیں؟"
"بس کتابیں ہی ہوتی ہیں۔"

80 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"انسان۔"

81 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"زندگی تو خدا کا تحفہ ہے۔ نعمت ہے۔ کیوں بری لگے گی۔"

82 "ویلنٹائن ڈے منانا کیسا لگتا ہے؟"
"میں نے کبھی یہ دن نہیں منایا۔ لیکن جو مناتے ہیں ان پر اعتراض بھی نہیں ہے۔ سب کو حق ہے اپنی زندگی گزارنے کا۔"

83 "زندگی کب بدلی؟"
"سوچنے کے بعد بدلی کہ زندگی کیا ہے۔"

84 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"تو پھر دوبارہ سو جائیں' اس میں کیا مسئلہ ہے۔"

85 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتے ہیں؟"
"جم سے آنے کے بعد۔"

86 "گھر آکر پہلی ہی خواہش کیا ہوتی ہے؟"
"دیر سے گھر آتا ہوں۔ اس وقت تک خواہشات مر چکی ہوتی ہیں۔"

87 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟"
"کچھ نہیں بس ٹھیک ہی ہوں۔"

88 "جس دن موبائل سروس آف ہوتی ہے تو کیسا لگتا ہے؟"
"برا لگتا ہے' مگر پھر whatsapp اور فیس بک سے کام چلا لیتے ہیں۔"

90 "سی این جی کی لائن میں کبھی لگے؟"
"بالکل لگا ہوں مگر اب نہیں۔"

91 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"کبھی دے دیتا ہوں' کبھی کہتا ہوں کہ جاؤ بابا معاف کرو۔"

92 "لائٹ چلی جائے تو بے ساختہ جملہ؟"
"بے ساختہ تو گالی ہی نکلتی ہیں۔"

93 "اچانک چوٹ لگنے پر کیا منہ سے نکلتا ہے؟"
"اللہ یا امی۔"

94 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"
"کسی کے لیے نہیں۔ اپنا ملک بہت اچھا ہے۔"

98 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"تو کوئی بات نہیں' لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ مگر تیار رہنا چاہیے ہر کام کے لیے۔"

☆

نادیۂ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

ناہید' ہادیہ' کلثوم... لاہور

خواتین ڈائجسٹ اور شعاع کی خاموش قاری ہیں۔ نمرہ احمد' راحت جبیں' آمنہ ریاض ہماری پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ سائرہ رضا تو بیسٹ ہیں۔ ان کو سالگرہ نمبر میں ضرور شامل کریں۔

ج۔ ناہید' ہادیہ اور کلثوم! سائرہ رضا کا مکمل ناول سالگرہ نمبر میں شامل ہوگا' ان شاء اللہ۔ نمرہ احمد کا ناول "دو مکمل" آپ بہت جلد پڑھ سکیں گی۔

انیقہ انا... چکوال

طویل غیر حاضری کی کیا وضاحت کروں کہ۔ دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ ہر چیز سے یقین اٹھ گیا۔ اب اس سے بڑھ کر اور کیا کہوں؟

ابھی میں خود سے نہیں مل پایا
ابھی کچھ اور دن نہ مل مجھ سے

سچ کہوں تو میرے اندر اگر کوئی اچھا انسان تھا بھی تو۔ وہ مر گیا۔ آخر کب تک یقین کی ڈور پکڑے خواب سنبھالے رہتی۔ لکھنے کی صلاحیت جو ذرا سی بچی تھی وہ بھی چھن گئی' یا شاید یقین ختم ہو گیا (جی ہاں! یقین اٹھ گیا' خود سے' دعاؤں سے) اب بھی فروری کا خواتین ہاتھ میں تھا' آپ نے لکھا "ہم بھی انیقہ کو یاد کر رہے ہیں" تو یقین مانیے! میری خوشی کی انتہا نہیں رہی اور میں خود کو خط لکھنے سے روک نہ پائی۔

تم نے مسکرا کر دیکھا تو مسکرا دیے ہم بھی!
حصار ذات سے نکلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

"بن مانگی دعا" کچھ خاص متاثر نہیں کر سکا (تاحال) سمیرا حمید' جن کی کہانی کا آغاز بہت منفرد ہوتا ہے سائرہ رضا بلاشبہ کمال کا لکھتی ہیں۔ شکریہ سائرہ! ایک طویل مدت کے بعد کوئی کہانی پڑھی اور کمال کی لکھی ہوئی۔

ج پیاری انیقہ' آپ نے ہمیں خط لکھا' بہت خوشی ہوئی لیکن ہم آپ سے بالکل بھی متفق نہیں' اچھائی کبھی نہیں مرتی۔ ہاں اچھے انسان حالات کے تحت وقتی طور پر کبھی پسپا ہو جاتے ہیں' مایوس ہو کر سیدھا راستہ ترک کر دیتے ہیں' خاموشی اختیار کر لیتے ہیں لیکن ان کے اندر کا سچا اور اچھا انسان کبھی نہیں مرتا۔ مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔ امید کی روشنی میں آگے بڑھیں اور خود کو منوائیں۔ آپ کی صلاحیتوں میں کوئی کمی نہیں ہے' بس صرف یہ یقین پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ آپ کے ساتھ ہے' خواب تو ٹوٹنے کے لیے ہی ہوتے ہیں مگر ان کی تعبیریں ہمیں تلاش کرنا پڑتی ہیں۔

اپنی کہانی فٹافٹ مکمل کر کے بھجوا دیں۔ فون پر آپ سے بات ضرور کریں گے' آپ اپنی کہانی پر فون نمبر ضرور لکھیں۔

مسز احمد... مردان

خواتین ڈائجسٹ کی پسندگی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں خیالی باتیں نہیں ہوتیں۔ اس ماہ بھی تمام تحریریں بہت اچھی تھیں لیکن سلسلہ وار ناول بہت ہی سلو ہیں "بن مانگی دعا" ابھی تک متاثر نہیں کر پایا۔ جبکہ عنیزہ سید کے ناول میں پہلی قسط سے جو تجسس سے شروع ہوا تھا وہ آج بھی قائم ہے۔ کہانی بالکل آگے نہیں بڑھی۔ سعد جیسا آج کے دور کا پڑھا لکھا نوجوان ایک فقیر کی باتوں پر اتنا اندھا یقین رکھتا ہے۔ نعوذ باللہ۔ ایک فقیر عالم الغیب کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک طرف تو آپ احادیث شائع کرتی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔ دوسری طرف اس طرح کی تحریریں۔؟ عنیزہ سید میری پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ انہیں لکھتے ہوئے احتیاط کرنی چاہیے۔

ج ۔پیاری زاہدہ! کل کیا ہوگا' یہ اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں' ہمارا یقین ہے کہ بلاشبہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ہے اور اس میں ہمیں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ بھی نہیں ہے۔ کہانیوں میں کرداروں کے حوالے سے کوئی بات شائع ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں بھی اس پر یقین ہے۔

زینت قریشی... دھنڈیاں علی پور چٹھہ

جس تحریر نے مجھے اپنی چپ توڑنے پر مجبور کیا۔ وہ ہے' سائرہ رضا کا ناول "اب کر میری رفوگری" اگر میں اب بھی خاموش رہتی تو یہ زیادتی تھی۔

سائرہ رضا جی! کیا لکھا آپ نے۔ کمال کر دیا۔ یہ معاشرے کا المیہ ہے۔ کہ ذات پات کو زندگی موت کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ جو لوگ اسلام کی اصل روح تک نہیں پہنچ پاتے' وہ ---- یوں ہی دوسروں کا جینا محال کر دیتے ہیں اسلام کے نام پر۔

اس ناول کا ہر کردار کمال کا تھا اور تھیم بھی زبردست۔ "چھتر پہلے مرحلے میں تکلیف' دوسرے میں ذلت اور اگر آپ باضمیر ہیں تو موت بن جاتا ہے۔" کیا کمال لکھا آپ نے ایک قاری بہن نے لکھا تھا کہ خواتین کا معیار پہلے جیسا نہیں رہا۔

مجھے یہ کہنا ہے' غریب طبقہ بھی زندگی' دل' جذبات و احساسات رکھتا ہے۔ انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ جیسے حالات آج کل ہمارے ملک کے چل رہے ہیں ان حالات میں ایک قاری بہن کا ایک ایسا مطالبہ۔ کمال ہے۔ کبوتر کی طرح آنکھ بند کر لینے کے مترادف لگتا ہے۔

ج ۔پیاری زینت! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ خواتین کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ جہاں تک تنقید کی بات ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں اگر کسی قاری بہن کو پرچے میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کا پورا حق ہے۔ اور یہ بھی غلط نہیں ہے کہ بہت زیادہ تلخ حقائق کا بیان ہمیں زندگی سے بیزار کر دیتا ہے۔ دل اور ذہن پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ اس لیے روشن پہلو کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔

اپنے بھائی کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیں۔ اس نے آپ کا خط پوسٹ کیا تو ہم آپ کی رائے جان سکے۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

یاسمین حنفی... کراچی

سرورق پہ ہنستی نیلم منیر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کہنی سنی اور کرن کرن روشنی کے بعد دوڑ لگائی اپنے سب سے فیورٹ ناول "ماہ تمام" کی طرف۔ واہ مزا آگیا۔ سائرہ رضا کے ناول کی دوسری قسط بھی شان دار رہی۔ لیکن پھر بھی لڑکیوں کو اپنے گھر میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو' انہیں یہ حق نہیں کہ اپنے باپ بھائیوں کی عزت سے کھیلیں افسانے بھی سب ہمیشہ کی طرح نارمل تھے' میں خبریں وبریں کا سلسلہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ (خاص کر آپ کے اس میں ایڈ کردہ خیالات' عنیزہ سید کا ناول پچھلے دو مہینوں سے نہیں پڑھا۔ بن مانگی دعا میں اب اللہ ہی جانے ایبہا کے ساتھ کیا ہوگا؟ مجھے اس میں عون کا کردار اچھا لگتا ہے۔ اب تو اس کا ساتھ دینے ثانیہ بھی آگئی ہیں۔

"میری خامشی کو زباں ملے" کے سوالات شائع کریں پلیز۔

ج۔ یاسمین! ہم آپ سے متفق ہیں' لڑکیوں کو والدین کی عزت کا پاس رکھنا چاہیے۔ جو لڑکیاں اس طرح کے قدم اٹھاتی ہیں' کبھی خوش نہیں رہتیں یہ حقیقت ہے کہ ہر لڑکی کو جاذب سلطان نہیں ملتا اور تاباں جاذب سلطان کو پا کر بھی خوش نہیں تھی۔ اس کا پورا خاندان برباد ہوا' اس ناول میں تاباں کے قدم کو جائز نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ ان غلط رسم و رواج کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جو لڑکیوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر رہے ہیں۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مثی گروپ۔۔۔ حویلی لکھا، تحصیل دیپالپور ضلع اوکاڑہ

سرورق سب نے بہت پسند کیا۔ پھر سائرہ رضا کے ناول تک دوڑ لگائی۔ اینڈ پڑھ کر جہاں اچھا لگا وہاں دکھ بھی بہت ہوا۔ تاباں کے گھر کے مونفسیاتی مریض تھے۔ زیادہ دکھ ضوفشاں کا ہوا۔ جس کا ڈاکٹر بننے کا خواب اس کی کتابوں کی طرح جلا دیا گیا۔ "ماہ تمام" میں امید ہے کہ آمنہ ریاض صاحبہ سب ٹھیک کر دیں گی۔ سمیرا حمید نے بہت اچھا لکھا۔ اگر جمیلہ، جمالے کی زندگی میں آجاتی تو شاید وہ جان جاتا کہ زندگی صرف کاٹنا اور سینا ہی نہیں اور بہت کچھ ہے۔ "وہ اک حرف یقین" نورین جی نے زبردست لکھا۔ "روبی گیلانی" سے باورچی خانے میں ملاقات اچھی رہی۔

خاتون کی ڈائری میں بھی سب کا انتخاب زبردست تھا۔

ج۔ آپ سب لوگوں کا تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کا خط شائع کر دیا ہے۔ اب آئندہ ماہ بھی ہمیں خط لکھیے گا لیکن صرف تعریف نہیں اگر کسی تحریر میں یا پرچے میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کے بارے میں بھی لکھیں۔

شاہجہان رفیق۔۔۔ وزیر آباد

میں شاید خواتین ڈائجسٹ کی سب سے پرانی اور عمر رسیدہ قاری ہوں میری عمر اس وقت 68 سال ہے ماشاء اللہ پوتے، پوتیاں نواسے نواسیاں اللہ کا دیا بہت کچھ ہونے کے باوجود میری وابستگی نماز اور قرآن کی تلاوت کے بعد صرف خواتین ڈائجسٹ سے ہے۔ اس دفعہ مجھے جس ناول نے خط لکھنے پر مجبور کیا، وہ ہے "اب کر میری رفوگری" سائرہ رضا نے لکھا ہے اور کیا خوب لکھا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک سبق آموز کہانی ہے۔ جو بڑے دین کے علم بردار بنے پھرتے ہیں۔ اپنی نام نہاد عزت اور اونچے شملہ کے لیے خدائی احکام کو بھول جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو حکم دیا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی رضامندی کے بغیر رشتہ نہ کیا جائے لیکن یہ دین سے بے بہرہ لوگ کب سمجھتے ہیں۔

بہرحال خواتین ڈائجسٹ کی ہر ہر کہانی تعریف کے قابل اور سبق آموز ہوتی ہے۔ ٹائٹل سے لے کر آخر تک کس کس چیز کی تعریف کروں۔

ج۔ شاہجہان جی! بہت خوشی ہوئی کہ خواتین ڈائجسٹ سے طویل وابستگی کے بعد آج آپ نے ہمیں یاد کیا اور خط لکھا۔ خواتین ڈائجسٹ بلاشبہ اس وقت تین نسلوں کا پسندیدہ ترین پرچا ہے اور شاید اس کی قارئین میں آپ سے بڑی عمر کی خواتین بھی شامل ہیں۔ آپ نے خط لکھ کر ہمیں بہت بڑی خوشی دی ہے۔ ایک سمجھ دار، میچور اور باشعور قاری کا خواتین کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار ہمارے اعتماد میں اضافہ کرتا ہے۔

عفیفہ خیام۔۔۔ راولپنڈی

آج بھی میں فروری کا شمارہ پڑھتے ہوئے ایک بہت بڑے ذہنی کرب سے گزری۔ اس دفعہ کا شمارہ سارا کا سارا ہمیشہ کی طرح زبردست ہے لیکن میرے دماغ میں صرف ایک بات کے حوالے سے اتنا شور ہے کہ میں فی الحال باقی شمارے پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ آپ کو پتا ہے کہ میں ہمیشہ خواتین و شعاع کو اونچی جگہ پر رکھتی ہوں صرف اس وجہ سے کہ اس میں اللہ اور آپ ﷺ کے نام مبارک اور اس کے ساتھ ساتھ صحاح ستہ کی مستند احادیث جو کہ آپ بہت احتیاط کے ساتھ شائع کرتے ہیں وہ ہوتی ہیں "کرن کرن روشنی" میں کبھی بھی (جتنا مطالعہ میں نے کیا ہے) کوئی بھی ایسی حدیث نظر سے نہیں گزری جو صحاح ستہ کے علاوہ ہو تو عرض یہ ہے کہ وہ شمارہ جو ہر بات چھاپنے سے پہلے مکمل تسلی کرتا ہے تو ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں سمیرا حمید کے ناولٹ "دائم الحبس" جو کہ بہت حساس موضوع لیے ہوئے تھا پڑھتے ہوئے بہت بہت بڑے شاک سے گزری۔

As a novel وہ سمیرا کی ہمیشہ کی طرح بہترین تحریر ہے لیکن ان کی تحریر میں صفحہ نمبر 225 پر جب میں نے لفظ عید میلاد النبی پڑھا تو آپ یقین کریں کہ میں جس دلی کرب و اذیت سے گزری ہوں وہ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں میں تو ہکا بکا بیٹھی صرف یہ سوچ رہی ہوں کیا یہ الفاظ میں "خواتین ڈائجسٹ" میں پڑھ رہی ہوں؟ "کرن کرن روشنی" کے لیے صحاح ستہ سے احادیث منتخب کی جاتی ہیں وہاں جا کر پوچھیں کہ صحاح ستہ کی تمام کتب میں کہیں یہ لفظ لکھا ہے؟ کیا دین اسلام میں 2 کے علاوہ تیسری کسی عید کا ذکر ہے؟

میں نے یہ سوال صرف ایک مسلمان ہونے کے ناتے

کیا ہے لہٰذا ایک مسلمان ہونے کے ناتے مجھے مطمئن کرنا آپ کا فرض ہے۔ آپ نے مجھے بہت بڑی ذہنی اذیت دی ہے۔

جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو ہماری نظر کے سامنے ہے صرف اتنا التماس ہے کہ اس کو ادب کا حصہ نہ بنائیں۔

ج: عفیفہ! افسانوں اور دیگر تحریروں میں کرداروں کی زبان میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ شرعی نقطہ نظر سے نہیں معاشرتی حوالے سے ہوتا ہے۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی اور آپ ذہنی اذیت میں مبتلا رہیں۔

آپ کا کہنا درست ہے کہ صحاح ستہ اور احادیث کی تمام کتابوں میں صرف 2 ہی عیدوں کا ذکر ہے۔

حرا قریشی۔۔۔ بلال کالونی ملتان

"کہنی سنی" صداقت سے اعتراف کریں تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ اندر باطل کی اس قدر آمیزش ہو چکی ہے کہ حق نے اپنی اصلی پہچان کھو دی ہے۔ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ جھوٹ پر یقین کر رہے ہیں اپنے راستوں کو کٹھن سے کٹھن تر بنانے کی مکمل تیاری کر رہے ہیں۔ غزالہ نے خامشی کو بیاں دے کر خاموشی کو اچھے انداز میں توڑا۔ ایک ادبی معمر تخلیق کا پیراہن "دائم الحبس" سمیرا حمید کی تحریر، خواتین کی کچھ ایسی مصنفین ہیں جن کے بارے میں کہتے ہیں کہ "آگئے اور بس چھا گئے" سمیرا جی بھی ان میں سے ایک ہیں۔ بے بسی کی انتہا! اس قدر اذیت اتنی تکلیف صرف اور صرف جمال کے لیے؟ اس چوغہ پوش درویش کی قابل رحم حالت پر ترس آیا بہت دکھ ہوا! بہت اعلیٰ! نورین کی "وہ اک حرف یقین" بلاشبہ ایک اچھی کاوش رہی۔ "میرا بھی" حنا یاسمین کے قلم کے رنگ نظروں کو خیرہ کر گئے اعلیٰ ظرف صباحت کی اعلیٰ ظرف تحریر ..... "ہم دیوار اور وہ بات ادھوری" بھی بہت اچھی تھیں۔ جذبوں کے نبض شناس شاعر ارشد ملک کی نظم بھی خوب رہی۔

ج: پیاری حرا! آپ نے ہر تحریر اور ہر سلسلے پر تفصیلی تبصرہ کیا بہت شکریہ۔ ارشد ملک کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔

ارم بنت شوکت۔۔۔ ڈیرہ غازی خان

"شعاع" اور "خواتین" دونوں بہت ہی اچھے اور معیاری رسالے ہیں۔ بس آپ ہمیشہ اپنا معیار قائم رکھیے گا۔ تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہو سکیں۔ "اب کر میری رفوگری" سائرہ رضا کا ناول بہت ہی شاندار تھا۔ انہوں نے بہت ہی اچھے موضوع پہ لکھا ہے، باقی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ خاص کر "کوہ گراں" اور "ماہ تمام" دونوں بہت اچھی جا رہی ہیں۔

ج: بہت شکریہ ارم، آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

سارہ علی۔۔۔ سوہاوہ گجر خان

تقریباً عرصہ 9 سال سے آپ کے تینوں ماہناموں کی خاموش قاری ہوں۔ وجہ خاموش رہنے کی میرے گھر والے ہیں۔ میں ایک ان پڑھ لڑکی ہوں۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو تعلیم نہیں دی جاتی۔ میں شکر گزار ہوں خواتین، کرن، شعاع کی جس نے مجھے لکھنا پڑھنا سکھایا۔ میں حافظہ ہوں اور شکر ہے حافظہ ہونے کی وجہ سے میرے والد صاحب نے اجازت دی مجھے بچوں کو آگے تعلیم دینے کی۔ میں بڑی مشکل سے رسالے منگواتی ہوں۔ ورنہ ہمارے گھر میں تو کبھی ہم نے مہمان کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اتنی پابندی ہے۔

ج: پیاری سارہ! اتنی پابندیوں میں رہ کر آپ نے پڑھا اور اب آگے دوسروں کو بھی تعلیم دے رہی ہیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے اور رائٹنگ بھی بہت صاف اور خوب صورت ہے بس ایک بات اچھی نہیں لگی آپ نے خود کو ان پڑھ لکھا ہے۔ جس کے سینے میں قرآن پاک جیسی عظیم نعمت محفوظ ہو وہ ان پڑھ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ تو حافظہ ہیں۔ آئندہ کبھی خود کو ان پڑھ نہ کہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عالیہ بتول۔۔۔ حویلی بہادر شاہ

میں پچھلے دو ماہ سے خط نہ لکھ سکی۔ 3 جنوری 2014ء کو میرے ماموں کا انتقال ہوا وہی لیٹر پوسٹ کر

دیتے تھے اور لفافہ بھی وہی لا دیتے تھے۔ بہرحال خواتین کے سارے سلسلے بہت پسند ہیں خاص طور پہ "کرن کرن روشنی" سائرہ رضا کا ناول اچھا تھا اور حقیقت پر مبنی تھا۔ عفت سحر طاہر کی کہانی اچھی جا رہی ہے۔ عنیزہ سید کی جتنی تعریف ہو اتنی کم ہے آمنہ ریاض کی کہانی میں شفا اور تقی دلچسپ موڑ ہے کہانی کا۔ سمیرا حمید کی دائم الحبس بہت اچھی لگی۔ آج کل کے حالات کے عین مطابق اور دکھ بھی ہوا وہ اک حرف یقین بھی اچھی تھی افسانے بھی سارے اچھے تھے۔

ج : پیاری عالیہ! اللہ تعالیٰ آپ کے ماموں کی مغفرت فرمائے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

صبا بتول۔۔۔ فیصل آباد

یہ آج سے بیس سال پہلے 1994ء کی بات ہے جب اس کو چھپ کر پڑھنا شروع کیا اور تب سے اب تک ہر موسم کے بدلتے تیوروں کو برداشت کرتا ہوا میکے سے سسرال تک کے سفر میں ہمارے ساتھ ہے۔ بدلتے ہوئے موسموں میں کئی مصنفین کے نام تو بدلے لیکن انداز وہی رہنمائی والا۔ کس کا تذکرہ کریں اور کس کا نہ کریں' ہر لکھاری نے اپنی تحریر سے انصاف کیا اور معاشرے کے ناپختہ ذہنوں کی اصلاح میں اپنا کردار ادا کیا اور یہ فراموش نہ ہونے دیا کہ اللہ رب العزت نے کیا ذمہ داریاں عائد کی ہیں جو ہمیں ایک عورت ہونے کے ناتے ادا کرنی ہیں۔ اس کا ہر سلسلہ' ہر ناول' ناولٹ' افسانہ' پکوان' نفسیات اور بیوٹی ٹپس بہترین ہے۔

"کرن کرن روشنی" سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ زندگی گزارنے کا فن' ایثار' صبر' شکر' مذہب' نیک نیتی جیسے اصول اتنی خوب صورتی سے بیان ہوئے کہ وہ جو نصیحتوں سے ہمیشہ خائف رہتے۔ لاشعوری طور پر ان ہی اصولوں کو اپنی زندگی میں شامل کرتے رہے۔ تبصرہ پھر بھی سہی! یہ خط تو صرف شکریہ ہے تمام مصنفین کا۔ ادارے کا جنہوں نے اپنی تحریر کی پختگی' تجزیے' مشاہدے سے جینے کا فن سکھایا۔

ج : پیاری صبا! خواتین کی ابتدا کے وقت ہم نے جو مقصد سامنے رکھا تھا اس کو کبھی فراموش نہ ہونے دیا اور ایسے ہی خط ہوتے ہیں جو ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے۔ بہت شکریہ۔ آئندہ خواتین کی تحریروں پر تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

خواتین ڈائجسٹ میں ٹائٹل گرل "نیلم منیر" کو دیکھ کر دل خوشی سے ہمکنار ہو گیا۔ ڈریسنگ' اسٹائل' کلر کمبی نیشن ہر چیز پرفیکٹ تھی "کوہ گراں تھے ہم" اس ناول میں سارہ خان میرا موسٹ فیورٹ کردار ہے لیکن سارہ کا کردار بہت ہی کم پڑھنے کو ملتا ہے "بن مانگی دعا" عفت سحر طاہر کا یہ ناول آگے جا کر اور بھی زبردست ہو گا۔ "اب کر میری رفوگری" سائرہ رضا کا ہر ناول ہی بہت اثر انگیز اور طرز تحریر بہت ہی زبردست ہوتا ہے "بے تعلق اور ہی" بشریٰ احمد کی ہلکی پھلکی تحریر پڑھ کر موڈ فریش ہو گیا۔ پڑھ کر مزا آیا۔ فارینہ کا کردار سب سے زیادہ پسند آیا۔ "دائم الحبس" سمیرا حمید نے بہت ہی اہم موضوع پر قلم اٹھایا اماں کا بے حس رویہ سمجھ سے بالاتر تھا اینڈ پسند نہیں آیا جمال کو جمیلہ کی صورت میں ایک خوشی تو ملنی چاہیے تھے اماں کو بھی اپنی خود غرضی کا احساس ہی نہیں ہوا' کچھ تشنگی محسوس ہوئی۔ نورعین کا ناولٹ "وہ اک حرف یقین" اس ناول کے اسٹارٹ نے ہی مجھے اپنے سحر میں لے لیا طرز تحریر دلچسپ اور اثر انگیز تھا۔ صارم کا کردار پسند آیا ناول دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔

افسانوں میں "اعلیٰ ظرف" بہت ہی متاثر کن تحریر تھی۔ "میرا بھی" اور "وہ بات ادھوری" بھی قابل تعریف تحریریں تھی۔ "ہم دیوار" موضوع بہت ہی جاندار تھا لیکن اینڈ میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی نائلہ کی کون سی بات سے سلیم کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

ج : پیاری مسرت! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا پچھلا خط شامل نہ ہو سکا سمیرا حمید کی کہانی ہمارے معاشرے کی ایک تلخ سچائی تھی نہ جانے کتنے جمال اس طرح کی خود غرضیوں اور مجبوریوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں' نسلوں کی غربت آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اور ضرورتیں ممتا کو گہری نیند سلا دیتی ہیں تو ضمیر کہاں جاگے گا۔

سنبل ملک اعوان۔۔۔ ونڈالہ دیال شاہ

سب سے پہلے بات کریں گے سلسلے وار ناول "کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ سید "بن مانگی دعا" عفت سحر طاہر زبردست حالات و واقعات بخت سے لے کر کرداروں تک کو خوب صورتی سے بیان کیا۔ بیوٹی بکس تو ہے ہی زبردست۔ نفسیاتی' ازدواجی الجھنیں' عدنان انکل کے جوابات ویلڈن۔ افسانے تمام کے تمام اچھے تھے۔ سائرہ رضا کا ناول زبردست۔ مجموعی طور پر پورا ڈائجسٹ فیورٹ ہے۔

آپ سے فرمائش ہے کہ پلیز رخسانہ عدنان نگار صاحبہ کا انٹرویو پلیز پلیز شائع کر دیں۔ اس کے علاوہ طارق عزیز۔ نیلام گھر والے کا تفصیلا "انٹرویو پلیز پلیز۔ کیا میں "میری خامشی کو زباں ملے" سلسلے میں شامل ہو سکتی ہوں؟

ج : پیاری سنبل! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ وجہ صفحات کی مجبوری۔ ہماری قارئین ہمیں اتنے خوب صورت خط لکھتی ہیں کہ ہم پڑھ کر داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن صفحات کی کمی کی وجہ سے ہمیں انہیں مختصر کرنا پڑتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین کے خط شامل ہوں اور جب کسی بہن کا خط شامل نہ ہو پائے تو ہمیں خود بھی بہت رنج ہوتا ہے۔ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ آپ خواتین کے ہر سلسلے میں خط لکھ سکتی ہیں۔ آئندہ بھی ہمیں خط ضرور لکھیں کیونکہ ہم تمام خطوط بڑی توجہ سے پڑھتے ہیں۔

حیا بنگش۔۔۔ کوہاٹ

میرے کزن برادر حسنین بنگش (سنی) محض سترہ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بائیک کے سامنے اچانک ایک کار آئی اور اس سے ٹکرا گئی۔ حسنین موقع پر ہی شہید ہو گیا۔ غلطی کار والے کی تھی۔ اس نے خود ہی اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ چاچو نے اسے معاف کیا کیونکہ اس کو سزا دے کر اس کا بیٹا واپس تو نہیں آسکتا تا۔ آپ احادیث میں تصویروں کے بارے میں مارچ کے شمارے ضرور کچھ بتائیں۔

ج : پیاری حیا! آپ کے کزن کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔ یہ بہت بڑے دل کی بات ہے کہ آپ کے چاچو نے اس گاڑی والے کو معاف کر دیا۔ یہ بہت سے لوگوں کے لیے قابل تقلید مثال ہو سکتی ہے اگر کوئی اپنی غلطی پر نادم ہو کر معافی مانگے تو اس کو معاف کرنا افضل ہے۔ ہم ان شاء اللہ اپریل کے شمارے تصویریں لگانے کے موضوع پر احادیث دیں گے۔

شفق راجپوت۔۔۔ گوجرہ

اس بار خط لکھنے کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ ہے میری موسٹ فیورٹ "سائرہ رضا" واہ زبردست۔ ان بلیوایبل۔ واقعی! لڑکی کے گھر سے باہر قدم نکالنے کا ذمہ دار اس گھر میں رہنے والا ہر ہر فرد ہوتا ہے۔ ہمارے بڑے گھر بٹھا کے لڑکیاں بوڑھی کر لیتے ہیں کہ جی غیر برادری میں رشتہ نہیں کرنا یہ روایت ٹوٹ جائے تو لڑکیاں بہت درست عمر میں اپنے گھروں کی ہو جائیں اور بہت اچھی جگہوں پر بیاہی جائیں۔ اب اس پر ہمارے بڑے کہتے ہیں کہ نصیب کی بات ہے۔ صرف برادری کے نام پر لڑکیاں بیاہی جاتی ہیں اور پھر اگر وہ اپنے گھر میں خوش نہ ہوں تو سارا قصور مقدر کو دے دیا جاتا ہے۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی کو ایک ان پڑھ اور جاہل قسم کے شخص کے پلے باندھ دیا جاتا ہے برادری اور ذات پات کے نام پہ حالانکہ اسی لڑکی کے لیے غیر برادری میں ایک سے بڑھ کر ایک اچھا رشتہ موجود ہوتا ہے۔ پتا نہیں یہ جاہلانہ رسم کب اپنے اختتام کو پہنچے گی۔

ج : شفق! آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔ تاباں نے حالات سے مجبور ہو کر قدم اٹھایا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ گھر سے نکلنے والی ہر لڑکی کو جاذب سلطان نہیں ملتا اور وہ کنوئیں سے نکل کر کھائی میں گر جاتی ہے۔ اپنے گھر کے دروازے بند ہوتے ہیں اور اگلا گھر انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ تاباں نے جو راستہ اپنایا' وہ بہرحال غلط تھا اور بہت سارے لوگوں کے لیے تباہی لے کر آیا۔

حنا سلیم اعوان۔۔۔ گاؤں آخون' باندی تحصیل و ضلع' ہری پور ہزارہ

ٹائٹل میں صرف ماڈل کے جھمکے پسند آئے۔ جس کہانی کے لیے میں نے قلم اٹھایا ہے وہ کون سی ہے؟ جی ہاں "اب کر میری رفوگری" سائرہ رضا بھی نمرہ احمد کی طرح تیزی سے ہمارے دلوں میں جگہ بنا رہی ہیں۔ ویلڈن سائرہ

مگر مجھے سائرہ سے اختلاف ہے کہ وہ یہاں پر گھر سے بھاگی لڑکیوں کو خواب دکھا گئی ہیں۔ ہر لڑکی کے ساتھ تاباں کی طرح نہیں ہوتا۔ جن کی خاطر وہ والدین کو بیچ چوراہے پر رسوا کرتی ہیں آخر کار ایک دن وہی انہیں خاطر میں نہیں لاتے اور طعنوں کی مار مارتے ہیں۔ جیسے بھی حالات سہی

تاباں ڈٹ کر مقابلہ کرتی۔ اس طرح کرکے وہ اپنے کردار کو بھی مشکوک بناگئی۔ ایک کہانی تھی۔ بڑی ہی پرانی۔ عمر اور تاباں ۔۔۔ دونوں کزنز ہیں۔ جن کی آپس میں نہ بنتی تھی۔ عمر کے باہر جانے کے بعد تاباں سگھڑبی بی کا روپ دھار لیتی ہیں اور آخر میں دونوں ایک ہوجاتے ہیں۔ کسی قاری کو یاد ہو تو بتادے۔

ج : پیاری حنا! تاباں کے گھر والوں نے حالات سنوارنے ' جدوجہد کرنے کی گنجائش ہی کہاں چھوڑی تھی۔ وہ تو اس کی شادی شکیل جیسے اجڈ اور نالائق سے کررہے تھے۔ جو مرد عورت پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔ اس سے کوئی بھی بات سمجھنے کی توقع بے کار ہے۔ سائرہ رضا نے لڑکیوں کو بھاگنے کی راہ نہیں دکھائی انہوں نے تو یہ دکھایا ہے کہ ایک لڑکی بغاوت کرکے گھر سے نکلی تو کتنی لڑکیوں کا مستقبل تاریک کرگئی اور خود بھی کبھی پورے دل سے خوش نہ ہوسکی۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے آئینہ ہے جو آج بھی رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے بتائے راستوں پر چلنے کے بجائے انسانوں کے بنائے رسم و رواج کو فوقیت دیتے ہیں۔

گلشن نذیر۔۔۔ چک 82'81/R-10' خانیوال

ہم پانچ فرینڈز مل کر تینوں شمارے (کرن ' خواتین ' شعاع) پڑھتے ہیں۔ ان شماروں نے ہماری بہترین تربیت بھی کی ہے۔ زمانے کی اونچ نیچ اور سماجی رویوں کے بارے میں بہت کچھ سکھایا ہے۔ ماہ تمام بہت اچھا جارہا ہے لیکن تقی کی ماں کا ساحر کی طرف داری کرنا بہت برا لگا۔ بن مانگی دعا بہت سلو جارہا ہے "کوہ گراں تھے ہم" بھی زبردست جارہا ہے۔

ج : گلشن! آپ سب دوستوں کا تہہ دل سے شکریہ۔

سحر خان۔۔۔ کوئٹہ

لڑکیاں گھروں سے کیوں بھاگتی ہیں؟ اس سوال کا جواب مجھے کہیں سے بھی نہیں ملا۔ "اب کر میری رفوگری" سائرہ رضا صاحبہ آپ کے الفاظ ہی نہیں آپ کے کردار بھی میرے سامنے آ آکے بولے ' ہر ہر کردار نے احتجاج بھی کیا اور اپنا کردار بھرپور طریقے سے نبھایا بھی۔ آپ کے ناول کے الفاظ "رفوگری" کی صورت ہجرت کرتے میرے دل کے اندر تک اتر گئے۔

عنیزہ سید صاحبہ پہلی بار آپ کے کسی ناول میں بے معنی سا تجسس پڑھا اور تجسس بھی ایسا جو حقیقت میں تجسس بھی نہیں رہا "کوہ گراں تھے ہم" بلاشبہ پڑھے جانے اور یاد رکھے جانے لائق ناول سہی مگر ناول پر تجسس کا جمود طاری ہوجاتا ہے عفت سحر طاہر صاحبہ ناول "بن مانگی دعا" میں تجسس تو رہا ہی نہیں ' آپ تو بہت خوب صورت الفاظ لکھتی ہیں تو پھر۔۔۔ بہرحال ناول تو ابھی باقی ہے۔

پرچے والوں سے پہلی مرتبہ فرمائش کررہی ہوں بانو قدسیہ صاحبہ کا تازہ انٹرویو ہوسکے تو سالگرہ نمبر میں ضرور شامل کیجئے گا۔ سمیرا حمید صاحبہ موضوع چاہے صدیوں پرانا ہی کیوں نہ ہو لکھنے والے کا انداز و الفاظ وہ جدت اور خوب صورتی بھردیتے ہیں کہ تحریر شاہکار نظر آتی ہے۔

ج : پیاری سحر! آپ چاروں بہنیں خالہ کے درجے پر فائز ہوئیں۔ ہماری طرف سے مبارک باد اور نومولود کے لیے دعائیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ

گل رعنا ہاشمی۔۔۔ فارورڈ کہوٹہ آزاد کشمیر

میں تقریباً" دس سال سے خواتین کی خاموش قاری ہوں۔ فروری 2014ء کا شمارہ تقریباً" پچھلے تمام شماروں پر بھاری رہا اور میرے خط لکھنے کی وجہ بھی۔ ٹائٹل تو ایک عرصے کے بعد مجھے پسند آیا۔ تمام ناولٹ قسط وار ناول ' افسانے سب کچھ اچھا تھا۔ "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" زبردست جارہا ہے۔ ماہ تمام پہلے اتنا پسند نہیں تھا مگر اب مزا آرہا ہے۔ "اب کر میری رفوگری" بہت اچھا رہا۔ بن مانگی دعا بھی اچھا جارہا ہے۔ افسانے بھی سبق آموز تھے۔ ہم تین بہن بھائی ہیں اور میری بہن کی کمی کو خواتین نے اکثر پورا کیا ہے۔

ج : گل رعنا! خواتین ڈائجسٹ دس سال سے آپ کا ساتھی ہے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی امی ہماری خاموش قاری ہیں۔ ہماری طرف سے ان کا شکریہ ادا کر دیں۔

شبنم شمشاد۔۔۔ نیاں

مصروفیات زندگی کے باعث کچھ عرصہ نہ پڑھ سکی۔ آپ کو تو میری کمی محسوس نہیں ہوئی ہوگی ناں؟

بہرحال معیار کبھی اپ تو کبھی ڈاؤن۔ نئی رائٹرز بلاشبہ بہت اچھی ہیں لیکن پرانوں کی کمی فیل ہوتی ہے اور بہت سارے کردار ذہن میں عجب ہلچل مچائے رکھتے ہیں۔ دعا کریں میرے کردار الفاظ کا روپ ڈھال کر امر ہوجائیں۔

ج : پیاری شبنم! آپ نے کیسے سوچا کہ ہمیں آپ کی کمی محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔ اب آپ کی آمد سے بے حد خوشی محسوس ہورہی ہے۔ ہماری بہت سی پرانی مصنفین نئی مصروف ہیں اور ان کی جگہ نئی مصنفین نے لے لی ہے۔ نئی مصنفین بہت اچھا لکھ رہی ہیں لیکن پرانی مصنفین کی اپنی جگہ ہے اور ہم بھی ان کی کمی محسوس کرتے ہیں۔

افشاں خان ' ثنا خان ' عطیہ حق نواز۔۔۔ شاہ پور چاکر

قسط وار کہانیاں سب اچھی چل رہی ہیں۔ "بن مانگی دعا" نام کی طرح زبردست ہے۔ "ماہ تمام" میں تقی اور شفا کے کردار بہت پسند ہے۔

ج : افشاں ' ثنا اور عطیہ! یاد آوری کا بہت شکریہ۔

عائشہ خان۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

ٹائٹل دیکھا ' پسند آیا۔ خاص طور پر دوپٹا ' کیونکہ آج کل ہر ماڈل کا دوپٹا نداردہوتا ہے۔

سب سے پہلے ماہ تمام پڑھا ' کہانی بڑی اچھی چل رہی ہے۔ تقی اور شفا کی چھوٹی چھوٹی تکرار مزے کی لگتی ہے۔ اور مجھے تو لگتا ہے کہ عمیر بھائی کو ساحر کی چالوں کا اندازہ ہے۔۔۔ چلو تقی اور اباجی کی جنگ بندی تو ہوئی۔

افسانوں میں سب سے پہلے پڑھا ' اعلا ظرف ' صباحت یاسمین کی بہترین کاوش ' نزہت کی اعلا ظرفی اچھی لگی۔ ویسے ہمارے گھر بھی کھانے میں نقص نہیں نکالتے ' جو جیسا پکا ہوتا ہے سب کھالیتے ہیں بلکہ ان فیکٹ ہمیں تو یہ معلوم بھی نہیں کہ نقص ہوتا کیا ہے۔ "ہم دیوار" بہت اچھا موضوع چنا حیا بخاری نے۔ "میرا تھن" حنا یاسمین نے بھی اچھا لکھا۔ موٹاپا ہو یا دبلا پن ' یہ سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اب عفیرہ موٹی تھی تو کیا ہوا ' مگر اس نے اپنے گھر کی روٹین کتنی اچھی بنائی ہوئی تھی تمام کام وقت پر ' ہر چیز سلیقے سے۔ سچ پوچھیں تو میں نے خط لکھا ہی خولہ بنت حوا کے افسانے (وہ بات ادھوری) کے لیے ہی ہے۔ مختصر سے افسانے میں کتنا بڑا میسج ہے۔ اختتامی 2 سطریں ' کہانی کا نچوڑ ہیں۔ "میری خامشی کو بیاں" میں غزالہ کنول کا تعارف پسند آیا۔ آپ کی تحریر میں بڑی پختگی ہے غزالہ۔ امید ہے آپ کا افسانہ جلد پڑھنے کو ملے گا۔

ج : پیاری عائشہ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

سمیعہ قدیر۔۔۔ سرگودھا

سب سے پہلے میرا سب سے پسندیدہ ناول "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" میں بہت سے رازوں سے پردہ اٹھ رہا ہے۔ "بن مانگی دعا" میں یہ تو پتا ہے کہ ابیہا کا نکاح معیز سے ہوا ہے ' خیر میری خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ "اب کر میری رفوگری" زبردست تحریر ہے کوئی تصویر دیکھ کر بھی اتنا پاگل ہوسکتا ہے اس چیز نے کہانی کو چار چاند لگا دیے ' لیکن تاباں کے گھر والوں کی انتہا پسندی ' ان کا غرور تکبر سب بہت برا۔ ضوفی کے ساتھ جو کچھ ہوا ' پڑھ کر بہت افسوس ہوا اتنی ضد بھی اچھی نہیں ہوتی۔ ناولٹ "بے تعلق اور ہی" میں عفیرہ کی جاسوسی "دائم الحبس" میں جمیل کے کام کرنے کی صلاحیت "وہ اک حرف یقین" میں صارم کا خیال رکھنے کا انداز سب بہت زبردست تھا۔ اعلا ظرف میں نزہت کی اعلا ظرفی اور معاف کرنے کی صلاحیت پسند آئی۔ باقی سارا شمارہ بھی زبردست تھا۔

ج : پیاری سمیعہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

فضا خالد۔۔۔ لاہور

"اب کر میری رفوگری" ایسا شان دار اور زبردست

قیمت میں اضافہ

کاغذ کی قیمت میں اضافہ کے باوجود ادارہ نے پرچے کی قیمت میں اضافہ نہیں کیا اور اضافی بوجھ برداشت کرتا رہا لیکن اب کاغذ کی قیمت میں مزید اضافہ ہونے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا۔ کاغذ کی قیمت کے ساتھ دوسرے اخراجات بھی بڑھے ہیں اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی قیمت میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ توقع کرتے ہیں کہ بہنیں خواتین ڈائجسٹ سے دلی وابستگی کے باعث اس اضافے کو بخوشی گوارا کرلیں گی۔

ناول لکھنے پر سائرہ رضا کو مبارک باد۔عنیزہ سید کا ناول بھی بہت اچھا جارہا ہے۔
ج۔ پیاری فضا! آپ کی رائے سائرہ اور عنیزہ تک پہنچا رہے ہیں۔

پاکیزہ شاد۔۔۔بھاول پور

رات نو بجے "اب کر میری رفوگری" پڑھنا شروع کیا اور رات دو بجے اختتام پر وقت گزرنے کا احساس ہوا' کتنے آنسو گالوں پر خشک ہو گئے تھے۔سائرہ رضا! آپ کی ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے۔
ج۔ پاکیزہ! درست کہا آپ نے۔واقعی سائرہ رضا کی کہانیاں بے مثال ہوتی ہیں۔

گڑیا نور۔۔۔سرگودھا

مجھے یہ شمارہ پورا بہت پسند ہے۔اس شمارے "اب کر میری رفوگری" یہ کہانی ساری کہانیوں میں بازی مار گئی۔ باقی بھی بہت اچھی تھیں۔

ج۔ گڑیا! سائرہ رضا واقعی بہت اچھا لکھتی ہیں۔

ثمرانہ کنول۔۔گاؤں 5 کاسی ضلع خانیوال

میں 20 سال سے آپ کے تینوں ماہناموں کی قاری ہوں۔مجھے یہ تینوں بہت پسند ہیں۔
ج۔ ثمرانہ! آپ کی رائے جان کر بہت خوشی ہوئی۔

ارفع۔۔۔گاؤں بخاری کھیل

خواتین اور شعاع دونوں مجھے بہت پسند ہیں ہمارے دادا شہر جاکر ہمارے لیے لے کر آتے ہیں۔آمنہ ریاض کی "ماہ تمام" اور عفت سحر پاشا کی "بن مانگی دعا" بہت اچھی لگتی ہے۔
ج۔ ارفع! اپنے دادا جی کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کردیں۔

سعدیہ۔۔۔ہارون آباد

خواتین بلاشبہ پورا کا پورا تعریف کے قابل ہے۔زبردست! ایک سے بڑھ کر ایک تحریر ہے۔عنیزہ سید کا ناول بہت پسند ہے۔
ج۔ سعدیہ! بہت شکریہ۔

نخبہ اکرم۔۔۔گاؤں کوٹلی

آپی! خواتین ڈائجسٹ کے بارے میں کیا کہوں۔سدا خوش رہیں۔میں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی ہوں۔صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے۔پھر بھی سائرہ رضا کا ناول ختم کیے بغیر نہ رہ سکی۔
ج۔ بہت شکریہ نخبہ!

نور۔۔۔ملتان

خواتین' شعاع' کرن دس سال سے زیر مطالعہ ہے۔موسٹ فیورٹ "ماہ تمام" ہے۔"اب کر میری رفوگری" زبردست۔بشریٰ احمد نے بھی اچھا لکھا ہے۔"ہم دیوار" بھی اچھی لگی۔
ج۔ بہت شکریہ نور۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	شیزا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا

عفت سحر طاہر

عین زندگی دعا

اقمیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز ' زارا اور ایزد۔ صالحہ ' اقمیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھیں مگران سے شادی نہ ہو سکی تھی اور سفینہ کو یقین ہے کہ وہ آج بھی ان کے دل میں بستی ہیں۔ صالحہ مرچکی ہیں۔ ابیہا ان کی بیٹی ہے۔ جواری باپ سے بچانے کے لیے صالحہ ' ابیہا کو اقمیاز احمد کے سپرد کرجاتی ہیں۔ تین برس قبل کے اس واقعے میں ان کا بیٹا معیز ان کا رازدار ہے۔

ابیہا ہاسٹل میں رہتی ہے۔ حنا اس کی روم میٹ ہے اور اچھی لڑکی نہیں ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں اقمیاز احمد ' ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب ' معیز میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔

رباب ' ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ زارا کے اصرار پر معیز احمد مجبوراً " رباب کو کالج پک کرنے آتا ہے تو ابیہا دیکھ لیتی ہے۔ وہ سخت غصے میں اقمیاز احمد کو فون کرکے طلاق کا مطالبہ کردیتی ہے۔ اتفاق سے وہ فون معیز احمد اٹینڈ کرلیتا ہے۔ ابیہا اپنی اس حرکت پر سخت پشیمان ہوتی ہے۔ معیز رباب میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔

صالحہ ایک شوخ الھڑسی لڑکی ہے۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند ہے مگر اس کے گھر کا ماحول روایتی ہے۔ اس کی دادی اور نانی کو اس کا اقمیاز احمد سے بے تکلف ہونا پسند نہیں ہے۔ اقمیاز احمد بھی اس بات کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر وہ ان کی مصلحت پسندی اور نرم طبیعت کو بزدلی سمجھتی ہے۔ نتیجتاً " وہ اقمیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان
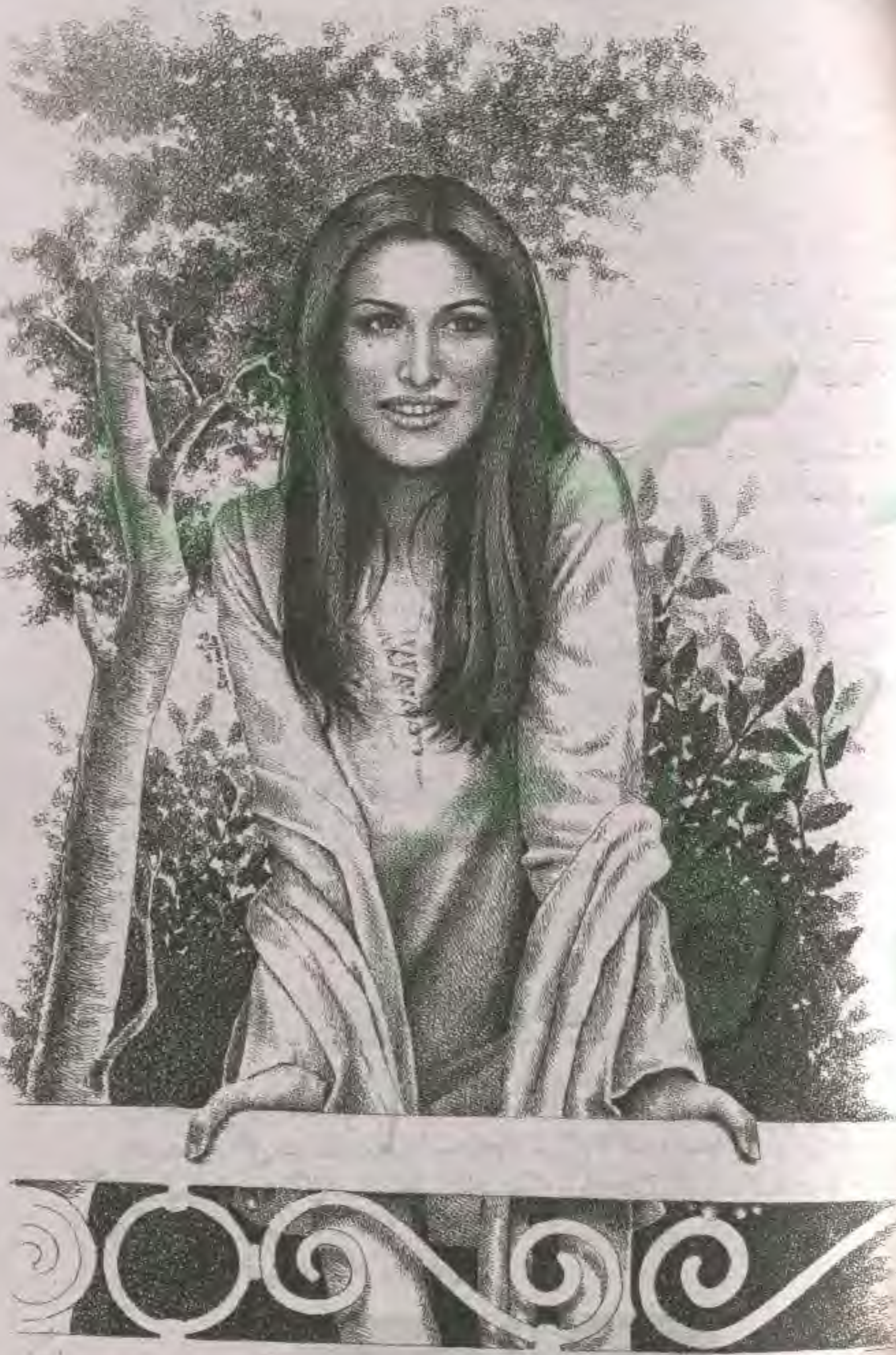
ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی سے ہوتی ہے۔ مراد صدیقی اسے اپنے آئیڈیل کے قریب محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ صالحہ کی ضد پر شازیہ اس کی ماں سے مراد کا ذکر کرتی ہے۔ وہ غصہ میں صالحہ کو تھپڑ مار دیتی ہیں۔

امتیاز احمد اپنے فلیٹ پر ابیہا کو بلواتے ہیں، مگر ابیہا وہاں معیز احمد کو دیکھ کو خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ معیز نے ابیہا کو صرف ازخود طلاق کا مطالبہ کرنے پر مجبور کرنے کے لیے وہاں بلایا ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ قطعاً" غلط نہ تھا مگر بات پوری ہونے سے قبل ہی امتیاز احمد ڈرائیور کی اطلاع پر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ معیز بہت شرمندہ ہوتا ہے۔ امتیاز احمد، ابیہا کو لے کر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔

ابیہا کالج میں رباب اور اس کی سہیلیوں کی باتیں سن لیتی ہے، جو محض تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے، ان سے پیسے بٹور کر بلا گلا کرتی ہیں۔ عموماً" یہ ٹارگٹ رباب کو اس کی خوب صورتی کی وجہ سے دیا جاتا تھا، جسے وہ بڑی کامیابی سے جیتا کرتی تھی۔

صالحہ کی ہٹ دھری سے گھبرا کر اس کے والدین امتیاز احمد سے اس کی تاریخ طے کر دیتے ہیں۔ مگر وہ امتیاز احمد کو مراد کے بارے میں بتا کر ان سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ امتیاز احمد، دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کرکے صالحہ کا راستہ صاف کر دیتے ہیں مگر شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھانے لگتا ہے۔

ابیہا، معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتی ہے۔

مراد صدیقی جواری ہوتا ہے۔ وہ صالحہ کا بھی سودا کر لیتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے، مگر پھر ایک روز جوے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے پولیس مراد کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کرنے لگتی ہے۔ فیکٹری میں ساتھ کام کرنے والی ایک سہیلی کسی دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے۔ جو امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ صالحہ کی سہیلی اسے امتیاز احمد کا کارڈ دیتی ہے جسے صالحہ محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے جب مراد رہا ہو کر واپس آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً" آجاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کرکے اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس دوران معیز بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ امتیاز احمد، ابیہا کو کالج میں داخلہ دلوا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ صالحہ مر جاتی ہے۔

معیز احمد، ابیہا کو اسپتال لے کر جاتا ہے مگر وہاں پہنچ کر عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ابیہا اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ ابیہا کا پرس ایکسیڈنٹ کے دوران کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کر پاتی ہے، نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ امتیاز احمد دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر بحالت مجبوری حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔

— ۶ —

چھٹی قسط

"واٹ اے سرپرائز... آج تو بڑے بڑے لوگ ساتھ لائی ہو ہنی..."

حنا سے بے تکلفی سے ملنے کے بعد وہ اب سیاہ چادر میں لپٹی خائف سی ابیہا کو سرتاپا گہری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اور ابیہا مراد... جو ابھی تک ایک صدمے اور بے حسی کی کیفیت میں حنا کے ساتھ بنا سوچے سمجھے چلی آئی تھی۔ گویا حواسوں میں لوٹ آئی۔

"بڑے نہیں۔ خوب صورت کہو، بلکہ حسین۔"

حنا یوں اترائی جیسے ابیہا کی خوب صورتی میں اس کا بھی ہاتھ رہا ہو۔

"تو کبھی ہمیں بھی موقع دو ان سے مل بیٹھنے کا۔"

اس کی نگاہوں میں خمار سا اترنے لگا تو ابیہا اپنی چادر کو بے اختیار اپنے گرد لپیٹتی حنا کے پیچھے ہو گئی۔ تب ہی حنا سنجیدہ ہو گئی۔

"تم کب آئے...؟" وہ سیفی سے پوچھ رہی تھی۔

"میں گیا ہی کہاں تھا...؟" وہ شانے اچکا کر حیرت سے بولا تو حنا بے اختیار کھنکھاری۔

"ہاں، تمہارے تو فارن کے اتنے چکر لگتے ہیں کہ گھر باہر ایک بنا رکھا ہے۔" سیفی نے حنا کو ہلکا سا گھور کے دیکھا۔

"ابھی کدھر جا رہے ہو؟"

"میم سے ملنے آیا تھا... مگر قسمت میں تم سے ملاقات بھی لکھی تھی۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

مگر ابیہا نے اس کی مسکراہٹ کا رنگ نہیں دیکھا، کیسا تھا۔ وہ تو زمین پر نظریں گاڑے حنا کی اوٹ میں کھڑی ان لمحوں کے جلد سے جلد گزرنے کی دعا مانگ رہی تھی۔

"او کے... ابھی شاید تم کسی کام سے جا رہے تھے۔ پھر ملاقات ہو گی۔"

ابیہا کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ حنا کو اپنے بازو پر اچھی طرح محسوس ہو رہی تھی، اسی لیے اس نے اپنے "بھائی" کو گویا جانے کی اجازت دے دی۔

"آہاں..." اس کی بات کو سمجھتے ہوئے سیفی نے دونوں ہاتھوں سے حنا کے رخساروں کو چھوا اور پیار سے بولا۔

"او کے... ابھی تو واقعی جلدی میں ہوں۔ مگر بہت جلد ملوں گا تمہیں۔"

بمشکل وہ ٹلا تھا۔ ابیہا نے کب کی دبی سانس کھل کے لی۔

"ماما بھی آگئی ہیں" حنا نے اپنے تئیں اسے خوش خبری سنائی۔ پھر ابیہا کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے بولی۔

"دیکھو نا اللہ کی مرضی۔ جب تمہیں ضرورت تھی تب نہ تو سیفی یہاں تھا اور نہ ہی ماما اور اب دونوں ہی موجود ہیں۔"

ابیہا کا دل پھر سے کٹنے لگا۔ اسے اچھی طرح احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک بند گلی میں آچکی ہے۔ زندگی میں اپنی مرضی سے آگے بڑھنے کا راستہ اس پر بند ہو چکا تھا۔

"مگر... تمہارے بھائی تو... میم کہہ رہے تھے۔" اسے دھیان آیا۔

"ہاں... وہ ماما کو ہی میم کہہ رہا تھا۔ ایکچوئلی کبھی مام سے اتنا کلوز نہیں رہا وہ اس لیے۔"

حنا نے اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھتے ہوئے اسے بتایا۔ حنا کا گھر واقعی بہت بڑا اور شاندار تھا۔ ابیہا کی توجہ بٹنے لگی۔ قیمتی ڈیکوریشن پیسز اور پینٹنگز سے سجی دیواریں، وال ٹو وال کارپٹ، وسیع و عریض لاؤنج میں کئی کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔

"ہماری فیملی تو بہت چھوٹی ہے مگر گھر بہت بڑا ہے۔ اسی لیے تو یہاں دل نہیں لگتا ہمارا۔" حنا نے افسردگی سے کہا۔ پھر ابیہا کو دیکھ کر قصداً" مسکرائی۔ "مگر اب تم آگئی ہو تو کم از کم میرے لیے تو رونق لگ ہی جائے گی۔ میں بھی اب گھر شفٹ ہو جاؤں گی۔"

ابیہا خاموش رہی۔

سیفی کے مطابق ماما آچکی تھیں مگر فی الحال تو وہ دکھائی نہ دے رہی تھیں۔ حنا اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ کمرہ دیکھ کے ایہا متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ کمرہ کیا۔۔۔ ایک شاہی خواب گاہ تھی۔

"یہ سب چھوڑ کر تم ہاسٹل میں سڑ رہی ہو۔" ایہا کہے بغیر رہ نہ سکی۔

"بھئی۔ کیا کروں۔ میری قسمت میں تمہیں وہاں سے چرانا لکھا تھا۔" حنا ہنسنے لگی۔

"تم اپنی زندگی جیو حنا۔ تمہیں ہاسٹل میں رہنا اچھا لگتا ہے تم وہیں رہو میں تو محض چند دنوں کے لیے۔۔۔ مہمان ہوں بس۔" ایہا آزردہ تھی۔

"بھول ہے تمہاری سویٹ ہارٹ۔ اس "خواب نگر" میں جو آیا' وہ قید ہو کے رہ گیا۔ یہاں آنے کا راستہ تو بہت سیدھا سادہ سا ہے مگر واپسی میں اتنی بھول بھلیاں ہیں کہ باہر نکلنے کو راستہ نہیں ملتا۔"

حنا سنجیدہ تھی۔۔۔ یا خدا جانے مذاق میں اتنی سنجیدہ ہو رہی تھی۔ مگر ایہا کا دل گھبرا سا گیا۔

"کیسی بھول بھلیاں۔۔۔؟"

"میرے پیار کی بھول بھلیاں۔۔۔" وہ کھلکھلائی تو ایہا کی سانسیں آسان ہوئیں۔

حنا نے پیار سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

"میں بھی سمجھوں گی مجھے بہن مل گئی۔ دونوں مل کے خوب موجیں کریں گے۔"

"اب اگر تمہاری ماما آگئی ہیں۔۔۔ تو کیا اب وہ میری مدد نہیں کر سکتیں۔۔۔ مطلب۔۔۔ میں ایگزیمز دینا چاہتی ہوں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی تو حنا نے سر جھٹکا۔

"دفع کرو یار! بلکہ تمہارے پیچھے تو میں بھی ایگزیمز میں نہیں بیٹھ رہی۔"

اس نے اس قدر اطمینان سے کہا کہ ایہا بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔

"تم نے جان بوجھ کر اپنا سال ضائع کیا۔۔۔؟"

"سو واٹ! مجھے ویسے بھی کون سا پڑھنے کا شوق تھا یا میں ہر سال گولڈ میڈل لے رہی تھی۔"

حنا نے لاپروائی سے کہا اور اپنے کپڑے لیے نہانے گھس گئی۔ اتنی سردی میں حنا کی ہمت کی داد دیتی وہ بستر میں گھس گئی۔ قیمتی بیڈ شیٹ سے سجا میٹرس اس قدر نرم و گداز تھا اور اس پر ڈبل پلائی کا گرم و ملائم کمبل۔

ایہا کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

پچھلے دنوں وہ اس قدر تباہ حالوں میں رہی تھی کہ یہ آرام روح میں تازگی بھر گیا تھا۔ ہر دکھ' ہر غم بند ہوتی پلکوں تلے سوتا چلا گیا۔

تین بجے کی سوئی وہ رات آٹھ بجے بیدار ہوئی تو حنا کمرے میں ہی تھی۔

وہ گڑبڑا کر اٹھی۔

"کک۔۔۔ کیا ٹائم ہو گیا ہے؟" اس کی آواز نیند سے بوجھل اور بھرائی ہوئی تھی۔

"زیادہ نہیں۔ بس رات کے آٹھ ہی بجے ہیں۔" حنا میگزین بند کرتی اس کے پاس آبیٹھی۔

وہ جی بھر کے شرمندہ ہوئی۔ "اتنی دیر سوئی میں۔۔۔"

"اچھا ہی ہوا۔ ہاسٹل کی نحوست اتر گئی ساری۔ اب دیکھنا یہاں بالکل گھر والے مزے ہوں گے۔" حنا مسکرائی۔ پھر اس سے کہا۔

"اب تم بھی جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ ماما کو میں نے تمہارے بارے میں بتایا ہے' وہ بھی تم سے ملنے کے لیے ایکسائیٹڈ نہیں۔" ایہا جلدی سے بستر سے اتر کر جوتوں میں پاؤں ڈالتے ہوئے بولی۔

"تم مجھے جگا تو دیتیں حنا! تمہاری ماما کیا سوچ رہی ہوں گی۔ آتے ہی گدھے گھوڑے بیچ کے سو گئی۔"

"جتنا سونا تھا سو لیا میری جان۔ اس گھر میں نیندیں ہماری غلام نہیں ہیں' یہاں کے دن رات کی گھڑی ماما کی سوئیوں پر چلتی ہے۔"

حنا کا انداز نہ سمجھ میں آنے والا اور بڑا معنی خیز تھا۔ ایہا نے اسے گھورا۔

"مطلب کہ جب تک ماما گھر میں رہتی ہیں' ہر کام ان کے ٹائم ٹیبل کے مطابق کرنا پڑتا ہے۔"

"تو اچھی بات ہے نا۔ ماؤں کی یہی تو عادت ہوتی ہے۔"

ایہا کے لب و لہجے سے حسرت سی جھلکنے لگی۔ حنا نے جلدی سے اسے واش روم کی طرف دھکیلا۔

"اچھا اب جلدی سے فریش ہو کے آؤ۔ میں تمہارے اچھے سے کپڑے نکال کے رکھتی ہوں۔ ماما پر اچھا امپریشن پڑے گا۔"

حنا اس کا بیگ کھنگالنے لگی تو ایہا اتنی اچھی دوست ملنے پر خدا کا شکر ادا کرتی واش روم میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼
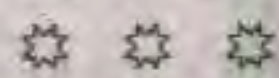
وہ حنا کے ساتھ بڑی نروس سی لاؤنج میں آئی۔ جہاں اس کی ماما فل اسکرین پلازما ٹی وی لگائے صوفے میں دھنسی بیٹھی تھیں۔

وہ ایہا سے بہت گرم جوشی سے ملیں۔ ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس ماڈرن سی خاتون۔ ایہا کو حنا کے بتائے ہوئے خاکے سے بہت مختلف لگیں اور حنا سے بھی۔

حنا کی ان سے ذرا بھی مشابہت نہ تھی۔ وہ بہت حسین اور طرح دار خاتون تھیں۔ جبکہ حنا کو حسن نکھارنے کے لیے پارلر جانا پڑتا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کا حال احوال پوچھا۔ حنا یقیناً "اس کے تمام حالات انہیں بتا چکی تھی تب ہی انہوں نے پیار بھرے رعب سے اسے باور کرایا کہ اب وہ اسی گھر میں رہے گی اور ان کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جائے گی۔

"اچھا ہے' تمہارے باپ کو بھی پتا چلے' تمہاری قدر و قیمت کا۔ دنیا میں ہاتھ تھامنے اور سہارا دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔"

وہ ممتاز احمد کے متعلق کہہ رہی تھیں۔ لمحہ بھر کو ایہا کا جی چاہا کہ وہ انہیں اپنے نکاح اور امتیاز احمد کے ساتھ جڑے اپنے رشتے کے متعلق بتا دے مگر پھر کسی مناسب وقت کا سوچ کر اس نے اس خیال کو ذہن کے پچھلے خانے میں دھکیل دیا۔

"بڑی بدتمیز ہو تم حنا! اتنی اچھی ماما ہیں تمہاری۔ تم تو ان سے یوں متنفر ہو کر ہاسٹل بھاگیں جیسے پتا نہیں کتنی ظالم سوتیلی ماں سے پالا پڑ گیا ہو۔"

ڈائننگ ٹیبل پر صرف وہی دونوں تھیں۔ جب ایہا نے موقع پا کر حنا کو لتاڑا۔

"مائنڈ یو۔ میں ماما سے نہیں ان کی بے جا مصروفیت اور اس گھر کی تنہائی سے بھاگی تھی۔" وہ تصحیح کرتے ہوئے بولی۔ پھر بات بدل ڈالی۔

"اب تم بتاؤ۔ تم نے کیا سوچا ہے آگے کے بارے میں؟"

"میں چاہتی ہوں' میں پرائیویٹ امتحان دے لوں۔" ہاتھ روکے وہ پر امید نظروں سے حنا کو دیکھتے ہوئے بولی۔ تو حنا نے چند ثانیوں تک اسے دیکھا پھر خفیف سے شانے اچکا کر چمچ سے چاول مکس کرتے ہوئے بولی۔

"اس کے لیے تو ماما سے پرمیشن لینی پڑے گی۔"
"کیا مطلب...؟" ایبہا نے تحیر سے پوچھا۔
"مطلب یہ میری جان کہ بینک بیلنس ماما کا ہے۔ سارا بجٹ وہی چلاتی ہیں۔ میری تو فکس پاکٹ منی ہے۔" حنا نے گویا ہاتھ اٹھا دیے تھے۔
"میں انہیں واپس لوٹا دوں گی۔ آئی پرامس کہیں جاب کر لوں گی۔"
ایبہا جانتی تھی اس کے لیے فقط یہی ایک امید باقی ہے جب تک امتیاز احمد سے رابطہ ہو پاتا تب تک تو.... شاید پرائیویٹ امتحان دینے کا چانس بھی گزر جاتا۔
"میں جانتی ہوں بیا۔ لیکن یقین کرو اس گھر میں داخل ہونے کے بعد صرف ماما کا آرڈر چلتا ہے۔ تم ان سے بات کر لو۔ اگر وہ اجازت دیتی ہیں تو پھر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔"
حنا نے خود کو اس معاملے سے یکسر الگ کر لیا تھا۔ ایبہا ذرا سی کھٹکی اور یہ اس کی نظروں ہی کا احساس تھا کہ حنا سنجیدگی سے بولی۔
"یہ دنیا کھیل تماشا ہے میری جان! یہاں جو دکھائی دیتا ہے وہ جھوٹ اور جو نہیں دکھائی دیتا وہی سچ ہے۔"
"مگر آنٹی تو اتنی سافٹ سی ہیں اور پھر.... میری تھوڑی سی ہیلپ کرنے میں انہیں کیا پرابلم ہو سکتی ہے؟"
ایبہا کو لگا تھا جیسے حنا جھوٹ بول رہی ہے وہ خود اس کی مدد نہیں کرنا چاہتی اور نام اپنی ماما کا لگا رہی ہے۔
"یہ تو جب تم ان سے بات کرو گی تب تمہیں پتا چلے گا۔ ان کے اپنے بڑے تحفظات ہیں۔"
حنا نے اسی سنجیدگی سے بات لپیٹ دی تھی۔ ایبہا کی طبیعت مکدر ہو گئی، وہ بنا کچھ کہے گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔ مگر یہ تو طے تھا کہ اب ماما سے اسے خود ہی بات کرنا تھی۔

☆ ☆ ☆
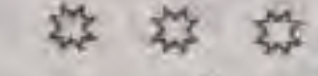
سفینہ کے وجود پر سے دھڑ دھڑ کرتی ٹرین گزر رہی تھی اور وہ اتنی ہی تکلیف محسوس کر رہی تھیں جتنی کہ ٹرین سے کٹتا وجود محسوس کر سکتا ہے۔
وہ سفینہ تھیں۔ امتیاز احمد سے ہلکا سا شکوہ ہو جانے پر ہی گھر کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیتی تھیں، یہ قیامت خیز باتیں سن کر تو واقعی قیامت کا سا طوفان اٹھا دیتیں مگر اگلا ایک گھنٹے میں امتیاز احمد کی طبیعت بگڑنے لگی۔
"ایبہا کو لے آؤ معیز...." سب سب ہی کچھ بھولے تھے۔ سفینہ اس وقت صرف ان کی زندگی کی دعا مانگ رہی تھیں، جب پسینہ نچوڑتے سپید پڑتے چہرے کے ساتھ امتیاز احمد نے معیز کا ہاتھ تھام کر کہا۔ تو معیز رک سا گیا۔ وہ ان کی حالت دیکھتے ہوئے جھکا اور باپ کے ہاتھ کو چوم لیا۔
"آپ ٹھیک ہو جائیں ابو پھر...."
"نہیں...." انہوں نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ سفینہ کے آنسو آنکھوں ہی میں ٹھہر گئے تھے۔
انہوں نے بے بسی سے سفینہ کو دیکھا۔
"میں جانتی ہوں امتیاز! سب سن لیا تھا میں نے۔" انہوں نے سرد و سپاٹ انداز میں محض ایک جملہ کہا تھا اور معیز سن ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر ماں کا چہرہ دیکھنے کی ہمت خود میں.... مفقود پائی تھی۔
امتیاز احمد کی حالت بگڑنے لگی تھی اور ان کی آخری فرمائش۔
"ایبہا کو لے آؤ معیز...."

ڈاکٹر نے فوری طور پر امتیاز احمد کو آئی سی یو میں شفٹ کرا دیا۔ معیز نے اپنی تمام تر ہمت ان کے ساتھ رخصت ہوتی محسوس کی تھی۔
وہ سب آئی سی یو کے سامنے ساکت و جامد تھے۔ سب کی سانسوں کی ڈوریاں اندر مشینوں میں جکڑے ڈاکٹرز کے نرغے میں بے سدھ پڑے امتیاز احمد کی الجھتی اٹکتی سانسوں سے بندھی تھیں۔
معیز اپنی ہمت ٹوٹتی محسوس کر رہا تھا۔ دیوار سے ٹیک لگائے دل ہی دل میں باپ کی زندگی کے لیے محو مناجات تھا، ایسے میں سفینہ کا سوال۔
"تم نے ایسے کیسے کیا معیز.... اپنی ماں کو کیسے دھوکا دیا؟ میرے مقابلے میں صالحہ کو جتوا دیا؟"
روتا کرلاتا.... شکوہ کناں لہجہ۔
یہ اس کی ماں کا تھا۔ وہ ماں جس سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔ معیز کو اپنا آپ چور سا لگا۔
مگر وہ اس پل میں اپنے باپ کو بری الذمہ قرار دینا چاہتا تھا۔ اس نے بینچ پہ بیٹھی ماما کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔
وہ بالکل سرد تھے۔
"وہ بہت مشکل وقت تھا ماما! آپ نہیں جانتیں وہ ہماری دنیا سے الگ ہی کوئی لوگ تھے۔ بہت گھٹیا اور رنج.... میں مانتا ہوں۔ ابو کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر وہ بہت مجبور ہو گئے تھے...."
وہ ضبط کی حدوں پر تھا.... سفینہ نے بالکل غیر متوقع طور پر اس کے ہاتھ جھٹکے اور سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔
"وہ تو صالحہ کے معاملے میں سدا کا مجبور تھا۔ مگر تم.... تم تو میرے بیٹے تھے معیز! تم نے بھی اپنے باپ کا ساتھ دیا۔ وہ عورت ساری عمر امتیاز کے حواس پر سوار رہی اور اب اس کی بیٹی کو بیاہ لایا ہے وہ۔"
وہ پھٹ پڑی تھیں۔ اتنی اونچی آواز میں کہ کچھ نہ جاننے والے ایرد اور زارا بھی گھبرا کر ان کے پاس چلے آئے۔ مگر معیز کی تمام تر توجہ ماں کی طرف تھی۔
"ماما پلیز.... میری آپ سے ریکویسٹ ہے۔ اس وقت کوئی گلہ کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ وہ آئی سی یو میں ہیں ان کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑ رہی ہے۔ انہیں صرف ہماری دعاؤں کی ضرورت ہے۔"
معیز نے عاجزی سے کہا تو خود پر ضبط کرتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی۔ زارا ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی۔
سفینہ نے لب بھینچ لیے۔ اسی وقت زارا کے سسرال والے آ گئے تو معیز کے ساتھ ان کی توجہ بھی بٹ گئی۔
اور پھر وہ رات شاید قیامت کی رات تھی۔
آئی سی یو کا دروازہ کھلا تو ان لوگوں پر گویا زندگی کا دروازہ بند ہو گیا۔
"آئم سوری.... ہی از نو مور۔"
ڈاکٹر نے معیز کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا تو وہ ڈھے سا گیا۔
زارا اور سفینہ کی چیخیں پورے کوریڈور میں گونجنے لگیں۔ ایرد بلک کر اس کے شانے سے آ لگا تو خود پر قابو کھو کر ایرد کے شانے میں منہ چھپائے وہ بھی رو دیا۔

☆ ☆ ☆

ایبہا نے مسلسل امتیاز احمد کے نمبر پر کالز کیں مگر ان کا فون بند مل رہا تھا۔ ایبہا کی جان ٹوٹنے لگی۔

"اور اگر یہ رابطہ منقطع ہو گیا تو۔۔۔؟"

"تم کیوں بے کار کی کوشش کر رہی ہو بیا! اپنے گھر والوں کو جانتی تو ہو تم۔ انہوں نے تو شاید تمہاری گمشدگی پر شکر کیا ہے۔"

حنا نادانستگی میں اس کے زخم کرید رہی تھی۔

"میں وارڈن سے کہہ کے آئی تھی کہ اگر کوئی میرا پوچھنے آئے تو وہ اسے۔۔۔"

"کوئی کیوں ڈھونڈنے آئے گا اللہ کی بندی۔۔۔؟ تمہارا اسیل فون نمبر سب کے پاس ہو گا۔ اگر کسی نے ابھی تک رابطہ کرنا ہوتا تو کال آجاتی۔"

حنا نے تیز لہجے میں کہا تو وہ چپ سی ہو گئی۔

"تم ایک چکر گھر کا کیوں نہیں لگا لیتیں۔"

حنا نے لحہ بھر کی خاموشی کے بعد بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا تو ایبہا گڑبڑا گئی۔

"وہ۔۔۔ میں تو کبھی اکیلی گئی نہیں۔ مجھے تو ٹھیک سے ایڈریس بھی بتانا نہیں آتا۔"

حنا بے اختیار سیدھی ہو بیٹھی۔

"مائی گڈنیس۔۔۔" وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے ایبہا کو دیکھ رہی تھی۔ "تمہیں اپنے گھر کا ایڈریس نہیں معلوم۔۔۔؟"

ایبہا کو زوروں کا رونا آیا۔ جسے روکنے کی کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں چھلک ہی گئیں۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

اسے واقعی امتیاز احمد کے گھر کا ایڈریس نہیں معلوم تھا۔ صرف ان کے کانٹیکٹ نمبرز پاس تھے۔ جواب بیکار ہی لگ رہے تھے۔

"یعنی۔۔۔ یعنی کہ تم اب گم ہو چکی ہو۔"

باوجود سنجیدہ بلکہ رنجیدہ صورت حال کے حنا کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔" وہ اپنے بیڈ پہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ "یہ تو جوک آف دی منتھ ہے۔"

ایبہا جو ایک غیر متوقع دکھ بھری صورت حال کا اچانک ادراک کر کے ششدر سی بیٹھی تھی۔ حنا کی بات سن کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

یک لخت اندر خوف سا ہی بھر گیا۔

تو کیا بھرے میلے میں وہ امتیاز احمد کا ہاتھ چھوڑنے جیسی سنگین غلطی کر بیٹھی تھی؟

ہاں یقیناً "وہ کھو گئی تھی۔

حنا اسے ایک دم یوں خود پر سے قابو کھوتے دیکھ کر فوراً" اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ وہ پشیمان تھی۔

"سوری۔ آئم رئیلی سوری بیا۔ میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہی۔ بس اس سچویشن کا سوچ کر۔ سوری یار۔"

وہ اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیے چپ کروا رہی تھی۔

"میں اب کیا کروں گی حنا! میں واقعی کھو گئی ہوں۔ میرے گھر والے مجھے کہاں ڈھونڈیں گے۔" وہ روتے ہوئے بے بسی سے بولی۔

"ڈونٹ وری یار۔ انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔ میڈیا اتنا اسٹرونگ ہو گیا ہے کہ سالوں پہلے کے بچھڑے ہوئے ٹی وی شوز میں مل جاتے ہیں۔ ایک تمہارے گھر والے نہ ملیں گے؟"

حنا نے اسے تسلی دی۔ مگر اس کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

وہ کسی کی منکوحہ تھی۔۔۔ اس کی گمشدگی اس کے لیے عذاب بننے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت کبھی ٹھہرا نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوا کرتا تو لوگ اپنی مرضی سے خوشیوں کے پل ٹھہرائے ہی رکھتے۔

ابھی کل کی بات لگتی تھی کہ امتیاز احمد ان سے بچھڑے اور آج چالیسواں بھی ہو چکا تھا۔

تھکا تھکا سا معیز سفینہ کے کمرے میں چلا آیا۔ وہاں ایزد اور زارا موجود تھے۔ بلکہ زارا تو اب سفینہ کے پاس ہی سوتی تھی۔

وہ سب ہی دکھ سے نڈھال تھے۔ مگر سفینہ۔۔۔ وہ روئیں ضرور لیکن ان کے وجود پر ایک محسوس کن سی سرد مہری لپٹی ہوئی تھی جو کسی اور نے تو نہ سہی مگر معیز نے بڑی اچھی طرح محسوس کی تھی۔

وہ ان کے بستر پر ان کے پیروں کی جانب آبیٹھا۔ ان چالیس دنوں میں ماں نے ضرورت کی بات کے علاوہ معیز کو مخاطب نہ کیا تھا۔

"کل وکیل صاحب آنا چاہ رہے ہیں۔ وصیت کے سلسلے میں۔"

معیز نے دانستہ ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بھائی پلیز۔۔۔ ابھی رہنے دیں سب کچھ۔ ان سب باتوں سے تو ابو کے جانے کا دکھ زیادہ ستاتا ہے۔" زارا رونے لگی تو ماحول ایک دم سے بھیگ گیا۔

"صبر کرو زارا! نہ تو وقت رکا کرتا ہے اور نہ ہی دنیا کے کام۔"

سفینہ نے سپاٹ سے انداز میں کہا تو معیز کو دکھ کا شدید احساس گھیرنے لگا۔ پھر وہ معیز سے کہنے لگیں۔

"وصیت پڑھنا ضروری تو نہیں۔ میرے سامنے ہی سب طے ہوا تھا۔"

معیز کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی۔ اسی وقت سے وہ گھبراتا تھا اور یہ وقت آ کر ہی رہا۔

"ابو نے وصیت میں کچھ تبدیلی کروائی تھی۔ اور ویسے بھی وکیل کا جو فرض ہے، وہ تو اسے ادا کرنا ہی ہے۔"

وہ نظر جھکا کر آہستگی سے بولا تو سفینہ بے اختیار سیدھی ہو کر بیٹھیں۔

"کیا۔۔۔ کیا تبدیلی کی تھی انہوں نے؟" ان کا لہجہ تیز تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔۔۔" معیز نے سچ بولا۔

"جھوٹ مت بولو۔ باپ کی طرح تمہیں بھی باتیں چھپانے کی عادت ہو گئی ہے۔" وہ پھنکاریں تو معیز کے ساتھ ایزد اور زارا بھی ششدر سے انہیں دیکھنے لگے۔

"ریلیکس ماما۔۔۔" زارا نے بے ساختہ انہیں شانوں سے تھاما۔

مگر وہ معیز کو گھور رہی تھیں۔

"ہر کام میں تم ان کے "رائٹ ہینڈ" بنے رہے ہو اور اب تمہیں نہیں پتا۔"

"آئی سویر ماما! مجھے تو بس ہاسپٹل میں انہوں نے مختصراً" وصیت کی تبدیلی کا بتایا تھا اور بس۔ وہاں تفصیل پوچھنے کا وقت ہی کہاں تھا۔"

معیز نے اپنی صفائی پیش کی۔

"ہنہ۔۔۔ چھوڑ گیا ہو گا اپنی اس ہوتی سوتی کے نام جائیداد۔۔۔"

وہ سلگ کر بولیں۔ تو معیز ضبط کی کوشش میں ناکام ہو کر سرخ چہرہ لیے انہیں ٹوک گیا۔

"ماما پلیز۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اب ان کی صرف اچھی باتوں کو یاد کریں۔"

"اچھی باتیں۔" وہ تنفر سے بولیں۔ "خود سوچ لو تم۔ میرے ساتھ اندر سے وہ اتنے اچھے تھے کہ صالحہ نہ سہی اس کی بیٹی کو میرے سر پہ بٹھا گئے۔"

ایزد نے معیز کی طرف نا سمجھنے والے انداز میں دیکھا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کی طبیعت فی الحال ٹھیک نہیں۔ آپ کو ریسٹ کی ضرورت ہے۔ پھر بات کریں گے۔"

وہ مزید وہاں رک کر ماحول کو اور خراب نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس لیے وہاں سے چلا گیا۔ اور وہ جو معیز کے سامنے بڑی پتھریلی بیٹھی تھیں رونے لگیں۔

"ماما پلیز۔ مت روئیں نا۔ آپ کی طبیعت مزید خراب ہوگی۔"

زارا ان سے لپٹ گئی۔

"یہ سب کیا ہے ماما۔۔۔ بھائی سے اتنی کیوں ناراض ہیں آپ؟ اور کس کے لیے وصیت میں تبدیلی کی تھی ابو نے؟"

ایزد بچہ نہیں تھا کہ بدلتے ماحول اور رویوں سے انجان رہتا اور سفینہ کون سا چھپانا چاہتی تھیں۔ پھٹ پڑیں۔

"دوسرا نکاح کر رکھا تھا تمہارے باپ نے۔ جانتے ہو کس سے؟ اسی صالحہ کی بیٹی سے جو کبھی تمہارے باپ کی منگیتر تھی اور یہ تمہارا بھائی۔۔۔ یہ باپ کے سب کرتوتوں میں برابر کا شریک تھا۔"

سفینہ کی باتیں اس قدر دھماکہ خیز اور غیر یقینی تھیں کہ وہ دونوں ششدر بیٹھے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼
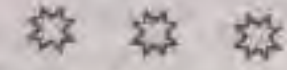
وکیل صاحب گیارہ بجے تک آپہنچے تو مجبوراً سفینہ کو لاؤنج میں آنا ہی پڑا۔

سیاہ لباس میں سر کو دوپٹے سے ڈھانپے وہ چہرہ چھپائے ہوئے تھیں۔ وہ ایزد کی اوٹ میں صوفے پر بیٹھیں۔

ساری جائیداد انہوں نے اپنی اولاد اور بیوی کے نام ہی کی تھی البتہ ایک اکاؤنٹ کی پچاس لاکھ کی رقم اور ماہانہ دس ہزار خرچہ انہوں نے ایہا مراد کے لیے وصیت کیا تھا اور اس گھر کا تین چوتھائی حصہ بھی۔

جب وکیل اس بارے میں تفصیل بتا رہا تھا تو نفرت سے سفینہ کا بگڑتا چہرہ معیز سے چھپا ہوا نہ تھا۔

"ایہا مراد کہاں ہیں؟ اصولاً تو ان کی موجودگی میں یہ وصیت پڑھی جانی چاہیے تھی۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا۔" وکیل معیز سے استفسار کر رہا تھا۔

"جی۔۔۔" وہ چونکا۔ پھر گڑبڑا کر بولا۔ "جی۔۔۔ وہ ابھی رابطہ نہیں ہے ان سے۔"

"حق دار تک اس کا حق پہنچانا اب آپ کی ذمہ داری ہے مرنے والا تو اپنا فرض ادا کر گیا۔ اس سارے لین دین کا گناہ و ثواب اب آپ لوگوں پر ہے۔"

وکیل وصیت نامہ معیز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے خاکی لفافہ بھی معیز کے حوالے کیا جو سربمہر تھا۔

"یہ خط آپ کے لیے ہے۔ آپ کے والد صاحب کی طرف سے۔"

معیز کا ہاتھ لرزا۔ وہ بنا کھولے بھی اس خط میں لکھے وعدوں اور قسموں کو پڑھ سکتا تھا۔

وہ وکیل کو ڈراپ کرنے چلا گیا۔

"دیکھ لی تم لوگوں نے اپنے باپ کی وصیت۔" سفینہ زہر زہر ہو رہی تھیں۔

"ریلیکس ماما! اب تو وہ سب ختم ہو گیا۔ ابو زندہ ہوتے تو کوئی شکوہ بھی تھا۔ یہ داستان تو ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔" ایزد نے انہیں دلاسا دیا۔

خود ان لوگوں کو بھی امتیاز احمد کی اس حرکت کا یقین نہیں آیا تھا۔ مگر وصیت کے بعد تو ساری بات کھل کر سامنے آچکی تھی۔

"داستان تو اب شروع ہو رہی ہے میرے بھولے بچے۔" سفینہ چمکیں۔

"وہ ناگن تو مر گئی مگر اپنا سنپولیا چھوڑ گئی مجھے ڈسنے کو۔ سنا نہیں تم نے 'تمہارے باپ نے پچاس لاکھ روپیہ چھوڑا ہے اس کے لیے اور معیز کو پابند کیا ہے کہ وہ اس لڑکی کو اس گھر میں لے کر آئے گا اور وہ یہیں رہے گی ہمارے ساتھ۔"

وہ نفرت سے نیلی پڑنے لگیں۔

"اللہ جانے وہ کہاں مر کھپ گئی ہے۔ ماما! اس کا صرف ابو سے رابطہ تھا اب وہ بھی ختم ہوا۔ آپ سمجھیں کہانی ختم ہی ہو گئی۔"

زارا بھی مطمئن ہی تھی۔ مگر سفینہ کو کسی طور چین نہ پڑتا تھا۔

"وہ تمہارے باپ کی مطلقہ ہوتی تو میں بھی چین کی بنسی بجاتی۔ مگر وہ ناگن ان کی بیوہ ہے اور جائیداد میں حصہ دار بھی۔"

سفینہ نے انہیں باور کرایا۔

ایزد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"اور معیز کو تو میں اس گناہ میں شریک ہونے پر کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔ جیتے جی میرے لیے جہنم خریدنے میں میرا بیٹا بھی شامل تھا۔ یہ سوچ مجھے سونے نہیں دیتی۔ کیسے نیچا دکھایا ہے ان باپ بیٹے نے مجھے۔"

وہ نا چاہتے ہوئے بھی شکست خوردہ سی رو دیں تو دروازے تک آیا معیز احمد دکھ کے شدید حصار میں گھرا وہیں سے لوٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

اس ڈیڑھ ماہ میں ایہا کی ساری خوش فہمیاں دم توڑ چکی تھیں۔

حنا کی بظاہر بہت نرم دل اور اعلا دکھائی دینے والی ماما اس کی پڑھائی کا سن کر اکھڑ ہی گئیں۔

"دیکھو ایہا۔ یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ تم یہاں سے نکلیں تو یوں شکار ہو گی جیسے معصوم چڑیا کسی ظالم شکرے کا شکار ہوتی ہے۔ شکر کرو کہ حنا تمہیں یہاں لے آئی مگر اس سے آگے میں تمہیں کوئی فیور نہیں دے سکتی۔ بلکہ تمہیں تو کسی آفس میں جاب کرنے کا سوچنا چاہیے اب۔ تاکہ اپنا خرچا خود اٹھا سکو۔"

انہوں نے چند جملوں میں اس کا منہ بند کرا دیا تھا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنی ظالم ثابت ہو سکتی ہیں۔ دولت کی ریل پیل ہونے کے باوجود وہ اس کی چند ہزار کی مدد کرنے سے لاچار تھیں۔

وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ آئی۔ حنا نے اس کی اتری ہوئی صورت اور سرخ آنکھیں دیکھیں ضرور مگر پوچھا کچھ نہیں۔ وہ تو پہلے ہی سے سب کچھ جانتی تھی۔

"مجھے بھلا کہاں جاب مل سکتی ہے ڈگری کے بغیر۔۔۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"حسن ڈگریوں کا محتاج نہیں ہوتا ڈارلنگ۔" حنا نے عجیب ہی بات کہی۔

"مگر پیسے کا محتاج ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ پیسے پیسے کا۔" وہ تلخ ہونے لگی۔

بعض اوقات ہما (خوش قسمتی کا پرندہ) لوگوں کے سر پہ بیٹھ چکا ہوتا ہے مگر انہیں اس کا علم نہیں ہو پاتا۔ ایہا کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔

وہ پچاس لاکھ کی مالکن بن چکی تھی مگر یہاں کوڑی کوڑی کو ترس رہی تھی۔ اس کا مستقبل داؤ پہ لگ چکا تھا اور "حال" کا حال بہت خراب تھا۔

اب تو اسے یہاں مفت کا کھاتے بھی شرم آنے لگی تھی۔

"تو پھر کوئی نوکری ڈھونڈ لو۔"

حنا کا مشورہ لاپرواہانہ تھا۔ وہ اب پرانی حنا نہ تھی جو بڑی دل سوزی سے اسے یہاں لے کے آئی تھی۔ اب تو وہ اسے چھوڑ کر سارا سارا دن نئی سنوری جانے کہاں کی سیریں کرتی رہتی اور ایبہا کا سارا دن رو رو کر گزرتا۔ اپنی ماں شدت سے یاد آتی اور امتیاز احمد۔۔۔ جو اسے نکاح کے بندھن میں باندھ کر بہت سے وعدوں اور ارادوں کے ساتھ یہاں لائے تھے۔۔۔ مگر اب مگر اب وہ کہیں نہ تھے۔

وہ روزانہ باقاعدگی سے فون چارج کرتی اور سارا دن امتیاز احمد کو کال ملاتی رہتی مگر ادھر سے مسلسل فون بند آرہا تھا۔

اور پھر ایک دن ایبہا نے وہ موبائل فون بھی کھو دیا۔ جو اس کی آخری امید تھا۔

وہ پاگلوں کی طرح ڈھونڈتی پھری۔

حنا شرمندہ تھی۔

"مل جائے گا یار! صفائی کے دوران ادھر ادھر ہو گیا ہو گا۔ تم میرا موبائل لے لو۔ تمہارے فون سے بھی اچھا ہے۔"

اس نے موبائل ایبہا کو تھما دیا۔

وہ پھپک کر رو دی۔

"اس میں میرے کانٹیکٹ نمبرز تھے حنا! مجھے تو زبانی کوئی بھی نمبر یاد نہیں۔"

حنا بھی سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور اب صحیح معنوں میں ایبہا کو احساس ہوا تھا کہ بے یارومددگار ہونا کسے کہا جاتا ہے۔ ایک جو مدھم سی آس تھی کہ کبھی نہ کبھی امتیاز احمد سے رابطہ ہو ہی جائے گا وہ بھی ختم ہوئی۔ وہ روئے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
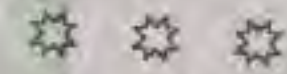
آج بڑے عرصے کے بعد وہ عون کے بے حد اصرار پر اس کے ریسٹورنٹ میں آیا تھا۔

"کیا یار۔۔۔ تم تو عید کا چاند ہی ہو گئے ہو۔" عون نے شکوہ کیا۔ وہ بذات خود اپنے اور معیز کے لیے چائے لے کر آیا تھا۔ یہ اس کی محبت کا خاص انداز تھا۔

"بس یار! زندگی نے کس بل نکال دیے سارے۔ کہاں تو زندگی کا مزہ چکھ رہا تھا اور اب وہی زندگی مزہ چکھانے پہ تل گئی ہے۔"

وہ آزردہ تھا۔ عون کو وہ بے حد کمزور اور تھکا ہوا لگا۔ آنکھیں سوجن زدہ اور سرخی مائل۔ جیسے نیند کی کمی کا شکار ہوں۔

"کم آن معیز۔ مشیت ایزدی میں راضی رہو گے تو صبر کرنے کے لیے کوشش نہیں کرنا پڑے گی۔ خود بخود ہی صبر و سکون آتا جائے گا۔"

عون نے اسے سنبھالا دیا۔ مگر وہ اس پر آئی قیامتوں سے واقف ہی کہاں تھا۔

"ہوں۔۔۔" معیز نے مبہم انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے پانی کا گلاس منہ سے لگا کر دو تین گھونٹ بھرے۔

"یونیورسٹی آؤ گے۔۔۔؟" عون اس کا دھیان بٹانا چاہ رہا تھا۔

"ہنہ۔۔۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرایا "اب تو وہ سارے کھیل تماشے ختم ہو گئے۔ زندگی نے میرے باپ کی سیٹ پہ لا بٹھایا ہے مجھے۔"

عون چپ رہ گیا۔ پھر اس کی ہمت بندھانے والے انداز میں بولا۔

"اچھی بات ہے۔ ایزو تو اس لائن میں ہے نہیں۔ مگر تم تو کافی عرصے سے انکل کے ساتھ تھے۔ امید ہے ان شاء اللہ اچھے طریقے سے سب سنبھال لو گے۔"

"ہاں۔۔۔" اس نے گہری سانس بھری۔ شاید وہ خود بھی اس اداسی اور خود ترسی کے ماحول سے نکلنا چاہتا تھا۔ تب ہی بات بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اسٹاف تو اچھا ہے۔ کوآپریٹو بھی ہے امید تو یہی ہے کہ کوئی بہتری ہی ہو گی۔"

"آنٹی کیسی ہیں اب۔۔۔؟"

عون نے سفینہ کے بارے میں پوچھا تو معیز کے چہرے پر دکھ کا تاثر بکھر گیا۔

"بہتر ہیں اب۔" اسے ماں کی سرد مہری اور خود سے لاتعلقی ٹوٹ کر یاد آئی تھی۔ مگر وہ کچھ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا۔

عون نے نظر بھر کے اپنے عزیز دوست کو دیکھا۔ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک وہ محض دو ہی دوست تھے۔ کسی تیسرے کی انہیں کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اگر عون محبت میں توحید کا قائل تھا تو معیز احمد نے بھی دوستی نبھانے میں کبھی کمی نہ کی تھی۔

"آفس کب سے جا رہے ہو؟"

عون کو اس کی خاموشی سے وحشت ہونے لگی تو گھبرا کر پھر سے بات شروع کر دی۔ تو وہ چونکا۔

"ابھی تو بہت ڈسٹرب ہوں۔"

وہ تھکے تھکے سے انداز میں گویا ہوا۔

"ابو جاتے ہوئے مجھ پر اتنی ذمہ داریاں ڈال گئے ہیں سوچتا ہوں روز قیامت پتا نہیں میں سرخرو ہو پاؤں گا کہ نہیں۔"

"صدق دل سے نبھاؤ گے تو ضرور سرخرو ہو گے معیز۔" عون نے تیقن سے کہا۔

معیز نے ایک ٹک اسے دیکھا۔

"اور اگر کچھ ایسا میں نہ کر پاؤں، جس کا وہ مجھ سے وعدہ لے چکے ہیں تو۔۔۔؟"

"تو سنا ہے کہ مرنے والے کی روح کو چین نہیں آتا۔" عون نے کہا۔

ایک دم ہی وہ ٹیبل پر کہنیاں ٹکاتا آگے کی طرف جھکا۔

"اس روز اس لڑکی کو تو نے کہاں ڈراپ کیا تھا؟"

معیز نے بہ عجلت پوچھا تو عون گڑبڑا گیا۔

"خدا کو مانو۔ کون سی لڑکی کو؟"

"وہی۔ جس کا میری گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

"وہ تو۔۔۔ گرلز ہاسٹل میں رہتی تھی شاید۔ وہیں ڈراپ کیا تھا۔ خیریت؟ وہ کہاں سے یاد آ گئی تمہیں۔" ایڈریس بتا کر عون نے حیرت سے اسے دیکھا۔

معیز نے اپنا موبائل جیب میں ڈالا اور ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔

"کدھر۔۔۔؟"

"اس لڑکی کا پرس میری گاڑی میں ہی گر گیا تھا۔ اچھی خاصی اماؤنٹ تھی اس میں۔ ابو والے سانحے کی وجہ سے اتنے دن گزر گئے میں لوٹا نہیں سکا۔ ابھی یاد آیا تو سوچا یہ کام بھی کر ہی ڈالوں۔"

وہ بڑی تفصیل سے بتاتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔ عون سر ہلا کر رہ گیا۔

معیز تیزی سے آکر گاڑی میں بیٹھا اور اسٹارٹ کرکے گاڑی پارکنگ سے نکالنے لگا۔

پرس والی بات ایک دم سے اس کے دماغ میں آگئی تھی جو بطور بہانہ اس نے عون کو مطمئن کرنے کے لیے پیش کر دی۔ اسے یاد آیا اس روز جب ایبہا کا فون آیا تو وہ اپنے پرس کی گمشدگی ہی کا ذکر کر رہی تھی۔

اور اب معیز احمد کچھ بار اپنے کندھوں سے اتارنا چاہتا تھا۔ امتیاز احمد نے ایبہا مراد کا جیب خرچ لگایا ہوا تھا تو وہ اسے بہر طور ہر حال میں ملنا چاہیے تھا۔

اسے دھیان آیا۔۔۔ اس لڑکی کو ابو اپنی ذمہ داری بنا کے لائے تھے' اس کے نان نفقے کی ذمہ داری قبول کی تھی اور اب جبکہ وہ فوت ہو گئے تھے تو کیا ان کی قبر کی منزل آسان کرنے کے لیے معیز کو یہ ذمہ داری پوری نہیں کرنی چاہیے تھی؟

وہ صالحہ سے نفرت کرتا تھا۔ کیونکہ سفینہ نے تمام عمر اس کے ان دیکھے وجود سے نفرت کی تھی۔ اسے ایبہا مراد سے بھی نفرت تھی۔ کیونکہ وہ صالحہ کی بیٹی تھی۔ وہ صالحہ جو نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ اس کی ماں اور باپ کے درمیان موجود رہی۔

مگر اب بات شرعی نقطۂ نظر سے سوچنے کی تھی۔

شریعت کی رو سے وہ پابند تھا کہ اپنے باپ کی وصیت پر عمل کرتا اور سب سے کرواتا۔ حق داروں کو ان کا حق دیتا۔ اسی لیے جو سب سے پہلے اس حق کی (اس کی نظر میں) مستحق تھی' وہ اس کے پاس جا رہا تھا۔

اسے باپ کا آخری خط ازبر ہو چکا تھا۔ وہ خط جو صرف معیز کے لیے تھا اور معیز ہی نے پڑھا تھا۔ اس نے دانتوں پر دانت جماتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ تیز کی۔

چند لمحوں کے بعد وہ عون کے بتائے ایڈریس کے مطابق گرلز ہاسٹل کے سامنے موجود تھا اور کچھ ہی دیر کے بعد وارڈن کے سامنے۔

"آپ کس سلسلے میں ایبہا مراد سے ملنا چاہتے ہیں؟" وارڈن نے مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔

"میں۔۔۔ کزن ہوں اس کا۔ دوسرے شہر سے آیا ہوں۔" معیز نے اسے ٹہلایا۔

"ہوں۔۔۔" وارڈن نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

"مگر وہ تو دو ماہ ہوئے یہاں سے جا چکی۔" معیز بے اختیار کرسی کی ٹیک چھوڑ کر سیدھا ہوا۔

"کہاں۔۔۔؟"

"میرے خیال میں آپ کا اس سے کوئی زیادہ قریب کا رشتہ نہیں ہے ورنہ وہ اس قدر بدحالی کا شکار نہ ہوتی۔ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کا پرس گم ہو گیا جس میں اس کی ہاسٹل اور کالج کی فیس تھی۔ نتیجتاً" نہ تو وہ ایگزیم دے سکی اور نہ ہی ہاسٹل میں رہ سکتی تھی۔ برے حالوں میں نکلنا پڑا اسے۔"

"مگر کہاں گئی وہ۔۔۔ جاتے وقت کوئی ایڈریس وغیرہ نہیں دے کر گئی۔" معیز جو ساکت سا سن رہا تھا۔ تیزی سے بولا۔

"نہیں۔ بس اتنا پتا ہے کہ اس کی روم میٹ حنا اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔" وارڈن اب بے زار ہونے لگی تھی۔

معیز کے پھر سے کچھ پوچھنے کے لیے کھلتے لب دیکھ کر وہ تیزی سے بولی۔

"باقی اب تم اس کے کالج سے پتا کر سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے وہ پرائیویٹ امتحان دے رہی ہو۔ البتہ اتنا تمہیں بتا دوں کہ اس کی روم میٹ کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ کم از کم میری نظر میں۔"

معیز بے اختیار اسے دیکھنے لگا۔

"اس کے گھر والوں کا قصور ہے۔ اس کے یہاں ایڈمیشن کے بعد سب گویا اسے بھول ہی گئے تھے۔ خدا کرے نیک ہاتھوں میں ہو وہ۔"

وارڈن نے تاسف سے کہا تو وہ کرسی گھسیٹتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کالج کا نام بتا سکتی ہیں آپ۔ جہاں ایہا مراد پڑھتی تھی۔" معیز نے آخری سوال پوچھا۔

کالج کا نام سن کر وہ چونکا۔

وارڈن کے کمرے سے نکل کر باہر گاڑی تک پہنچتے اسے یاد آچکا تھا کہ یہ وہی کالج تھا جہاں رباب احسن پڑھتی تھی۔

"فائنل ایر۔۔۔ اور رباب کے بھی ایگزیمز ہو رہے ہیں۔۔۔ شاید وہ ایہا مراد کو جانتی ہو۔" معیز کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔

اس نے گاڑی کا رخ رباب کے گھر جانے والی سڑک کی طرف موڑ دیا۔

وہ اس سلسلے میں خود کو سرخرو کرنے کے لیے اپنی سی کوشش کرنا چاہتا تھا۔۔۔ باقی جو اللہ کو منظور۔

☼ ☼ ☼

وہ نیٹ آن کیے اسکائپ پر اپنی بیسٹ فرینڈ سنبل سے گپیں لگا رہی تھی۔

بڑا ہاٹ ٹاپک زیر گفتگو تھا۔

"اچھا۔۔۔ شکل سے تو اتنا امیر نہیں لگتا تھا اور گاڑی اس کی نئی تھی مگر ہزاروں ایسی چلا رہے ہیں۔" سنبل نے مذاق اڑایا۔

"کاش تم اس دن ساتھ ہوتیں پھر دیکھتیں۔ تین برانڈ نیو گاڑیاں اس کے وسیع و عریض پورچ میں کھڑی تھیں۔ اس کی شکل پہ مت جاؤ۔ وہ صرف شکل ہی سے غریب لگتا ہے۔" رباب ہنسی۔

"کم آن رباب۔ اب اور کتنا کھینچو گی اس معاملے کو۔ ٹاسک پورا ہو گیا اب دفع کرو۔ کہیں وہ سیریس ہی نہ ہو جائے تمہارے لیے۔"

سنبل نے اسے ڈرایا۔ یہ واحد بندہ تھا جس کے ساتھ ٹاسک پورا ہونے کے بعد بھی رباب نے دوستی ختم نہ کی تھی۔

"ابھی تو ایگزیمز ہو رہے ہیں۔ فون ملاقات بالکل بند ہے۔ ڈونٹ وری۔" رباب نے اسے تسلی دی۔

"مجھے لگ رہا ہے تم اس کے متعلق سیریس ہو۔" سنبل نے اسے گھور کے دیکھا تو وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

پھر آہ بھر کے بولی۔

"بس تھوڑی سی گڑبڑ کی وجہ سے مجھے میرا آئیڈیل ملتے ملتے رہ گیا۔"

"وہ کیا گڑبڑ ہے؟" سنبل نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ میرا آئیڈیل گھر سیفی کے پاس ہے اور شکل و صورت معیز احمد کے پاس۔"

وہ حسرت سے اس طرح بولی کہ اس کے ساتھ ساتھ بات کے اختتام پر سنبل بھی ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"ایک ہی حل ہے۔ دونوں کے ساتھ کچھ عرصے کے لیے شادی کر سکتی ہو تم۔"

ان ذہنی بیمار لڑکیوں کی گفتگو اکیلے میں یونہی اخلاق سے عاری ہوتی تھی۔ بظاہر انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ وہ اس طرح کی لچر گفتگو بھی کر سکتی ہیں۔

"ہے نا زیادتی۔ مردوں کو تو اکٹھی چار کی اجازت دی ہے اللہ نے۔ عورتوں کے پاس دل نہیں ہوتا کیا۔" رباب نے منہ بنایا۔

بہت سی باتیں جو "ایسے ہی" مذاق میں کہہ دی جاتی ہیں۔ مگر ایسی باتوں کی پکڑ بھی "ایسے ہی" ہو جایا کرتی ہے۔

"اچھا بس کرو۔ کسی مفتی ملا نے سن لیا تو گردن اتروا دے گا تمہاری۔" سنبل ہنسی۔

"بہر حال۔ تھینکس ٹو گاڈ۔ اگر وہ لڑکے نہ بناتا تو ہم تو بہت بور ہوتیں یار۔" رباب نے قہقہہ لگا کر کہا۔

رباب اس معاملے میں اب خاصی پکی ہو چکی تھی۔ کسی کو ہاتھ تک نہ پکڑنے دیتی مگر ایسے گھماؤ اور چکر دیتی کہ لڑکے اس کے پیچھے دم ہلاتے پھرتے اور چند دنوں کے بعد رباب نامی تتلی پھر سے اڑ جاتی۔

"یہ تو ہے۔" سنبل نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ سب رباب کی طرح مختلف لڑکوں کو پھنسا کر ان کے جذبات سے کھیلنے کی عادی تو نہ تھیں مگر ان سب ہی نے ایک ایک بوائے فرینڈ ضرور بنا رکھا تھا۔ جو ان کی ذہنی گراوٹ اور پراگندگی کا ثبوت تھا۔ اسی وقت رباب کا موبائل بجنے لگا۔

اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ پھر موبائل اٹھاتے ہوئے سنبل کو آنکھ مار کر بولی۔

"معیز کی کال ہے۔۔۔ اوکے۔۔۔ پھر بات کریں گے۔"

"اوکے۔۔۔ بیسٹ آف لک۔"

رباب کال اٹینڈ کرتی کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھ کر اپنے بیڈ کی طرف آگئی۔

"ہیلو معیز۔ کیسے ہو؟" اس کا لہجہ پرجوش تھا۔ وہ معیز کو دل سے پسند کرتی تھی۔ کیونکہ وہ اس کے ساتھ محض ایک "سہیلی" جیسا تھا۔ دوست نہیں "سہیلی"۔ نہ تو وہ اس کے لب و رخسار کی تعریف کرتا تھا اور نہ اس کے حسن و خوب صورتی پر مرتا تھا۔ "تجھ کو اپنا نہ بنایا تو میرا نام نہیں۔"

وہ اکثر معیز کے لیے گنگناتی یا شاید خود کو باور کراتی رہتی تھی۔

"ابھی۔۔۔ مجھے انفارم تو کرتے۔ میں تیار ہی ہو جاتی۔" وہ ٹھنکی۔

"کہیں جانا نہیں ہے۔ تمہارے لان ہی میں ٹہل لیں گے بس۔" وہ اپنے آنے کا بتا کر فون بند کر چکا تھا۔

رباب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اسے جلد سے جلد شعلہ بننے کا طریقہ بہت اچھی طرح آتا تھا۔ اگلے چند منٹوں میں وہ بلیک ٹراوزر اور پنک ٹاپ پہنے۔۔۔ تیار تھی۔ اسٹائلش سا پنک ٹاپ اس کی رنگت کو جگمگا رہا تھا اور کچھ نہ دکھائی دینے والی میک اپ کا کمال۔ اس نے ملازم کو ہدایت کر دی۔

"معیز آئے تو اسے اوپر ٹیرس پہ بھیج دینا اور ساتھ ہی دو کافی لے آنا۔" وہ خود ٹیرس پر آگئی۔

چند ہی لمحوں کے بعد اس نے معیز کی گاڑی کو اندر آتے دیکھا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ گاڑی سے اتر کر اب بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ملازمہ اس کے پاس کھڑی یقیناً "رباب ہی کا پیغام اسے دے رہی تھی۔ معیز نے ٹیرس کی طرف دیکھا تو رباب نے ہاتھ ہلا دیا۔

وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

رباب کا دل انوکھی سی ترنگ میں دھڑکنے لگا۔ آج گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ماسوائے رباب کے۔ کیا آج بھی وہ دل کی بات نہ کہے گا؟ رباب کے ہونٹوں پر جیت لینے والی مسکراہٹ تھی۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر آیا۔

"ہیلو۔۔۔!" رباب کا انداز بہت دلبرانہ تھا۔ معیز مسکرا دیا۔
"کیسی ہو۔۔۔؟"
"یہ تو آج تم بتاؤ گے۔" وہ اس کے پاس آکر اس کے سینے پہ انگشت شہادت کھبو کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔
"بیٹھتے ہیں۔" معیز نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا تو رباب گہری سانس بھر کے اس کے پیچھے آئی۔
"آج کتنے دنوں بلکہ مہینوں کے بعد آئے ہو۔" رباب کا شکوہ بجا تھا۔
امتیاز احمد کی وفات اور بعد میں آتے جاتے معیز سے سامنا تو ہوا۔ مگر یوں روبرو آج ملاقات ہو رہی تھی۔
"تم جانتی تو ہو سب۔" وہ ٹھہرے پانیوں جیسا پرسکون تھا۔ مگر یہی سکون رباب کے اندر تلاطم پیدا کر رہا تھا۔
اسے اب تک واسطہ پڑنے والے مردوں کی ستائشی اور ترسی ہوئی نظریں یاد آنے لگیں۔
"انکل آنٹی کہاں ہیں؟" معیز کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔
"ملنے والوں میں فنکشن تھا۔ وہیں گئے ہیں۔ رات تک واپسی ہوگی۔"
رباب نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی نظروں میں اس کی نظروں کو جکڑ رکھا تھا۔
ملازمہ کافی کے دو مگ رکھ گئی۔ معیز اسے کافی رکھتے دیکھنے لگا۔ مگر رباب کی نگاہ ابھی بھی معیز پر تھی۔
"میں نے تمہیں اتنا یاد کیا۔"
"تم مجھے روزانہ سونے سے پہلے کال کرتی ہو۔" معیز نے اسے یاد دلایا۔
"مگر وہ ملنا تو نہیں۔ ملنا تو کچھ اور ہوتا ہے۔" وہ بے اختیار بولی تو معیز چونکا۔ مگر یہ فقط ثانیے بھر کی بات تھی۔ پھر وہ مسکرا دیا۔
"چلو" آج مل بھی لیے اب خوش؟"
"ہوں۔۔۔" وہ منہ بنا کر بولی اور اثبات میں سر ہلایا۔
"پیپرز کیسے ہو رہے ہیں؟" معیز نے پوچھا۔
"اچھے۔۔۔"
"بس اچھے؟"
"ہاں۔ اچھے ہی ہوتے ہیں تب ہی تو ہر بار پوزیشن آتی ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔
اور واقعی غیر نصابی سرگرمیاں اس کی چاہے کتنی بھی "غیر اخلاقی" تھیں مگر پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت اچھی تھی اور کچھ پوزیشن لے کر سب کی نظروں میں رہنے کا شوق بلکہ جنون۔
"ہوں۔۔۔ اور تمہاری فرینڈز کے؟" معیز بات سے بات نکال رہا تھا۔ رباب نے کافی کا مگ اسے تھمایا۔
"تھینک یو۔۔۔"
"وہ بس ایوریج ہی ہیں۔ اچھے نمبرز لے کر پاس ہو جاتی ہیں۔"
رباب نے ٹانگ پر ٹانگ جماتے ہوئے اپنی مخصوص لاپروائی سے کہا۔
معیز کافی کے گھونٹ بھرتا کچھ سوچنے لگا۔
رباب نے کافی کے مگ سے اٹھتے دھوئیں کے پار اس کا خوب صورت مردانہ چہرہ دیکھا۔
اس کی سوچتی آنکھیں دل میں کھب رہی تھیں۔ اس کا مضبوط مردانہ سراپا اور مخصوص کلون کی دلکش خوشبو ہر بار ہی رباب پر عجیب سا اثر کرتی تھی۔ وہ بے خودی سی اسے دیکھ رہی تھی۔
"تم کسی ابیہا مراد کو جانتی ہو؟" ایک دم ہی اسے لگا اس کی سماعتوں نے کچھ غلط سنا ہو۔ وہ بڑے زوروں سے

چونکی۔
"ہوں۔ کیا پوچھ رہے تھے تم؟"
"ابیہا مراد۔ تمہارے ہی کالج میں پڑھتی تھی۔ فائنل ایئر تھا اس کا بھی۔" وہ رباب کو دیکھ رہا تھا۔
"تم اسے کیسے جانتے ہو؟" رباب کا دل عجیب سے وہم سے دھڑکا۔
"اہم بات یہ ہے کہ تم اسے جانتی ہو۔ کالج آرہی ہے وہ؟" معیز نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔
"نہیں۔ بلکہ وہ تو ایگزیمز دے ہی نہیں رہی۔ میرا اسی کے ساتھ کمپی ٹیشن ہوا کرتا تھا۔ اس بار تو کوئی مقابل ہے ہی نہیں۔"
رباب نادانستگی میں ابیہا کی ذہانت کا اعتراف کر گئی تھی۔ پھر جیسے مزہ لیتے ہوئے مسکرائی۔
"غریب گھرانے سے تھی بے چاری۔ ایگزیمز کی فیس جمع کرانے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے اس کے پاس۔ آخری دن کالج میں روتی پھر رہی تھی۔"
معیز کے دماغ میں سنسناہٹ سی دوڑ اٹھی۔
"تو تم اس کی ہیلپ کر دیتیں۔" وہ بے اختیار بولا۔
"آئی ہیٹ ہر۔۔۔" رباب نے حقارت سے کہا۔
"کس بات کی نفرت؟" وہ حیرت سے بولا۔
"جو بھی میرے مقابل آئے میں اسے مخالف سمجھ کر ہی مقابلہ کرتی ہوں۔" وہ اطمینان سے بولی۔
"دوست سمجھ کر بھی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔" معیز نے نصیحت کی۔
"دوستوں کے ساتھ مقابلے نہیں ہوا کرتے۔ صرف دوستی ہوتی ہے۔ اسے کس نے کہا تھا اتنے بہترین کالج میں ایڈمیشن لے۔ اس کی دوست تو شاید اس کے لیے چندہ مانگنے بھی آئی تھی ہمارے پاس۔۔۔ خوب مذاق بنا اس کا۔" وہ اب بھی مذاق اڑا رہی تھی۔ پھر دفعتاً "ٹھٹکی اور معیز کو ہلکا سا گھورا۔
"مگر تم کیسے جانتے ہو اسے؟"
معیز اپنا ہوم ورک راستے ہی میں مکمل کر کے آیا تھا۔
"میرا فرینڈ ہے عون۔ اس کی دور پار کی کزن تھی۔ اس نے ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ تم بھی اسی کالج میں پڑھتی ہو۔"
"تھینک گاڈ! اس سے جان چھوٹی۔ تین سال سے ہر کلاس ٹیسٹ اور ایگزیمز میں جی جان سے میرا مقابلہ کر رہی تھی۔ دیکھنے میں کچھ نہیں تھی مگر تھی بہت انٹیلی جینٹ۔"
رباب کبھی اس سے نفرت کرتی، کبھی حسد اور کبھی رشک۔ معیز کو ڈھلکتی سیاہ چادر میں سے چھلکتا روپ یاد آیا۔ جب وہ زارا کے نکاح میں شریک ہونے آئی تھی۔
"لاحول ولا۔۔۔" اس نے سر جھٹکا۔
"کافی تو ختم ہو گئی۔ اب لانگ ڈرائیو پہ چلتے ہیں۔" رباب نے ابیہا مراد نامی بورنگ موضوع کو بند کرتے ہوئے دل ربائی سے مسکرا کر کہا تو وہ نرمی سے انکار کرتے ہوئے بولا۔
"ایم سوری رباب۔ ابھی تو صرف تم سے چھوٹی سی ملاقات کرنے آ گیا تھا۔ بٹ آئی پرامس یو۔ جلد ہی پروگرام بناتے ہیں کوئی۔"
رباب کو اس کا انکار اچھا نہیں لگا۔ بلکہ اسے تو یقین ہی نہیں آیا تھا کہ کوئی رباب نامی قیامت کو انکار کر سکتا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے محض وہاں کافی ہی پینے آیا ہو۔ اس نے رباب کے چھلکتے حسن پر ایک بھی نگاہ غلط انداز نہ ڈالی تھی۔ جانے وہ کس دھیان میں تھا۔

اس کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر تک وہ وہیں بیٹھی اندر ہی اندر سلگتی رہی۔

☼ ☼ ☼
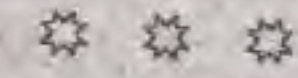
عون نے والد محترم کی سامنے بے شرمی اور ڈھٹائی سے کہہ دیا کہ وہ سب کے بیچ ثانیہ سے معذرت کرنے کو تیار ہے۔ مگر شرط یہ تھی کہ اس کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر ثانیہ کی رخصتی کی تاریخ فائنل کی جائے اور وہ تو پہلے بھی یہی چاہتے تھے۔

اور عون نے یہ شوشا چھوڑا بھی تب تھا جب کہ ثانیہ اپنی بڑی خالہ (عون کی بڑی پھپھو) کے ساتھ ان کے گھر ہی آئی ہوئی تھی۔

عون کی چھوٹی بہن عبیرہ نے فوراً "جاکے یہ خوش خبری ثانیہ کے کان میں پھونکی تو وہ بدک اٹھی۔

"صبح سب کے سامنے بھائی آپ سے معافی مانگ لیں گے اور پھر شادیانے بجیں گے بھابی جان۔" عبیرہ بہت خوش تھی۔

اسے ثانیہ بہت اچھی لگی تھی اور دونوں میں اس سے دوستی بھی ہو گئی تھی۔

اب ثانیہ کا بس نہ چلتا تھا' دو چار لگا کے سب کے درمیان قہقہے لگاتے عون عباس کو ٹھیک کر دے۔ مگر بہر حال اس کا دماغ درست کرنا بھی ضروری تھا۔ لمبی محفل چلی۔ ثانیہ تو جلد ہی اٹھ کر اپنے اور عبیرہ کے کمرے میں آ گئی۔ عبیرہ بھی سو چکی تھی اس کا صبح ضروری ٹیسٹ تھا۔

مگر ثانیہ کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی تھی۔

اسے یاد آیا۔ کیسے عون نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا۔ جس رشتہ دار کے ہاتھ اس نے پیغام بھیجا اس نے نہ صرف ثانیہ کے گھر بلکہ پورے خاندان میں عون کے انکار کے الفاظ کو نشر کیا تھا۔

ثانیہ کے ددھیال والے تو یوں بھی اس بچپن کے رشتے کے خلاف تھے سب نے طعنوں تشنوں کی بارش کر دی۔ اس کی فیملی کو کیا کیا باتیں نہ سننا پڑی تھیں۔

"اور اب تم اتنی آسانی سے اپنے من کی مراد پانا چاہتے ہو۔۔۔ ہنہ' کبھی نہیں۔ پہلے تم نے انکار کیا تھا' اب میں کروں گی۔"

وہ سلگ رہی تھی۔ شدید غصے اور بے بسی سے آنکھیں بار بار بھر آتیں۔

پھر کچھ فیصلہ کر کے وہ اٹھی۔ رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ وہ دوپٹہ شانوں پہ ڈالتی کمرے سے نکلی تو ٹی وی لاؤنج میں خاموشی تھی۔ اس نے دیکھا سب ہی سونے کے لیے جا چکے تھے۔

کچن میں جا کر پانی پینے کے بعد اس نے ہمت پکڑی اور دھڑکتے دل کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتی عون کے کمرے کی طرف بڑھی۔

چند سیکنڈ دروازے کے باہر کھڑے ہو کر اس نے جیسے اپنی ہمت مجتمع کی اور پھر دروازے کی ناب گھما کر جلدی سے اندر داخل ہوئی۔

ادھر سے عون بھی شاید باہر ہی نکلنے لگا تھا دونوں کا تصادم شدید تھا۔ ثانیہ کو سنبھالتے سنبھالتے وہ بھی زمین بوس

ہو گیا تھا۔

خوشبوؤں سے بھری لچکیلی ڈال تھی جو اس پر لد گئی تھی۔ اس کا دل عون کے سینے میں دھڑک رہا تھا۔ ثانیہ کے تو حواس ہی اڑ گئے۔

"چور چور۔۔۔" وہ شرارت سے دھیمے لہجے میں بولا تو ثانیہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پرے ہٹی۔

وہ جان بوجھ کر کراہتا ہوا اٹھا۔۔۔ ثانیہ جو خجالت اور شرم کے مارے لال چہرہ لیے کھڑی تھی اس کی اداکاری پر طیش میں آ گئی۔ مگر پیشتر اس کے کہ کچھ کہتی' باہر سے ماموں جان کی آواز آئی۔

وہ عون کے کمرے ہی میں آ رہے تھے شاید۔ عون نے نیچے گری فائل اٹھائی اور جلدی سے دروازہ بند کر کے لاک دبا دیا۔

"یہ۔۔۔ کیا کر رہے ہو؟" مارے صدمے کے ثانیہ کی آواز بند ہونے لگی۔

"شش۔۔۔" عون نے ہونٹوں پہ انگلی رکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچا تو ثانیہ کی تمام تر بہادری اڑن چھو ہو گئی۔ وہ بے یقینی اور صدمے کی کیفیت میں گھری عون کو دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
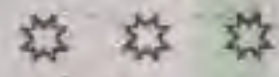
حنا پچھلے ایک ہفتے سے غائب تھی۔ آج ماما نے ابیہا کو بھی طلب کر لیا۔

"کیا سوچا ہے پھر تم نے؟" ابیہا نے ان کے خشک انداز پر اپنی ہمت ٹوٹتی محسوس کی تھی۔

"جی وہ۔۔۔ آنٹی! کوئی جاب نہیں ملی مجھے۔" وہ دونوں ہاتھوں کو باہم مسلتے ہوئے شرمندگی سے ڈوب مرنے کو تھی۔

"دیکھو۔ بہت ہوا۔ یہ کوئی آشرم یا دارالامان نہیں ہے۔۔۔ ہزار خرچے ہیں تمہارے۔ مفت خوری سے اب مزید وقت نہیں گزار سکتیں تم۔" ان کا انداز ان دو اڑھائی ماہ میں بالکل بدل چکا تھا۔

شروع میں تو وہ بالکل محبت سے پیش آتیں۔ پھر آہستہ آہستہ ان کا رویہ بدلنے لگا اور وہ اسے گھر سے نکلنے اور جاب کرنے کا کہنے لگیں۔ اب حنا کسی شادی میں شرکت کا کہہ کر گئی تو ایک ہفتہ ہوا واپس نہ آئی تھی۔ ابیہا نے خود کو مزید تنہا محسوس کیا۔ حالانکہ حنا نے بھی ماسوائے اسے یہاں لانے کے آگے اس کا کوئی ساتھ نہ دیا تھا۔

ابیہا ان لوگوں کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ حنا خود ہزاروں اڑاتی۔ مگر ابیہا کو وہ ایک روپیہ بھی نہ چھونے کو دیتی۔ اور اب ماما کا بگڑتا رویہ۔۔۔

"میں نے سیفی سے بات کر لی ہے۔ اس کے آفس میں ایک پوسٹ خالی ہے۔ تم وہاں جاب کرو گی۔" ماما کا لہجہ قطعی تھا۔

ابیہا کو لگا اس کی سماعتوں پر بجلی گر گئی ہو۔

"اور اگر تمہارا جواب انکار میں ہے تو اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور کسی یتیم خانے میں شفٹ ہو جاؤ۔" وہ سفاکی سے بولیں۔

ابیہا کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

(باقی ان شاء اللہ اگلے ماہ)

شاہین ملک

"سر! آج اپنی شادی کی تصویریں دکھائیں گے؟" اس نے کام کرتے کرتے اچانک عجیب سی بات کی اور پھر سر کے بگڑتے تیور دیکھ کے سہم گئی۔ "معاف کیجیے گا سر! شاید مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

"ہاں... میں وہی سوچ رہا تھا۔ یہ اچانک لکھتے پڑھتے تصویروں کی کیا سوجھی۔"

پھر وہ بھی چپ ہو گئی اور رجسٹر پر اس کی آنکھیں جم سی گئیں۔ اچھے بھلے لفظ ٹوٹے ٹوٹے سے اور دن کی روشنی میں ڈھلتے سائے جیسے ماحول سے اکتاہٹ سی ہونے لگی۔

"تم کام ختم کر لو پھر دیکھ لینا۔" اب کے کمرے کا سکوت مسز انصاری نے توڑا، جو وہاں چائے کے خالی مگ اٹھانے آئی تھیں۔ انصاری صاحب پان بنانے لگے۔ کمرے میں پاندان کی کھڑکھڑاہٹ سے ترنم پھوٹتا ورنہ ایسا لگ رہا تھا، ساشا نے بہت ہی غلط بات کر دی۔ چائے کے برتن کچن میں دھو دھلا کے رکھنے کے بعد وہ کمرے میں لوٹیں تو انصاری صاحب کو بلند آواز میں ریاضی کا کوئی فارمولا ڈسکس کرتے دیکھا۔ ساشا کے ہاتھ جلدی جلدی چل رہے تھے۔ اس گہرے انہماک کے باوجود اس کی نظر البم پر پڑی تو وہ مسز انصاری کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"تھوڑی دیر بریک کر لیں۔" مسز انصاری نے فرمائش بھی کی اور سفارش بھی، جسے سر نے مان لیا۔

ساشا نے بہت خوشی سے البم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"بھئی کیا رکھا ہے اب پرانی تصویروں میں۔ شادی بھی پرانی بلکہ ہم بھی پرانے آؤٹ ڈیٹڈ۔" اچانک ان کی نظریں بیگم کی طرف اٹھیں تو جملہ ادھورا چھوڑ کر ساشا کی جانب متوجہ ہو گئے۔

ایک تصویر میں نظر آ رہا تھا کہ پتھر کی اینٹوں سے بنا ایک صحن ہے چھوٹا سا اور کچھ لوگ سہرا بندی میں حصہ لے رہے ہیں۔

"یہ آپ کی بھابھی ہوں گی۔ آنکھوں میں سرمہ تو وہی لگایا کرتی ہیں۔" ساشا خوش ہو کر بولی۔

"اگر بڑی بہن ہوں تو یہ ذمہ داری بہن کی ہوتی ہے باقی رسما" کوئی بھی بھابھی لگا دیتی ہے۔" مسز انصاری نے وضاحت کی۔ "دراصل یہ ان کی بڑی بہن ہیں جو اب کینیڈا منتقل ہو گئی ہیں۔"

"سر! آپ بہت اسمارٹ لگ رہے ہیں۔" ساشا نے دولہا بنے اپنے سر کے بارے میں رائے دی۔

"ہاں دیکھیے! اتنا خوب صورت تھا میں کسی زمانے میں۔" ان کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھے۔

"اب بھی ہیں سر!" بے ساختگی سے تبصرے کا رد عمل کچھ یوں ہوا کہ کمرے میں تینوں کے قہقہے گونج اٹھے۔

"آپ بھی اچھی لگ رہی ہیں۔" ساشا نے دولہا دلہن کی تصویر میں والہانہ پن دیکھ کر دھیرے سے کہا۔ مسز انصاری ہولے سے مسکرا دیں۔

"سب ہی کہتے ہیں۔" انہوں نے بات آگے بڑھائی۔

"یہ کون ہیں۔ اچھا سر کے بھائی بہن... اچھا یہ لو

امی ہیں اور آپ کے گھر والے اچھا۔۔۔ واہ اس خاتون نے بہت بڑھیا سوٹ پہنا ہوا ہے۔ آپ نے زیور کہاں سے بنوایا تھا۔ بہت خوب صورت ہے۔ عروسی جوڑا بھی اچھا ہے مگر یہ نیکلس۔۔۔ کیا یہ ولیمہ کی تصاویر ہیں؟" وہ سوال بھی کر رہی تھی اور جواب بھی خود ہی دے رہی تھی۔ اس لمحے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"جی۔۔۔ ان دنوں نیلا' سبز' ارغوانی یا فیروزی رنگ ہی ولیمہ پر پہنا جاتا تھا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں' ابھی بھی کم و بیش ایسا ہی رواج ہے۔" وہ بڑے دلار سے تصویریں دیکھ رہی تھی۔

"مگر اب تو گولڈن اور آف کلرز بھی فیشن میں ان ہیں ناں۔ پہلے انہیں مرکزی اہمیت کہاں دی جاتی تھی۔"

"تم اپنی شادی پر کیسا جوڑا بنواؤ گی بیٹا؟" مسز انصاری نے ہولے سے پوچھا۔ اس وقت انصاری صاحب کسی کا ایس ایم ایس پڑھنے میں مشغول تھے۔

"پتا نہیں۔ ویسے مجھے بھی آف وائٹ یا آف پنک ہی پسند ہیں' لیکن آپ تو جانتی ہوں گی۔ شادی میں اپنی مرضی کہاں چلتی ہے۔ جو سسرال والے لے آتے ہیں وہی جوڑا پہن لیا جاتا ہے۔ بہت کم لوگ مشورہ کر کے خریداری کرتے ہیں۔" اس کے چہرے پر شرم کی سرخی کے بجائے زردی سی اتر آئی تھی۔

"کہیں بات وات طے ہوئی ہے کیا؟" مسز انصاری نے بات طویل کرنا چاہی۔

"رشتے تو آتے ہیں مگر یا تو بیرون ملک قیام کرنے والوں کے یا پھر اس قدر لالچی کہ کاروبار کرنے یا ملازمت دلانے کے چکر میں الجھے رہتے ہیں۔ فرمائشیں ہی ختم نہیں ہوتیں لوگوں کی' جہیز بھی منہ کھول کے بے غیرتوں کی طرح مانگتے ہیں جیسے شادی کا بندھن نہ باندھ رہے ہوں' بیٹا بیچ رہے ہوں۔ ایسے میں کوئی فیصلہ آسانی سے نہیں ہو سکتا۔" وہ ایک ہی سانس میں بولے چلی گئی۔

"ہاں یہ مسئلے مسائل تو ہیں۔۔۔ بڑی ناہمواری ہے معاشرے میں اور مایوسی بھی ہے لوگوں میں۔۔۔ نفرت اور خود غرضیوں کے ایسے ہی کئی واقعات سننے میں آ رہے ہیں۔"

"نفرت بھی ایسی ویسی۔ مہاجر پنجابیوں میں رشتہ نہیں کرنا چاہتے۔ پنجابی پٹھانوں سے فاصلے پر رہتے ہیں۔" ساشا نے پتے کی بات کہی۔

"بات یہ ہے کہ بعض دفعہ ایڈجسٹمنٹ دشوار ہو جاتی ہے' اس لیے بھی قوم پرستی کا رجحان غالب آ رہا ہے۔" مسز انصاری نے اپنے تجربے کی روشنی میں ساشا کو تصویر کا دوسرا رخ دکھایا۔

"آپ کی شادی میں کیسے حالات رہے تھے۔ کیا اس وقت عصبیت اسی طرح تھی اور خاندان ہی میں رشتہ کرنے کی روایت نہیں تھی۔" ساشا نے سرخ کی تصویر البم سے الگ کر کے ایک جانب رکھ دی مگر مسز انصاری نہ جانے کس دھیان میں تھیں۔ ان کی نظر بھی نہ پڑی۔

"خاندان میں شادی کرنے کی روایت اب ماضی کا قصہ بنتی جا رہی ہے۔ شاید بچے میڈیکل سائنس اتنا جان چکے ہیں کہ انہیں جین میں پلنے والی بیماریوں کا سبب معلوم ہو چکا ہے۔ میری بیٹی بھی خاندان میں شادی نہیں کرنا چاہتی جبکہ اس کے ماموں اور چچا کے ہاں ایک بہتر میچ موجود ہے۔ وہ مذاق ہی میں سہی مگر کہہ رہی تھی یہ میچ فکسنگ کی غلطی کبھی نہیں کرنی چاہیے خمیازے میں بے چارے بچے معذور ہو کر زندگی کی قید کاٹنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ میں بھی اسی خیال کی پروردہ ہوں۔"

"اچھا بھئی بریک ختم۔ اب آپ سمیٹیں تصویریں اور انہیں کام مکمل کرنے دیں۔" انصاری صاحب نے بیگم کو ٹوک دیا۔

"جی اچھا ویسے بھی میرا آلو گوشت تیار ہونے کو ہے اور عصر کی نماز بھی پڑھنی ہے۔" مسز انصاری یہ کہہ کر صحن میں آ گئیں۔ "کافی ذہین لڑکی ہے مگر یہ تھس میں پتا نہیں کیوں مار کھا جاتی ہے۔۔۔" انہوں نے دل ہی دل میں سوچا کہ "اس کی شادی کے لیے کوشش کرنی چاہیے اب بھلا لڑکی خود تو کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

انصاری صاحب نے انہیں نماز سے فارغ ہوتے دیکھا تو چائے کی ایک پیالی کی فرمائش کر دی۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد جب چائے کی ٹرے لے کر اندر گئیں تو تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ شاسا بجائے پڑھائی کے ان سے جوتا چھپائی اور دودھ پلوائی کی رسموں کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی تھی۔ پڑھائی کب ہو گی۔ دو گھنٹوں سے تو شادی کی مووی کو ری وائنڈ کر کے دیکھا جا رہا ہے۔ وہ ثاقب انصاری کی طبیعت سے خوب واقف تھیں۔ اچھے خاصے موڈی انسان تھے۔

شام رات میں ڈھلنے لگی تو دونوں میاں بیوی معمول کے مطابق کھانا کھا کے ٹہلنے نکلے۔ آج بھی وہ ریلوے اسٹیشن تک گئے۔ کچھ ہی دیر وہاں بیٹھے تھے کہ اچانک یاد آیا نہ گھر میں ماچس ہے نہ دودھ۔ دیر کی تو کہیں دکانیں نہ بند ہو جائیں۔ اس لیے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سارے راستے وہ دونوں چپ رہے۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز سہ پہر کو ساشا آئی تو اس کے ہاتھ میں پھولوں کا چھوٹا سا مگر بہت خوب صورت بوکے تھا۔

"آج میری سالگرہ ہے۔" "رسما" دونوں کی طرف سے سالگرہ مبارک کہا گیا۔ آج اس کا پڑھنے کا کوئی موڈ نہ تھا۔ مسز انصاری نے جھٹ پٹ کیک منگوایا اور ہلکی پھلکی باتیں شروع ہو گئیں۔ شادی کے جوڑوں کا ذکر ایک بار پھر نکل آیا تو وہ بولی۔

"اب تو میرون' سلور پیچ اور سی گرین ہر قسم کے رنگ فیشن میں ہیں۔ میری کزن نے حال ہی میں نیوی بلو کلر اور سلور کومبی نیشن سے عروسی جوڑا تیار کروایا۔ اس کے سسرال والے ہیروں کا سیٹ پہنانا چاہ رہے تھے ناں آنٹی!" ساشا نے زور دے کر بتایا۔

"ویسے آج کل کندن کے سیٹس بھی فیشن میں ان ہیں۔ لوگ بڑے چاؤ سے جڑاؤ زیورات بنا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ ایک لاکھ میں بڑے شاندار سیٹس مل رہے ہیں۔"

"ایک۔۔۔ ل۔۔۔ لاکھ۔" اس کی آواز گھٹ سی گئی۔ یہ دو حرف بڑی مشکل سے اس کے منہ سے نکلے۔

"سونا تو بیٹا! اس سے بھی مہنگا ہو چکا ہے۔ اب بڑی مشکل سے شادی کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ملازمت پیشہ اور خاص کر متوسط طبقے والوں کے لیے بڑی آزمائش کا دور ہے۔"

"وہ آنٹی! امی کہہ رہی تھیں۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ کل لے آؤں انہیں؟" وہ اسی طرح گرم جوشی سے بولتی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں' یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اچھا اب اپنی پڑھائی کرو' بہت ٹائم لے لیا میں نے۔" وہ جانے لگیں تو ایک اچٹتی سی نظر انصاری صاحب پر پڑی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں غصے کا اظہار کر رہے تھے۔

وہ چائے کے بکھرے ہوئے برتن سمیٹتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔ کیا کیک منگوا کر غلطی کی ہے کیا مجھے گرمجوشی سے سیلیبریٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر اس وقت تو وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے کچن میں آ کر بڑی دلچسپی سے ناشتے کی ٹرالی سجی دیکھی تھی۔ ہمارے گھر میں تنہائی کے علاوہ رہتا کون ہے۔ ایک یہی تو لڑکی آتی ہے جو ذرا ہنس بول کر دو گھنٹے گزار دیتی ہے اس کے بعد تو ہمیں عینی کے فون ہی کا انتظار رہتا ہے۔ اب یہ رخصت ہو گی تو پتا چلے گا۔ وہ معمول کے کاموں میں لگ گئیں۔

جاتے وقت وہ چپل گھسیٹتی ہوئی صحن میں آئی۔

"اچھا آنٹی! جا رہی ہوں بہت شکریہ آپ کی نوازش کا۔"

"ہم تمہیں اپنی بیٹی ہی سمجھتے ہیں۔" انہوں نے آگے بڑھ کر ساشا کا ماتھا چوما۔ وہ سلام کر کے روانہ ہو گئی۔۔۔۔ انصاری صاحب حسب معمول اپنے ایس ایم ایس دیکھنے لگے۔

☆ ☆ ☆

صحن میں چاول صاف کرتے ہوئے مسز انصاری کو خیال آیا کہ کیوں نہ کل جب ساشا کی امی آئیں تو وہ انہیں کھانے پر روک لیں۔ "مروتاً" انکار تو کریں گی لیکن اچھا نہیں لگتا یوں چائے اور ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد رخصت کر دینا۔ اسی بہانے وہ دانیال کے رشتے کی بات چھیڑ کے دیکھیں گی۔

دانیال ان کے دور پار کے رشتے داروں کا بیٹا تھا۔ اپنی ذاتی فرم قائم کر چکا تھا۔ پوش ایریا میں رہنے اور اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی اس گھرانے کی سوچ میں عاجزی، انکساری اور غریب پروری موجود تھی۔ ایسا فی زمانہ ہوتا کہاں ہے۔ دنیا مادہ پرستی کے جال میں الجھی ہوئی ہے لیکن دانیال کی امی ابو نے انصاری فیملی کو اس کے رشتے کے لیے کوشش کرنے کو کہا تھا۔

"پروفیسر صاحب کی کوئی شاگرد وہ دیکھ لیں بھابھی!" پچھلے ہی ہفتے دانیال کی امی صادقہ نے فون پر رائے دی تو ان کے ذہن میں ساشا اور اس کی بہنوں کا خیال آیا۔ اس کے بعد خاندان میں دو شادیوں کی مصروفیت آڑے آ گئی۔ اب ساشا نے امی کے ملنے کا خیال ظاہر کیا تو وہ ارادہ کر چکی تھیں کہ انہی کو دانیال کے والدین سے ملائیں گی۔ رات گئے جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو انہوں نے پروفیسر صاحب سے یہ ذکر چھیڑا۔ وہ اس وقت چائے پی رہے تھے۔ ایک دم پرچ پر پیالی جماتے ہوئے انہوں نے گھور کر بیوی کو دیکھا۔

"آپ کو کس نے کہا اس بکھیڑے میں پڑنے کے لیے۔ پرائے بچوں کی ذمہ داریاں کیسے لے سکتی ہیں آپ؟"

"دانیال اپنا ہی بچہ ہے۔ عینی اسے بھائی جان کہتی ہے اور وہ بھی بہنوں جیسا مان نبھاتا ہے، ورنہ میں اپنی بیٹی کی فکر پہلے کرتی۔ دوسرے ساشا کی فیملی بھی دیکھی بھالی ہے۔ اس کی بڑی بہن کے لیے پریشان رہتی ہیں اس کی امی۔"

"آپ کو پتا ہے منگنی ہو گئی ہے اس کی پچھلے ہفتے رہ گئی ساشا تو اس لڑکی کے دماغ بہت اونچے ہیں اور آپ کو کیا پڑی کہ سوشل ورک کریں۔" وہ جھلا سے گئے۔

"منگنی کا تو خیر مجھے پتا نہیں تھا اور لڑکیوں کے جتنے بھی اونچے دماغ ہوں، رشتہ والدین کو بھا جائے تو آپ ہی آپ سمجھ جاتی ہیں۔"

"بہر حال آپ کو یہ صلاح مشورہ دینے کی ضرورت نہیں۔" وہ اٹھے اور واش روم میں چلے گئے۔

انہوں نے بھی بحث کرنی ضروری نہیں سمجھی۔ وہ دوسرے واش روم میں عشاء کی نماز کے لیے وضو کرنے چلی گئیں مگر دماغ الجھ سا گیا تھا۔ کہاں تو اپنے ہر شاگرد کے بلا تخصیص جنس، نسل اور مذہب ہمدرد اور مشفق بزرگ کم دوست زیادہ مشہور تھے۔ کالج کے میگزین میں ان پر نظمیں اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ گھر تھا یا سماجی ادارہ یہ انہوں نے کبھی مختلف نہ جانا۔

"بیسیوں طلبا کو علم کی روشنی دینے والا طلسماتی کردار، ایک شجر سایہ دار کہ جس کی شاخیں زمین پر پھیلی اور جڑیں علم کے خزینے میں پیوست تھیں۔

ایک نظریہ، علم کی تہذیب اور ایک تاریخ ساز حقیقت، وہ فیصلہ نہیں کر پاتی تھیں کہ انصاری صاحب کی تلخ باتیں سن کر بھی ان سے ناراضی کیوں نہ ہوتی۔ مگر ساشا کے معاملے میں وہ انہیں لاتعلق رہنے کے لیے زور دے رہے تھے۔ انہوں نے سر جھٹک کے دھیان بدل دیا۔

☆ ☆ ☆

عینی کا آسٹریلیا سے فون آ گیا تو موڈ اور بھی اچھا ہو گیا۔ وہ سڈنی سے میلبورن جا رہی تھی۔ جس کے قصے اس کے ساتھی طلبا بہت سناتے تھے۔ وہاں کے نباتاتی باغ، پینٹن ٹائل، مختلف میوزیمز دیکھنے کا شوق پورا ہو گا۔ اس خیال سے وہ بہت خوش تھی۔

"امی! آپ بھی کچھ روز کے لیے یہاں آ جائیں۔ دیکھیں، یہ شہر بہت خوب صورت ہے۔ یہاں نہ دہشت گردی کا خطرہ ہے نہ لوٹ مار دنگا فساد ہوتا ہے۔ لوڈ شیڈنگ، سی این جی، ایل پی جی، پیٹرول کا کوئی بکھیڑا نہیں ہے۔ سب مطمئن ہو کر اپنا کام کرتے ہیں اور موسم بھی اچھا ہے۔۔۔" وہ تعریفیں کرتی جا رہی تھی۔

"مگر بیٹا! میں اور تمہارے ابو کانووکیشن پر ہی آ سکیں گے۔ اس سے پہلے ہمارا نکلنا مشکل ہے۔ اچھا بتاؤ، ماموں جان کے ہاں گئی تھیں؟"

"نہیں وہ آ گئے تھے۔ شاید بھائی نیویارک جا رہے ہیں، وہ ملنے آئے تھے۔ امی! انہوں نے مجھے بہت خوب صورت سی جیکٹ لے کر دی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا میں شکریہ کا فون کروں گی۔"

"نہیں میں نے شکریہ ادا کر دیا تھا۔" عینی نے فوراً جواب دیا۔

"اچھا میری بیٹی سمجھ دار ہو گئی ہے۔ ورنہ تم تو کہا کرتی تھیں، قریبی دوستوں اور عزیزوں کے درمیان شکریہ کا رشتہ نہیں ہوتا۔"

"جی۔۔۔ اب میں سمجھ گئی ہوں۔ شکریہ نہ کہنا بد اخلاقی میں شمار ہوتا ہے۔ لوگ دوستیاں ختم کر دیتے ہیں اور امی! میں دوستی ختم کرنا کم از کم پردیس میں افورڈ نہیں کر سکتی۔" عینی اپنی عمر سے بڑی بڑی باتیں کرنے لگی تھی۔

"دوستی کہیں بھی ختم کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ اچھا چلو اپنا خیال رکھنا۔ پیسوں کی ضرورت نہیں؟"

"امی! میں نے اپنی پرانی جیکٹ سیل کر دی۔ آپ کو پتا ہے مجھے یہاں لیدر گڈز کے آؤٹ لیٹ پر کام مل گیا ہے۔ اسی لیے تو میں میلبورن جا رہی ہوں۔ ہماری ایک برانچ وہاں بھی ہے۔ شکریہ ہے امی! مجھے انگریزی آتی ہے ورنہ میں خوار ہو جاتی یہاں۔"

"ہاں یہ فیصلہ تو اچھا ہی کیا ہم نے تاکہ اولاد پھل کھا سکے۔"

"شکر ہے امی! میری اسکولنگ بہت اچھی ہوئی۔ پاپا کہاں ہیں۔ میری بات کروا دیجیے۔" وہ بہت جلدی میں تھی۔

مسز انصاری نے فون انہیں تھما کر بیڈ کے سرہانے بیٹھنا چاہا تو انہوں نے اشارے سے انہیں رخصت ہونے کو کہا "کمال ہے بیٹی کا فون ہے۔ ایسی کیا بات کرنی ہے، جو میں چلی جاؤں۔" وہ چونکیں مگر کمرے سے باہر آ گئیں۔

یقیناً "اس بائیس سالہ زندگی کے تئیسویں برس لگنے تک ہم دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار نہ ہو سکا۔ شاید وہ قربت اور رفاقت کی کشمکش بھی نہیں اور شاید اسی لیے ہم جذباتی سطح پر بھی ایک ساتھ نہیں چل پا رہے۔ مگر مجھے یہ پریکٹس جاری رکھنی ہے۔ مسز انصاری نے اپنے آپ کو نیا حوصلہ دیا۔ زندگی کا ایک رنگ جذباتی بحران کا بھی ہوتا ہے۔ جس سے نکلنے کے لیے نہایت صبر آزما حالات کو جھیلنا پڑتا ہے۔

☆ ☆ ☆

رات کا کھانا دونوں نے خاموشی کے ساتھ کھایا۔ بیسنی روٹی کے ساتھ ٹماٹر کی چٹنی میں سرخ مرچیں مقدار میں کچھ زیادہ ہو جانے پر بھی وہ ناراض نہیں ہوئے۔ پہلے وہ سہمی ہوئی تھیں مگر جب انہیں چپ چاپ کھانا کھاتے دیکھا تو شکر کہہ کر خود بھی کھانے میں محو ہو گئیں۔

"آج عینی بہت خوش تھی۔ میلبورن جا رہی ہیں عینی اور فاطمہ۔" مسز انصاری نے کمرے کے سکوت کو توڑا۔

"ساشا اس کے لیے ایک گھڑی دے کر گئی ہے میں نے اسے بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔" انہوں نے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بتایا۔

"اچھا۔۔۔ ہمیں بھی دکھایئے۔"

"وہاں رکھی ہے پہلے کھانا کھالو ۔۔۔ میں کتاب پڑھنے میں ایسا مشغول ہوا کہ تمہیں پتا بھی نہ پایا۔"

کھانے کے بعد وہ چائے پیا کرتے تھے۔ جب وہ چائے لے کر کمرے میں گئیں تو انہوں نے خوب صورت پیکنگ والا ایک ڈبا انہیں تھما دیا۔

"یہ تو بڑی قیمتی معلوم ہوتی ہے۔" انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے پیکنگ کھولی۔

"تحفہ دینے والے کا خلوص دیکھنا چاہیے۔ برانڈڈ گھڑی ہے جنیوا کی۔" انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"مگر آج تو اس کی اپنی سالگرہ تھی ۔۔۔ میں تو کچھ لاتے لاتے رہ گئی۔ اسی لیے کیک منگوایا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا ۔۔۔"

"اب ایک احسان کرنا کل اسے شکریہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی اس کے والدین کے سامنے اس کا ذکر کرنا ۔۔۔ دے دیا تحفہ تو دے دیا۔ بچوں نے اپنی پاکٹ منی رکھی ہوئی ہے ان کاموں کے لیے اور ساشا کوئی عام لڑکی نہیں کہ جسے صرف اپنی ذات پر پیسہ خرچ کرنے کی دھن سمائی رہے۔"

"جی ۔۔۔ دل کی بڑی اچھی لڑکی ہے جب ہی تو میرے ذہن میں دانیال کے جوڑ کا خیال آیا تھا۔"

"ارے بھئی تم اب بھی اس چھچھورے لڑکے کے لیے پریشان ہو ۔۔۔ کوئی جوڑ نہیں ۔۔۔ اور پھر لڑکے کو لڑکیوں کی کیا کمی۔ ادھر یہ لوگ پتا نہیں کس طرح کا داماد سوچے ہوئے ہوں۔ نہ بن پائی تو سارا الزام ہمارے سر پر آجائے گا۔ نبھ گئی تو کہیں گے ہماری بیٹی کا مقدر بہت اچھا تھا اور تم کب سے مشاطہ بن گئیں۔ تمہیں غرض کیا ہے دانیال کے والدین سے؟"

وہ اپنا نقطہ نظر بیان کر چکے تو وہ دھیرے سے اٹھیں اور سونے کا لباس الماری سے نکال کر واش روم میں چلی گئیں۔ گھڑی وہیں سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھی۔

وہ صلح جو قسم کی عورت تھیں۔ جب پچھلے دو ایک دنوں میں وہ اپنا نقطہ نظر ظاہر کر چکے تھے تو اب ایک بار پھر پرانی بحث کو از سر نو چھیڑنے کا کوئی مطلب کہاں باقی رہ جاتا تھا۔ وہ عمر کے اس دور میں نہیں تھے جب میاں بیوی ایک ساتھ ایک کمرے اور ایک بستر کو مل بانٹ کے بڑے ولار سے رات گزارتے ہیں۔ انہوں نے شب خوابی کا لباس پہنا۔ دانت صاف کیے ایک بار پھر وضو کیا اور اپنے کمرے میں آکر پنکھا آن کیا۔ بستر جھاڑا۔ چادر نکالی اور بستر پر دراز ہو گئیں۔ آیت الکرسی' زبانی حفظ کردہ سورتیں اور کلمہ شریف جو جو یاد آتا رہا پڑھتی رہیں۔

"ٹھیک ہے ہماری بیٹی کو تحفہ دیا لیکن کیا میں آؤٹ سائیڈر ہوں جو مجھے اسی وقت نہیں دکھایا گیا۔"

گھوم پھر کے وہی خیالات اور اپنی کم مائیگی کا احساس ستانے لگا۔ پتا نہیں کتنی رات گئے تک برابر والے کمرے کی بتی جلتی رہی اور نہ جانے آنکھوں کے گوشے کتنی بار بھیگے۔ پھر انہیں نیند آگئی۔

وہ ذہنی طور پر تیار ہو کر سوتی تھیں کہ ایک آدھ گھنٹہ نیند لے کر تہجد کے لیے بیدار ہونا ہے۔ اس رات اتفاق سے انصاری صاحب کے بستر پر وہ چادر رکھنا بھول گئیں۔ اچانک رات ڈھائی بجے ان کی آنکھ کھلی۔ بہت زیادہ محبت کرنے والی بیویوں کو شوہروں کی بے آرامی اور تکلیف چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ گو کہ انصاری صاحب کو ناراض رہنے کی ایک عادت سی تھی مگر وہ سمجھتی تھیں کہ اندر سے بہت نرم دل اور اچھے انسان ہیں۔ اگر تلخ ہو بھی جاتے ہیں تو یہ شاگردوں کی نالائقی کا ردعمل ہوتا ہے۔

یہی انصاری صاحب ہیں' جو طویل سفر پر نکلتے تو سارا وقت ان کا ہاتھ تھامے رہتے خصوصاً" سڑک پار کرتے وقت تو وہ کبھی بھی انہیں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کے ساتھ کئی آسان سی راتیں اور آسان سے دن گزرے تھے۔ جیسے دن رات کے اصول ضابطے قدرت نے بنا دیے تھے۔ ان کے گھر گرہستی کے زاویے بھی اسی طرح تشکیل پا چکے تھے مثلاً" روزانہ بیڈ ٹی بنانی ہے۔ صاحب کو جگانا ہے۔ سردیوں میں ادرک کی چائے گرمیوں میں دودھ پتی یا کبھی کبھار جوشاندے والا قہوہ۔ تازہ پھول چن کر گلدان سجانا' انڈا

ابلنا وہ بھی اگر دیسی مرغی کا ہو' کپڑے استری کرنا اگر انصاری صاحب کا باہر جانے کا موڈ ہو۔ اگر وہ آرام کر رہے ہوں تو سبزی والے کی دستک سے پہلے دروازہ نیم وا کر کے اس کا انتظار کرنا کہ کہیں اس نے بیل پر انگلی جما دی تو انصاری صاحب ڈسٹرب ہو جائیں گے اور جینئس آدمی کا ڈسٹرب ہونا اچھا نہیں ہوتا۔

گھر میں کام کرنے والی آئے گی۔ وہ تکلفاً" صفائی کرے گی باقی سارا بکھرا گھر سمیٹنا مسز انصاری کا کام ہے۔ بازار کا سودا سلف' مہمان داری طلبا طالبات اور عزیز و اقارب سب ہی کو عمدہ معیار کی مہربانی کا ہنر پیش کرنا اس خاندان کا تمدن بن چکا تھا۔ اللہ نے اولاد میں صرف ایک بیٹی دی تھی جسے اسکالر شپ پر سڈنی جانے کا موقع ملا تھا۔

☼ ☼ ☼
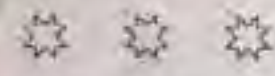
میلبورن میں مسز انصاری کے بھائی معظم انصاری بزنس کرتے تھے ان کا سڈنی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس لیے بھی عینی کے باہر جانے کا مسئلہ نہیں رہا۔ یوں بھی اس لاڈلی لڑکی کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا اور خود مختاری سے زندگی کے کچھ فیصلے کرنے کے لیے وقت دینا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ آسٹریلیا میں بزنس پڑھنے لگی اب ہر دوسرے تیسرے روز ای میل یا فون پر اپنے دن بھر کی روداد بتاتی تو ان کی تنہائی دور ہو جاتی تھی۔

مسز انصاری ہر روز رات کو لیپ ٹاپ آن کر کے بیٹھ جاتیں کہ شاید آج عینی اسکائپ استعمال کرے اور وہ اسے دیکھ سکیں بات کر سکیں لیکن شاید وہ بہت مصروف تھی۔ آج پھر اچانک ایک میسج کرنے کے بعد وہ اسکائپ پر آگئی۔ اس کا چہرہ آج اترا اترا سا لگا۔

"کیا ہو گیا کمزور سی کیوں لگ رہی ہو۔"

"امی! میری روم میٹ مسز جو بیمار ہے اور مجھے واش روم' کچن اور اپنا کمرا خود صاف کرنا پڑا اور وہ تین دن کے لیے اب ہانگ کانگ جا رہی ہے۔" وہ کہہ رہی تھی

"یہ تو ہوتا ہے کبھی کبھی ۔۔۔ یاد کرو میں نہ کہتی تھی کہ گھر کے کاموں میں دلچسپی لیا کرو۔ لڑکیاں کام کرتے ہوئے اچھی لگتی ہیں اور یہ تو ہلکی پھلکی سی ورزشیں ہیں ان سے کیا گھبرانا۔ تمہارا کیا خیال ہے پاکستان میں ہم ماسیوں پر کلی انحصار کر سکتے ہیں۔ میں تو روزانہ اس کے ساتھ لگتی ہوں۔ آخر میں پتا چلتا ہے کہ اسے تو آسانی نصیب ہو رہی ہے اور کھپ میں رہی ہوں۔"

"امی! آپ کو تو عادت ہے دعائیں لینے کی۔"

"بیٹا! دل لگا رہتا ہے۔ توجہ بھی بٹتی ہے اور کوئی بھی کام بدقسمتی مجبوری یا مصیبت سمجھ کر نہ کرو تو ۔۔۔"

"معاف کیجیے گا امی! قطع کلامی ہو رہی ہے یہاں تو روم میٹ اچھا ملنا قسمت والوں کی نشانی ہے۔ ہم ایسے خوش قسمت کہاں۔ اچھا پاپا کیسے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔"

"ان کے اسٹوڈنٹ چلے گئے ہیں اور اب وہ ٹیکسٹ میسجز میں فلسفے کی گتھیاں سلجھا رہے ہیں۔"

"ساشا آج کل بڑی مہربانیاں فرما رہی ہیں ۔۔۔ ہر صبح کو سلام کا میسج کر رہی ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں بھی اور سنا ہے انہوں نے میرے لیے گھڑی کا تحفہ بھیجا ہے۔"

"جی ۔۔۔ بڑی تابعدار اور ہونہار شاگرد ہے ۔۔۔ رونق سی لگا دیتی ہے ہمارے گھر آ کر ۔۔۔ تم کو کوریر کروا دوں گھڑی یا رکھی رہنے دوں' جیسا کہو۔"

"میرے پاس ہے ۔۔۔ بہت اچھی گھڑی۔ آپ پہن لیجیے اور ہاں ذرا خیال رکھیے مجھے تو بڑی شاطر سی لگی ہیں محترمہ ساشا۔"

"چھوڑو' ایسی کوئی بات نہیں چلو' یہ بتاؤ کیا پکایا ہے آج؟"

"ماش کی دال۔ آلو کے کباب اور ایک بن رکھا ہوا ہے جو میں لائی تو دو روز پہلے تھی مگر موسم اچھا ہے خراب نہیں ہوا' وہی کھالوں گی۔ امی! آپ جو دیسی مکھن کے ساتھ روٹیاں بناتی تھیں۔ لہسن اور ادرک کا تڑکا لگا کر ماش کی دال بناتی تھیں۔"

"اب نہیں چپڑی ہوئی روٹی بناتی اب تو سادہ سی

چپاتی بناتی ہوں۔ اب ہم کوئی بچے تو ہیں نہیں کہ جنہیں ایسی توانائیاں درکار ہوں۔ کولیسٹرول نہ بڑھ جائے۔ بلڈ پریشر نہ ہو جائے یہی دھڑکا لگا رہتا ہے مگر تم تو مکھن پنیر کھایا کرو۔"

"دو ماہ میں وطن لوٹوں تو ٹھیک ٹھاک وزن بڑھا کے آؤں اور پھر سلمنگ کلینکوں کا دورہ کرنا شروع کر دوں۔"

"اچھا یہاں تو رات کے ڈیڑھ بج رہے ہیں بیٹا! اب میں سونے جا رہی ہوں۔" یوں ہنستے ہنستے ان کی آج کی بات چیت اپنے اختتام کو پہنچی۔ اتنے میں انصاری صاحب کمرے میں آئے اور لیپ ٹاپ اٹھا کر چل دیے۔

وہ سونے کے لیے بستر جھاڑنے لگیں تو وہ بولے۔

"بیگم صاحبہ! کیا آج پھر صاحبزادی سے چیٹنگ کی ہے؟"

"جی!" وہ ہولے سے بولیں۔

"جب ہی تو چہرہ کھلا کھلا سا لگ رہا ہے۔ کیا چیز ہے اولاد کی محبت بھی..... اب مجھے عینی کے چلے جانے کے بعد اولاد کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے..... جی چاہتا ہے دوسری شادی کر لوں۔ کچھ تو زندگی کی تنہائی دور ہو۔"

وہ چلتے پھرتے ایسی باتیں کرتے تھے۔ شاید ان ہی باتوں کی وجہ سے مسز انصاری بجھی بجھی سی رہنے لگی تھیں۔ تنہائی تو ان کی بھی بڑھی تھی جب ہی تو وہ ساشا اور دوسری بچیوں سے التفات برتنے کی کوشش کرتی تھیں.....

وہ اس رات بھی بستر پر لیٹیں تو پچھلے کئی زمانے یاد آ گئے۔ پہلا مس کیرج، دوسرا، تیسرا اور چوتھی اولاد عینی اور پھر قدرت نے جیسے رحمت کی آنکھیں ہی موڑ لیں۔ سینے میں غبار اٹھتا رہا..... انصاری صاحب سمجھتے رہے کہ ان کی بیگم خود غرض ہیں۔ بہت سی باتیں اتنی بوجھل تھیاں، اتنے اداس رنگوں کی بارشیں وہ سب کی سب جھیل جاتی تھیں۔

"کوئی بات نہیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" نفرت کا رزق بننے والی اس ہستی نے ہمیشہ اپنے رب سے خیر کی دعا مانگی۔

☼ ☼ ☼

مسز انصاری کے والدین بھارت میں مقیم تھے مگر دس برسوں میں صرف ایک ماہ کے لیے وہاں گئیں۔ اس کے بعد سسرال والوں نے کھوکھلی معیشت کی ڈراؤنی سی تصویر دکھا کے سڑک اور ہوائی راستے بند کر دیے اور یہ سچ بھی تھا کہ بھرے پرے سسرال کی معیشت کو سہارا دینا ترجیحی بنیادوں کا کام تھا تب انہوں نے انصاری صاحب کے لیے دعا کی تھی۔

"یہ مجھ پر کبھی روشنیوں کے دروازے بند نہ کریں۔ میری چاہت کے آئینوں کو گرد آلود نہ ہونے دیں۔ میرے خواب ادھورے نہ رہنے دیں۔ میرے وجود کو کبھی شکستہ نہ ہونے دیں۔ بس کافی ہے اتنا ہی بہت ہے۔"

لیکن پتا چلا کہ نہیں..... بے شک آپ کے بچے مرتے رہے ہوں آپ نے ڈی این سی کی تکالیف برداشت کی ہوں..... جان سے گزر جانے کے عذاب جھیلے ہوں آپ ہی کو مورد الزام ٹھہرایا جائے گا۔

مسز انصاری اپنی خانگی زندگی دیکھ کر کبھی کسی کو لعن طعن نہیں کرتی تھیں حالانکہ قریبی عزیز خواتین کہا کرتی تھیں کہ یہ تو پتا نہیں کس مٹی سے بنی ہیں۔ دکھ دینے والوں کو بھی دعا دیتی ہیں۔ کتنی آندھیاں چلیں۔ اجالوں کے زندہ چراغوں کو جھٹلا میں کتنی ہی بارشوں کے موسم دھوپ کی نذر ہو جائیں وہ مسکراتی رہتی تھیں۔ پتا نہیں وشت میں سائبان کی خواہش کیسے پوری ہو سکتی تھی۔ بیتے ہوئے وقت کو لوٹایا نہیں جا سکتا تھا..... جو عمر بیت گئی اسے کیسے آواز دی جا سکتی تھی۔ افسوس تو اس بات کا تھا کہ انصاری صاحب کی سوچ اپنی بیگم کے ساتھ ساتھ بڑھی نہیں۔

ایک بار انہوں نے ہمت کر کے پوچھ لیا تھا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"مکمل مادی سہولتیں..... عام انسانوں کی طرح ایک گھر۔ پھولوں سے مہکتا آنگن اور کوئی چیز ادھوری نہیں چاہتا۔"

"لیکن انسان تو ادھورا ہے اسے تو مکمل ہونا بھی نہیں آتا۔"

"میں نہیں جانتا کہ ادھورا کر دینے والی ہستیاں نحوست لے کر میری ہی دنیا میں کیوں وارد ہو گئی ہیں۔"

"نحوست..... یہ کیا کہا آپ نے؟"

"وہی جو سنا تم نے..... نہ رہو تم تو شاید میں بھی ادھورا نہ رہوں۔"

☼ ☼ ☼

چند روز بعد نیا ادبی جریدہ آیا تو ان کی نظم شائع ہو چکی تھی۔

کوئی محبت اگر مکمل ہو پاتی
کوئی عشق اگر پورا سچا ہوتا
تو پھر کوئی عشق نہیں کرنے پاتا
تو پھر کوئی اور محبت نہ ہوتی
عشق میں اب تک ایک تسلسل قائم ہے
اور محبت پوری ہونا باقی ہے
اسی لیے میں باقی ہوں تم باقی ہو
اسی لیے میں آدھا ہوں تم آدھی ہو
ہم تکمیل کو ملتے ہیں تو جوڑ لگا رہ جاتا ہے
پھر دوری رہ جاتی ہے
اور پھر تکمیل نہیں ہوتی

انہوں نے نظم کو بار بار پڑھا..... لفظوں کی سنگینی سے ایسا لگا کہ شیشۂ دل شکستہ ہو گیا ہو حوصلوں کی اڑانیں گرفتار ہو گئیں۔ انصاری صاحب نے تو اپنی محبت کی تقدیر لکھی تھی مگر انہیں ایسا لگا کہ آنسوؤں کے خزاں رنگ بازار میں وہ بے قیمت ہی بک گئی ہیں۔

"ایسی عورتیں وقت کی ٹھوکر میں پڑی رہتی ہیں جو شوہروں کو آزادی نہیں دیتیں.....

آزادی..... ایک نئے عشق کی یا.....

"ہر بار جس مرد کے بستر سے اٹھتے ہوئے تمہیں ایک طعنہ ملے بیگم انصاری! تم اسی مرد کی جوتیاں سیدھی کرنے اور ہانڈیاں پکانے میں کیوں جتی رہتی ہو۔" وہ اپنے آپ سے سوال کر رہی تھیں۔

"ہر بار کتنے بدنام اندھیروں میں دھکیلتا ہے یہ شخص تمہیں اور ہر بار تم غسل خانے میں جا کر اپنی پرچھائیں کی پوشاک بدلتی ہو..... تم اسے آزاد کیوں نہیں کر دیتیں یا خود آزاد ہو جاؤ۔"

"تم کیا سمجھتی ہو تمہارا سانولا رنگ، تمہارا بوٹا سا یہ قد کسی گداز شام کی رنگت کا پیرہن ہے....."

ساشا جیت گئی اپنی مہتابی رنگت کے بل پر۔ اسے بزرگ پروفیسر سے خفیہ تعلق راس آ گیا اور تمہارا سڈول بدن سانولا سلونا بدن بازوؤں کی تھکن میں شکستہ انگڑائی سا بن گیا۔ تم کسی کی تھکن نہ اتار سکیں نہ اپنی نہ اپنے شوہر کی.....

"ساشا کا شادی نہ کرنا ہی میری غزلوں کو نیا پن اور لہجوں کو خوشبو دے سکتا ہے۔" ایک بار نہیں کئی مرتبہ وہ اپنی بے چرگی کا اعتراف کرتے۔

☼ ☼ ☼

آج اتفاق سے وہ ساشا کے گھر میں اس کے کمرے میں بیٹھی انصاری صاحب کی تصویر دیکھ رہی تھیں جو انہوں نے بڑے چاؤ سے ولیمہ کے اگلے روز کھنچوائی تھی۔ ساشا نے تصویر کا وہی حصہ کاٹا تھا جس میں مسز انصاری آسمانی رنگ کی کلیدائی ساڑھی پہنے کوئی دیو مالائی کردار دکھائی دے رہی تھیں۔

انہوں نے خاموشی سے تصویر دیکھی اور رسم دنیا نبھا کے گھر لوٹ آئیں۔

کسے پتا کہ ساشا جوڑ لگا کے بھی مہتابی امکانوں کو تصویر کرنے کی خواہش پوری کر سکے گی بھی یا نہیں؟

شاعر نے تو پہلے ہی کہہ دیا ہے۔

ہم تکمیل کو ملتے ہیں تو جوڑ لگا رہ جاتا ہے
پھر دوری رہ جاتی ہے
اور پھر تکمیل نہیں ہوتی.....!

☼
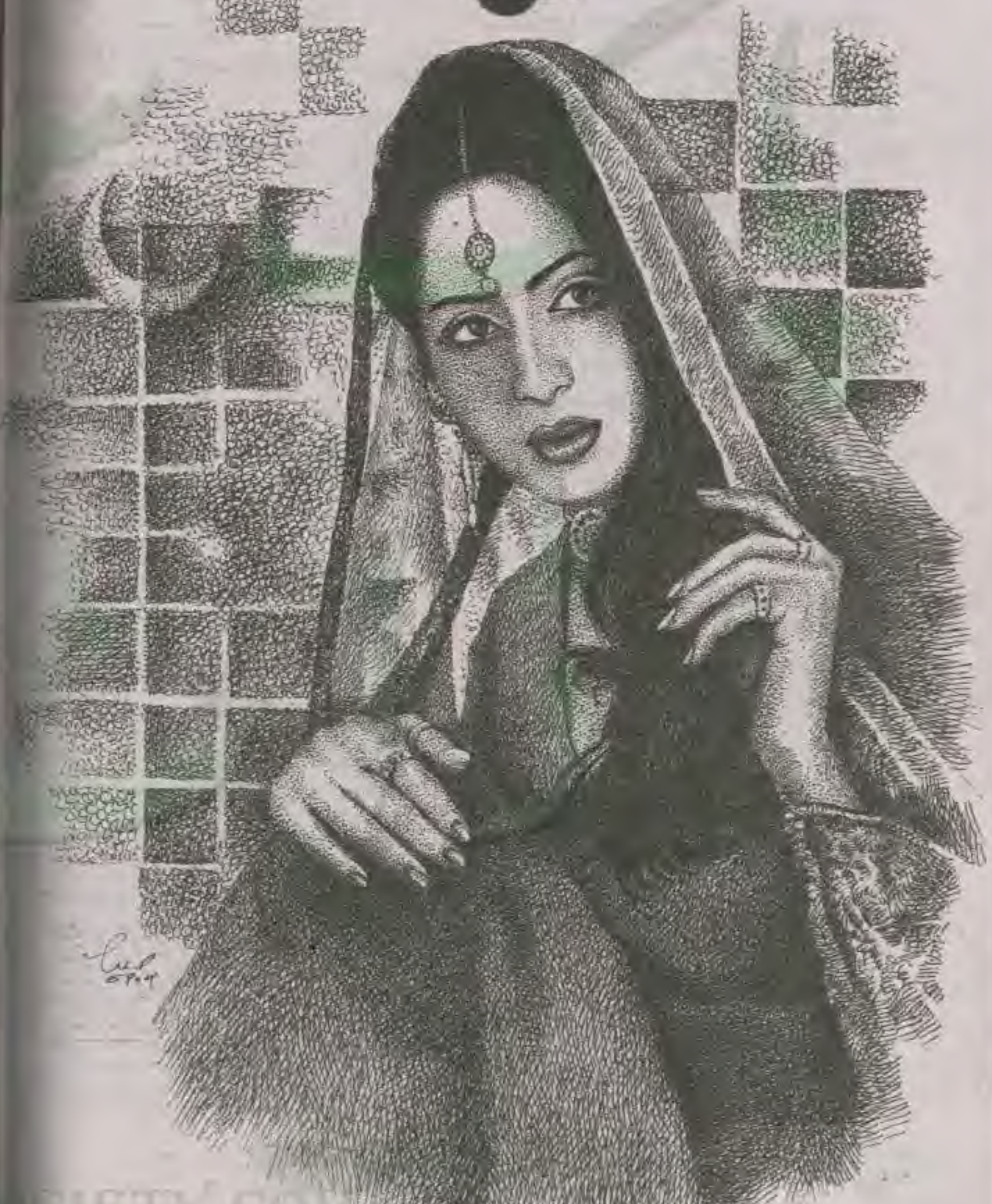
آج وہ بہت خوش تھے کیونکہ ان کی بڑی بیٹی عیشہ کی شادی کا دن تھا' خوش تو فریحہ رفیق بھی تھیں کہ انہوں نے آج پہلے فرض سے سبک دوش ہونے کی طرف قدم بڑھایا تھا مگر خوشی کے ساتھ ساتھ ان کا دل چھوٹا پڑ رہا تھا کیونکہ ان کے دونوں بیٹے باہر تھے اور بہن کی شادی میں نہیں آپا رہے تھے اور اس شادی کا انتظام انہیں تنہا کرنا پڑ رہا تھا' وہ تیار ہو رہی تھیں جب رفیق احمد کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح اپنی بیوی کے لیے ستائش ہی ستائش تھی' فریحہ رفیق انہیں دیکھ کر مسکرائی تھیں ــــ اور محبت سے تیار ہونے کا کہا تھا۔

"ہاں یار! شادی کے یہ کام ختم ہی نہیں ہو رہے دو گھنٹے سے تیار ہونے کا سوچ رہا ہوں لیکن لگتا ہے اسی طرح مسٹر جلول بن کر شامل ہونا پڑے گا۔"

"ارے ایسے نہ کریں عیشہ کیا سوچے گی۔ چلیں جائیں میں تیار ہوں باقی کام میں دیکھ لیتی ہوں۔"

رفیق احمد مسکرائے۔

"مجھے یقین ہے تم سب کچھ مجھ سے بہتر دیکھ سکتی ہو سنبھال سکتی ہو۔"

فریحہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جذب سے کہا "ہاں میں سب کچھ بہتر طور پر سنبھال سکتی ہوں لیکن یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ مجھے ہر گھڑی آپ کے ساتھ ہونے کا گمان رہتا ہے۔"

"واہ صرف گمان ــــ" رفیق احمد نے پیچھے سے انہیں کندھوں سے تھام لیا تھا "گمان نہیں میں واقعی تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔"

"اچھا بس آج کے لیے اتنا کافی ہے باقی پھر کبھی سہی۔"

رفیق احمد قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے "محبت کی اتنی ناقدری میں نے آج تک نہیں دیکھی۔"

وہ ہنستے ہنستے مڑیں اور ان کی آنکھیں ایک تصویر پر آ کر ٹھہر گئیں' ان کی ہنسی ایک دم سے جیسے کسی عفریت نے پی لی تھی' رفیق احمد کی نگاہیں بھی ان کی نظر کے زاویے کے ساتھ چلتے چلتے اس تصویر پر جا کر رک گئی تھیں یہ ایک شادی کی تصویر تھی' لیکن اس میں رفیق احمد کسی اور پری پیکر کے ساتھ کھڑے تھے۔

"کتنی بار کہا میں نے باقی چیزوں کی طرح اس تصویر کو بھی اسٹور روم میں رکھوا دو لیکن تم نے آج تک نہیں مانی میری یہ بات۔"

فریحہ رفیق مسکرانے لگی تھیں "یہ ایک حقیقت ہے اور حقیقتوں سے نظریں نہیں چرائی جا سکتیں مجھے اس تصویر سے کوئی الجھن ہے نہ ہی آئینے سے کوئی رخاش۔"

رفیق احمد کچھ بولے بغیر کپڑے لے کر واش روم میں چلے گئے تھے اور وہ خود باہر نکل آئی تھیں پھر انتظامات دیکھتے ہوئے وہ احکامات دے رہی تھیں جب کسی کی مضبوط بانہوں نے انہیں جکڑ لیا تھا۔

"ہائے بار بی ڈول کیسی ہیں آپ؟"

وہ یکدم ہنس پڑی تھیں لیکن ان کے چہرے پر پھیلنے والی خوشی دیدنی تھی۔

"تم دونوں کتنے جھوٹے ہو' ہارون۔"

"صرف میں نہیں زارون بھائی بھی کم نہیں ہیں' زارون فریحہ رفیق کے گلے سے جھول گیا "نہیں تو مام یہ جھوٹ نہیں تھا میں یا یہ ہرگز نہیں آسکتے تھے' لیکن یہ ہارون دی گریٹ' اموشنل کرنے کا اتنا ماہر ہے کہ اس نے دولت اور رشتوں میں سے کسی ایک کو چننے کی بات کی تو پھر مجھے ووٹ آپ کے اور عیشہ کے حق میں کاسٹ کرنا پڑا بہت سے کام پینڈنگ میں ڈال کر آئے ہیں ہم دونوں۔"

فریحہ رفیق مسکرانے لگیں دونوں میں سر مو فرق نہیں تھا' دونوں ٹوئنز تھے اور عادات و اطوار میں بھی ایک جیسے تھے پڑھنے کے لیے باہر گئے تھے مگر اب ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ساتھ مل کر رفیق احمد کے بزنس کو چار چاند لگا رہے تھے۔

ملازم ان کا سامان اٹھا کر اوپری منزل میں لے گئے اور شوخ شنگ سا زاروں رفیق پارٹی میں آنے والی لڑکیوں کی ڈریسنگ پر جملے کس رہا تھا یہ اس کی شروع کی عادت تھی جس پر کبھی کبھی فریحہ کہہ دیتیں کہ یہ بالکل اپنے بابا پر گیا ہے۔

زاروں ہمیشہ ایسے میں اپنے کالر اکڑاتا ہوا ایک ہی بات کہتا۔ پاپا جیسا ڈیشنگ ہونا میرے لیے قابل فخر بات ہے۔

اس نے کیمرہ مین سے موری کیمرہ لے لیا تھا اور صرف ایک لڑکی کی موری بنا رہا تھا' ہارون نے یہ بات فریحہ کو بتادی' تب ہی وہ سارے کام چھوڑ کر اس کے قریب آگئی تھیں۔

"حلیہ دیکھا ہے بالکل بھوت لگ رہے ہو۔"

"لڑکیاں اس بھوت پر ہی مرتی ہیں مام' اگر آپ کے حکم کا پاس نہ ہوتا کب کا دو چار گوریوں کو پٹا کر آپ کی بہو بنا چکا ہوتا۔"

وہ مسکرانے لگیں۔ "لڑکی ہے تو اچھی کہو تو تمہاری بات چلاؤں۔"

زاروں نے کانوں کو ہاتھ لگائے "مگر میری پسند کو اسی طرح اہمیت دیتی رہیں تو ایک وقت آئے گا اس گھر میں میرے اور آپ کے رہنے کی جگہ نہیں بچے گی' بہوؤں کا جمعہ بازار لگ جائے گا۔"

"ہاتھ ہولا میرے یار' کچھ میرا بھی خیال۔" ہارون کب نہا دھو کر نیچے آگیا تھا فریحہ کو پتا بھی نہیں چلا تھا۔

"یہ بچہ ہے بالکل میری طرح' ہر کام ذمہ داری اور وقت پر کرنے والا۔"

زاروں ماں کے گلے میں جھول گیا تھا "بس شروع سے آپ ہارون کو مجھ پر فوقیت دے کر مجھے جلا بھنا کر روسٹ کردیتی ہیں۔" لمحہ بھر رک کر شرارت سے بولا۔

"اگر مجھے پتا نہ ہوتا کہ آپ یہ مجھے جلانے کے لیے کہتی ہیں تو میں کب کا ہارون کو زہر دے کر مار چکا ہوتا۔"

فریحہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا انہوں نے زاروں کی بانہوں سے خود کو آزاد کروالیا اور غصے سے اسے دیکھا۔ "بولتے ہوئے سوچ سمجھ لیا کرو کہ کیا کہہ رہے ہو کیا نہیں۔"

زاروں کا چہرہ اتر گیا۔ "مذاق کر رہا تھا ——— آپ جانتی ہیں میں ہارون سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

مگر فریحہ جواب دیے بغیر اٹھ کر اپنے روم میں آگئی تھیں۔ وہ جس کرسی پر بیٹھی تھیں وہاں سے وہ تصویر صاف نظر آرہی تھی' جس میں رفیق احمد کسی اور پری پیکر کے ساتھ کھڑے تھے اور یہ شادی کے جوڑے میں کھنچی تصویر تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کاموں میں مصروف تھیں جب رفیق احمد ان کے قریب آئے تھے' کل انہوں نے اپنی زندگی کی بہترین شام منائی تھی اپنی شادی کی سالگرہ اور آج فریحہ تیزی سے ان کے سامنے سے گزر رہی تھیں جب رفیق احمد نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا "یوں مت کرو فریحہ! تم جانتی ہو میرے لیے تمہاری ناراضی کیا معنی رکھتی ہے۔"

فریحہ نے مڑ کر قاتل نظروں سے انہیں دیکھا پھر سرسراتے لہجے میں کہا۔ "محبت کا ذکر کرکے خود کو اور مجھے شرمندہ مت کریں' پہلے مجھے بھی لگتا تھا میں واقعی محبت کو پا چکی ہوں لیکن اب لگتا ہے میں تو آپ کی دہلیز دل کے باہر کھڑی ہوں۔"

"ایسا نہیں ہے' بخدا ایسا نہیں ہے' جو تم ہو میرے لیے وہ انیلا ہرگز نہیں ہوسکتی۔"

فریحہ نے طنز سے مسکرا کے انہیں دیکھا۔ "بالکل یہی لفظ اور یہ جملہ تم انیلا سے بھی کہتے ہوگے۔ میں جانتی ہوں اس ایموشنل بلیک میلنگ کو' میرے بھیا بھی عرصے سے یہی گیم کھیلتے آرہے ہیں اور وہ دونوں عورتیں اپنی اپنی جگہ خوش ہیں کہ جواد ناصر صرف اسی کا ہے اسی کی مٹھی میں قید ہے' لیکن آپ کو پتا ہے انہیں محبت صرف اس لڑکی سے تھی جو ان کے کالج کے زمانے میں ان کے ساتھ پڑھتی تھی جس کے

ساتھ جینے مرنے کے انہوں نے خواب دیکھے تھے' اتنے بڑے بڑے محبت بھرے خط لکھے تھے بلکہ اب بھی لکھتے ہیں اور جلا دیتے ہیں' اس لیے محبت کی بات مت کریں' مرد کے لیے یہ ایک ایسا دلفریب جھوٹ ہے جس کے لفظوں کی تاثیر آہستہ آہستہ کسی سحر جادو کی طرح اور بڑھتی جاتی ہے۔"

"فریحہ میں خود نہیں جانتا تم جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے میں نے اسے تم پر فوقیت کیوں دی؟"

فریحہ رفیق صوفے پر بیٹھ گئی تھیں "حیرت ہے آپ کو نہیں پتا' آپ نے اسے مجھ پر فوقیت کیوں دی؟" شاید آپ کل کی فون کال بھول گئے جس پر اس نے آپ کو اولاد کی گڈ نیوز دی تھی۔" رفیق احمد نے سر جھکا لیا تھا کچھ لمحے خاموش رہے تھے پھر اٹھ کر ان کے پاس آگئے تھے۔

"فریحہ! وہ ہمارے بچے ہوں گے' ہم دونوں مل کر ان کی پرورش کریں گے ہماری زندگی ایک مکمل زندگی لگتی ہے لیکن خاموش گھر اور تنہائی ڈیس دیتی ہے تم جس طرح ہنستے ہنستے چپ ہو جاتی ہو' کیا مجھے اس کا اندازہ نہیں ہے۔"

فریحہ نے دل میں سوچا "کیا کبھی رفیق احمد یہ سوچیں گے کہ اس حادثے کے بعد وہ ہنس بھی سکیں گی۔"

عورت سب کچھ برداشت کرسکتی ہے لیکن سوت نہیں اماں کہتی تھیں "سوت چون (چون ماننے پیتل کا برادہ جس سے بننے والی چیزیں انتہائی کمزور ہوتی ہیں) کی ہو تو وہ بھی بری لگتی ہے۔" مگر رفیق احمد مرد تھے اور مرد کی محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں' پھر بھائی بھی اس عمل سے گزر چکا تھا اس لیے وہ اور بھی اعتراض یا احتجاج کرنے کی حالت میں نہ تھیں۔ تیسری بات' جس نے ان کے منہ پر چپ لگادی تھی کہ میڈیکل رپورٹ کے مطابق وہ رفیق احمد کو ساری زندگی اولاد کی خوشی نہیں دے سکتی تھیں' اس لیے اگر رفیق احمد ان کی منتیں ترلے کر رہے تھے تو یہ ان کے کردار کی اہمیت کا اوج تھا۔

کمپرومائز کا یہ زہر انہیں پینا ہی پڑا تھا' پھر یوں ہوا رفیق احمد نے اوپر انیلا کو پورشن بنا کر دے دیا' خاص ملازمہ بھی رکھ دی پھر پتا نہیں کیا ہوا' نئے آنے والے بچے کی خوشی حسرت بننے کے بجائے ترنگ بن کر ان میں تیرنے لگی "ہم ان بچوں کو مل کر پالیں گے" یہ فقرہ کبھی کبھی ان کو مسکرانے پر مجبور کردیتا پھر جب انیلا نے دو بچوں کو جنم دیا تو خود بخود ایک کی ذمہ داری انہوں نے لے لی' یہ زاروں تھا' شور شرابا مچانے والا' پھر اگلے سال ہی عشنہ آگئی تو انیلا اور خود انہیں اپنی سدھ بدھ ہی نہ رہی انیلا کی صحت ایک دم سے گرگئی تھی رفیق احمد نے اولاد میں وقفہ کروالیا تھا لیکن یہ احتیاطی تدبیر بھی ان کے کسی کام نہ آئی جب بی پی ہائی رہنے کی وجہ سے انیلا کو پہلا اٹیک ہوا وہ اسپتال میں تھیں جب انیلا نے ان کا ہاتھ تھام کر دل گیری سے کہا تھا۔

"آپی! میرے بچے اللہ کے بعد آپ کے حوالے ہیں' آپ نے کبھی مجھے سوتاپے سے جلایا نہیں' جس طرح آپ نے رفیق احمد کو اپنے اور میرے درمیان بانٹا ہے' ایسا بہت کم عورتیں کرتی ہیں آپ ایک عظیم عورت ہیں اور مجھے اس بات کی خوشی ہے اگر میں مر بھی گئی تو بھی میرے بچوں کی پرورش ایک عظیم عورت کی گود میں ہوگی۔"

انہوں نے انیلا کے آنسو پونچھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا تھا "میں عظیم نہیں بس میں نے اس آزمائش کو دل سے قبول کیا تبھی یہ آزمائش بچوں کی قلقاریوں کی صورت میں سر اٹھنے سے محفوظ رہی ہیں۔"

یوں انیلا گھر آگئی لیکن فریحہ گھر کا بچوں کا خود خیال رکھتیں' انیلا میں عشنہ کی پیدائش پر کچھ پرابلمز بھی ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے وہ صرف بستری ہو کر رہ گئی تھی بچے ماں کے پاس بھاگے بھاگے آتے فریحہ کو بڑی امی' انیلا کو امی کہہ کر مخاطب کرتے' رفیق احمد خود بے قرار سے تھے اور اس وقت فریحہ کو احساس ہوا تھا انیلا جو رفیق احمد کے لیے ہے شاید وہ کبھی نہیں ہو سکتیں۔

رفیق احمد کی نیندیں اڑ گئی تھیں وہ اسموکنگ زیادہ

کرنے لگے تھے کام میں دھیان دیتے تھے نا خود پر، تبھی ایک رات انہوں نے رفیق احمد سے سوال کیا "اگر میں مرجاؤں تو کیا تب ۔۔ آپ اسی طرح میرا غم منائیں گے۔"

"کیا فضول بات ہے یہ؟" وہ غصے میں بستر سے اٹھ کر صوفے پر چلے گئے تھے اور پھر کمرے سے بھی باہر۔ فریحہ کے دریافت کرنے پر رفیق احمد نے یہ نہیں کہا فریحہ خدانہ کرے ایسا ہو، فریحہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا بلکہ موت کے نام پر انیلا سے بچھڑنے کا ڈر ان کی آنکھوں میں در آیا تھا تبھی وہ فوراً کمرے سے باہر چلے گئے تھے، محبت پل صراط ہے اس دھار پر محبت بھوگنے والے آدھے تن کے ساتھ منزل مراد کو پہنچتے ہیں اور پھر ساری عمر آدھے تن کی تلاش میں سرگرداں حیران و پریشان خود کو پوری دنیا میں ٹٹولتے ڈھونڈتے پھرتے ہیں مگر ایک گم ہو جانے والا حصہ پھر کبھی نہیں مل پاتا۔

اور آج ان کا یہی آدھا تن گم ہو گیا تھا انیلا کی دیکھ بھال بھی وہ اس لیے کرنے لگی تھیں تاکہ ان کا شوہر ان کی اس ریاضت کی قدر کرے، وہ عجیب طرح کی مظلومیت کے خول میں بند ہو گئی تھیں۔

اس دن انیلا کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی وہ اس کی دوائیں ڈھونڈ رہی تھیں، انہوں نے رفیق احمد کو اور ایمبولینس کو ایک ساتھ کال کرلی تھی اور انیلا کی اکھڑی سانسیں وہ گھبرا ہی گئی تھیں۔

"تم نے ٹیبلٹ ختم ہونے کا نہ مجھے بتایا نہ رفیق احمد کو؟"

انیلا ان کا ہاتھ پکڑے روئے جا رہی تھی پھر ایمبولینس اور رفیق احمد ایک ساتھ آئے انیلا کو ہسپتال لے جایا گیا مگر ہارٹ اٹیک بہت شدید تھا یوں محض 24 گھنٹوں میں انیلا نے دنیا کو خیرباد کہہ دیا تھا، رفیق احمد نے سب کام صبر سے کیے مگر رات کو میلے میں گم کسی بچے کی طرح ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹے تو آسمان زمین ایک کر کے روئے۔

"میں کیسے بھول گیا اتنی اہم بات اس نے لسٹ دی سب چیزیں لے آیا بس اس کی اتنی ضروری ٹیبلٹ بھول گیا میں اتنا غیر ذمہ دار کیسے ہو گیا۔"

وہ خاموش رہی تھیں اور پھر تینوں بچوں کی ذمہ داری ان کے سر آ گئی تھی اور انہوں نے رفیق احمد کے ساتھ اس ذمہ داری کو پورے دل سے نبھایا تھا اور آج اس ذمہ داری کی سب سے خوب صورت قسط کی ادائیگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اُفوہ تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں ڈھونڈ آیا، زارون کہہ رہا تھا تم اس کی کسی بات سے خفا ہو گئی ہو، باہر پریشان کھڑا ہے۔" رفیق احمد نے فریحہ کو سمیٹ لیا تھا اور اندر ہی اندر کوئی بات تھی جو انہیں رلا رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دو انیلا مجھے معاف کر دو۔"

ان کے سامنے ان کا ماضی ابھی تک کمرے میں سانس روکے کھڑا تھا۔ فریحہ اس منظر میں خود کھڑی تھیں انہوں نے لسٹ بنا کر رفیق احمد کے ہاتھ میں تھمائی تھی جو وہ ناشتے کی ٹیبل پر بھول آئے تھے۔

"تھینکس یہ سب بہت ضروری تھا، میں بہت غیر ذمہ دار ہوتا جا رہا ہوں۔" وہ مسکرائی تھیں۔

وہ انیلا کے لیے پرہیزی کھانا بنوا رہی تھیں یہ تیسرے دن کی دوپہر تھی جب انہوں نے انیلا کی آواز سنی تھی، فریحہ اتنا خیال کرنے لگی تھیں انیلا کا کہ رفیق احمد نے کل وقتی نرس کو ہٹا کر جزوقتی نرس رکھ لی تھی۔

اور اب انیلا کی چیخیں ۔۔۔ وہ اندر ۔۔۔ پریشانی سے انیلا کے تکیے کے نیچے درازوں میں ٹیبلٹ ڈھونڈ رہی تھیں۔

سین بدلا تھا، وہ واش روم میں آ گئی تھیں اور دراز میں سے اٹھائی دوا کی بوتل کو ٹوائلٹ میں بہا دیا تھا پانی کے ایک جھٹکے سے گولیاں غائب ہو گئی تھیں ان کے چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی، انیلا تکیے کے نیچے یہاں وہاں میڈیسن ڈھونڈ رہی تھی وہ جب کمرے میں واپس آئیں وہ چکرا کے گرنے والی تھی، انہوں نے اسے بیڈ پر بٹھایا تھا اور وہ بے قراری سے بولی تھی "آدھی بوتل تھی ابھی اسی لیے میں نے لسٹ میں وہ نہیں لکھی پتا نہیں کہاں گئی ہے۔"

"تم پریشان نہ ہو، میں پھر سے دیکھتی ہوں۔" انہوں نے پھر سے درازیں کھنگالنی شروع کر دی تھیں اور پھر خالی بوتل دیکھ کر انیلا کی اکھڑی سانسیں اور بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔

"میں بھاگ کر لے کر آجاتی ہوں دوا۔۔؟"

"نہیں آپی اس وقت مجھے بالکل اکیلا چھوڑ کر مت جائیں، کیمسٹ کی دکان کہیں قریب میں نہیں آدھے گھنٹے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"گھبراؤ مت۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا، میں نے رفیق اور ایمبولینس کو کال کر دی ہے جو بھی پہلے آ گیا تمہیں ہاسپٹل لے جائے گا۔"

انیلا نے سر تکیے پر مارا تھا بے قراری سے اور انہوں نے بے چارگی سے کہا تھا اگر مجھے گاڑی چلانی آتی تو میں خود تمہیں ہسپتال لے جاتی۔"

☆ ☆ ☆

"ماما ۔۔۔ سوری میرا مقصد وہ نہیں تھا آپ جانتی ہیں مجھے بھائی سے بالکل ویسی محبت ہے جیسے آپ کو میری ماما سے محبت تھی۔۔۔"

فریحہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں، رفیق دیوار سے ٹیک لگائے ترحم سے انہیں دیکھ رہے تھے زارون نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا مگر اندر کا سفر اتنا پیچیدہ تھا کہ انہیں یہ پتا ہی نہیں چلا کب رفیق کی بانہوں کا حصار ان کے گرد سے نکلا اور کب زارون ان کے قریب آ گیا تھا اور اب بھی وہ گم صُم بیٹھی تھیں، کوریڈور میں رفیق کی بڑی بہن کسی عورت کو بتا رہی تھیں۔

"بہت عظیم عورت ہے اس نے اپنی سوکن کے بچوں کو جس طرح اپنی ممتا دے کر پالا ہے کوئی اور عورت ہوتی تو کبھی ہاتھ نہ لگاتی۔"

اندر فریحہ، انیلا کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ "مجھے معاف کر دے انیلا مجھے معاف کر دے کاش مجھے بانٹنا آجاتا کاش میں نے جو صبر کیا تھا اس صبر کے راستے پر ڈگمگاتی نہ کھائی میں گرتی لوگ جب مجھے عظیم عورت کہتے ہیں تو میری روح پر یہ تمغہ چابک کی طرح لگتا ہے نیل و نیل کر جاتا ہے مجھے۔"

"اتنا کیوں رو رہی ہیں ماما۔۔۔" ہارون نے بھی ان کے گرد اپنی بانہیں پھیلا دی تھیں۔

"بیٹی رخصت کرنا کوئی آسان کام ہے۔۔۔" نند نے بھی ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تھی، بڑی ہونے کے باوجود ان کی عظمت کو سلام کیا تھا اور وہ خود اپنی روح کے گرد چکر کاٹ رہی تھیں۔

اور روح کا بس ایک ہی نعرہ تھا "معاف کر دے انیلا اللہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کے واسطے معاف کر دے مجھے، رفیق احمد صرف تیرے ہیں آج بھی کل بھی ہمیشہ میں نے تیرا حق ہمیشہ بچا کے رکھا ہے بس زندگی کی اس ریاضت کے عوض مجھے معاف کر دے۔"

رفیق احمد کی آنکھوں میں ان کا اور صرف ان کا عکس جھلملا رہا تھا لیکن فریحہ کو یہ جیت ہی اپنی سب سے بڑی شکست جیسی لگتی تھی۔

☆

سارا ادریس

رات سرد تھی بالکل میرے دل کی طرح! میرے خاموش ہوتے ہی کمرے میں روح تک اتر جانے والا سناٹا چھا گیا۔ وہ سناٹا میرے اندر اتر چکا تھا۔

آج میں نے اسے سب بتا ڈالا تھا اپنی ہر بات، اپنا ہر احساس۔ اپنے دل میں پکنے والے لاوے کو اگر میں آج بھی نکلنے کا رستہ نہ دیتا تو وہ میرے اندر ہی گر جاتا سب کچھ جلا ڈالتا..... بھسم کر دیتا!

"پھر کیا جواب دیا اس نے؟" میرے خاموش رہنے پر اس نے پوچھ لیا تھا۔

"جواب؟" میں کھوئے کھوئے لہجے میں بولا تھا۔

اس "جواب" کے الفاظ کی بازگشت میرے چاروں طرف ہونے لگی۔ اس آندھی کے جھکڑ پھر سے چلنے لگے جس سے میں گزر کر آیا تھا۔

اور پھر میں نے اسے وہ جواب بھی بتا دیا کہیں بھی رکے بغیر۔ کچھ بھی بھولے بغیر۔ ان الفاظ کو میں بھول بھی کیسے سکتا تھا؟ اس جواب نے تو میری محبت کی اوقات بتا دی تھی اس کی حیثیت جتلا دی تھی۔ ان الفاظ کی بازگشت تو اب تمام عمر میرے ساتھ رہنا تھی۔

"تم نے اسے کنوینس کرنے کی کوشش نہیں کی؟ ہو سکتا ہے وہ اپنا فیصلہ بدل دے۔ آج..... اس ملاقات

کے بعد؟"

اپنی بیوی کی اس بات پہ میرے دل نے ایک قہقہہ لگایا تھا۔ ایک استہزائیہ قہقہہ! ملیحہ ہمدانی کو جاننے والا کوئی شخص اس کے بارے میں ایسا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ لیکن وہ بھلا جانتی ہی کب تھی ملیحہ ہمدانی کو؟ وہ میری بیوی تھی، میری محبوبہ کے بارے میں کیسے جان سکتی تھی؟

"نہیں! وہ ایسا کچھ نہیں کرے گی۔" مجھے اپنی ہی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔ ضبط کرنا مشکل ہونے لگا تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے اپنے کندھے پہ اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔

"آئی ایم سوری۔" ایک مدھم آواز... میں بمشکل سن سکا۔ ایک ذرا سی ہمدردی ملنے کی دیر تھی، میری آنکھوں میں کب سے رکے آنسوؤں کے دو قطرے چھلک کر نیچے جا گرے۔ چند لمحات یونہی گزر گئے۔ اور پھر میں نے وہ ہاتھ کندھے سے ہٹتا ہوا محسوس کیا۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بہت عجلت میں کمبل کو خود پھیلانے کے بعد مخالف سمت میں کروٹ لے رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کرنے کے بعد اس نے کمبل کو سر تک اوڑھ لیا۔

"اور اب وہ چند ہی منٹوں میں سو جائے گی۔" میں نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے حسرت سے سوچا۔ یہ میرا غم تھا، مجھے ہی سہنا تھا۔ محبت میری لٹی تھی تو بے خوابی کو بھی تو میرا ہی مقدر بننا تھا۔

گزشتہ وہ دو سال جن میں مجھے زندگی نے دنیا بھر کی خوب صورتی دی۔ نہیں دی نہیں، صرف اس خوب صورتی کی ایک جھلک دکھائی۔ ایک خواب دکھایا اور جب وہ خواب میری پوری کائنات بن گیا تو اسے مجھ سے چھین لیا۔ مجھ سے زیادہ بدنصیب شخص بھی تھا دنیا میں؟

☼ ☼ ☼

آج سے ٹھیک دو سال پہلے میں لاہور کے لیے روانہ ہوا تھا۔ لاہور جانے کا یہ پہلا اتفاق نہیں تھا لیکن اتنا طویل قیام میں پہلی بار ہی کرنے والا تھا۔ اپنے شہر میں فیصل آباد انسٹیٹیوٹ آف فیشن ڈیزائننگ سے بی ایف اے کی ڈگری لینے کے بعد میں نے لاہور جانے کا مطالبہ پاپا کے سامنے رکھ دیا تھا۔ میرے پاپا حیدر علی اور میرے تایا صفدر علی مشترکہ طور پر فیصل آباد کی نامی گرامی ٹیکسٹائل ملز میں سے ایک کے مالک تھے۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مجھے بھی اس بزنس میں ان کا ہاتھ بٹانا تھا، مجھے خوب اچھی طرح معلوم تھا لیکن میں ابھی سے اپنی باگیں پاپا کے ہاتھ میں نہیں پکڑانا چاہتا تھا۔ اس روکھے پھیکے کاروباری مستقبل کو میں ذہنی طور پہ قبول کر چکا تھا اور مجھے اس سے کوئی انکار نہیں تھا لیکن اگر مزید دو سال اس سے دور رہنے کا ایک موقع مل سکتا تھا تو اس سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں ایم ایف اے کی ڈگری لینے کا بہانہ تلاش کر لیا تھا۔ اب یہ ڈگری مجھے فیصل آباد سے نہیں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے لینا تھی۔ اس سے نہ صرف میری ڈگری کی ویلیو بڑھ جاتی بلکہ گھر سے دور ایک نئے شہر میں مکمل آزادی سے رہنے کا ایک موقع بھی مل جاتا۔ ختم ہوتی آزادی کی آخری بہاریں اس کی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ!

پاپا کو میرے اس فیصلے سے کتنا بھی اختلاف ہوتا آخر کار ہار انہی کو ماننا تھی۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا۔ انکل صفدر کی موجودگی میں پاپا میرے ساتھ کوئی زبردستی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اے لیولز کے بعد اگر میں نے بی بی اے کے بجائے بی ایف اے کی فیلڈ کو اپنایا تھا تو یہ بھی انہی کی مہربانی تھی۔ پاپا مجھے ایم بی اے کروا کر مکمل طور پہ ایک بزنس مین کے روپ میں ڈھال لینا چاہتے تھے لیکن یہ میرے لیے ناممکن تھا۔ میتھیس کے سوال حل کرتے ہوئے مجھے ابکائی آنے لگتی تھی۔ ہندسے اپنی جگہ سے اٹھ کر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے اور سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا۔ میں چھوٹی چھوٹی جمع تفریق بھی بھولنے لگتا۔ میرا دماغ کبھی یہ بات قبول ہی نہ کر پایا تھا کہ انگریزی کے حروف جیسے ایکس اور وائے کو حسابی شکل میں لکھ کر ان کی کوئی قیمت بھی مقرر کی جا سکتی ہے۔

مجھے ہندسوں سے نہیں رنگوں سے پیار تھا۔ میں حسن پرست تھا۔ خوب صورتی مجھے ایک عجیب سے انداز میں اپنی طرف کھینچتی تھی۔ میں اس خوب صورتی کو صرف آنکھوں میں نہیں اتارنا چاہتا تھا بلکہ محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔ کیمرے سے فوکس کر کے نہیں، اپنے ہاتھوں سے بنا کے۔ میں اسکول ایج میں ہی بہت سی تصویریں بنا کر ڈھیروں داد بھی وصول کر چکا تھا حالانکہ ان میں پرفیکشن نہیں ہوتی تھی، پروفیشنلزم نہیں ہوتا تھا۔ مجھے ان دونوں چیزوں کی آرزو تھی۔ لان میں بیٹھ کر قدرت کے حسن کو سراہنا اور اسے اپنے کینوس پہ سمیٹنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

میرے دوست جو وقت کلبز اور سینماز میں گزارتے تھے میں اسے کھلی فضا میں گزارنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اس بات پہ میرا ان سے ہمیشہ اختلاف رہتا لیکن میں اپنا فارغ وقت کبھی بھی ان گھٹن زدہ مقامات پہ لٹانے پہ آمادہ نہ ہوا تھا۔ اعتماد کی کمی تھی یا کچھ اور میں اپنے کینوس کو کبھی گھر سے باہر نہیں لے کر گیا تھا۔

میرا دوسرا شوق کتابیں تھیں۔ اے لیولز کے بعد جب میں نے بیچلرز آف فائن آرٹس میں داخلہ لینے کی خواہش ظاہر کی تو پاپا بیٹھے سے اکھڑ گئے۔ میں اس قدر سخت ردعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے کچھ بوکھلا گیا۔ یہی بوکھلاہٹ مجھے انکل صفدر کے دروازے پہ لے گئی تھی جنہیں میں نے ہمیشہ پاپا کی نسبت خود سے زیادہ قریب پایا تھا۔

"فائن آرٹس؟" پاپا ہمیشہ اس لفظ کو خوب لمبا کھینچ کر بولتے۔

"آخر کون سا تیر مار لے گا یہ فائن آرٹس کی ڈگری لے کر؟" ان کی نظر میں تیر مارنا کسے کہتے تھے میں اچھی طرح جانتا تھا۔

"کیا بات کرتے ہو حیدر! تیر مارنا تو اب کسی بھی شعبے میں نہیں سکھایا جاتا۔" انکل صفدر نے حسب عادت ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ جانتے ہیں بھائی صاحب! میں اسے اپنے ساتھ بزنس میں لانا چاہتا ہوں مگر یہ پتا نہیں کہاں سے رنگوں کا شوق اٹھا لایا ہے۔" پاپا نے انکل کی بات کا اثر لیے بغیر کہا۔

"تو اس نے کب انکار کیا ہے تمہارے ساتھ بزنس میں آنے سے؟" انکل کی بات سن کر میں اپنی جگہ پہ کسمسایا تھا۔

"انکار ہی تو کیا ہے۔ مصوری سیکھ کر ہمارے ساتھ فیکٹری چلانے سے تو رہا۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں حیدر! ہم یہاں کوئی اسٹیل مل تو نہیں چلا رہے۔ کپڑا بناتے ہیں ہم کپڑا۔ اور تمہارا بیٹا ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں اسپیشلائز کر کے ہمارے کاروبار کو کہاں لے جا سکتا ہے تمہیں کوئی

اندازہ ہے؟"

اس نئی افتاد پہ میں نے سٹپٹا کر انکل کی طرف دیکھا۔ ٹیکسٹائل ڈیزائننگ تو میرے خوابوں میں کہیں بھی نہیں تھی۔ انکل صفدر نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور میں چپ ہی رہا تھا۔ مجھے ان پہ بھروسا تھا۔ اس کے بعد انکل نے کسی نہ کسی طرح پاپا کو راضی کر لیا۔ انکل صفدر کی معاملہ فہم طبیعت نے بڑی آسانی سے میرا مان بھی رکھ لیا تھا اور پاپا کو بھی رضامند کر لیا۔ میں جو ہمیشہ سے ان کا عقیدت مند رہا تھا اب احسان مند بھی ہو گیا تھا۔

لاہور آنے کے مطالبے پہ بھی اسی طرح کا ایک ہنگامہ میرا منتظر تھا لیکن اب کی بار اس کی شدت کافی کم تھی۔ یہاں بھی میرا ساتھ دینے والی واحد ہستی انکل صفدر ہی کی تھی۔

"دیکھ لیں بھائی صاحب! یہ بے جا فرمائشیں مان کر کہیں آپ اسے بگاڑ نہ دیں۔" پاپا نے مانتے مانتے آخری آواز اٹھائی تھی۔

"کیا بات کرتے ہو حیدر علی! اتنا پیارا بیٹا ہے ہمارا۔ بگڑنے کی عمر میں نہیں بگڑا تو اب ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اب تو ماشاء اللہ سمجھ دار ہو گیا ہے۔" انکل نے کہتے ہوئے اپنا بازو میری گردن کے گرد پھیلایا۔

"دیکھ لیں! اگر لاہور کی آب و ہوا نے اس کی بغاوت کو ہوا دے دی تو آپ یا میں کچھ نہیں کر پائیں گے۔ میرا تو ایک ہی بیٹا ہے۔" پاپا کے وہی اندیشے جو کسی حد تک صحیح بھی تھے۔

"تو پھر یہ بدقسمتی تو تمہاری اپنی پیدا کردہ ہے کیونکہ میرے تو تین بیٹے ہیں۔" انکل نے اپنے دو بیٹوں قمر اور اظہر کے ساتھ مجھے بھی شامل کیا۔ پاپا اس بات پہ شرمندہ سے ہو کر اپنے قول کا مداوا کرنے میں مصروف ہو گئے اور میں اپنی بات بنتی دیکھ کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

یونیورسٹی میں داخلے کے تمام مراحل سے لے کر پیکنگ تک کے تمام کام میں نے انتہائی جوش خروش سے انجام دیے۔ میری روانگی کے دن ماما بہت اداس تھیں۔ انکل صفدر کی تمام فیملی بھی ہمارے گھر موجود تھی۔ قمر بھائی، اظہر اور نرمین نے اپنے اپنے انداز میں مجھے اپنا خیال رکھنے کی تلقین کی تھی۔ تائی امی الگ میرے گرد دعاؤں کے حصار باندھنے میں مصروف تھیں۔ مجھے ان سب کے اس انداز پہ ہنسی آنے لگی۔ گویا میں لاہور نہیں امریکا جا رہا تھا۔ میں بچپن سے انہی محبتوں کا عادی تھا۔ اکلوتا ہونے کے باوجود میں نے کبھی بہن بھائیوں کی کمی محسوس نہیں کی تھی۔ انکل صفدر کا گھر ہمارے گھر کے بالکل ساتھ تھا اور پھر کاروبار بھی سانجھا ہونے کی وجہ سے ہم سب ایک ہی گھر کے افراد کی طرح رہتے تھے۔ دنیا میں بہت کم لوگوں کو ایسی محبتیں نصیب ہوتی ہیں لیکن اگر کبھی یہی محبتیں امتحان بن کر سامنے آ کھڑی ہوں تو کس حد تک مجبور اور لاچار کر سکتی ہیں ہمیں نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا!

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی میں پہلا دن میری توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ روکھا اور بے زار۔ تمام اساتذہ ہی عجیب آدم بے زار نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے دن کے چار لیکچرز میں سے صرف مس عائزہ نے اسٹوڈنٹس کو اپنا تعارف کروانے کا موقع دیا تھا۔ باقی تمام اساتذہ نے اپنے مضمون ہی کا تعارف کروانے کو ترجیح دی تھی۔ قدرے کم عمر سی مس عائزہ نے ہم سے نام اور سابقہ یونیورسٹی کے بارے میں تو پوچھا تھا لیکن اس کے لیے بھی کسی کو لیکٹرن پہ آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ نتیجتاً" میں جو پہلی رو میں بیٹھا تھا، صرف پہلی رو کے اسٹوڈنٹس کا ہی تعارف حاصل کر سکا۔ گردن موڑ کر پچھلی رو کے اسٹوڈنٹس کا تعارف سننا میری طبیعت نے گوارا نہیں کیا تھا۔ میں لیکچر ختم ہونے کے بعد بلڈنگ چھوڑ کر باہر گراؤنڈ میں نکل آیا۔ باہر لگے سنگی بینچز پہ نظر دوڑائی تو کچھ ہی فاصلے پہ ایک بینچ خالی بھی مل گیا۔ سرسبز درخت اور پرندوں کی چہچہاہٹ سے بھرپور فضا میری طبیعت پہ خوشگوار اثر ڈالنے میں ہمیشہ

کی طرح کامیاب ہو رہی تھی۔ انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے قدرت کی بولی ایک ہی رہتی ہے۔ میں بھی اپنی پرانی دوست کی آغوش میں آ بیٹھا تھا۔ میری قریب ہی گراؤنڈ کے مالی کا پائپ پڑا تھا۔ دل کھلا تھا اور اس کے گرد پانی جمع ہو رہا تھا۔ پرندے درختوں سے اڑ اڑ کر آتے اپنی پیاس بجھاتے اور ایک بار پھر سے پرواز کر جاتے۔ میں حسب عادت اس منظر میں کھو سا گیا۔ شاید ابھی کچھ دیر اور اس منظر میں گم رہتا مگر قریب سے آنے والی آواز نے میری محویت کو توڑ ڈالا تھا۔

"ہائے۔ کیا ہو رہا ہے؟"

کندھوں تک آنے والے سیاہ بالوں اور نکھرے رنگ پہ فرنچ کٹ والے چہرے کا مالک کامران مجھ سے ہی مخاطب تھا۔ وہ کلاس میں میری عین دائیں طرف موجود کرسی پہ براجمان تھا اور وقتاً "فوقتاً" اساتذہ کے بارے میں ریمارکس میرے کانوں میں سرگوشی کی صورت پہنچاتا رہا تھا۔ میں صرف مسکرانے پہ ہی اکتفا کرتا رہا تھا۔ کلاس میں تمام وقت میرا سر کھانے کے بعد اب وہ ایک بار پھر میرے سر پہ کھڑا تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ بس کھلی فضا میں سانس لینے بیٹھا ہوں۔" میں نے بمشکل مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ دوست بنانے میں میں ہمیشہ سے کنجوس رہا تھا۔ اسکول، کالج اور اس کے بعد یونیورسٹی، میرا کہیں بھی کوئی ایسا دوست نہیں رہا تھا جس سے میں مسلسل رابطہ رکھتا۔ انکل صفدر کے بچوں سے میری خاصی دوستی تھی، خاص کر اظہر سے۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ وہ میرا ہم عمر تھا اور مجھے یہ تعلق بنا بنایا ملا تھا کسی بھی خاص محنت کے بغیر۔ اظہر نے ایم بی اے کے بعد فیکٹری جوائن کر لی تھی اور اس کی وجہ سے ہی مجھے اکثر پاپا سے لیکچرز سننا پڑتے تھے لیکن اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ تعلیمی ادارے مختلف ہونے کے باوجود ہم ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کیا کرتے تھے۔

"ہاں بھئی! اندر کی "ڈبہ بند" فضا کے بعد تو یہ واقعی بہت ضروری تھا۔" وہ خوشگواریت سے کہتا ہوا مجھے حال میں واپس لے کر آیا۔

"ہاں، بالکل!" میں نے بے دلی سے اس کی تائید کرتے ہوئے اس بلا کے سر سے ٹل جانے کی دعا کی۔

"گھر جانے کا ارادہ نہیں کیا؟" اس نے اگلا سوال پوچھا۔

"نہیں میں ہاسٹل میں رہتا ہوں۔" میں نے ایک بار پھر مختصراً "بتایا۔

"ارے واہ! یہ تو کمال ہو گیا۔ چلو پھر باہر نکلو یہاں سے۔ کچھ کھا پی کر آتے ہیں۔" میرے ہاسٹل میں رہنے میں کیا کمال تھا جس پہ اسے اتنی خوشی ہوئی میں سمجھ نہیں پایا لیکن اس نئی افتاد پہ سخت جھنجھلایا۔

"نہیں اس وقت میرا موڈ نہیں ہو رہا۔ تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔" میں نے تمام لحاظ بالائے طاق رکھ کر جواب دے تو دیا مگر اس کے ساتھ ہی مجھے شرمندگی کے احساس نے آن گھیرا۔ عجیب بات تھی ابھی کچھ دیر پہلے میں اپنی بے زاری کی وجہ اس اجنبیت کو قرار دے رہا تھا اور اب اس دوستانہ پیشکش سے چھٹکارہ بھی چاہ رہا تھا۔

"اکیلا جا کر میں کیا کروں گا؟ ایسے ہی ٹھیک ہے!" اس نے برا سا منہ بنایا اور ٹانگ پہ ٹانگ دھر کر وہیں بینچ پہ بیٹھ گیا۔ وہ بھی ڈھیٹوں میں ڈھیٹ تھا!

"نرڈ آف دا کلاس" (کلاس کی جل پری)

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے پھر اس کی آواز سنی۔ میں نے اس کے نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ سامنے ہماری ہی کلاس کی ایک طالبہ بیٹھی تھی۔ اسے کلاس میں داخل ہوتے اور نکلتے تو دیکھ چکا تھا لیکن ابھی تک نام سے ناواقف تھا۔ آنکھوں پہ سیاہ فریم کے سادہ گلاسز لگائے، پہلو میں جہازی سائز کا ایک بیگ رکھے، سامنے کتاب کھولے، ہلکے نیلے رنگ کے بالکل سادہ کپڑوں میں ملبوس وہ دبلی پتلی سی لڑکی اپنے اردگرد موجود لوگوں سے مکمل طور پہ مختلف لگ رہی تھی۔ کامران ماتھے پہ تیوری چڑھائے یقیناً" اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے کالج آف آرٹس اینڈ

ڈیزائننگ میں اس قسم کے حلیے پہ آپ کو یہی خطاب دیا جا سکتا تھا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ کامران سے گفتگو کے دوران یہ میری پہلی مسکراہٹ تھی جس میں بناوٹ نہیں تھی۔

"کیوں کیا غلط کہہ رہا ہوں؟" کامران نے مجھے گھورا۔

"نہیں، بالکل بھی نہیں۔" مجھے قطعاً کوئی اختلاف نہیں تھا۔

"یار جسٹ لک ایٹ ہر بیگ! آج ہمارا پہلا دن ہے۔ پہلے دن آخر وہ اس میں کیا بھر کر لا سکتی ہے؟" کامران کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے بیگ میں جا کر جھانک آتا۔

"اس کا بیگ ہے، اس کو اٹھانا ہے تم خوامخواہ کیوں ہلکان ہو رہے ہو؟" میں نے اس کے ساتھ ساتھ خود کو تسلی دی۔

"نہیں خیر خوامخواہ تو ہلکان نہیں ہو رہا۔ کافی ٹھوس وجہ ہے پریشان ہونے کی۔"

"اور وہ کیا؟" آخر کامران کی باتوں میں کچھ دلچسپی کا عنصر نظر آنے لگا تھا۔

"تم نہیں جانتے کیا حالات ہو رہے ہیں آج کل لاہور کے؟ کیا معلوم خاتون کوئی دہشت گرد ہی ہوں۔ پہلا دن ہے بھلا کون جانتا ہے کسی کو؟ عین ممکن ہے اس جہازی سائز کے بیگ میں بارودی مواد ہی بھرا ہوا ہو جو کسی بھی لمحے ہمیں اڑا کر رکھ دے!" وہ آنکھیں پھیلا کر خود کو خوفزدہ ظاہر کرنے لگا۔

"چلو بھئی، اٹھو یہاں سے نکلیں۔ لوگ کیا کہیں گے ہمیں ایک پردیسی دوست کو اپنے شہر میں ایک دہشت گرد سے بھی نہ بچا سکا؟"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میرا بازو تھام کر مجھے بھی اٹھانے لگا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر وہ اسے "نڑو" کے بعد "دہشت گرد" کا خطاب دینے کے بعد مجھے اپنا خیر خواہ ثابت کر کے میرے ساتھ چل رہا تھا۔ کامران ان لوگوں میں سے تھا جو ہر طرح کے لوگوں کو خوش کرنے کا گر جانتے ہیں اور بڑی آسانی سے اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ اس بات کا قائل ہونے میں مجھے وقت لگا تھا لیکن میرا دوست ہونے کی حیثیت اس نے پہلے ہی دن منوالی تھی۔

☆ ☆ ☆
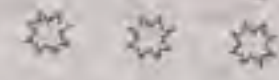
"اور آخری بات یہ کہ آپ کا یہ کام میں گروپ اسائنمنٹ کے طور پہ کلیکٹ کروں گی۔" اسائنمنٹ کی آؤٹ لائن دیتے ہوئے مس عائزہ کی اس بات پہ میں نے سٹپٹا کر سر اٹھایا۔ اوپر دیکھنے پہ اندازہ ہوا کہ اس بات پہ حیران ہونے والا میں واحد نہیں تھا۔ تقریباً پوری کلاس ہی پین چھوڑے، منہ کھولے مس عائزہ کی شکل دیکھ رہی تھی۔ مس عائزہ کے ساتھ یہ ہماری دوسری کلاس تھی جو وہ تین دن کے وقفے سے لے رہی تھیں۔ اس کلاس میں وہ ہمیں ایک لمبی چوڑی اسائنمنٹ بھی دے چکی تھیں اور اس پہ ستم یہ کہ یہ ایک گروپ اسائنمنٹ تھی۔ ابھی ہمیں یونیورسٹی میں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے اور ہم ایک دوسرے کے ناموں سے بھی مکمل طور پہ واقف نہیں ہو سکے تھے۔ کلاس میں دبی دبی سی احتجاجی آوازیں اٹھنا شروع ہو گئیں۔

"مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہے کہ آپ لوگ ابھی ایک دوسرے سے ناواقف ہیں۔" مس عائزہ نے کہنا شروع کیا۔

"لیکن یہی وہ وقت ہے جب آپ اس قسم کے تجربے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ پریکٹیکل لائف میں آپ کو ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ کسی کو آپ پسند کرتے ہیں اور کسی کو نہیں۔ آپ کا ہر کولیگ آپ کا دوست نہیں ہو سکتا۔ یہاں آپ کو ان لوگوں سے کام نکلوانا سیکھنا ہے جنہیں آپ نہیں جانتے اور شاید جو کچھ جان پاتے ہیں اسے پسند نہیں کرتے۔ آگے بڑھیے اور اس تجربے کو کامیاب بنائیے۔"

اس تقریر سے احتجاج کی آوازیں دم توڑ گئیں اور اسٹوڈنٹس اپنے گروپ فیلوز تلاش کرنے لگے۔

"گروپنگ کے سلسلے میں میں آپ کی مدد کر دیتی ہوں اور استاد ہونے کی حیثیت سے میرا خیال ہے میں تھوڑا سا فائدہ بھی اٹھا سکتی ہوں۔ سولہ اسٹوڈنٹس کی کلاس میں چار گروپ با آسانی بنائے جا سکتے ہیں ہر گروپ چار افراد پہ مشتمل ہو گا۔ میں آپ میں سے چار اسٹوڈنٹس کو یہاں بلاؤں گی تاکہ وہ باری باری اپنے گروپ فیلوز کو منتخب کر سکیں۔"

اس نئی پلاننگ نے کلاس کو کافی حد تک پرجوش کر دیا تھا۔ اس کے بعد مس عائزہ نے جن چار اسٹوڈنٹس کو بلایا ان میں اتفاق سے ایک میں بھی تھا۔ اب سامنے بلائے جانے والے طلبہ کو باری باری ایک ایک ساتھی منتخب کرنا تھا۔ میں نے اپنی پہلی باری پہ اپنی واحد پہچان کامران کو ہی پکارا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ باقی طلبہ اپنے اپنے ساتھیوں کو پکار رہے تھے۔

"اگلی باری پہ "دہشت گرد" کو بلوا لے۔" کامران نے حسب عادت میرے کان میں سرگوشی کی۔ ایک مسکراہٹ میرے ہونٹوں پہ رینگ گئی۔

"اور اگر اسے پہلے ہی کسی نے بلوا لیا تو؟" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"چل دیکھ لیتے ہیں! پر یہ یاد رکھنا نڑو سے اور کچھ ہو نہ ہو اسائنمنٹ تگڑی بنوائی جا سکتی ہے۔" اس نے پھر اس مختصر سے وقفے میں اسے دونوں خطابات سے نوازا۔ اتنے میں اگلا اسٹوڈنٹ منتخب کرنے کی میری باری آ چکی تھی۔ میں مستعد ہو کر کھڑا ہو گیا۔ مگر مجھے تو اس کا نام ہی نہیں معلوم تھا۔

"آپ... پلیز آپ آجائیں۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلانا چاہا۔ میرے اس اشارے پہ وہ تو نہ اٹھی البتہ اس کے عین پیچھے بیٹھا ایک باڈی بلڈر قسم کا لڑکا کھڑا ہو گیا۔

"نہیں، نہیں سوری، آپ نہیں میں ان سے کہہ رہا تھا۔" میں نے تصحیح کی۔ وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا واپس بیٹھ گیا مگر محترمہ دہشت گرد صاحبہ بھی ہنوز اپنی سیٹ پہ براجمان رہیں۔ اس ساری پس و پیش میں پوری کلاس کی نگاہیں مجھ پہ مرکوز ہو کر مجھے بوکھلانے لگی تھیں۔

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ جن کے پاس جہازی سائز کا بیگ ہے۔"

اس بوکھلاہٹ میں مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو یہی علامت زبان سے پھسل گئی۔ اس جملے نے جہاں پوری کلاس میں کھلکھلاہٹیں بکھیری تھیں، وہاں مجھ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہماری سمت آنے لگی لیکن میں اس سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہا۔ میں نے یقیناً پہلے ہی تعارف میں ایک برا تاثر چھوڑا تھا۔

"مجھے ملیحہ ہمدانی کہتے ہیں۔" میں نے اس آواز پہ سر اٹھایا۔ وہ بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔ یوں جیسے میرے دیے گئے لقب کو اس نے بھی پوری کلاس کے ساتھ انجوائے کیا تھا۔ مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی۔

کامران آنکھیں ٹیڑھی کر کے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ یہ ساری خفت مجھے اسی کی وجہ سے اٹھانی پڑی تھی۔

"آئی ایم سوری دراصل..." میں نے وضاحت کرنے کے لیے لب کھولے۔

"اٹس اوکے، میں سچ بات کا بالکل برا نہیں مانتی۔" وہ پھر مسکرائی۔

"مائی نیم از..."

"فصیح حیدر۔ رائٹ؟" وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

اس کے رد عمل نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت خوب صورت تھی۔ میں نے اعتراف کیا۔ ایسی مسکراہٹ جو لبوں سے زیادہ آنکھوں میں کھلتی تھی اور ان آنکھوں میں ایسی چمک پیدا کر دیتی کہ باقی ہر شے ماند پڑ جائے۔ آنکھوں کے سامنے لگا چشمہ بھی اس چمک کو دھندلا نہیں سکا تھا۔ یہ ملیحہ ہمدانی کی ذات سے منسلک پہلی خوب صورتی تھی جس سے میں اس روز واقف ہوا۔ اس کی ذات کا ہر پہلو خوب

صورت تھا۔ یہ جاننے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

جمعے کی شام کو میرا گھر جانے کا ارادہ تھا۔ میں کئی دن سے اس سامان کی لسٹ تیار کر رہا تھا جو مجھے ویک اینڈ پہ گھر سے لے کر آنا تھا لیکن اس روز صبح ہی سے طبیعت بوجھل محسوس ہونے لگی۔ میں نے اس بوجھل پن کے ساتھ سفر کرنا مناسب نہ سمجھا اور گھر جانے کا ارادہ اگلے دن تک کے لیے ملتوی کر دیا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہفتے کی شام تک میری طبیعت پہلے سے بھی زیادہ بگڑ گئی اور اتوار کی صبح تک میں بری طرح بخار میں پھنک رہا تھا۔ ہاسٹل کے کھانے میرا احساس معدہ سب برداشت نہیں کر پایا اور مجھے لے بیٹھا۔

اصل پریشانی مجھے اس وقت ہوئی جب پیر کی صبح تک بھی بخار کا زور نہ ٹوٹا۔ یونیورسٹی حاضر نہ ہونے پہ صبح ہی صبح کال کرنے والا کامران تھا۔ میری بیماری کی خبر سنتے ہی وہ پندرہ منٹ کے اندر میرے کمرے میں موجود تھا اور اب تک بے خبر رکھنے پہ میرے کان کھا رہا تھا۔ بہت مشکل سے اس نے میری معذرت قبول کی پھر اپنے ساتھ چیک اپ کروانے ہسپتال لے گیا۔ مجھے واپس ہاسٹل ڈراپ کرنے کے بعد بھی وہ اس وقت تک نہیں ٹلا تھا جب تک میں اس کے سامنے سینڈوچ کے بعد دودھ کے ساتھ دوا لے کر لیٹ نہیں گیا۔

اگلی صبح تک میری طبیعت کافی بہتر تھی۔ اس دوران کامران کئی بار ہاسٹل کا چکر لگا چکا تھا۔ میں مزید چھٹی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اسی نے مجھ پہ مزید ایک دن حاضر نہ ہونے کی پابندی عائد کر دی تھی۔ صرف ایک ہفتے کی شناسائی اور وہ میری یوں پروا کر رہا تھا جیسے بچپن سے ساتھ ہو۔ اتنا خلوص یقیناً خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے شاید وہ اثر ڈاکٹر کی دوا کا نہیں اس کی فکر مندی کا تھا جس سے میں اتنی جلدی صحت یاب ہو گیا تھا۔

شام کے وقت میں اگلے دن کی تیاری میں مصروف تھا جب میرا موبائل بجنے لگا۔ اس پہ کامران کا نمبر آ رہا تھا۔ وہ بیس منٹ پہلے تو میرے پاس ہی موجود تھا۔ میں نے قدرے حیران ہوتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"ہیلو یار! ذرا باہر آجاؤ۔" میرے ہیلو کے جواب میں اس نے فرمائش کی۔

"باہر؟" میں واقعی حیران ہوا۔

"ہاں ہاں! بلڈنگ سے باہر۔ میں یہاں گیٹ کے سامنے کھڑا ہوں۔"

"خیریت! تم وہاں کیا کر رہے ہو؟"

"تو یہ نخرے کرنا بند کر اور ایک منٹ کے اندر اندر باہر آ۔ تیری ملاقات آئی ہے۔"

اس نے غصے سے اتنا کہہ کر کھٹ سے فون بند کر دیا اور میں حیرانی کے عالم میں قدم باہر کی طرف بڑھانے لگا۔ پہلا قدم باہر رکھتے ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ ہاسٹل کے باہر بنے چھوٹے سے گراؤنڈ میں ملیحہ ہمدانی کامران کے ساتھ موجود تھی۔ میں نے خود پہ قابو پاتے ہوئے آگے بڑھ کر سلام کیا۔

"آپ دو دن سے یونیورسٹی نہیں آ رہے تھے۔ کامران سے پوچھنے پہ پتا چلا کہ کچھ بیمار ہیں تو میں نے سوچا عیادت کے لیے جانا چاہیے۔ آپ کو زحمت تو نہیں ہوئی؟"

ایک طرف دھری کرسیوں پہ بیٹھنے کے بعد وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی جبکہ میں ابھی تک اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لڑکی جس کے نام سے میں تین دن پہلے واقف ہوا تھا اس وقت ایک معمولی سے بخار کے آجانے پہ میری عیادت کرنے ہاسٹل تک آن پہنچی تھی۔ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

وہ کچھ دیر بیٹھی میرا حال احوال دریافت کرتی رہی۔ میں نے اسے یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ اس کا آنا میرے لیے کسی بھی طرح باعث زحمت نہیں بنا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں کامران کے عجیب و غریب اشارے اور مسکراہٹوں کو بھی نظر انداز کرتے کی

بھرپور کوشش کرتا رہا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا میں اچھی طرح جانتا تھا مگر اس وقت دل ہی دل میں اسے گالیاں دینے کے سوا کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔

یہ سب یہاں ختم نہیں ہوا تھا بلکہ جاتے جاتے وہ حیران ہونے کی ایک اور وجہ بھی چھوڑ گئی تھی۔ مجھے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے اس نے اپنا جہازی سائز بیگ کھول کر ایک لفافہ میری طرف بڑھایا۔

"یہ میں کچھ فروٹس لے کر آئی تھی۔ بیماری میں اس سے بہتر غذا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ زیادہ تو نہیں لائی کہ پھل ہمیشہ تازہ ہی اچھے لگتے ہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو کل پھر لیتی آؤں گی۔" میں انکار کرتا ہی رہ گیا لیکن وہ لفافہ میرے ہاتھ میں پکڑا کر چلی گئی۔ کامران جب تک اسے واپس یونیورسٹی کے گیٹ پہ چھوڑ کر آیا میں سکتے کے عالم میں وہیں بیٹھا تھا۔

"چل بیٹا! اب فٹافٹ اگل دے۔ کیا ماجرا ہے یہ سب؟" وہ میرے سر پہ کھڑا جواب طلب کر رہا تھا۔

"میں کیا اگل دوں؟ لے کر تو تم آئے تھے اسے۔" میں چلایا۔

"مگر دعوت نامہ تو میں نے نہیں دیا تھا۔"

"قسم لے لے اگر میں نے تیری غیر موجودگی میں اس سے ایک بار بھی بات کی ہو۔ اب اگر وہ میری مزاج پرسی کے لیے آ ہی گئی تو اس میں تمہارے جلنے سے کیا فائدہ؟ اگلی بار تم بیمار پڑ جانا میں خود اس کو لے کر تمہارے گھر آ جاؤں گا۔ پکا وعدہ!" میں نے اسے یقین دلایا۔

"اچھا تو اب اس بمعہ پھل حاضری کے لیے مجھے بیمار پڑنا ہو گا؟ چلو کوئی بات نہیں۔۔۔ سوچ لیتے ہیں اس بارے میں بھی۔" میرے مشورے پہ وہ کچھ مطمئن سا ہو کر واپس چلا گیا اور مجھے اپنے خیالوں میں گھرا چھوڑ گیا۔

اس رات میں بہت دیر تک ملیحہ ہمدانی کو سوچتا رہا تھا۔ آج اس نے مجھے دوسری بار حیران کیا تھا۔ میں چاہ کر بھی اپنے خیالات کو اس کی ذات سے ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ اس میں کچھ تو ایسا تھا جو مجھے پہلے کسی لڑکی میں نظر نہیں آیا تھا۔

اس حوالے سے اظہر کو میرے بارے میں بہت سے شبہات تھے۔ میں مصوری کا شوقین تھا اور شاعری کا دلدادہ۔ اظہر کے مطابق "رومانٹک" ہونے کے لیے یہی دو شوق کافی تھے۔ مصوری اور شاعری کا شوقین ہونے کے باوجود میرا دل آج تک کسی حسینہ پہ نہیں اٹکا تھا یہ بات اس کے لیے ناقابل ہضم تھی۔

"اچھا زیادہ نہ سہی کوئی ایک آدھ تو ہو گی؟" وہ جیسے مجھے اقبال جرم میں رعایت دیتا۔

"کوئی نہیں ہے میرے بھائی! کوئی نہیں ہے۔ جس دن ملی سب سے پہلے تمہیں ہی بتاؤں گا۔" میں اسے یقین دلاتا۔

"ارے جاؤ! بتانا ہوتا تو ابھی بتا دیتے۔ سب جانتا ہوں بہت گھنے ہو تم!" اس نے کبھی بھی میری بات پہ یقین نہیں کیا تھا لیکن تب ایسا کچھ تھا ہی نہیں تو میں اسے کیا بتاتا۔ ملیحہ ہمدانی سے پہلے تو میں نے کسی لڑکی کو اس قدر تسلسل سے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس میں ایسا کیا تھا جو میں اسے سوچے جا رہا تھا۔ اس کا بہت عام ہونا اسے ہر جگہ بہت خاص بنا تا تھا۔

ہاں! اس کی مسکراہٹ خوب صورت تھی۔ مگر میں اس کے ظاہر سے تو متاثر نہیں ہوا تھا۔ میں تو ملیحہ ہمدانی کے باطن سے متاثر ہوا تھا۔ وہ باطن جو تھوڑا تھوڑا کر کے مجھ پہ عیاں ہوتا رہا۔ اپنے ہر اظہار پہ مجھے پہلے سے زیادہ اسیر بناتا رہا اور جب میں مکمل طور پہ اس کی قید میں آ گیا تو میرے صیاد نے مجھے اپنانے سے ہی انکار کر دیا۔ مجھے اس قید خانے میں لاوارث چھوڑ دیا جس کی چابی صرف صیاد ہی کے پاس تھی۔ اس میں کوئی دانہ ڈال سکتا تھا نہ پانی' رہائی تو بہت دور کی بات تھی!

☼ ☼ ☼

پہلے سمسٹر کے اختتام تک میں چار افراد پہ مشتمل اس گروپ کا حصہ بن چکا تھا جس میں میرے علاوہ کامران' ملیحہ ہمدانی اور ندا رحمان شامل تھے۔ ہر وقت ٹک ٹک کے لیے تیار رہنے والی وہ تیکھی سی لڑکی ملیحہ کے توسط سے ہی ہمارے گروپ میں آئی تھی جبکہ ملیحہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کا فیصلہ میرا اور کامران کا مشترکہ تھا۔ اس کی ہاسٹل آمد نے میرے اور کامران کے دل میں جس غلط فہمی کو جنم دیا تھا وہ کچھ ہی دنوں میں دم توڑ گئی تھی۔ وہ اس کی طرف سے تعلق بڑھانے کی کوئی پیش رفت نہیں تھی بلکہ صرف ایک کار ہمدردی تھا جس کا مستحق اس کی نظر میں کوئی بھی بیمار شخص ٹھہر سکتا تھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد جب میں یونیورسٹی پہنچا تو اس نے ایک بار پھر میرا حال احوال دریافت کیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حفظان صحت کے اصولوں پہ ایک لمبا سا لیکچر بھی دیا تھا۔ اس لیکچر سے میری معلومات میں تو نہیں البتہ گردن کے سریے کی لمبائی میں گراں قدر اضافہ ہوا تھا۔ اس ساری کارروائی پہ کامران کا جلاپا عروج پہ تھا' جسے چھپانے کی اس نے قطعاً" کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ اس کے جلے کٹے جملے ہی تھے جو میرا دماغ ساتویں آسمان پہ پہنچانے میں معاون ثابت ہو رہے تھے۔ وہ دن میں نے واقعی ہواؤں میں گزارا تھا اور اس دوران میں اتنی بلندی پہ جا پہنچا تھا کہ واپسی کا سفر دو ہفتوں میں مکمل ہوا اور دو ہفتوں کے بعد میں صرف زمین پہ پہنچا نہیں تھا بلکہ بہت زور سے گرا تھا۔

وہ دوپہر ڈھلے کا وقت تھا۔ ڈپارٹمنٹ کافی حد تک خالی ہو چکا تھا لیکن ہمارا گروپ اپنی اسائنمنٹ پہ کام کرنے کے لیے وہیں کوریڈور میں جمع تھا۔ کوریڈور میں بہت کم لوگ ہونے کی وجہ سے ایک خاموشی کا عالم تھا۔ اسی خاموشی میں کسی کی ہیل کی آواز سنائی دینے لگی۔ "ٹک ٹک" کی اس آواز سے میں ہمیشہ سے خار کھاتا تھا اور اس وقت بھی اس نے میری ساری توجہ توڑ کر رکھ دی تھی۔ میں بے چینی سے اس نظر نہ آنے والے وجود کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں یہ وجود سامنے سیڑھیوں پہ نمودار ہوا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سامنے آنے والی لڑکی کا تین انچ کی ہیل والا جوتا ہاتھ میں پکڑی تین بائی چار فٹ کی پینٹنگ سے ٹکرایا تھا۔ ایک لمحے میں اس کا توازن بگڑا اور وہ ایک چیخ کے ساتھ نیچے گرنے لگی۔ یہ اس کی چیخ ہی تھی جس نے باقی افراد کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ سب لوگ بھاگتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ وہ بری طرح زخمی نظر آ رہی تھی۔ تین انچ کی ہیل کے ساتھ ایک لمبی چوڑی پینٹنگ پکڑ کر سیڑھیوں سے اترنے کی کوشش کا یہ نتیجہ کوئی زیادہ غیر متوقع بھی نہیں تھا لیکن اس وقت اس کی پیشانی سے تیزی سے نکلتا خون سب کو پریشان کر رہا تھا۔

"فصیح! ہیلپ لائن کو کال کرو جلدی سے!" ملیحہ چلائی تھی۔ وہ اس لڑکی کا سر تھپتھپا رہی تھی جو غالباً" بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں موبائل نکال کر کال ملانے لگا۔ کوریڈور میں موجود اکا دکا لوگ بھی جمع ہو چکے تھے۔

"کامران! تم پلیز میرا بیگ لا دو۔"

اس نے دوسرا جملہ قریب کھڑے کامران سے کہا۔ اس کے اس تقاضے نے چہروں پہ موجود پریشانی کو حیرت میں بدلا تھا۔ کامران بھی حیرانی سے اسے دیکھتا ہوا بیگ لینے چلا گیا۔ بیگ لیتے ہی اس نے اس میں سے ایک چھوٹی سی فرسٹ ایڈ کٹ برآمد کی۔ وہاں کھڑے سب لوگ دلچسپی سے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے جبکہ وہ بڑی مہارت سے اس لڑکی کو فرسٹ ایڈ دینے میں مصروف تھی۔ چند منٹوں میں ہیلپ لائن کا عملہ پہنچ گیا اور اسے اسٹریچر پہ ڈال کر ایمبولنس میں منتقل کیا جانے لگا۔ اس دوران ملیحہ تیزی سے اپنا بیگ سمیٹ رہی تھی۔ حیرت کا دھچکا مجھے اس وقت لگا جب میں نے اسے بھی ایمبولنس میں سوار ہوتے دیکھا۔ میں نے اس کی طرف قدم بڑھائے۔

"کیا تم اس لڑکی کو جانتی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں تو۔ کیوں کیا ہوا؟" اس نے جواباً" یوں سوال کیا جیسے میں اس کے بارے میں کوئی خفیہ معلومات رکھتا تھا۔

"تم ساتھ جا رہی ہو تو میں نے سوچا کہ شاید۔۔۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"وہ اسی ڈپارٹمنٹ کی ایک اسٹوڈنٹ ہے اور اس

وقت بری طرح زخمی ہے۔ انسانیت کے ناتے میں اس کے ساتھ جانے کو اپنا فرض سمجھتی ہوں۔" وہ خفگی سے کہتی ہوئی اندر بیٹھ گئی اور میں حیرت اور خفت کے ملے جلے اثرات کے ساتھ وہیں کھڑا رہ گیا۔

ابھی میں شاید کچھ دیر مزید وہیں کھڑے رہ کر اس سارے واقعے پہ سوچ بچار کرتا کہ پیچھے سے سنائی دینے والے قہقہے نے میرا ارتکاز توڑ دیا۔ کامران میری ہونق صورت کا ریکارڈ لگانے والا تھا۔ میں نے اس نئی صورت حال کے لیے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے خود کو تیار کیا۔

"کیوں بھئی ہمارے شہزادے کو کیا ہوا؟" اس نے میرے کندھے پہ ایک زور دار دھپ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کی بتیسی تمام کی تمام باہر تھی۔

"یار! یہ تو منہ اٹھا کر ساتھ ہی چلی گئی۔" میں نے برا سامنہ بناتے ہوئے بالآخر کہا۔

"وہ منہ اٹھا کر تیرے پاس بھی تو آئی تھی۔" کامران کی طرف سے دوبدو جواب آیا۔ چند ہی منٹوں کے اس واقعے نے ملیحہ ہمدانی کی ہاسٹل آمد کو بہت خاص سے بہت عام بات بنا دیا تھا۔ میرا دل کٹ کے رہ گیا۔

"یعنی یہ منہ اٹھا کر ہر جگہ ہی چلی جاتی ہے؟" کامران سے بھلا کب کوئی پردہ تھا؟ میں نے تسلیم کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

"ہاں وہ "مستحق" سمجھ کر ہر جگہ جاتی ہے اور لوگ خود کو نام کروز سمجھنے لگتے ہیں۔" اس نے پھر سے دانت نکوسے۔ اب مجھے کتنے عرصے تک اس مذاق کا نشانہ بننا تھا۔ یہ سوچ کر میں تلملا کر ہی رہ گیا۔ "حضور! اب آپ اپنی اوقات میں آجائیں۔ اسی میں بھلائی ہے۔"

اور میں واقعی اپنی اوقات پہ آگیا تھا۔ میری عیادت کے لیے اس کے ہاسٹل آنے سے اب تک میں اپنی ہر ممکنہ اچھی بات کے بارے میں سوچتا رہا تھا جس نے ملیحہ کو اپنی طرف کھینچا آج مجھ پہ عیاں ہوا تھا کہ وہ اچھی بات مجھ میں نہیں، ملیحہ ہمدانی میں تھی۔ وہ ایسا کیوں کرتی تھی میں نہیں جانتا تھا لیکن اس سے پہلے میں نے کسی کو دوسروں کے لیے یوں پریشان ہوتے نہیں دیکھا تھا، وہ بھی اس صورت میں جب آپ ان دوسروں کو جانتے تک نہ ہوں۔ ملیحہ صرف اس دن اس کے ساتھ نہیں گئی تھی بلکہ اگلے تین دن وہ اس کی عیادت کے لیے جاتی رہی تھی۔ اور میں روز نئے سرے سے ان خیالات اور قیاس آرائیوں پہ خود سے شرمندہ ہوتا رہا جو میں نے اس کے بارے میں کی تھیں۔ میں نے سچے دل سے اعتراف کیا تھا کہ ملیحہ ہمدانی کا دل بھی اس کی مسکراہٹ کی طرح خوب صورت تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ اور کامران نے یہ اعتراف ملیحہ ہمدانی کے سامنے اپنی زبان سے بھی کر دیا تھا۔ یہ ہماری دوستی کی شروعات تھی۔

☆ ☆ ☆

"ملیحہ! تمہارے پاس اسٹیپلر ہوگا؟" عدنان نے بڑی عجلت میں آکر اس سے پوچھا۔

"ہاں بالکل! ابھی دیتی ہوں۔ اور تم اسے پکڑنا ذرا۔" اس نے عدنان اور مجھے بیک وقت مخاطب کر کے اپنی گود میں بیٹھی بلی مجھے تھمائی اور اپنے بڑے سے بیگ میں سے اسٹیپلر ڈھونڈ کر اسے تھمایا۔

"اوہ تھینک یو سو مچ! میں بس ابھی واپس کر جاؤں گا۔" اسٹیپلر ہاتھ میں لیتے ہی عدنان بھاگتا ہوا واپس مڑ گیا۔

ملیحہ ہمدانی کا بیگ کوئی معمولی بیگ نہیں تھا بلکہ عمرو عیار کی کوئی زنبیل تھی۔ اس میں ضرورت کا ہر سامان ہمہ وقت موجود ہوتا تھا اور اس کی شہرت کلاس سے باہر بھی دور دور تک پھیل چکی تھی۔ اسٹیپلر، اسکیل، قینچی، پیپر پنز، ہیئر پنز، فرسٹ ایڈ باکس، گلو، ٹشو پیپرز کا پیکٹ اور نہ جانے کیا کیا اس کے بیگ میں بھرا تھا۔ کسی کو کیسی ہی انوکھی چیز کی ضرورت پڑتی، وہ سیدھا ملیحہ ہمدانی کے پاس ہی آتا اور ننانوے فیصد لوگوں کو اپنی مطلوبہ چیز اس کی زنبیل سے مل ہی جاتی تھی۔ اگر نہیں ملا تھا تو کامران کو اس میں سے بارودی مواد نہیں ملا تھا۔

عدنان کے جانے کے بعد اس نے بلی میرے

ہاتھوں سے واپس لے لی اور اس کی ٹانگ پہ مرہم لگانے لگی۔ اس روز اتفاق سے ندا اور کامران دونوں ہی چھٹی پہ تھے۔ آخری کلاس غیر متوقع طور پہ فری ہونے کا پیغام سن کر ہم گراؤنڈ میں چلے آئے۔ موسم خوشگوار تھا۔ ہم ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف تھے جب سامنے سے ایک زخمی بلی کو گزرتے دیکھا۔ اس کی ایک ٹانگ سے خون رس رہا تھا۔

"فصیح! تم اسے آگے سے پکڑو۔ اس کی بینڈیج کر دیتے ہیں۔ ایسے تو زخم خراب ہو جائے گا۔" اس نے کپڑے جھاڑتے ہوئے مجھے بھی اٹھنے کو کہا۔ ملیحہ نے بہت احتیاط سے اس کا زخم صاف کرنے کے بعد اس پہ مرہم لگایا تھا۔ مجھے اس بلی پہ رشک آرہا تھا۔ میں اس دوران کچھ بھی نہیں بولا تھا۔ صرف چپ چاپ اسے یہ سب کرتا دیکھتا رہا۔

"کیا ہوا ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" شاید یہ میری نظروں کا ارتکاز ہی تھا جس نے اس کی محویت کو توڑا تھا۔

"کچھ نہیں۔" میں دھیمے سے مسکرایا۔ میں ابھی تک اس سے متعلق اپنے احساسات کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ میں اسے پسند کرتا تھا، مجھے معلوم تھا لیکن اس پسندیدگی کی نوعیت کیا تھی میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی موجودگی مجھے جیسے کسی سحر میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ بولتی تو میرا دل چاہتا وہ ہمیشہ یونہی بولتی رہے اور میں سامع بنا رہوں۔ اس میں کچھ ایسا تھا جو مجھے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اپنے بارے میں اس کی رائے جاننے کا بھی شدید خواہش مند تھا۔

"زندگی میں بہت سے کام ہم بہت غیر معمولی خیال کرتے ہوئے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ جانے اور سوچے بغیر کہ کسی کی زندگی کا دارومدار اسی ایک چھوٹے سے کام پہ تھا۔" ملیحہ ہمدانی بہت دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔ اس کی نظریں اب بھی وہی نرمی لیے اس بلی پہ مرکوز تھیں۔ مگر شاید آج اس نے میری آنکھوں میں لکھی "تم یہ سب کیوں کرتی ہو؟" کی تحریر پڑھ لی تھی اور اب وہ اسی تحریر کا جواب دے رہی تھی۔

"مثلاً؟" میں نے اسے مزید بولنے پہ اکسایا۔

"مثلاً" اس بلی کی بینڈیج کرنے کا کام۔" اس نے اس بار مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا اور میں ہمیشہ کی طرح اس مسکراہٹ میں کھو سا گیا۔

"ہم میں سے کتنے لوگ ہوں گے جو ایک زخمی بلی کو دیکھ کر رک جائیں تاکہ اس کے زخم پہ مرہم لگا سکیں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ میں جانتا تھا یہ سوال نہیں تھا سو میں خاموش رہا۔

"شاید سو میں سے کوئی ایک۔" اس نے کچھ توقف سے خود ہی جواب دیا تھا۔ "میں نہیں جانتی اسے یہ زخم کیسے لگا لیکن ہو سکتا یہ زخم بڑھ کر اس کے پورے جسم پہ پھیل جاتا اور اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ ہو سکتا ہے چند دن تک یہ چلنے پھرنے سے مکمل طور پہ معذور ہو جاتی اور اسے بھوک سے مرنا پڑتا اور کیا معلوم یہ صبح اپنے بچوں کے لیے کھانا لینے نکلی ہو اور یہ حادثہ پیش آگیا ہو۔ ان بچوں کا اس کے بعد کیا ہوتا؟ ایک جاندار کی موت صرف اس کی موت تو نہیں ہوتی اس سے منسلک بہت سے جانداروں کی موت بن جایا کرتی ہے۔ بہت سی زندگیاں متاثر ہو جاتی ہیں۔ گھر اجڑ جاتے ہیں۔" بات کے اختتام تک اس کی آواز میں نمی گھلنے لگی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔ میں یکدم گھبرا گیا۔

"کیا ہوا ملیحہ؟" میں نے تشویش کے عالم میں پوچھا۔ ابھی کچھ ہی لمحے پہلے تو وہ مسکرا رہی تھی اور اب ایسی کون سی بات تھی، جس نے اسے اس قدر غمگین کر دیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چہرے پہ مسکراہٹ سجانے کی کوشش کی تھی۔

"تو رو کیوں رہی ہو؟"

"نہیں میں رو تو نہیں رہی۔" وہ ایک بار پھر سے مسکرائی لیکن اس کی مسکراہٹ آنکھوں تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی تھی۔ وہاں ابھی تک نمی چمک

رہی تھی۔ وہ اپنا غم مجھ سے نہیں کہنا چاہتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا۔ اس خیال سے میرے دل کو ٹھیس لگی تھی لیکن اس کی نم آنکھیں جو ٹھیس میرے دل کو لگا رہی تھیں وہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔

"اچھا چھوڑو یہ سب! آؤ یہاں سے باہر نکلیں۔" میں کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہیں پتا ہے تازہ تحقیق نے یہ بات ثابت کی ہے کہ اگر انسان زیادہ وقت تعلیمی اداروں کی اندرونی طرف گزارے تو اس کی صحت پہ ناقابل تلافی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔" میں نے کہتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے تھام کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ان منفی اثرات کے تحت بہت سی بیماریوں کے لاحق ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں جن میں ڈپریشن سرفہرست ہے۔ اور ڈپریشن کی ابتدائی علامات بھلا کس سے پوشیدہ ہیں؟ یونہی بات بات پہ پریشان ہونے لگنا۔ چھوٹی سی اونچ نیچ ہو جانے پہ خود پر سنجیدگی طاری کر لینا۔ ذرا ذرا سی بات پہ آنکھوں میں نمی اتر آنا۔ کسی کو۔" میں کامران کی کمی پوری کر رہا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ فصیح!" اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل پوری طاقت سے مجھے ماری تھی۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

ملیحہ ہمدانی کی وہی مسکراہٹ۔ جو لبوں سے زیادہ آنکھوں میں کھل رہی تھی۔ جو مجھے لمحہ بہ لمحہ اپنا اسیر بنا رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ آج یہ مسکراہٹ میری وجہ سے آئی تھی۔ اس احساس نے میرے دل کو ناقابل بیاں مسرت بخشی تھی۔

"یہ کہاں جا رہے ہو تم؟" اس نے میرے ساتھ یونیورسٹی کا گیٹ عبور کرتے ہوئے پوچھا۔

"انار کلی۔"

"وہ کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"میں نے وہاں ایک چیز ڈسکور (دریافت) کی ہے' چلو آج وہ تمہیں دکھاتا ہوں۔"

ہم پیدل چلتے ہوئے انار کلی کی مین سڑک تک پہنچ چکے تھے۔

"وہ سامنے۔" میرے کہنے پر اس نے رش سے بھرپور اسٹالز سے پیچھے بنی کسی خاص عمارت کو تلاش کرنا چاہا لیکن ایسا کچھ نہ پا کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"دو منٹ صبر نہیں کر سکتیں تم؟" میں اسے ڈانٹتے ہوئے برگر کے اسٹال پہ رکا اور اسے دو برگر کا آرڈر دیا۔ وہ اس دوران حیرت سے آنکھیں کھولے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"فصیح حیدر! تم نے یہ برگر دریافت کیا ہے؟" وہ چلائی۔

"نہیں میں نے اس برگر کا ذائقہ دریافت کیا ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور تم اس کے علاوہ کیا کیا دریافت کر چکے ہو؟" وہ ناراضی سے پوچھ رہی تھی۔

"آج تو یہ کھاؤ۔ اگر چاہو گی تو باقی بھی دکھاؤں گا۔"

"اس طرح کے اسٹالز سے اوٹ پٹانگ چیزیں کھاؤ گے تو ایک بار پھر بیمار پڑ جاؤ گے۔ اس بات کا اندازہ ہے تمہیں؟" وہ مجھے ڈانٹ رہی تھی۔ میں اس کے اس فکر مندانہ انداز پہ خوشی سے جھومنے لگتا۔ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ ہر دوسرے انسان کے لیے اسی طرح فکر مند رہتی تھی۔

"ملیحہ ہمدانی! میں تمہارے اس لیکچر پہ کسی فرصت کے لمحے میں غور کروں گا۔ اس وقت تو تم میرے ساتھ یہ برگر کھاؤ۔ خوب اسپائسی بنانا یار!" میں نے اسے کہتے ہوئے آخری ہدایت برگر والے کو دی۔ میری اس بات پہ اس نے صرف تاسف سے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ ہاتھوں میں برگر اور کولڈ ڈرنکس لے کر ہم واپس مڑ گئے تھے۔ برگر والے نے میری ہدایت پہ ضرورت سے زیادہ ہی عمل کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ملیحہ برگر کھاتے ہوئے مسلسل مجھ پہ چلا رہی تھی۔ اس کی چھوٹی سی ناک مکمل طور پہ سرخ ہو گئی تھی اور میں اس صورت حال سے خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔

"اب کہاں جا رہے ہو؟" واپسی پہ میں نے یونیورسٹی کی طرف جانے کے بجائے دوسری طرف

مڑنے کی کوشش کی تو اس نے سوال اٹھایا۔

"تمہیں ایک اور دریافت دکھانے لے جا رہا ہوں۔"

"نہ بابا نہ! مجھے باز ہی رکھو تم اپنی دریافتوں سے۔" وہ ایک جھٹکے سے واپس مڑ گئی۔

"ارے بات تو سنو! اب کوئی ایسی ویسی چیز نہیں ہے۔" میں تیزی سے اس کے پیچھے پلٹا۔

"نہیں! اب نہیں جانے والی میں کہیں بھی تمہارے ساتھ!"

"یار! کہہ رہا ہوں نا کوئی ایسی ویسی چیز نہیں ہے۔ تم اتنی سی بات نہیں مان سکتیں میری؟" میں نے اس کے پیچھے چلنے کے بجائے وہیں کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا۔

اس نے میری آواز پہ پلٹ کر میری آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کیا تھا؟ ایک ایسا تاثر جس سے میں اب تک ناواقف تھا۔ میں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ ناکام رہا تھا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر واپس پلٹ آئی۔ اسے پلٹتا دیکھ کر میرے چہرے پہ ایک جاندار مسکراہٹ ابھری تھی۔ اس لمحے میں اپنے ہی جذبات سمجھنے سے قاصر تھا۔ ملیحہ ہمدانی کا ساتھ مجھے عجیب سے احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ یہ احساس میرے لیے بالکل نیا تھا۔ سڑک پار کرتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ہاتھ کا لمس میرے دل میں نئی خواہشات کو جنم دے رہا تھا۔ اس ہاتھ کو کبھی نہ چھوڑنے کی خواہش۔۔۔ اس سڑک کے کبھی نہ ختم ہونے کی خواہش یا شاید وقت کو اس لمحے میں تھام لینے کی خواہش!

اس روز میری ایسی کوئی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی لیکن کچھ ایسا ضرور ہو گیا تھا جس کی خواہش بھی میں دل میں نہ لا سکتا تھا۔

ہم ناصر باغ چلے آئے۔ اپنے سابقہ رویے کے خلاف میرے ساتھ وہاں آنے تک وہ بالکل خاموش تھی۔ اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ کوئی اعتراض نہیں اٹھایا تھا۔ میں اس چھوٹے سے پارک میں بیسیوں بار آ چکا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح آج بھی میرا رخ اسی بڑے درخت کی طرف تھا جو ایک مخصوص شان کے ساتھ ایک طرف کھڑا تھا۔ کئی فٹ پہ محیط تنے والے اس درخت کی شاخیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میں اس کے پاس جا کر رک گیا۔

"میں نے جب سے اس درخت کو دیکھا ہے' اس سے پیار کرنے لگا ہوں۔"

میں نے اپنا بازو پھیلا کر جیسے کسی دوست کا تعارف کروایا۔

"امیزنگ!"

اس نے بھرپور انداز سے اس کی تعریف کی تھی۔ میں اس تعریف سے یوں کھل اٹھا تھا جیسے وہ اس درخت کی نہیں میری تعریف تھی۔ ہم بہت دیر تک اس درخت کے گرد گھومتے رہے تھے۔ ہر زاویے سے اس پہ غور کرتے اور تبصرہ کرتے رہے تھے۔ وہ میری ہی طرح قدرت کے حسن سے متاثر ہو کر اسے سراہ رہی تھی اور میں اسے ہمیشہ سے بڑھ کر اپنے قریب محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ہر دوسرے شخص کی طرح میرے شوق کو دیکھتے ہوئے مجھے "ورڈز ورتھ کا جانشین" کا خطاب نہیں دیا تھا کیونکہ شاید وہ بھی میری ہی قسم سے تعلق رکھتی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں یہ بات اتنی دیر سے کیوں پتا چلی' مجھے اس بات پہ حیرت کے ساتھ خود پہ غصہ آ رہا تھا۔

"میرا مقصد تمہیں تکلیف دینا نہیں تھا۔" میں نے اس کی آواز پہ چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ درخت کا معائنہ کرنے کے بعد ہم اس کے نیچے گھاس پہ بیٹھ چکے تھے۔ ہمارے درمیان چھا جانے والی خاموشی کو ملیحہ کے اس جملے نے توڑا تھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یونیورسٹی میں میرا بات کو بدل دینا تمہیں اچھا نہیں لگا تھا۔" وہ اپنے سامنے کسی غیر مرئی نقطے پہ نظریں جمائے ہوئی تھی۔

"تم سے کس نے کہا؟"

"تمہارے چہرے پہ لکھا تھا۔"

"تو تم چہرے بھی پڑھ لیتی ہو؟"

"سب کے نہیں۔" میں اس کی بات پہ ایک بار پھر چونکا تھا۔

"تو کیا میں اسے اعزاز سمجھوں؟" میرے سوال پہ اس نے ایک لمحے کو میری طرف مسکرا کر دیکھا تھا اور پھر سے نظریں سامنے جما لی تھیں۔ ہمارے درمیان پھر سے ایک خاموشی آن ٹھہری۔ مجھے وہ خاموشی بہت بے چین کر رہی تھی۔

"اسد مجھ سے دو سال بڑا تھا۔" اس خاموشی کو ایک بار پھر اسی نے توڑا۔

"میرا بھائی۔ میرا بیسٹ فرینڈ ہم ہر کھیل اکٹھے کھیلتے تھے۔ ہر شرارت ایک ساتھ کیا کرتے تھے۔ آپس میں ہونے والی مسلسل نوک جھونک کے باوجود ایک دوسرے کے بغیر ہمارا گزارا ناممکن تھا۔ ہمیں ٹام اینڈ جیری کا پاکستانی ورژن کہا جاتا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پہ کسی پرانی یاد کے رنگ بکھرے تھے۔ وہ دھیمے سے مسکرائی۔ میں خاموش رہا۔

"اسے ایئر فورس میں جانا تھا۔ پاکستان کے بہترین فائٹر پائلٹس میں شامل ہونا تھا۔ ممی نہیں مانتی تھیں۔ اسے فوج میں بھیجنے سے انہیں خوف آتا تھا لیکن اس کے شوق کے سامنے آخر کار انہیں بھی ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ وہ اس بات سے بہت خوش تھا۔ کئی سال لگے تھے اسے یہ بات انہیں سمجھانے میں۔ ایف ایس سی کے بعد اسے کمیشن ٹیسٹ دینا تھا اور اس سے آگے اس کے خوابوں کی دنیا تھی۔ پھر میں اور ممی کچھ دنوں کے لیے خالہ کے پاس کینیڈا چلے گئے۔ میں نے اس کے بغیر جانے پہ بہت شور مچایا تھا لیکن وہ اپنے امتحانات کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں جا سکا اور پھر ایک دن کالج سے واپسی پہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اسے معمولی خراشیں آئی تھیں مگر اس کے بعد اس کے سر میں درد رہنے لگا۔ اس نے یہ بات کسی کو بھی نہیں بتائی تھی۔ جب ہم تین ہفتے بعد پاکستان واپس آئے اس وقت تک اس کا درد شدت اختیار کر چکا تھا۔ ڈاکٹر نے تفصیلی چیک اپ کا مشورہ دیا اور تب پتا چلا کہ ایکسیڈنٹ نے اس کے دماغ کے اس حصے کو متاثر کیا تھا جس کا تعلق براہ راست نظر سے تھا۔ اگر بروقت علاج ہو جاتا تو اسے بچایا جا سکتا تھا لیکن اب کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اسد کو زیادہ سے زیادہ ایک سال کے عرصے تک مکمل طور پہ بلائنڈ ہو جانا تھا۔ وہ دن ہمارے لیے قیامت کا دن تھا۔ ہم سب رو رہے تھے۔ میں نے اس روز پاپا کو بھی آنسو چھپاتے دیکھا تھا لیکن اسد خاموش تھا۔ وہ نہ رویا تھا نہ کچھ بولا تھا۔ اس نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا تھا۔ میں اسے بہت دیر تک تسلیاں دیتی رہی، اسے جھنجھوڑتی رہی لیکن وہ ساکت رہا۔ خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھتا رہا۔ وہ اس کے بعد کبھی بھی نہیں بولا۔ اس نے اس رات اپنی دونوں کلائیاں کاٹ لی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی میرا نہیں سوچا تھا۔ کسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اگر اس سے ایک دن پہلے قیامت کا دن تھا تو وہ دن کیا تھا؟ میں کبھی سمجھ نہیں سکی۔ کبھی بھی نہیں۔" وہ خاموش ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"آئی ایم ایکسٹریملی سوری!"

میں اس کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ تمام الفاظ کھو گئے تھے۔ وہ ہر کسی کی چھوٹی سی تکلیف سے اس قدر پریشان کیوں ہو جاتی تھی' یہ بات میرے لیے اب کوئی معما نہیں رہی تھی لیکن آج اس نے مجھ سے اپنا دکھ بانٹا تھا۔ کیا وہ یہ سب مجھے محض ایک دوست ہونے کے ناطے بتا رہی تھی یا اس کے دل میں بھی میرے لیے کوئی خاص جگہ تھی؟ میں ایک نئی الجھن کا شکار ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے اکیسویں بار گھڑی کو دیکھا اور نظریں پھر سے دروازے پہ لگا دیں۔ سوا آٹھ بج چکے تھے اور ابھی تک ہمارے گروپ کا کوئی بھی فرد نہیں پہنچا تھا۔ آج ہمارے جونیئرز کی ویلکم پارٹی تھی۔ پروگرام آٹھ بجے کے مقررہ وقت کے مطابق شروع

ہو چکا تھا۔ میں آدھے گھنٹے سے پی سی کے اس ہال میں موجود تھا جبکہ باقی تینوں کا ابھی تک کوئی نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ندا جس طرح سے تیار ہوتی تھی۔ میں اس کے لیٹ ہونے کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ عموماً" کلاس میں بھی وقت کے بعد ہی پہنچا کرتی تھی لیکن کامران اور ملیحہ آج کہاں رہ گئے تھے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ آخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے جیب سے موبائل نکال کر کامران کو کال ملائی۔

"کہاں مر گئے ہو؟" میں نے اس کے ہیلو کے جواب میں پوچھا۔

"ارے ایسے کیوں چلا رہے ہو؟ ابھی تک "وہ" نہیں پہنچیں کیا؟" ملیحہ کے لیے میری پسندیدگی اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی اور وہ مجھے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں' کہاں ہو ابھی تک؟" میں نے اس کا سوال نظر انداز کر کے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"اوہ..... یعنی وہ واقعی نہیں پہنچیں۔" اس نے جواباً" میرا سوال نظر انداز کیا۔ میں نے اس پہ لعنت بھیجتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اسی لمحے میں نے ندا کو ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے عین پیچھے ملیحہ بھی داخل ہو رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔ ہلکے سے کام والی گرے شرٹ کے ساتھ بلیک ٹراؤزرز میں آج وہ پہلی بار میک اپ کیے ہوئے تھی۔ وہ ہمیشہ سے بڑھ کر حسین لگ رہی تھی۔ میں ابھی اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اس سے دیر سے آنے کی وجہ بھی نہ پوچھ پایا تھا' جب کامران اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میرا سر پیٹنے کو دل چاہا۔ اس کے دیر سے آنے کی وجہ اس کے حلیے سے خود بول رہی تھی۔ اپنے اچھے خاصے لمبے بالوں کو وہ پورے سر پہ اسپائکس کی صورت کھڑے کیے وہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

"کامران! تم ٹھیک تو ہو نا؟" ملیحہ نے اسے دیکھتے ہی فکر مندی طاری کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے حیرت سے پہلے ملیحہ اور پھر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کرنٹ زیادہ تو نہیں لگا؟" وہ اس کے بالوں کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ میں نے اس کے اس سوال پہ بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"او جاؤ یار! میں تین گھنٹے لگا کر ہیر اسٹائل بنوا کر آیا ہوں اور تم اتنے برے الفاظ میں بول رہی ہو۔" وہ خفا ہوا۔

"اچھا؟ مجھے کیسے پتا چلتا۔ میں نے تو جب بھی کارٹونز میں کسی کو کرنٹ لگتے دیکھا ہے' ان کے بال ایسے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں۔" اس نے معصومیت سے توجیہہ پیش کی۔

"اچھا تو تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میں ایک کارٹون ہوں اور اس وقت کسی الیکٹرک شاک سے اس حالت کا شکار ہوا ہوں؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"دیکھنے میں تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

"ٹھیک! اگر تم اگلے تین دن بمعہ پھل میری عیادت کے لیے آنے کا وعدہ کرتی ہو تو مجھے منظور ہے۔" وہ واقعی اپنے نام کا ایک تھا۔ میں نے دل سے اعتراف کیا۔

"میرا خیال ہے پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب ہمیں بیٹھ جانا چاہیے۔" ندا کے توجہ دلانے پہ ہم اپنی سیٹوں کی طرف بڑھ گئے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے تک رسمی پروگرام جاری رہا جس کے ختم ہونے پر اساتذہ ہال سے جا چکے تھے۔ اس وقت ہال میں فل والیوم میں بے ہنگم انگلش میوزک چل رہا تھا جس پہ اسٹوڈنٹس میوزک سے بھی کہیں بے ہنگم طریقے سے رقص کر رہے تھے۔ کامران بھی اسٹیج پر ہی موجود تھا اور اپنے "فن" کا بھرپور مظاہرہ کرنے پہ تلا ہوا تھا۔ ندا کو کسی کام سے جانا تھا اس لیے وہ پروگرام ختم ہوتے ہی وہاں سے جا چکی تھی۔ اسی بے زاری کے عالم میں میں نے ملیحہ کو اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر جاتے دیکھا۔ شاید وہ بھی اس ماحول سے اکتا گئی تھی۔ میں بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔ ہال سے

باہر نکلتے ہی وہ مجھے سامنے نظر آگئی تھی۔ ایک ستون سے ٹیک لگائے وہ ہوٹل کے لان کی طرف رخ کیے کھڑی تھی۔ میں آہستگی سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ معمولی سی سج دھج نے اس کو بے حد حسین بنا دیا تھا۔ میں ایک بار پھر سے اس کے سراپے میں کھو سا گیا۔ آج اس کا چشمہ وہ نہیں تھا جو وہ عام دنوں میں استعمال کیا کرتی تھی۔ نازک سے سیاہ فریم کی اطراف میں چھوٹے چھوٹے نگینے وہاں کی روشنیوں میں جگمگا رہے تھے۔ کانوں میں پہنے لمبے ایر رنگز اس کے کندھوں تک آرہے تھے۔ اس نے بالوں کو ایک اونچے سے جوڑے کی صورت میں لپیٹ رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی لمبی گردن اور اس کے ساتھ جھومتے ہوئے ایر رنگز اور بھی نمایاں ہوگئے تھے۔ اس وقت وہاں کھڑی ملیحہ ہمدانی مجھے کسی میوزیم میں رکھے گئے مجسّمے کی مانند لگی تھی جس کے خالق نے اسے پرفیکشن کی حد تک خوب صورت بنا دیا ہو۔ میں اپنے گردوپیش سے بے نیاز کتنی لمحے اسی محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ شاید یہ میری نظروں کا ارتکاز ہی تھا جس نے اسے پلٹنے پہ مجبور کیا تھا۔

”تم یہاں؟“ وہ مسکرائی۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کے لبوں اور آنکھوں میں کھلتی ہوئی مسکراہٹ کا موازنہ کیا۔

”یہ بے ہنگم میوزک میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔“ میں نے ناک چڑھاتے ہوئے بتایا۔

”می ٹو۔“ اس نے جواباً کہا اور اپنی توجہ پھر سے لان پہ مرکوز کرلی اور میں نے اس پر!

”ملیحہ!“ میں نے کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے مخاطب کیا تھا۔ پارک میں ہونے والے واقعے کے بعد مجھے اس سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

”تم بہت خوب صورت ہو!“

”اچھا؟ میرا خیال ہے تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں خوب صورت لگ رہی ہوں۔“ اس نے تصحیح کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں! میں بالکل وہی کہہ رہا ہوں جو میں کہنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنے الفاظ پہ زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ فقط مسکرا دی۔

”جانتی ہو میں یہ کیوں کہہ رہا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم بتاؤ؟“

”کیونکہ جو خوب صورت ہوتے ہیں وہ ہمیشہ ہی خوب صورت لگتے ہیں لیکن خوب صورت لگنے والے ہمیشہ خوب صورت نہیں ہوسکتے اور ملیحہ ہمدانی۔۔۔ تم خوب صورت ہو۔ بہت خوب صورت!“ الفاظ خود بخود ادا ہونے لگے تھے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میری بات پہ اس کا کیا ردعمل ہوگا لیکن آج میں اسے یہ بات بتا دینا چاہتا تھا کہ میں نے دنیا میں کسی کو اس سے زیادہ خوب صورت نہیں پایا۔

”کیا بات ہے لوگو! آج گھر جانے کا ارادہ نہیں کیا؟“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی کامران پیچھے سے آن دھمکا تھا۔

”میری تو گاڑی خراب ہے سو واپسی پہ پاپا پک کر لیں گے۔ لیکن ابھی انہیں کچھ وقت لگے گا۔“ ملیحہ نے بتایا۔

”اچھا تو اس لیے آج تمہیں آنے میں بھی دیر ہوگئی تھی؟“ کامران نے یہ سوال تو ملیحہ سے کیا تھا لیکن نظریں مجھ پہ جمائے ہوئے تھا۔

”ہاں میں تو وقت پہ ہی نکل رہی تھی گاڑی نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کردیا۔“

”اچھا تو اب تم فصیح کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں؟ یہ تمہیں ڈراپ کردے گا۔ اسے کون سا گھر جانا ہے جہاں لوگ اس کا انتظار فرما رہے ہیں۔“ کامران نے ایک ہی جملے میں میرا خون بڑھانے کے بعد جلایا تھا۔

”ہاں کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے، چلو میں تمہیں ڈراپ کردیتا ہوں۔“ میں نے فوراً سے پیشتر کہا۔

”نہیں نہیں ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں یہاں انتظار کرلیتی ہوں اور اگر زیادہ دیر ہوئی تو میں ٹیکسی لے لوں گی۔“ اس نے فوراً انکار کیا۔

”کم آن یار! جب فصیح ڈراپ کرسکتا ہے تو یہاں انتظار کرنے کا کیا مقصد؟ اور اس وقت ٹیکسی سے کیسے جاؤ گی؟ یقین کرو یہ کسی ٹیکسی والے سے تو زیادہ ہی قابل بھروسا ہے۔“ کامران کبھی میرا کوئی کام عزت سے نکلوا دیتا یہ واقعی ناممکنات میں سے تھا!

تھوڑے سے تردد کے بعد وہ میرے ساتھ جانے پہ رضامند ہوگئی تھی۔ مجھے اس لمحے کامران پہ بے تحاشا پیار آرہا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے آنکھ ماری اور میں نے ملیحہ سے چھپاتے ہوئے اس کا جواب اپنی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے دیا تھا۔

وہ واقعی ایک حسین شام تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے میں خود کو سڑک پہ نہیں ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کررہا تھا۔

ملیحہ مکمل طور پہ خاموش تھی۔ میرے اس قدر واضح الفاظ میں تعریف کرنے کے بعد اس نے اب تک مجھ سے کوئی بات براہ راست نہیں کی تھی، لیکن وہ میری گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ میرے لیے یہی کافی تھا۔ میں نے ہلکی آواز کے ساتھ میوزک پلیئر آن کردیا۔ گاڑی میں میرا وہی پسندیدہ میوزک چلنے لگا جس کی بنا پہ اظہر مجھے ”بوڑھی روح“ کا خطاب دیا کرتا تھا۔

اس لمحے میں پھر سے اپنی کیفیات سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ آج یہ دوسری بار ہوا تھا۔ وہ سرشاری کی سی کیفیت میں پھر سے محسوس کررہا تھا۔ شاید محبت اسی کو کہتے ہیں۔ ہاں میں ملیحہ ہمدانی سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں نے وہاں بیٹھے اعتراف کیا۔ میں پھر سے ہلکی موسیقی کی طرف متوجہ ہوا۔

ایسی تو میری تقدیر نہ تھی
تم سا جو کوئی محبوب ملے
دل آج خوشی سے پاگل ہے
اے جان وفا تم خوب ملے

کسی کو چاہنے کے اس اچھوتے احساس سے میں آج پہلی بار واقف ہوا تھا۔ میری چاہت اس وقت میرے ساتھ تھی، یہ میری خوش قسمتی کی انتہا تھی۔

اس نے گھر کے سامنے پہنچ کر اپنی طرف کا دروازہ کھولنے سے پہلے مجھے اندر آنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے یقیناً ”یہ دعوت رسماً“ دی تھی لیکن اس وقت میں جس ٹون میں تھا اس کے ایک بار کہنے پہ ہی گاڑی سے اتر آیا۔

وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باہر نکل گئی اور کچھ ہی دیر میں ایک خاتون کے ساتھ داخل ہوئی۔

”فصیح! یہ میری ممی ہیں۔“ اس نے داخل ہوتے ہی تعارف کروایا۔ سر پہ چادر لپیٹے اور ہاتھ میں تسبیح تھامے وہ شفیق سی خاتون ہمارے آنے سے پہلے شاید نماز میں مصروف تھیں۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام بیٹا! بیٹھو۔ ملیحہ بہت ذکر کرتی ہے تمہارا۔ تمہارا اور کامران کا بھی۔ ندا بیٹی تو آتی رہتی ہے۔ تم لوگ کبھی نہیں آئے۔ آج آئے بھی ہو تو اس وقت کہ گھر پہ سبحان ہے نہ فاروق ہیں۔“ انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے اور شوہر کا نام لیا جنہیں میں نام کی حد تک ہی جانتا تھا۔

”کوئی بات نہیں آنٹی! میں تو صرف ملیحہ کو ڈراپ کرنے آیا تھا لیکن اگر آپ بلائیں گی تو ضرور دوبارہ حاضر ہوں گا۔“ میں کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاں بیٹا ضرور آنا لیکن اب تو چائے پی کر جاؤ۔“

”نہیں آنٹی! چائے پھر سہی۔ اب کافی دیر ہوچکی مجھے چلنا چاہیے۔“ پھر ان کے کافی اصرار پہ بھی میں چائے کے لیے نہیں رکا تھا لیکن وہ شفیق سی آنٹی مجھے بہت پسند آئی تھیں لہٰذا میں نے انہیں بھی بطور ساس اوکے کردیا تھا۔

اسی سرشاری کے عالم میں میں ہاسٹل پہنچا لیکن تھکن کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بیڈ پہ لیٹتے ہوئے میں نے موبائل ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میرا ارادہ اظہر کو کال کرنے کا تھا کیونکہ اس وقت میں اپنی خوشی کسی سے شیئر کرنا چاہتا تھا۔ یوں بھی جو بات آج

مجھ پہ عیاں ہوئی تھی وعدے کے مطابق مجھے اظہر ہی کو بتانا تھی۔ میں ابھی فون بک کھول کر اظہر کا نمبر تلاش کر رہا تھا جب اسکرین پہ ملیحہ ہمدانی کا نمبر جگمگانے لگا۔ وہ مجھے کال کر رہی تھی۔ میں نے کچھ حیرت سے کال ریسیو کی۔

"سو تو نہیں چکے تھے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"بالکل نہیں۔" میں بشاشت سے بولا۔

"مجھے تھینکس کہنا تھا۔"

"کس بات کا؟"

"گھر ڈراپ کرنے کا۔"

"مائی پلیژر!"

کچھ مزید رسمی گفتگو کے بعد وہ فون بند کرنے لگی تھی جب میں نے اسے مخاطب کیا۔

"ایک منٹ ملیحہ!"

"ہاں بولو"

"مجھ سے شادی کرو گی؟" میں نے پوچھا تھا۔

"واٹ؟" وہ بہت زور سے چلائی تھی۔ شاید اس کے لیے میرا سوال بہت غیر متوقع تھا۔

"ول یو میری می؟"

میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"فصیح حیدر! تم کچھ زیادہ ہی تھک چکے ہو۔ اب سو جاؤ!" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ میں موبائل کو سینے پہ رکھے بہت دیر مسکراتا رہا۔

بہت دیر بعد جب میں اس کی سوچوں سے نکلا تو گھڑی پہ نگاہ دوڑائی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر فون ہاتھ میں لے کر اظہر کو کال ملانی شروع کی۔

"ہیلو!" کئی بیلیں جانے کے بعد اظہر کی غنودگی میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

"تم سو رہے تھے؟"

"نہیں تو! یہ ٹائم تو میرے پارٹ ٹائم بزنس کا ہے۔ گرم انڈے بیچنے نکلا ہوں۔" اس کے جلے ہوئے انداز پہ میں نے قہقہہ لگایا۔

"کیوں فون کیا اس وقت۔ سب خیریت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں بالکل خیریت۔ ایک بات بتانی تھی تمہیں۔"

"تو کیا وہ بات بتانے کے لیے کوئی شریفانہ وقت نہیں ملا تمہیں؟"

"نہیں۔" میں اطمینان سے گویا ہوا۔

"تو پھر جلدی بولو اور سونے دو مجھے۔" اس نے بے زاری سے کہا لیکن اس وقت مجھے کسی کی بھی کوئی بات بری نہیں لگ سکتی تھی۔

"اظہر! مجھے محبت ہو گئی ہے۔" میں نے ڈرامائی انداز میں خبر دی۔

"فصیح! میرا خیال ہے تمہارا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے۔ جاؤ جا کر سو اور مجھے بھی سونے دو! میں تم سے صبح بات کروں گا اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو خود لاہور آ کر کسی سائکاٹرسٹ کے پاس بھی لے چلوں گا۔" اس نے کہہ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ میں جانے کب تک خواب بنتا ہوا نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

اس کے بعد میری زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا۔ جس میں رنگ تھے، خوب صورتی تھی، محبت تھی، خوشیاں تھیں اور خواب تھے!

میرے دوبارہ پوچھنے پہ ملیحہ نے صرف اتنا کہا تھا کہ اس کے خاندان کا شمار ابھی تک ان لوگوں میں ہوتا ہے جہاں یہ معاملات بڑوں کے درمیان طے کیے جاتے ہیں اور اگر اس کے ماں باپ کو اعتراض نہ ہوا تو اسے بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

اس کے والدین کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا مجھے اس بات کا یقین تھا۔ میں عزت دار اور دولت مند باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ صاحب جائیداد تھا، پڑھا لکھا تھا، خوب صورتی کا مجسمہ نہ سہی لیکن اچھا خاصا خوش شکل تھا۔ آخر وہ مزید کس چیز کی خواہش کر سکتے تھے؟ جہاں تک ماما پاپا کا تعلق تھا مجھے معلوم تھا کہ اس معاملے میں وہ میری پسند کو ہی ترجیح دیں گے۔ اگرچہ پاپا حسب روایت

اعتراض اٹھاتے بھی تو مجھے انکل صفدر پہ بھروسا تھا۔ ان کی موجودگی میں میرے ساتھ کوئی زبردستی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

میں شب و روز ایک خوشی کے عالم میں رہنے لگا تھا۔

میرے دل میں روز بروز ملیحہ کی قدر بڑھتی جارہی تھی۔ میں ہر شے کو اس کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ ہر چیز میں اس کی پسند و ناپسند کو اپنانے لگا تھا اور ملیحہ ہمدانی؟ میں نے اسے اپنے رنگ میں ڈھلتے دیکھا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنی محبت لکھی صاف نظر آئی تھی۔ وہ محبت جسے دیکھ کر میں خود پہ رشک کرتا تھا۔ ہم اکثر ہی یونیورسٹی کے بعد کہیں گھومنے نکل جاتے تھے۔ ہم گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتے۔ اپنے بچپن کے قصے، اپنے اسکول و کالج کے واقعات، اپنی پسند و ناپسند، ہم نے سب کچھ ایک دوسرے کو بتا ڈالا تھا۔ اس کے باوجود ہماری باتیں ختم ہونے کو ہی نہ آتی تھیں۔ بعض اوقات مجھے خود پہ حیرت ہونے لگی۔ میں جو ہمیشہ سے اتنا کم گو رہا تھا اس کے سامنے اتنا کیسے بول لیتا تھا؟

انہی دنوں میں ایک عجیب سا واقعہ ہوا جسے میں کبھی بھی بھول نہیں پایا۔ یونیورسٹی سے نکل کر انار کلی برگر کھانے جانا ہمارے معمولات میں شامل ہو چکا تھا۔ برگر لے کر ہم ناصر باغ آجاتے اور اسی برگد کے درخت تلے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ اس روز بھی ہم اسی ارادے سے نکلے تھے جب ملیحہ پارک کے سامنے جاکر رک گئی۔

"فصیح! آج تم خود برگر لے آؤ نا میں وہاں درخت کے پاس انتظار کرتی ہوں تمہارا۔"

"کیوں؟ تم کیوں نہیں جاؤگی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آج نیا جوتا پہن کر آئی تھی۔ کاٹ رہا ہے۔" اس کے بتانے پہ میں نے تشویش سے جھک کر اس کے پاؤں کو دیکھا۔ انگوٹھے کے قریب لگے اسٹریپ سے دایاں پاؤں بری طرح چھل چکا تھا۔

"تو یار! تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں گاڑی نکال لاتا۔" میں ناراض ہوا۔

"نہیں اب ایسی بھی بات نہیں۔ اتنا تو چل سکتی ہوں۔" اس نے مجھے یقین دلایا۔

"ملیحہ! تمہارا پاؤں بری طرح زخمی ہے اتنا کیسے چلوگی؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم یوں بات کا بتنگڑ بنادوگے تو میں تمہیں بتاتی ہی نا! سخت بھوک لگ رہی ہے۔ میں وہاں جاکر بیٹھتی ہوں۔ تم جلدی سے برگر لے کر آؤ۔" اس نے بات کو ہلکے پھلکے انداز میں ٹال کر قدم آگے بڑھائے لیکن اس کا زخم مجھے تکلیف دے رہا تھا۔

"نہیں تم ایسے کیسے جاؤگی۔ رکو میں ابھی گاڑی لے کر آتا ہوں پھر چلتے ہیں۔" میں کہہ کر واپس پلٹا۔

"فصیح رکو! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ کہا نا ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ چلو، میں تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں شاید تمہیں یقین آجائے۔"

میں نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔

"اچھا چلو میں تمہیں وہاں تک چھوڑ آتا ہوں۔ اپنی چیزیں دو مجھے۔" میں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل میرے حوالے کردی۔

"یہ اپنا ڈھائی من کا بیگ بھی پکڑا دو۔" میں نے خفگی سے کہتے ہوئے بیگ لینا چاہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اس کو تم اٹھاؤگے؟"

"کیوں تم اٹھا سکتی ہو تو میں کیوں نہیں اٹھا سکتا؟"

"کیوں کہ یہ ایک لیڈیز بیگ ہے۔"

"تو اس کو اٹھانے کے جرم میں مجھے جیل نہیں ہوجائے گی۔" میں نے کہتے ہوئے اس سے بیگ لے لیا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے پارک میں اپنے مخصوص مقام پر پہنچنے تک میری نظریں بار بار اس کے پاؤں پر جاتی رہی تھیں۔ اس کے وہاں بیٹھنے پہ میں نے اس کے ساتھ اپنی چیزیں بھی وہیں ڈھیر کیں اور باہر نکل آیا۔ وہاں سے میرا رخ سیدھا پارکنگ میں اپنی گاڑی کی طرف تھا۔ میں کسی صورت بھی ملیحہ کو واپس پیدل نہیں لاسکتا تھا۔ گاڑی نکالنے کے بعد میں برگر لے کر پہنچا۔ وہ کسی کتاب پہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"لیں جناب ہم آگئے۔" میرے کہنے پہ بھی اس نے سر نہیں اٹھایا۔

"کیا پڑھا جارہا ہے؟" میں خوش دلی سے کہتا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھ کر میں ششدر رہ گیا تھا۔

"کیا ہوا ملیحہ؟" میں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔

"تم اس طرح کیوں رو رہی ہو؟ پاؤں میں زیادہ درد ہے؟" اس کے آنسوؤں نے مجھے بری طرح بے چین کردیا تھا۔

"نہیں تو۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ "میں یہ نظم پڑھ رہی تھی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی نوٹ بک میرے آگے کردی۔ میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اس نوٹ بک کو دیکھا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ میری ہی نوٹ بک پکڑے ہوئے تھی۔

وہ کہتی ہے سنو جاناں محبت موم کا گھر ہے
تپش اک بدگمانی کی کہیں پگھلا نہ دے اس کو
میں کہتا ہوں کہ جس دل میں ذرا بھی بدگمانی ہو
وہاں کچھ اور ہو تو ہو محبت ہو نہیں سکتی

وہ کہتی ہے سدا ایسے ہی کیا تم مجھ کو چاہوگے
کہ میں اس میں کمی بالکل گوارا کر نہیں سکتی
میں کہتا ہوں محبت کیا ہے یہ تم نے سکھایا ہے
مجھے تم سے محبت کے سوا کچھ بھی نہیں آتا

وہ کہتی ہے جدائی سے بہت ڈرتا ہے میرا دل
کہ خود کو تم سے ہٹ کر دیکھنا ممکن نہیں ہے اب
میں کہتا ہوں کہ یہی خدشے بہت مجھ کو ستاتے ہیں
مگر سچ ہے محبت میں جدائی ساتھ چلتی ہے

وہ کہتی ہے بتاؤ کیا میرے بن جی سکوگے تم
میری یادیں، میری آنکھیں، میری باتیں بھلا دوگے
میں کہتا ہوں کبھی اس بات پر سوچا نہیں میں نے
اگر اک پل کو بھی سوچوں تو سانسیں رکنے لگتی ہیں

وہ کہتی ہے کہ آتش جی بہت باتیں بناتے ہو
مگر سچ ہے کہ یہ باتیں بہت ہی شاد رکھتی ہیں
میں کہتا ہوں یہ سب باتیں، فسانے اک بہانہ ہیں
کہ پل کچھ زندگانی کے تمہارے ساتھ کٹ جائیں
پھر اس کے بعد خاموشی کا اک دلکش رقص ہوتا ہے
آنکھیں بولتی ہیں اور یہ لب خاموش رہتے ہیں...!

"بہت اچھی ہے۔" وہ کہتے ہوئے ایک بار پھر سے مسکرائی۔

"ہاں اچھی ہے۔ لیکن تم رو کیوں رہی تھیں؟" وہ اب تک اپنے آنسو صاف کرچکی تھی۔

"بتایا تو ہے نظم بہت خوب صورت ہے۔ بس اسی کو پڑھتے ہوئے آنسو آگئے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"ملیحہ! تم یہ نظم پڑھ کر رو رہی تھیں؟" میرے سوال پہ اس نے فقط اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"کیا اچھی چیزیں پڑھ کر رویا جاتا ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"تم نہیں روتے ہوگے میں تو بہت روتی ہوں... جب کوئی بہت اچھی چیز پڑھوں... ایسی کہ جسے محسوس کرسکوں۔" میں اسے صرف دیکھ کر رہ گیا۔

میں نے کچھ ہی روز پہلے وہ نظم کسی میگزین میں پڑھی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق میں نے اسے اپنی نوٹ بک پہ بھی لکھ لیا تھا۔ اسے پڑھتے ہوئے ہر بار میری آنکھوں کے سامنے ملیحہ کا عکس ابھرا تھا۔ ہر بار اسے پڑھتے ہوئے میرے لبوں پہ مسکراہٹ آئی تھی اور وہ اسی نظم کو پڑھ کر رو رہی تھی۔ اس نے ایسا کیا محسوس کیا تھا جو اس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا؟ کیا اس کے ذہن میں بہت پہلے سے وہ اندیشے موجود تھے جن کا گزر میرے گمان میں بھی نہ تھا؟

☆ ☆ ☆

"کیا چل رہا ہے؟" اظہر کی کال آئی۔

"پریزنٹیشن دینی ہے کل' اسی کی تیاری کر رہا ہوں۔"

"اس بار ویک اینڈ پہ کیا ارادہ ہے۔ گھر آرہے ہو؟"

"نہیں۔ ابھی تک تو کوئی ارادہ نہیں۔" میں نے اگلے ہفتے کی مصروفیت پہ نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔

"نہیں ہے تو بنالو۔" اس نے حکم جاری کیا۔

"کیوں؟ کوئی خاص بات؟"

"خاص نہیں خاص الخاص۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"تمہاری شادی ہو رہی ہے کیا؟"

"وہ تو پہلے تمہاری ہوتی نظر آتی ہے۔ ہماری ایسی قسمت کہاں؟" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بتاؤ ویک اینڈ پہ کیا ہو رہا ہے؟" میں اسے واپس اصل موضوع کی طرف لایا۔

"نرمین کی انگیجمنٹ۔" اس نے نیوز بریک کی۔

"واٹ؟" میں چلایا۔ تین دن پہلے میں گھر سے آیا تھا اور اس وقت تو وہاں ایسی کسی بات کا ذکر تک نہ تھا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو!" میں نے ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

"نہیں یقین آتا تو چچی سے پوچھ لو۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"مگر اتنی اچانک کیسے یار! ابھی تین دن پہلے تک تو مجھے کسی نے نہیں بتایا۔" میں نے اعتراض کیا۔

"ہمیں خود نہیں معلوم تھا تمہیں کیسے بتاتے؟"

"اور اسی ویک اینڈ پہ رسم بھی کی جا رہی ہے۔ اس ایمرجنسی کی وجہ؟" میں نے اگلا اعتراض اٹھایا۔

"دولہا میاں کو انگلینڈ کا پلین پکڑنا ہے۔"

"اور یہ موصوف ہیں کون؟"

"انکل انصاری کو تو جانتے ہو نا۔ بابا کے دوست؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔"

"ان کا بیٹا ہے فرحان۔ ابھی حال ہی میں ایم ایس کیا ہے اس نے انگلینڈ سے اور مستقبل میں وہیں سیٹل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔" اس نے تفصیلاً بتایا۔

"لیکن پہلے تو ایسا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ اب سب اتنا اچانک؟" میں نے اپنی حیرت اس تک پہنچائی۔

"تم منگنی پہ حیران ہو رہے ہو اور سال اگلے ماہ میں شادی کی تاریخ زیر غور ہے۔" اس نے اگلا دھماکا کیا۔

"اگلے ماہ... نرمین کی شادی؟" اس نے واقعی آج مجھے ایک کے بعد دوسرا جھٹکا دینے کی قسم کھائی تھی۔

"ہاں اپنے اینڈ ٹرم ایگزام کی ڈیٹ بتا دو۔ بابا پوچھ رہے تھے تاکہ تمہاری چھٹیوں میں ہی شادی کی ڈیٹ فکس کر دی جائے۔" میں نے اسے اپنا شیڈول بتایا اور مزید کچھ باتوں کے بعد فون رکھ دیا۔

اینڈ ٹرم میں ایک ماہ سے بھی کم وقت باقی تھا۔ آج کل میں اسی کی تیاریوں میں مصروف تھا اور اب اس کے فوراً" بعد شادی کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ نرمین مجھ سے ایک سال بڑی تھی۔ اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد آج کل وہ گھر پہ ہوتی تھی۔ اور اب اچانک اس کی شادی... مجھے یہ سب قبول کرنے میں وقت محسوس ہو رہی تھی۔

میں کچھ سوچ کر نرمین کو کال ملانے لگا۔ پہلی ہی بیل پہ کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ دوسری طرف سے نرمین کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے اسے خوش دلی سے مبارک باد دی تھی۔ کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے فون رکھ دیا۔ وہ خوش لگ رہی تھی اور اگر وہ خوش تھی تو مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اس خیال نے مجھے مطمئن سا کر دیا۔

☼ ☼ ☼
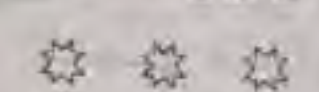
ستائیس دسمبر کی شام بہت اداس تھی۔ آج سردیوں کی پہلی بارش ہوئی تھی اور ابھی تک بوندا باندی جاری تھی۔ گزشتہ رات منگنی کی رسم رات گئے تک جاری رہی تھی جس کی بنا پہ میں صبح کافی دیر سے جاگا تھا۔ بارش نے ماحول کی خنکی میں خاطر خواہ اضافہ

کر دیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں ہاسٹل کے لیے روانہ ہو گیا۔ سردیوں کی بارش مجھے ہمیشہ ہی ایک عجیب سے انداز میں اداس کر دیا کرتی تھی سو آج بھی کر رہی تھی۔ بھیگی سڑکوں پہ میں سست روی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

اس اثنا میں ڈیش بورڈ پہ رکھے موبائل کی بپ بجی اور اس پہ ملیحہ ہمدانی کا نام چمکنے لگا۔ اس کے ایس ایم ایس نے بے اختیار میرے لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر دی۔ میں نے مسکراتے ہوئے میسج کھولا۔

"تمہیں معلوم ہے آج غالب کا یوم پیدائش ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ میری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ میں نے چند روز پہلے ہی اس کے پوچھنے پہ اپنے پسندیدہ شاعر کا نام غالب بتایا تھا اور وہ اگلے ہی روز دیوان غالب خرید لائی تھی۔ اور آج وہ مجھے غالب کا یوم پیدائش یاد دلا رہی تھی۔ میں نے پھر اپنی قسمت پہ ناز کیا تھا۔

"مجھے بھی ابھی معلوم ہوا ہے۔" میں نے جوابی میسج بھیجا۔ کچھ ہی پل میں اسکرین پھر سے چمکنے لگی۔

"چلو پھر سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ مجھے غالب کا ایک اچھا سا شعر لکھ کر بھیجو۔" اس نے تجویز پیش کی۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی' درد لا دوا پایا

میں نے وہی شعر لکھ بھیجا جو ان دنوں اکثر میری زبان پہ رہتا تھا۔

"اب تمہاری باری۔" میں اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

تیرے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان' جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا!

میرے دل پہ جیسے کسی نے گھونسا مارا تھا۔ میرا پاؤں تیزی سے بریک پہ پڑا۔ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے گاڑی سڑک کے ایک طرف روکی۔ موبائل ہاتھ میں پکڑ کر میں پھر سے وہ شعر پڑھنے لگا۔ اس کے بعد میں نے اسے بیسیوں بار پڑھا تھا۔ کیا اسے میری محبت پہ کوئی شک تھا۔ میرا دل کٹنے لگا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر اسے کال ملانا شروع کی۔

"ملیحہ! کیا تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے؟" میں نے اس کے کال ریسیو کرتے ہی بغیر کسی رسمی گفتگو کے پوچھا۔

"مجھے بھلا کیا شکایت ہو گی؟"

"یہ تو تم بہتر جانتی ہو۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔

"فصیح! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ایسے کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس کی آواز میں پریشانی جھلکی تھی۔

"مجھے محسوس ہوا کہ تم مجھ سے خوش نہیں ہو۔" میری آواز دھیمی ہو گئی۔

"اور ایسا محسوس کرنے کی کوئی وجہ بھی ہو گی۔"

"تم نے ابھی غالب کا شعر بھیجا۔"

"تو؟"

"تو مجھے لگا شاید تمہیں میرے جذبات پہ کوئی شک ہے۔" میری اس بات پہ وہ بہت زور سے ہنسی تھی۔

"فصیح! تم بالکل پاگل ہو چکے ہو! میں نے غالب کا ایک بہت اچھا شعر تمہیں بھیجا ضرور ہے مگر ڈیڈیکیٹ نہیں کیا تھا۔" وہ مسلسل ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میں اپنی ہی کیفیت پہ شرمندہ ہونے لگا۔

اس سے بات کرنے کے بعد میری پریشانی کم ہو گئی تھی' لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ یہ اگر صرف آج کی بات ہوتی تو میں اس کی توجیہہ سے مطمئن ہو جاتا لیکن بار بار میری آنکھوں کے سامنے اس کا بھیگا ہوا چہرہ آرہا تھا۔ ضرور وہ کسی اندیشے کا شکار تھی۔ وہ اندیشہ کیا تھا میں غور کرنے لگا۔

گھر میں یہ بات اب تک صرف اظہر کے علم میں تھی۔ میں نے اسے ابھی کسی سے ذکر کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ میرا ارادہ ڈگری مکمل کر لینے کے بعد بابا سے بات کرنے کا تھا۔ لیکن اب میں فوری طور پہ اس معاملے کو حتمی طور پر طے کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اپنی خواہش کا اظہار کرنے کے باوجود اس معاملے کو کوئی رسمی شکل نہیں دی تھی اور میرے

قیاس کے مطابق ملیحہ کو یہی چیز پریشان کر رہی تھی وہ مجھے فلرٹ سمجھے۔ یہ بات میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔

☼ ☼ ☼

نرمین کی منگنی سے شادی کے روز تک کا وقت بہت تیزی سے گزرا تھا۔ امتحانات اور شادی کی تیاریوں میں، میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس دوران میں دوبار گھر گیا تھا لیکن ہر فرد مصروفیت کی انتہا پہ نظر آرہا تھا۔ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی اس صورت حال نے سب ہی کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ میں ان حالات میں اپنی شادی کی بات نہیں چھیڑ سکتا تھا، لیکن میں نے ایک راہ سوچ لی تھی۔ نرمین کی شادی پہ میں نے کامران کے ساتھ ملیحہ کو بھی دعوت دی تھی۔ اس بہانے میں اسے ماما پاپا سے ملوا سکتا تھا۔

ہاسٹل سے گھر آتے ہی میں مکمل طور پہ کاموں میں جت گیا تھا۔ اگرچہ وقت کم تھا لیکن میں نے تمام ممکنہ تیاریاں کرلی تھیں۔ ملیحہ پہلی بار میرے گھر آرہی تھی۔ میں اس گھر کو اس کے شایان شان کسی محل کے روپ میں دھار دینا چاہتا تھا۔ مگر فی الوقت میں ان ہی کاموں میں مصروف تھا جو میں کر سکتا تھا۔ میں نے فرنیچر کی سیٹنگ بدل دی تھی۔ لان کی صفائی میں اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا۔ دیواروں پہ لگی پینٹنگز کی میں نے نئے سرے سے نہ صرف جگہ بدلی تھی بلکہ ان میں بہت سے پرانی پینٹنگز ہٹا کر ان کی جگہ نئی لگا دی تھیں۔ ماما اس ساری کارروائی پہ خاصی حیران تھیں۔ وہ مجھے بار بار یاد دہانی کروا رہی تھیں کہ شادی ہمارے گھر نہیں بلکہ انکل صفدر کے ہاں ہے۔ کئی بار میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں ان سے اپنی خوشی کہہ دوں، لیکن کچھ سوچ کر اپنے خیال کو رد کر دیا۔

اور آخر آج وہ میرے گھر آرہی تھی جس کے نام میں نے اپنی ہر سانس لکھ دی تھی۔ جو میری روح میں بسنے لگی تھی۔ جس کی ایک مسکراہٹ میرے چاروں طرف رنگ بکھیر دینے کے لیے کافی تھی۔ جس کا ایک آنسو میری دھڑکنوں کو بے قرار کر دینے کی طاقت رکھتا تھا۔ میں نے سر شام ہی اس کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہو رہی تھیں یہ جانے بغیر کہ وہ ایک انتظار لاحاصل تھا! بے معنی تھا! اور تمام عمر میری زندگی کا حصہ بننے والا تھا!

گھڑی کے آٹھ بجاتے ہی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور میری نظریں مسلسل اس گیٹ پہ ٹکی تھیں جس سے مہمان اندر داخل ہو رہے تھے۔ اسی انتظار میں، میں نے گیٹ سے کوریر کے ایک نمائندے کو اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ پھولوں کا ایک بوکے اور ایک لفافہ چوکیدار کے حوالے کر کے وہ واپس پلٹ گیا تھا۔ میں حیرت سے اس کارروائی کو دیکھ رہا تھا جبکہ چوکیدار وہ دونوں چیزیں لے کر گھر کے اندرونی جانب بڑھ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے اظہر کی بوکھلائی ہوئی زرد صورت دیکھی تھی۔ وہ متحیر آنکھوں سے جیسے مہمانوں کے ہجوم میں کوئی چہرہ تلاش کر رہا تھا۔ میں پریشانی کے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔

"کیا ہوا اظہر؟" میں نے قریب پہنچ کر اس کے کندھے کو جھنجھوڑا۔

"ہاں۔۔۔ فصیح۔۔۔ چلو تم میرے ساتھ اندر چلو۔" وہ چونکتے ہوئے ٹوٹے لہجے میں بولا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟ سب خیریت ہے؟ تمہاری رنگت کیسی ہو رہی ہے؟" میں نے ایک ہی جملے میں کئی سوال پوچھ ڈالے۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں، اندر چلو۔۔۔ پاپا بلا رہے ہیں۔" وہ کہتا ہوا واپس پلٹا اور میں حیرت زدہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ انتہائی سستی سے قدم اٹھا رہا تھا اور اس کا ہر ہر انداز مجھے ہولائے دے رہا تھا۔ اسے وہیں چھوڑتا ہوا میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا اندر کی طرف بڑھا۔

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی میں دنگ رہ گیا تھا۔ اندر کی صورت حال اظہر کی حالت سے کہیں بھیانک تھی۔ تائی امی بیڈ پہ بے ہوش پڑی تھیں۔ ماما ان پہ پانی کے چھینٹے ڈال رہی تھیں۔ ایک طرف صوفے پہ نرمین

عروسی جوڑے میں ملبوس بیٹھی تھی، لیکن اس کا وجود بالکل ساکت تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مسلسل سامنے دیوار پہ کچھ تلاش کر رہی تھی۔ انکل، پاپا اور قمر بھائی اپنی اپنی جگہ پہ خاموش بیٹھے تھے۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی قمر بھائی تیزی سے میری طرف بڑھے۔

"اظہر کہاں ہے؟" وہ پوچھ رہے تھے۔

"آرہا ہے۔" اسی لمحے اظہر اندر داخل ہوا۔ اس کے اندر قدم رکھتے ہی قمر بھائی نے لاؤنج کا دروازہ لاک کر دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر نا سمجھی میں وہاں بیٹھے ہوئے افراد کو دیکھا۔ صورت حال میرے حواس مختل کیے دے رہی تھی۔

"کوئی مجھے بتائے گا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں چلایا۔ کسی نے میری بات کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اظہر نے سینٹرل ٹیبل سے ایک کاغذ اٹھا کر میرے آگے کر دیا۔ میں نے تیزی سے پڑھنا شروع کیا۔

مس نرمین!

مجھے بہت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے ساتھ یہ شادی میری مرضی کے خلاف زبردستی طے کی گئی تھی۔ میں نے امی ابو کو ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی ہٹ دھرمی پہ قائم رہے۔ میں انگلینڈ میں اپنی ایک کلاس فیلو میں انٹرسٹڈ ہوں اور ہم بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔ اس صورت حال میں میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میں یہ شادی کر کے آپ کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس سے پہلے مجھے کوئی فلائٹ نہیں مل سکی لیکن جب تک آپ کو یہ خط ملے گا میرا پلین روانہ ہو چکا ہوگا۔ اگرچہ اس سارے معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں، میں آپ سے معافی کی درخواست کرتا ہوں۔

فرحان انصاری

میں نے رکتی ہوئی سانسوں کے ساتھ سر اٹھایا۔ وہاں موجود افراد میں صرف پاپا کو میں نے اپنی طرف دیکھتے پایا تھا۔ اظہر نرمین کے پاس بیٹھا اسے سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہا تھا۔ قمر بھائی دیوار پہ نظریں جمائے بیٹھے تھے جبکہ انکل صفدر جھکے ہوئے سر اور کندھوں کے ساتھ مسلسل اپنے جوتوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے پہلی بار جانا تھا کہ بیٹی کا باپ ہونا کتنا بڑا امتحان ہوتا ہے۔ وہ امتحان جس میں کبھی بیٹی کی وجہ سے سر جھکانا پڑتا ہے تو کبھی دنیا کی وجہ سے کندھے۔

آج انکل صفدر کی بیٹی دلہن کے روپ میں بیٹھی تھی۔ اس بارات کے انتظار میں جو کبھی نہیں آنے والی تھی۔ میں ترحم بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ دفعتاً میرے موبائل کی بپ بجنے لگی۔ میں نے نمبر دیکھے بغیر اسے آن کر کے کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو فصیح!" دوسری طرف ملیحہ ہمدانی کی آواز ابھری تھی۔ "ہم لوگ پہنچنے ہی والے تھے لیکن پاپا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ فصیح! ہم واپس جا رہے ہیں۔ آئی ایم سوری۔۔۔ میں آج نہیں آسکوں گی۔" وہ پریشانی سے کہہ رہی تھی۔ میں نے کچھ بھی کہے بغیر کال منقطع کر دی۔ وہ واقعی ایک بھیانک رات تھی۔

"فصیح!" میں نے انکل صفدر کی آواز پہ چونک کر سر اٹھایا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظریں ابھی بھی اپنے جوتوں پہ جمی تھیں۔

"میری بیٹی سے شادی کرو گے؟"

میرے وجود پہ بجلی گری تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں۔۔۔ میں؟ نرمین سے شادی کیسے کر سکتا ہوں؟" میں بے یقینی سے بولا۔

"کیوں۔ تم نرمین سے شادی کیوں نہیں کر سکتے؟" یہ سخت آواز پاپا کی تھی۔ میں نے پلٹ کر ان کی جانب دیکھا۔ نرمین کے علاوہ کمرے میں موجود تمام افراد کی نظریں اب مجھ پہ جمی تھیں۔ پیروں کے نیچے سے زمین کھسکنا کسے کہتے ہیں۔ یہ میں نے اس لمحے جانا تھا۔

"میں جانتا ہوں بیٹا! میں نے تم سے بہت بڑی قربانی مانگ لی ہے لیکن میں ایک بیٹی کا باپ ہوں۔ اس وقت اور کس پہ بھروسا کروں؟ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا

بیٹا ہی سمجھا ہے۔ کبھی تمہیں قمر اور اظہر سے الگ رکھ کر نہیں سوچا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ نرمین تم سے بڑی ہے، لیکن میں اور کس جانب دیکھوں؟ اس باپ پہ رحم کھاؤ بیٹا! اس باپ پہ رحم کھاؤ!"

یہ کہتے ہوئے انکل صفدر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔

میں نے مدد طلب نظروں سے اظہر کی جانب دیکھا۔ وہاں صرف وہی تھا جو میرا واقف راز تھا۔ ایک لمحے کو اس کی نظریں میری نظروں سے ملی تھیں اور پھر اس نے آنکھیں چرالی تھیں۔ میں شل ہوتے اعصاب کے ساتھ صوفے پہ ڈھے گیا۔

"کرو گے نرمین سے شادی؟" انکل صفدر کی آواز پھر سے گونجی۔ وہ آواز جس میں لجاجت تھی، منت تھی، امید تھی۔ وہ آواز جو ہمیشہ میرے حق کے لیے اٹھتی آئی تھی۔ وہ آواز جو ہمیشہ مجھے میری من پسند چیزیں دلواتی آئی تھی۔ آج اس نے مجھ سے میرا سب کچھ مانگ لیا تھا۔ مجھے اپنا وجود زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس ہوا۔

میں نے اپنا سر اثبات میں ہلتا محسوس کیا۔

میں نہیں جانتا اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ کوئی مجھے اٹھا کر گلے لگا رہا تھا۔ کوئی میرے کندھے تھپتھپا رہا تھا لیکن وہ سب چہرے یک دم میرے لیے نا آشنا بن گئے تھے۔ وہ ترس، جو میں کچھ دیر پہلے انکل صفدر پہ کھا رہا تھا خود پہ کھانے لگا۔ آج میری خواہشوں کا خون ہوا تھا۔۔۔ میرا خون ہوا تھا! وہ میری زندگی کی بھیانک ترین رات تھی یا شاید میری "زندگی" کی آخری رات!

اس کے بعد کا ہر منظر دھندلا گیا تھا۔ ہاں ایک بات مجھے یاد تھی۔

کامران۔۔۔ وہ اسٹیج پہ آیا تھا۔ اس نے مجھے بھینچ کر گلے سے لگایا تھا اور بہت دیر لگائے رکھا تھا۔ جب اسے اندیشہ ہوا کہ میں اس کے بازوؤں میں پھوٹ پھوٹ کے رو دوں گا تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔

☆ ☆

کلاسز شروع ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور میری شادی کو تین ہفتے۔۔۔ آج میں نے تین ہفتوں بعد اپنا موبائل آن کیا تھا۔ تواتر سے میسجز آنے لگے۔ میں نے کسی بھی میسج کو کھول کر پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں روز صبح گھر سے نکلتا رات گئے لوٹتا تھا۔ ایک بار میں نے رات بھی گھر سے باہر ہی گزار دی تھی۔ میں واش روم میں آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لے رہا تھا جب میرا موبائل بجنے لگا۔ میں ست روی سے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ کامران کی کال آرہی تھی۔ میں نے ریسیو کر کے موبائل کان سے لگایا۔

"ہوش آ گیا تمہارے فون کو؟" وہ خفگی سے بولا۔

"ہاں۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"اور تمہیں؟"

"معلوم نہیں۔"

"فصیح!" کچھ لمحوں کے بعد اس کی نرم آواز ابھری تھی۔

"بولو!" میں نے جواب دیا۔

"لاہور آجاؤ۔"

"سامنا نہیں کر سکتا۔" میرے جواب پہ ایک بار پھر سے خاموشی چھا گئی۔

"یونیورسٹی جوائن کرلو۔"

"نہیں کر سکتا۔"

"یوں تو ڈراپ آؤٹ کر دیے جاؤ گے۔"

"مجھے پروا نہیں۔"

"سمسٹر فریز کروا لو بعد میں کمپلیٹ کر لینا۔"

"ضرورت نہیں اب۔" وہ کال کے دوران تیسری بار خاموش ہوا تھا۔

"فصیح!" اس نے پھر سے پکارا۔

"بولو!" میں نے پھر سے جواب دیا۔

"لاہور آجاؤ۔" اس نے پھر سے فرمائش کی۔

"کیا سب کچھ دہراؤں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔

"پھر؟"

"لاہور آجاؤ۔"

"اچھا۔" میں نے کہہ کر کال منقطع کر دی۔

موبائل ایک طرف اچھال کر میں وہیں بیڈ پہ اوندھا لیٹ گیا۔ آہٹ ۔۔۔ پہ میں نے سر اٹھایا۔ کمرے کے دروازے پہ نرمین کھڑی تھی۔ مجھے اندر موجود پا کر وہ نظریں چراتے ہوئے واپس نکل گئی۔ شادی کے بعد ہم دونوں میں براہ راست کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

گھر میں میرا مختصر سا قیام بھی کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ ہر شخص نصیحتوں کے انبار کے ساتھ میری اصلاح پہ مامور ہو چکا تھا۔ یہ بات میری گھر سے اکتاہٹ میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ میرے اندر ایک جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ میرا دل چاہنے لگتا کہ میں چیخ چیخ کر سب کو بتا دوں۔ انہیں بتا دوں کہ میری شادی صرف اس لڑکی سے نہیں کی گئی جسے میں نے ہمیشہ ایک بہن کی نظر سے دیکھا تھا بلکہ مجھے اس لڑکی کی نظروں سے بھی ہمیشہ کے لیے گرا دیا جسے میں اپنی زندگی کا حاصل سمجھ [illegible] نے ... ایک سے بات کرنا چھوڑ دی تھی، [illegible] بھی مجھے میرے حال پہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ گھر میں نرمین واحد فرد تھی جس نے مجھ سے ایک بار بھی بات نہیں کی تھی۔

وہ دن میں نے گھر پہ ہی گزارا تھا۔ بہت دن بعد مجھے ماما کے چہرے پہ اطمینان کی جھلک نظر آئی تھی۔ کھانے کی میز پہ ہر وہ شے موجود تھی جو میں کبھی بہت شوق سے کھایا کرتا تھا۔ میں نے ماما کے اصرار پہ کھانا نکال تو لیا تھا لیکن میری زبان جیسے اس کا ذائقہ محسوس کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

اس سے اگلے روز میں واقعی ایک مختصر سا بیگ تیار کر کے لاہور روانہ ہو گیا تھا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے میرا ذہن انہی خیالات سے بھرنے لگا جنہیں میں تین ہفتوں میں ہزاروں بار جھٹلا چکا تھا۔

کاش کہ میں نے ماما پاپا کو ملیحہ ہمدانی کے بارے میں بتا دیا ہوتا۔

کاش کہ وہ اسی روز شادی میں پہنچ جاتی۔۔۔ شاید اسے دیکھ کر میری رائے پوچھ لی جاتی۔۔۔ شاید اسے سامنے پا کر مجھ میں انکار کی ہمت ہی آجاتی۔

کاش کہ نرمین کی شادی کبھی فرحان سے نہ طے ہوئی ہوتی۔

کاش کہ انکل صفدر نے اس کے بارے میں مکمل تحقیقات کروائی ہوتیں۔

کاش کہ اس روز ملیحہ کے پاپا کا نہیں میرا ایکسیڈنٹ ہو جاتا! نہ میں گھر پہنچتا اور نہ ہی مجھے قربانی کا بکرا بنایا جاتا۔۔۔

کاش کی ایک لمبی قطار تھی۔

اس قطار کے بعد میری آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ آن کھڑا ہوتا۔۔۔ ملیحہ ہمدانی کا چہرہ۔۔۔ آنسوؤں سے تر چہرہ۔۔۔!

اس خبر پہ اس کا کیا رد عمل ہوا ہوگا؟ وہ جو ایک نظم پڑھ کر اتنا رو رہی تھی اس خبر کو سن کر کتنا روئی ہوگی؟ کل سے موبائل آن کرنے کے بعد میں لاشعوری طور پہ اس کی کال کا انتظار کرتا رہا تھا مگر اس کی کال نہیں آئی۔

لاہور پہنچ کر ہاسٹل جانے کے بجائے میں نے گاڑی کامران کے گھر کی طرف موڑلی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں تھا۔ اسے جلدی پہنچنے کا کہہ کر میں نے وہیں گاڑی میں اس کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

نہیں! میں نے بے وفائی نہیں کی تھی۔ میں نے محبت کی تھی۔۔۔ دل سے۔۔۔ صاف نیت سے۔ اور جن کی نیت صاف ہو ان کو ایسا پھل نہیں ملا کرتے جو مجھے ملا تھا۔ مجھے ایک بار ملیحہ سے ملنا تھا! اسے وہ سب بتانا تھا جو میرے ساتھ پیش آیا۔ میں وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کرنے لگا۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ میری بات ضرور سنے گی۔ سمجھ جائے گی۔ نرمین کے ساتھ میری شادی فقط ایک وقتی مصلحت تھی۔ سمجھوتا تھی۔

☆ ☆ ☆

میں ملیحہ ہمدانی سے ایک ملاقات ترتیب دے رہا تھا۔

"ضرور مل لو۔" کامران نے حوصلہ افزائی کی۔

"تم اسے کہیں باہر بلوا دو۔"

میں اور کامران وقت سے پہلے ہی مقررہ مقام پر پہنچ

گئے تھے۔ وہاں بیٹھے ہوئے اس کے انتظار کا ایک ایک پل صدیوں پہ محیط ہونے لگا تھا۔ کامران کے ساتھ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری تھی۔ میں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔ کامران معذرت کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔ اب ہم ایک دوسرے کے سامنے موجود تھے لیکن تمام الفاظ گم ہو چکے تھے۔ وہاں صرف خاموشی تھی۔ ایک دوسرے سے نظریں چرانے کا ایک سلسلہ تھا۔

"جو کچھ بھی ہوا' میرے اختیار سے باہر تھا۔" میں نے بہت لمبی خاموشی کے بعد کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" اس نے بہت مختصر جواب دیا تھا۔

"ملیحہ! میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

"فصیح! میں نے تمہیں معاف کیا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں نمی اترتے دیکھی۔۔۔ یا شاید یہ میرا وہم تھا۔

"میں نرمین کو طلاق دے دوں گا۔"

"کیوں؟" مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

"کیونکہ مجھے تم سے شادی کرنی ہے۔" میں چیخا۔

"لیکن مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔" اس کی پرسکون آواز نے میرے سر پہ بم پھوڑا۔

"لیکن کیوں؟"

"اس کیوں کا جواب تم جانتے ہو!"

"ملیحہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"شاید۔۔۔"

"تم جانتی ہو' وہ صرف ایک وقتی مصلحت تھی۔"

"تمہارے لیے ہوگی' تمہارے انکل اور نرمین کے لیے نہیں۔"

"لیکن اب میں انہیں یہ بات سمجھا سکتا ہوں۔"

"مجھے نہیں سمجھا سکتے۔" اس کا انداز۔۔۔ قطعی تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ اپنی عادت کے برخلاف آج وہ مسلسل مجھ سے نظریں چرا رہی تھی۔ میں بہت دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کے اتار چڑھاؤ کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"تو کیا میں یہ سمجھوں کہ میری محبت یک طرفہ تھی؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"سمجھ لو۔"

"جو کچھ ہمارے درمیان تھا' اس کے بعد میں یہ بات کیسے مان سکتا ہوں؟"

"خالہ نے سمیر کے لیے میرا ہاتھ مانگا ہے۔ میں انہیں مثبت جواب دے چکی ہوں۔" اب کی بار آسمان میرے سر پہ گرا تھا۔

"واٹ۔۔۔ ملیحہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو؟" میں بے ربط انداز میں بولنے لگا۔

"تم جانتی ہو میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گا؟ تم نے ایک بار بھی میرے بارے میں نہیں سوچا؟"

"تمہارا مسئلہ پتا کیا ہے فصیح؟" میں نے اس کی تلخ آواز سنی۔

"تم ایک مرد ہو! اور مرد صرف محبت کرنا جانتا ہے۔ اپنی محبت کو پانے کے لیے وہ اپنا سب کچھ داؤ پہ لگا دیتا ہے۔ ہر رشتہ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جب تک اپنی محبت پا نہیں لیتا' اسے چین نہیں آتا کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے وجود کو ادھورا محسوس کرنے لگتا ہے۔ عورت یہ سب نہیں کر سکتی۔ اسے معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے بہت سے بھرم رکھنے ہوتے ہیں۔ بہت سے رشتوں کا مان رکھنا ہوتا ہے۔ جس کی لاج رکھنے کے لیے وہ اپنی محبت بھی قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتی ہے کیونکہ وفا کے بغیر اس کا وجود ادھورا نہیں ہوتا' مٹ جاتا ہے!" وہ الفاظ نہیں تھے پگھلا ہوا سیسہ تھا جو وہ میرے کانوں میں انڈیل رہی تھی۔ میں درد کی شدت سے بلبلا بھی نہ سکا۔

"ماما پاپا ایک سال سے میری شادی کی فکر میں ہیں' لیکن میں انہیں روکے ہوئے تھی۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی۔ میں تمہارے انتظار میں تھی۔ تم سے وفا نبھا رہی تھی۔ پھر تمہاری شادی ہو گئی۔۔۔ شمسہ خالہ نے سمیر کے لیے

میرا رشتہ مانگا اور میں نے ہاں کہہ دی اور کیوں نہ کہتی؟ کب تک تمہارا انتظار کرتی؟ وہ بھی اس صورت میں جب تم شادی کر چکے تھے؟ مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گے۔ اگر ابھی سب کھو گے' جواب کہہ رہے ہو لیکن میں اب تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ تم نے نرمین سے اس لیے شادی کی کہ تمہارے تایا کے سوشل سرکل میں ان کی عزت داؤ پہ لگ گئی تھی۔ تم نے بروقت مدد کر کے ان کی عزت بچالی۔ اب تم ایک شادی شدہ مرد ہو۔ میں اپنے پاپا سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ تم ایک طلاق فائل کرنے کے بعد مجھ سے شادی کرو گے۔ اور پھر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تمہارے گھر والے مان جائیں گے؟ اگر مان جائیں گے تو اپنے دل میں میرے لیے جگہ بنا پائیں گے؟ میرے پاپا کا بھی ایک سوشل سرکل ہے' میں تم سے شادی کر کے ان کی عزت داؤ پہ نہیں لگا سکتی۔ اور پھر ایک مجبور لڑکی کو طلاق دلوا کر بسایا جانے والا میرا گھر کتنے دن چلے گا۔ میں اپنے ماں باپ کو اتنے اندیشوں میں ڈال کر تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

وہ مجھے آئینہ دکھا رہی تھی اور میں اس آئینے میں نظر آنے والے اپنے ہی عکس سے نظریں چرانے پہ مجبور ہو گیا تھا۔ اس کی آواز میرے سر پہ ہتھوڑے برساتی رہی اور میں شل ہوتے اعصاب کے ساتھ سنتا رہا۔ میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا میرے لب سل چکے تھے۔ وہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"فصیح حیدر! تمہیں اپنے تایا کی عزت اسی طرح پیاری ہے جس طرح مجھے اپنے باپ کی۔ تم نے ان کی عزت بچانے کے لیے ایک رشتہ باندھا ہے تو اس کا مان بھی رکھو۔ تم نے محبت کی ہے' اب وفا نبھانا بھی سیکھ جاؤ!"

وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ میں وہیں بیٹھا خود سے دور جاتے اس کے وجود کو دیکھتا رہا۔ اگر آج سے بائیس روز پہلے اس رات لاؤنج میں بیٹھے لوگوں نے مجھ سے میری زندگی چھینی تھی تو آج یہاں بیٹھے ملیحہ ہمدانی نے

میرے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

وہاں سے اٹھنے کے بعد میں گھر کیسے پہنچا تھا' میں نہیں جانتا۔ دو بار میرا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تھا لیکن میں گھر پہنچ گیا تھا "زندہ" اور "سلامت"

گھر جا کر میں اپنے کمرے میں بند ہو گیا اور بہت دیر تک بند رہا تھا۔ رات کو وہ جانے کون سا پہر تھا جب میں نے زرمین کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔

"چچی کہہ رہی ہیں' پی لو۔" وہ گلاس میری طرف بڑھائے کہہ رہی تھی۔ یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے اتنے دن میں مجھ سے کہا تھا۔ میں نے چپ چاپ گلاس پکڑ کر لبوں سے لگا لیا۔

گلاس پکڑانے کے بعد وہ وہیں ایک طرف صوفے پہ بیٹھ گئی۔ مجھے اس کی موجودگی سے کوفت ہونے لگی۔

"زرمین! تم انکل کی طرف کیوں نہیں چلی جاتیں؟" میں نے دل کی بات زبان سے کہہ ڈالی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"تم چاہتے ہو تو چلی جاتی ہوں۔" وہ یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں' نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" مجھے اپنے الفاظ کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ "تم سارا دن یہاں اکیلی ہوتی ہو' میں اس لیے کہہ رہا تھا۔" اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ پھر صوفے پہ بیٹھ گئی۔ ہمارے درمیان وہی خاموشی ٹھہر گئی' جو ہم دونوں کے وجود کا حصہ بن چکی تھی۔

"فصیح! ایک بات پوچھوں؟" میں نے بہت دیر بعد اسے کہتے سنا تھا۔

"پوچھو۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا تمہیں کسی سے محبت ہے؟" میں نے چونک کر سر اٹھایا۔

کیا میرا چہرہ ایسی کھلی کتاب بن گیا تھا جسے ہر کوئی پڑھ لیتا ہے لیکن اگر میرے چہرے پہ وہ تحریر اتنی واضح تھی تو اسے انکل صفدر یا کوئی اور کیوں نہ پڑھ پایا؟

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ صوفے سے اٹھ کر وہ سونے کی غرض سے بیڈ کے دوسرے کنارے پہ آ گئی۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ مجھ سے ایک سال بڑی تھی لیکن ہم اکٹھے پلے بڑھے تھے' ساتھ کھیلے تھے' ساتھ پڑھے تھے' بالکل دوستوں کی طرح۔ بڑے ہونے پہ ہمارے درمیان خود بخود تھوڑا فاصلہ آ گیا تھا اور اب اچانک یہ فاصلہ بڑھ کر ایک خلیج کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

"ہاں! میں نے محبت کی تھی۔" میں نے خود کو کہتے پایا۔ سائیڈ لیمپ بجھانے کے لیے بڑھا ہوا اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر میں اسے سب بتاتا چلا گیا۔ ہر بات کہتا چلا گیا۔ یونیورسٹی میں پہلی ملاقات سے لے کر آج تک کا واقعہ۔۔۔ میں نے سب کہہ دیا تھا۔

رات کے کس پہر میری آنکھ لگی مجھے خبر نہیں ہو سکی۔ اگلی صبح میں بہت دیر سے جاگا تھا۔ زرمین کمرے میں نہیں تھی۔ میں اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ جب میں کمرے میں واپس آیا تو اسے سامنے پایا تھا۔ وہ میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں سرخی اور سوجن کی جھلک نظر آئی جیسے وہ رات بھر جاگی ہو۔ میں نے اپنے خیال کو وہم سمجھ کر جھٹک دیا۔ وہ کمرے سے اپنی کچھ چیزیں اٹھا کر باہر نکل گئی تھی۔

مجھے یک دم اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ ملیحہ ہمدانی اپنی ۔۔۔۔ راہ الگ کر چکی تھی اور اب زرمین بھی جانے والی تھی۔ میں ہر بازی مکمل طور پر ہار چکا تھا۔ میں نہ محبت نبھا سکا تھا نہ کوئی رشتہ۔ میرا ہر درد' ہر قربانی رائیگاں ہونے جا رہی تھی۔ وہ ضرور رات بھر میری باتوں کو سوچتی رہی تھی اور یقیناً" اب تک کسی فیصلے پہ پہنچ چکی تھی۔

میں اسی سود و زیاں کے حساب میں مصروف تھا جب وہ ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوئی۔

"تمہارے لیے ناشتا لے آؤں؟" وہ مجھ سے یوں پوچھ رہی تھی جیسے یہ اس کا معمول تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔

"مجھے بھوک نہیں۔" میں کہہ کر اس کے رویے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں ایک بار پھر ناکام رہا۔ یک دم کمرے کی فضا بہت بوجھل محسوس ہونے لگی۔ میں اس گھٹن سے نکل کر لان میں جانے کے ارادے سے اٹھ کر باہر کی طرف بڑھا۔ کسی کے موبائل کی رنگ ٹون بج رہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ جی ماما میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں۔" زرمین کہہ رہی تھی۔ میں غائب دماغی سے سننے لگا۔

"جی ناشتا بھی کر لیا ماما! آپ فکر مند مت ہوا کریں۔۔۔ جی وہ بھی ٹھیک ہے' گھر پہ ہی ہے۔۔۔ ہاں ہم نے ساتھ ہی ناشتا کیا ہے۔" کمرے سے باہر نکلتے میرے قدم وہیں جم گئے۔ وہ یقیناً" میرے ہی بارے میں بات کر رہی تھی۔

"ہاں ضرور آؤں گی۔۔۔ جی میں پوچھتی ہوں اس سے لیکن شاید اسے آج پھر لاہور جانا پڑے۔۔۔ بتا رہا تھا کچھ کام ہے وہاں۔" میں اس کی بات پہ ۔۔۔ سناٹے میں آ گیا تھا۔ میں سکتے کے عالم میں وہیں کھڑا رہا۔

"فصیح! تم ٹھیک تو ہو؟" وہ سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"زرمین!" میں نے اسے پکارا۔

"ہوں؟"

"پتا ہے ملیحہ نے کل کیا کہا تھا؟" میں کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"کیا؟"

"مرد صرف محبت کرنا جانتا ہے۔ اپنی محبت کو پانے کے لیے وہ اپنا سب کچھ داؤ پہ لگا دیتا ہے۔ ہر رشتہ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جب تک اپنی محبت پا نہیں لیتا اسے چین نہیں آتا کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے وجود کو ادھورا محسوس کرنے لگتا ہے۔ عورت یہ سب نہیں کر سکتی! اسے معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے بہت سے بھرم رکھنے ہوتے ہیں۔ بہت سے رشتوں کا مان رکھنا ہوتا ہے۔ جس کی لاج رکھنے کے لیے وہ اپنی محبت بھی قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔" میں بہت دھیرے دھیرے بات مکمل کرنے کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔

"ملیحہ نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔"

ندامت بڑھنے لگی۔ میں نے اس سے نظریں چرائی تھیں۔ میں نے کل ملیحہ ہمدانی کو اپنی محبت قربان کرتے دیکھا تھا۔ آج میں زرمین صفدر کو رشتے نبھاتے دیکھ رہا تھا۔ میں محو حیرت تھا۔ زندگی کی بازی میں ایک ذرا سے غلطی نے کتنی جانوں کو متاثر کیا تھا۔ ان متاثر ہونے والوں میں دو عورتیں تھیں۔ ایک کی محبت لٹی تھی۔ ایک کے خواب ٹوٹے تھے۔ وہ دونوں اس کو قبول کر چکی تھیں۔ ایک فیصلے کے بعد اس پہ مکمل پیرا تھیں۔ اور میں؟ میں ابھی تک قسمت کے اس وار سے نڈھال زمین پہ اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ مجھے وہاں سے اٹھنا تھا ایک فیصلہ مجھے بھی کرنا تھا اور اس پہ قائم رہنا تھا۔

"زرمین!" میں نے اس عورت کو پکارا جو میری محبت نہیں تھی' لیکن میری بیوی بن چکی تھی۔ میرے نکاح میں تھی اور اس مقدس رشتے کا پاس رکھنا خوب جانتی تھی۔ میں اپنی زندگی میں آنے والی ایک عورت کو اس کی محبت نہیں لوٹا سکتا تھا' لیکن دوسری عورت کے خواب لوٹا دینا میرے اختیار میں تھا۔ فیصلہ ہو گیا تھا۔

"بولو۔" اس نے جواب دیا۔

"ہم شام کو انکل صفدر کی طرف چلیں گے۔" میں نے خود کو کہتے پایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک رنگ چمکا تھا۔

"تم میرے ساتھ چلو گے؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ہاں اب ہم ساتھ چلیں گے!" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ میں نے اپنے دل سے ایک بوجھ سرکتا ہوا محسوس کیا۔ میں اس کے ساتھ مسکرا دیا تھا۔

☆

مصباح نوشین

شانزہ اسے بہت دیر سے کام میں مصروف دیکھ رہی تھی۔ وہ اس قدر انہماک اور دل جمعی سے کام کر رہی تھی کہ شانزہ کو اس پر رشک محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ بریانی کو دم دے کر رائتہ بنا رہی تھی۔ پورے کچن کا پھیلاوا اس نے ساتھ کے ساتھ ہی سمیٹ لیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچن میں کافی دیر سے کوئی کام کیا ہی نہیں گیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو شانزہ کو اپنی جانب محویت سے تکتا پا کے مسکرائی۔

"ارے شانزہ۔ تم کب آئیں؟" وہ سل بٹے کو دھوتے ہوئے حیرت سے استفسار کر رہی تھی۔

"مجھے تو کافی دیر ہو گئی۔ تم اتنی محو ہو کام کرنے میں کہ تمہیں تو ارد گرد کی خبر ہی نہیں۔" وہ ہولے سے ہنسی۔

"ہاں بس۔۔۔ کیا کروں۔ دوپہر کے کھانے میں شیر زمان اکثر ہی دوستوں کو ساتھ لے آتا ہے۔ بھوک کا کچا ہے۔ صبر بالکل بھی نہیں کرتا۔ اسی لیے میں جلدی کرتی ہوں تاکہ وہ بھوکا نہ چلا جائے۔"

وہ صابن سے ہاتھ دھونے کے بعد دوپٹے کے پلّو سے ہاتھ صاف کرتے بولی۔

"تم اتنا کام کر کیسے لیتی ہو یار۔۔۔ میں حیران ہوتی ہوں۔ تم تھکتی کیوں نہیں۔" شانزہ نے اس کے چہرے کی تازگی و ملاحت کو دیکھتے استفسار کیا۔

"پتا نہیں۔۔۔ شاید تھکتی اس لیے نہیں کہ مجھے پتا ہے کہ ہر حال میں یہ سارا کام کرنا مجھے ہی ہے۔" وہ بے ساختہ ہنسی تو اس کے سفید موتیوں جیسے دانت اس کی خوب صورتی کو بڑھا گئے۔ شانزہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ وہ اپنے خاندان کی سب سے زیادہ حسین لڑکی تھی۔

"تو تم کوئی ملازمہ رکھ لو نا۔۔۔ یہاں پاکستان میں تو بہت سہولت ہے۔ نوکر مل جایا کرتے ہیں۔" شانزہ نے اپنے ریشمی براؤن بالوں میں انگلیاں چلاتے ادائے بے نیازی سے مشورہ دیا۔ وہ اس کے حسن بے پروا کو دیکھ کر رہ گئی۔

"شیر زمان جان نکال دے گا۔ اگر میں نے ملازمہ کا نام بھی لیا تو۔۔۔"

"واٹ۔۔۔!" وہ برٹش لہجے میں بے ساختہ اپنی حیرت کا اظہار کر گئی۔ "یہ تو بہت بڑی زیادتی ہے یار۔۔۔ میں بات کروں گی شیر زمان سے۔۔۔"

اس نے فوراً" نفی میں سر ہلایا۔

"رہنے دو۔۔۔ تم میرے لیے اتنی خواری مت اٹھاؤ۔ ویسے بھی مجھے عادت ہو گئی ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔۔۔ آج سے میں تمہارے ساتھ کام کروایا کروں گی۔"

"تم مہمان ہو ہماری۔۔۔" وہ ہچکچائی۔ شانزہ تھم سی گئی۔

"میں کزن ہوں تمہاری زرقا۔۔۔! میری جڑیں بھی یہیں ہوتی ہیں اسی گاؤں کی۔ اسی گھر سے میرا تعلق ہے اپنے ڈیڈ کی وجہ سے۔" شانزہ کو ہمیشہ کی طرح بہت تکلیف ہوتی۔ جب اسے ایک دفعہ پھر اس گھر میں مہمان کہا گیا۔ مطلب وہ جتنی بھی کوشش کر لے درمیان میں گزرے بیس سال یہ محیط اس طویل فاصلے کو پاٹ نہیں سکتی تھی۔ زرقا بس سر ہلا کے رہ گئی۔

یوں جیسے اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا کر رہی ہو۔۔۔؟" وہ اپنے کمرے سے تیار ہو کر باہر نکلی تو زرقا حسب توقع کسی کام میں مصروف ہی تھی۔ شانزہ اس کے پاس آئی تو دیکھا کہ اس نے کلف لگے کپڑوں کو ہلکا ہلکا تر کر کے رکھا ہوا تھا۔ شانزہ لمحے میں جان گئی وہ شیر زمان کے کپڑے تھے۔

"شیر زمان کے کپڑے پریس کر رہی تھی۔" وہ اسے دیکھ کے ہولے سے مسکائی۔ کام کرتے وقت ذرا سی بھی شکن اس کے ماتھے پر نہیں دکھتی تھی۔

"لاؤ۔۔۔ میں تمہاری ہیلپ کر دیتی ہوں۔" شانزہ خیر سگالی کے جذبے کے تحت کہتے فوراً" آگے بڑھی مگر زرقا نے ٹوک دیا۔

"رہنے دو یار۔۔۔! کلف لگے ہیں تم سے نہیں ہوں گے۔"

"تم مجھے چیلنج کر رہی ہو۔۔۔؟" شانزہ نے آنکھیں دکھائیں۔

"نہیں۔ خبردار کر رہی ہوں۔۔۔ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ شیر زمان کو شکن تک پسند نہیں اپنے کپڑوں میں۔۔۔ بہت احتیاط سے کرنا پڑتے ہیں۔" شانزہ نے "اچھا ٹھیک ہے" کہتے اس سے زبردستی استری لے لی تھی۔

"میں بہت اچھے کپڑے آئرن کرتی ہوں۔۔۔ یو ڈونٹ وری لندن میں اپنا سارا کام میں خود کیا کرتی ہوں۔" وہ اس کے ہاتھ سے استری لے کر مزے سے استری کر رہی تھی اور بہت اچھی کر رہی تھی۔

"شیر زمان کو اگر پتا چلے کہ اس کے کلف والے کپڑے اس کی لندن پلٹ کزن نے استری کیے ہیں تو

شاید وہ کبھی یقین ہی نہ کرے۔" زرقا نے حیرت سے اسے اتنے اچھے کپڑے پریس کرتے دیکھ کر کہا تھا۔

"مجھے ڈیڈ نے سب سکھایا ہوا ہے زرقا۔ اور مام نے بھی مجھے کبھی نہیں روکا۔ میں دنیا کا ہر کام سیکھنا چاہتی ہوں۔ دنیا کی ہر آسائش اور خوشی خریدنا چاہتی ہوں۔ ہے نا عجیب بات....."

"زندگی میں انسان ہر خوشی نہیں حاصل کرپاتا شانزہ!"

"میں کرسکتی ہوں اپنی ذہانت سے۔" وہ متانت سے مسکرائی مگر اس کے چہرے پر عجیب سے دکھ کے سائے لرزاں تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ دادی اماں کے کمرے میں رہا کرتی تھی اس نے خود فرمائش کر کے دادی اماں کے ساتھ رہنے کی فرمائش کی تھی۔ دادی اماں تو نہال ہی ہوگئی تھیں مگر شانزہ سے شاید زیادہ نہیں۔ وہ ایک ماہ کی چھٹی پر آئی تھی۔ ڈیڈ کے بعد مام نے اسے بالکل بھی پاکستان کے اس پسماندہ گاؤں آنے سے نہیں روکا تھا۔ وہ ان ماؤں میں سے تھیں، جو بچوں کو ہر طرح کی آزادی دے کر تجربے سے سیکھنے کی اجازت دیا کرتی ہیں۔ شاید کہیں نہ کہیں انہیں بھی اس بات کا اطمینان تھا کہ شانزہ جیسی نک چڑھی ڈسٹ الرجک لڑکی اس پسماندہ گاؤں میں ایک دن بھی نہیں رہ پائے گی۔ اکیسویں صدی کی آزاد کھلی فضا انہیں چھو کے بھی نہ گزری تھی۔ مگر وہ یہ بھول گئی تھیں کہ ان کی بیٹی عجیب تر ہے۔ وہ دنیا کا ہر تجربہ کرنا چاہتی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہونا چاہتی ہے۔

"دادو.....! ایک بات تو بتائیں..... یہ شیر زمان اتنا غصیل کیوں ہے۔ جب دیکھو ماتھے پر تیوری چڑھائے پھرتا ہے۔" دادی اماں اس کے چہرے پر بیزاری کا رنگ نمایاں دیکھ کر مسکرا دیں۔

"چھوٹی عمر میں بڑی بڑی ذمہ داریاں اٹھا رہا ہے میرا بچہ۔ ہنسنے مسکرانے کا اسے وقت ہی نہیں ملا اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اوائل جوانی میں اڑنے کی خواہش کو پس پشت ڈال کے اس نے ذمہ داریوں کا طوق گلے میں پہن لیا۔"

دادی اماں کو اس بات کا بہت افسوس تھا کہ شیر زمان پر وقت سے پہلے ہی بہت زیادہ ذمہ داریاں ڈال دی گئیں۔ شانزہ نے انہیں یوں دکھی دیکھا تو ہلکے پھلکے لہجے میں بول پڑی۔

"اب اتنا بھی چھوٹا نہیں ہے..... لندن میں تو اٹھارہ سال کا ہوتے ہی بچے اپنا خرچ خود اٹھانا شروع کردیتے ہیں۔ والدین کی کفالت کا ذمہ ختم ہوجاتا ہے۔ مجھے دیکھیں! اٹھارہ سال کی عمر سے جاب کرکے کما رہی ہوں۔" وہ دھپ سے ان کی مسہری پر ان کے قریب آلیٹی۔ انہوں نے بے ساختہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

"ہائے میری بچی! عبدالرحیم اور سلطانہ نے کتنا ظلم کیا تمہارے ساتھ۔ چلو شیر زمان کے والدین تو اللہ کی رضا جان کے راہ عدم کے مسافر بنے تھے مگر تمہارا باپ اور ماں تو زندہ تھے۔" شانزہ برابر مسکرا رہی جبکہ دادی کافی دیر تک کف افسوس ملتی رہیں۔

دوسرے ہی روز جب وہ چھت پر کھڑی دور لہلہاتی سرسبز فصلوں کا نظارہ کررہی تھی تو شیر زمان چلا آیا۔ دس روز ہوگئے تھے اسے آئے ہوئے اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ گھر میں نظر آرہا تھا۔ شانزہ اسے دیکھ کر خیر مقدمی سے مسکرائی۔

"کیسی ہو؟" وہ گھنی مونچھوں تلے عنابی ہونٹوں کو متانت سے ہلکا سا پھیلاتے بولا۔ وہ اچھا خاصا ہینڈسم تھا۔

"بالکل ٹھیک اور آپ جناب کو یاد آگئی کہ ایک بے چاری سی کزن اتنی دور سے ملنے کے لیے آئی ہوئی ہے اسے بھی ٹائم دینا ہے۔" وہ لڑاکا بیویوں والے انداز میں کہتے شیر زمان کو بہت دلچسپ لگی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی یہ کزن اتنی بے تکلف ہے جبکہ چہرے سے وہ نک چڑھی اور مغرور دکھتی تھی۔

"سوری ڈیئر کزن..... آج کل بس کچھ نئی فصلوں کی بوائی کا موسم ہے تو اسی میں بہت مصروف رہا ہوں۔ اب آج سے اس غلطی کا ازالہ اچھی طرح سے کروں گا اور ویسے بھی تم نے تو مجھے سڑیل مشہور کردیا ہے کہ میں ہر وقت غصے میں رہتا ہوں اور ہر وقت میرے ماتھے پر غصے سے بل پڑے رہتے ہیں۔" اس نے شگفتہ انداز میں شانزہ کے چہرے پر حیرت و شرمندگی کو یکجا دیکھا۔

"اوہ گاڈ..... دادو..... ان کے پیٹ میں بات کیوں نہ ٹکی۔" وہ حیرت سے بولی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ دادو اس کی بات اسی طرح شیر زمان تک پہنچائیں گی۔ شیر زمان اسے شرمندہ شرمندہ سا دیکھ کے ہنسا۔

"سوری شیر زمان۔" اس نے لب بھینچے۔

"آؤ..... تمہیں کہیں باہر لے چلوں۔" شیر زمان مسکراتے ہوئے اسے آفر کررہا تھا اور یہ پہلی بار تھا کہ اس نے کسی بھی لڑکی کو یوں بے تکلفانہ اپنے ساتھ چلنے کی آفر دی تھی۔

"کہاں؟" شانزہ کو بہت اچھا لگا۔

"کچھ خاص دکھانے۔" وہ فوراً راضی ہوگئی۔

وہ دونوں نیچے آئے تو زرقا صحن میں چھڑکاؤ کرکے جھاڑو لگا رہی تھی۔ کچی مٹی کی خوشبو نے سانسیں معطر کردی تھیں۔ شانزہ نے رک کر ٹھنڈی گہری سانس اندر کھینچی۔ شیر زمان نے اسے دلچسپی سے دیکھا اور شیر زمان کی اس دلچسپی کو زرقا نے.....

"مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کتنی سکون آور اور فرحت بخش ہوتی ہے نا شیر زمان!" وہ سانس اندر اتارتے ہوئے شیر زمان سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں۔ اپنے وطن کی مٹی یونہی فرحت و اپنائیت کا احساس دلاتی ہے۔ آؤ چلیں۔ دیر ہورہی ہے۔" شانزہ شیر زمان کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اس نے ایک بار بھی زرقا کو ساتھ چلنے کی آفر نہیں کی بلکہ شاید اس نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ زرقا ان دونوں کو جاتا دیکھتی رہی۔ جھاڑو اس کے ہاتھ سے نیچے چھوٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

اور پھر یہ روز ہونے لگا۔ شیر زمان اب زیادہ تر گھر میں رہنے لگا اور وہ جتنی بھی دیر رہتا شانزہ کے اردگرد ہی منڈلاتا رہتا۔ شانزہ زرقا کے ساتھ مل کر کام کرواتی۔ وہ کھانا پکانا سیکھ رہی تھی۔ پاکستانی ڈشز شوق سے پکاتی۔ وہ جیسی بھی پکتیں۔ شیر زمان شوق و رغبت سے کھانے کے علاوہ تعریفیں بھی کرتا۔ زرقا کو حیرت ہوتی۔ اس نے زرقا کے پکائے کھانوں کی آج تک تعریف نہیں کی تھی مگر شاید یہ مغربی حسن تھا جس کا جادو اس کے سر پر چڑھ کے بول رہا تھا۔

زرقا کچن میں برتن دھو رہی تھی اور شانزہ اپنے اور شیر زمان کے لیے چائے بنا کے لے گئی تھی۔ شیر زمان شاید کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ ہال کمرے میں وہ کھڑا زرقا کو آوازیں دے رہا تھا۔ زرقا کو بہت دنوں بعد اس نے پکارا تھا۔ ورنہ تو اس کی آدھی سے زیادہ ذمہ داری اب شانزہ نے سنبھال لی تھی۔

"یہ..... کپڑے دھوئے ہیں تم نے؟" وہ اسے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"داغ تو اتارے ہی نہیں اور استری بھی دیکھو کیسے کی ہے۔ ساری سلوٹیں نظر آرہی ہیں۔"

زرقا نے بہت غور سے اپنی غلطی دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ سامنے والی جیب کے اوپر ہلکا سا بے حد مدھم تیل کا نشان لگا تھا اور وہ بلیچنگ پاؤڈر ختم ہوجانے کی وجہ سے اسے اتار نہیں پائی تھی اور رہی کپڑوں کی سلوٹوں کی بات تو یہ وہی سوٹ تھا جو شانزہ نے استری کیا تھا۔ حالانکہ اس نے کافی اچھا کیا تھا لیکن شیر زمان نے وہ سوٹ کافی دنوں کے بعد پہنا تھا تو اسی لیے اس کی تہیں جم گئی تھیں۔ زرقا خاموشی سے شرٹ لینے آگے بڑھی۔

"شیر زمان..... اتنا معمولی سا تو داغ ہے..... بالکل نظر نہیں آرہا۔" شانزہ نے زرقا کے چہرے کی طرف دیکھا تو بول اٹھی۔

"یہ معمولی داغ کیا ہوتا ہے۔ داغ 'داغ ہی ہوتا ہے اور وہ بدنما ہی لگتا ہے اور وہ چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔" شانزہ نے اپنا وجود سناٹوں کی زد میں محسوس کیا

پھر زرقا کی طرف دیکھا۔ وہ آنسو پیتی خاموشی سے اس کے دوسرے کپڑے نکالنے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"لاؤ۔ میں یہ داغ اُتار دیتی ہوں۔" وہ آہستگی سے کہتی اس کی طرف اس کے ہاتھ سے قمیص لینے بڑھی۔

"رہنے دو۔۔۔ تم نہیں کرپاؤگی۔۔۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔

"جی نہیں۔۔۔ میں ہر کام کرلیتی ہوں اور دنیا کا ہر مشکل کام میں بآسانی کرسکتی ہوں۔"

"اچھا۔۔۔!" شیر زمان کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ لہجہ آپوں آپ گمبھیر ہوگیا۔

"یہاں رہ سکتی ہو ہمیشہ کے لیے۔۔۔ میرے سارے کام کرنے کے لیے۔۔۔" وہ ۔۔۔ کیا کہہ گیا تھا۔ شانزہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"آپ جانتے ہیں' آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اچھی طرح سمجھتا بھی ہوں۔" وہ سینے پر دونوں ہاتھ لپیٹے دلچسپی و وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ وہ چمک شانزہ کے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی اور قوس قزح کے کئی رنگ شرم سے سر جھکانے سے پہلے اس کے چہرے پر بآسانی دیکھے جاسکتے تھے اور ان رنگوں کو زرقا نے بھی دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

شیر زمان اور شانزہ کی منگنی کی خبر نے سب پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری کردی تھی۔ دادی بار بار شانزہ اور شیر زمان کا ماتھا چوم کر نہال ہوجاتیں۔ شانزہ کے مام ڈیڈ نے بھی شانزہ کی مرضی پر بات ڈال دی تھی۔ ویسے بھی ان کے مطابق زندگی ان دونوں نے آپس میں گزارنی ہے' سو مطمئن ہو کے فیصلہ بھی وہی کریں۔ زرقا کی آنکھیں اب اکثر ہی نم رہا کرتی تھیں۔ بہت بچپن سے ہی اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ وہ شیرو کی دلہن بنے گی۔ وہ اس کی پھوپھی زاد تھی۔ اپنی ماں کی وفات کے بعد جب اسے اس کے ماموں اپنے گھر لے آئے تھے تب انہوں نے اپنی ماں کے ساتھ بھی وعدہ کیا تھا پھر اب جانے سب لوگ وہ وعدہ کیوں بھول گئے تھے۔ وعدہ کرنے والے اس دنیا میں نہیں رہے تھے' مگر وعدے کی پاسداری کرنے والے تو موجود تھے۔ پھر؟

"تم نے ٹھیک کہا تھا' تم دنیا کی ہر خوشی حاصل کرسکتی ہو۔" اس رات زرقا' شانزہ کے پاس آئی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم اور سرخ تھیں۔ شانزہ نے اسے کسی قدر حیرت سے دیکھا۔

"تم بہت ذہین ہو شانزہ۔۔۔ تم اپنی ذہانت سے کسی کا سب کچھ چھین سکتی ہو۔۔۔ حتیٰ کہ کسی کی زندگی کا حاصل بھی' اس کی متاعِ جان بھی۔" وہ رو رہی تھی بے تحاشا' مگر شانزہ کو اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"میں نے کیا کیا ہے زرقا؟"

"زندگی چھین لی تم نے میری۔۔۔" وہ روتے روتے چلائی۔ شانزہ دم بخود تھی۔

"بچپن سے میں شیر زمان کے نام سے سانس لے رہی ہوں۔ اسے کیا پسند ہے کیا ناپسند۔۔۔ میں اس کا خیال رکھتی رہی ہوں۔ وہ میرا ہے' صرف میرا۔ اس بات کا یقین کیے خود کو اس کی پسند میں ڈھالتے اردگرد حتیٰ کہ خود سے بھی بیگانہ ہوگئی تھی۔ میں کیا ہوں۔ میری کیا خواہش ہے۔ میری کیا پسند ہے۔۔۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ شیر زمان کو کیا اچھا لگتا ہے۔ اس کی کیا پسند ہے۔ میں بس یہ یاد رکھتی ہوں۔ میں نے ایک عمر تیاگ دی خود کو اس کی پسند و معیار کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اور تم نے کتنی آسانی سے آکے اسے مجھ سے چھین لیا۔۔۔ تمہیں تو دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی شانزہ! تمہارے لیے تو ایک دنیا پڑی ہے' مگر میری دنیا تو ایک شیر زمان تھا اور تم نے میری ہی دنیا کو اپنی دنیا بنانے کا ارادہ کرلیا۔۔۔"

وہ روتی تڑپتی چلی گئی۔ شانزہ کے اندر سناٹا اتر گیا۔ آنِ واحد میں زرقا نے شانزہ کی پوری ہستی کو ہلا ڈالا تھا۔ وہ تو یہاں محبتوں کی سفیر بن کے آئی تھی' جو کوتاہی اس کے والدین نے بیس سال رابطہ نہ کرکے کی تھی' اس کا مداوا کرنے' مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ انجانے میں زرقا کی دنیا اندھیر کررہی ہے۔ جو اس کے من کی خوشی و مرضی تھی' اسے کیا معلوم تھا کہ زرقا کے من کے سنگھاسن پر بھی اسی ۔۔۔ کا راج ہے۔ وہ فوراً "زرقا کے پیچھے گئی۔ وہ خود غرض نہیں تھی۔ تنگ دل بھی نہیں تھی اور غاصب تو بالکل بھی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"اگر تمہاری دنیا شیر زمان ہے زرقا۔۔۔ تو وہ تمہارا ہی رہے گا اسے تم سے کوئی بھی نہیں چھینے گا۔" لندن واپس آتے وقت اس نے محبت سے زرقا کو گلے لگاتے کہا تھا۔ زرقا نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ اس نے آخر ایسا کیا کہا تھا شیر زمان سے کہ اس نے زرقا سے شادی کرنے کا فیصلہ لیا تھا۔

"میں نے تمہیں تمہارا شیر زمان لوٹا دیا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اسے کیسے سمیٹتی ہو۔" جہاز میں بیٹھے واپسی کے سفر میں اس نے زرقا کے تصور سے ہمکلام ہوتے سرگوشی کے سے انداز سے کہا تھا۔

"اور شیر زمان۔۔۔" شانزہ کی آنکھ سے آنسو موتی بن کے گرا۔ وہ کتنا بے یقین ہوا تھا وہ سب سن کے۔ شانزہ جانتی تھی وہ اس کی پشت پہ تادیر نگاہیں جمائے کھڑا رہا تھا اور شانزہ نے مڑ کے بھی نہیں دیکھا تھا کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ پیچھے مڑ کے دیکھ لیتی تو یقیناً" پتھر کی ہوجاتی اور اسے پتھر نہیں ہونا تھا بلکہ زرقا کی پلکوں پر شیر زمان کے ساتھ کے خواب سجانے تھے۔

اس نے کہا تھا "شیر زمان۔۔۔ کل ساری رات میں سو نہیں پائی۔۔۔ رہ رہ کے ایک بات مجھے پریشان کرتی رہی۔ ہم نئی زندگی کی شروعات کررہے ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ماضی سے اچھی طرح واقف ہوں۔۔۔ اسی لیے میں ایک سچ تم سے کہنے آئی ہوں۔ ایک حقیقت تاکہ تم اس حقیقت کو مدِنظر رکھ کے کوئی فیصلہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کل کو تمہیں پچھتانا پڑے اور اگر تم بعد میں پچھتائے تو مجھ سے برداشت نہیں ہو پائے گا۔"

ضبط کی انتہا پر کھڑے اس نے بہت مشکل سے تمہید باندھی تھی۔ شیر زمان الجھ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہ رہی ہو شانزہ۔۔۔ اتنی لمبی تمہید؟"

"شیر زمان۔۔۔!" وہ ایک قدم آگے بڑھ آئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تمہیں کپڑوں پر معمولی سی شکن اور داغ برداشت نہیں ہوتا نا؟"

شیر زمان کا سر بے ساختہ اثبات میں ہل گیا۔

"اسی لیے تمہیں بتا رہی ہوں عجب میں سولہ سال کی تھی تو میری زندگی میں کوئی آیا تھا۔۔۔ میرا پہلا بوائے فرینڈ۔۔۔ تب میں ناسمجھ تھی اور کچھ میرا ماحول بھی ایسا تھا کہ میں ایک کنواری لڑکی کی حدود و قیود نہیں جانتی تھی۔ مجھ سے غلطی ہوئی تھی شیر زمان! باوجود اس کے کہ اس کے بعد میں بہت محتاط ہوگئی لیکن۔۔۔"

شیر زمان نے اپنا ہاتھ بے ساختہ شانزہ کے ہاتھ سے چھڑا لیا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا تھا مگر شانزہ نے اس کے چہرے پر لکھی تحریر بآسانی پڑھ لی تھی۔ جو شخص معمولی سی سلوٹ اور داغ برداشت نہ کرسکے' وہ کیسے ایک داغ دار لڑکی کو اپنا سکتا تھا۔۔۔ دوسری ہی صبح شانزہ کی واپسی سے بھی پہلے اس نے اپنا فیصلہ دادی اماں کو سنا دیا تھا۔

شانزہ خوش تھی کہ وہ زرقا سے کیے وعدے کی پاس داری میں معتبر ٹھہری تھی۔ وہ کسی کی خوشیاں جلا کے اپنا گھر نہیں بسا سکتی تھی لیکن۔ بہت سال پہلے پڑھی نظم اس کے ہونٹوں پر مچلنے لگی تھی۔

آؤ درد کو تباہ کریں
آؤ دعا کریں
آؤ شرط لگائیں
ہم غم کی تھکاوٹ کو دور رکھ سکتے ہیں
لیکن ہمیں یہ بھی مان لینا چاہیے
کہ ہم شکست خوردہ ہیں۔۔۔!

☼

زندگی عجیب ہے اور دنیا گول ہے' اسے پتا تھا زندگی عجیب ہے' مگر اسے ابھی پتا چلا کہ دنیا گول ہے' جب وہ دفتر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھی تب بھی سب وہی تھا جب وہ گاڑی سے اتر کر مال گئی تب بھی سب ٹھیک تھا۔۔۔ مگر واپس آتے ہوئے راستے میں جب بارش ہو رہی تھی اور جب وہ فٹ پاتھ پہ چھتری لیے کھڑا تھا۔ تب اسے لگا جیسے دنیا گھوم رہی ہے جیسے اس کی نظر چکرا رہی ہے۔ مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ وہی تھا' وہ اس کو دیکھ کر حیران تھا۔ شاید اس کی نگاہ میں بھی دنیا

سدرۃ المنتہیٰ

ڈراما ختم

گھوم رہی ہو گی شاید وہ بھی یقین کرنے میں اسی مشکل کا شکار ہو گا۔ مگر شاید ایسا نہ تھا۔

وہ دوڑتا ہوا اس کے پیچھے ہوٹل کا دروازہ کھول کر داخل ہوا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کونے والی میز پہ آ بیٹھی۔ سامنے کی طرف سے اس کی پشت تھی۔ وہ اسے دور سے دیکھتا ٹیبل تک آیا تھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"مبینہ۔۔۔ مبینہ۔۔۔ تم کیسی ہو؟" وہ تیز تیز چلنے کے سبب ہانپ رہا تھا۔

"اب یہ مت کہنا کہ تم مجھے نہیں پہچان پائیں۔۔۔ یہ مت کہنا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ مبینہ تم تو ویسی کی ویسی ہو۔"

وہ بہت ایکسائٹڈ تھا۔ بہت پرجوش' بہت خوش خوش سا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔۔۔ وہ اسے دیکھتی رہی جب یقین آگیا کہ وہ وہی طاہر تھا تو خاموشی سے بیگ میز سے اٹھایا اور گاڑی کی چابیاں مٹھی میں بند کیں۔ سیل فون پرس میں رکھا اور بغیر ایک لفظ کہے کھڑی ہو گئی۔

"مبینہ۔۔۔ پلیز رکو مجھ سے بات کرو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو ہم بہت عرصے بعد ملے ہیں!" وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"پلیز مبینہ رک جاؤ۔۔۔ دو منٹ صرف دو منٹ مبینہ!"

اس کے قدم اس کے ساتھ ساتھ تیز ہو رہے تھے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے باہر آیا ہوٹل سے باہر پارکنگ تک۔

"مبینہ! ایک منٹ پلیز صرف ایک منٹ۔" وہ گھوم کر آئی گاڑی میں بیٹھی۔

اس نے پھرتی سے دروازہ کھولا اور بیٹھ گیا۔

"اتریں گاڑی سے میں آپ کو نہیں جانتی آپ کون ہیں۔ گاڑی سے اتریں ورنہ میں یہاں کسی گارڈ کو آواز دیتی ہوں۔"

"مبینہ تم ایسا کیوں کر رہی ہو۔۔۔ کیا تم میری بات بھی نہیں سنو گی۔ پرانی دوستی کے ناتے۔ اس تعلق کے ناتے جو ہم میں کئی سال رہا۔"

"میں نے کہا نا کہ میں آپ کو نہیں جانتی۔ کیا آپ

نے سنا نہیں یا سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک بار پھر سن لیں ۔۔۔ میں آپ کو نہیں جانتی۔ اب اتریں پلیز ۔۔۔ ورنہ مجھے کسی کو بلانا پڑے گا۔"

"تم وہی ہو۔ یقین نہیں آرہا۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا دروازہ کھولا وہ ناچار اتر گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

وہ دور کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ وہ دیکھتا رہا۔

وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے پلیئر آن کیا۔

شام سے پہلے آنا ۔۔۔ عالمگیر کی آواز گونجی گاڑی میں

دھوپ ساری ڈھل رہی ہو
پھول سارے کھل رہے ہوں
موسم سارے لے آنا
اس کی آنکھوں کے آگے دھند چھا رہی تھی
پھر وہی دن آئے ہیں
جانے کیا لے آئے ہیں
جیون میرا ۔۔۔ سارا تیرا
جینا تو اک بہانہ ہے

اسے بار بار آنکھیں صاف کرنا پڑی تھیں تاکہ سکرین صاف نظر آئے۔

اک تیرے آجانے سے
مل رہے ہیں زمانے سے
جیون میرا سارا تیرا
دور اب کیا جانا
شام سے پہلے آنا

دھوپ ساری" اس نے ہاتھ بڑھا کر پلیئر بند کر دیا۔ آنکھوں سے کتنے دنوں بعد پھر وہی سیلاب باہر آیا تھا۔

جو یاد نہیں کرنا چاہا وہی سب یاد کیوں آنے لگا تھا۔ گاڑی سے گھر تک گھر سے بستر تک اور رات تک وہ تیز بخار میں جل رہی تھی۔

"کیا میری مشکلوں کا کبھی خاتمہ نہیں ہو گا؟" بخار میں کروٹیں بدل بدل کر وہ یہ سوال کس سے پوچھ رہی تھی ۔۔۔ خود سے یا پھر خدا سے ۔۔۔؟

☆ ☆ ☆

ساری مشکلیں، سارے کڑے وقت اسے یاد تھے

جب وہ بارہ سال کی تھی اور اس کی ماں دو جڑواں بچوں کو جنم دے کر مر گئی تھی، اس کی موت کی اصل وجہ کیا تھی۔ اس کا ٹھیک طرح سے نہ علاج ہوتا یا پھر اور کچھ ۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا تھا۔ انہیں بچہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان کو ٹھیک غذا نہ ملی۔ وہ کمزور تھیں سوکھی لکڑی کی طرح اور جب ڈاکٹر نے کہا۔ "بچہ کو بچا سکتے ہیں یا ماں کو۔" تو اس کے باپ نے بچے کو ترجیح دی اور اس نے ماں کو کھو دیا۔

زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اس کے ساتھ تب پیش آیا تھا۔

وہ اس صدمے سے شاید بہت دیر بعد نکلتی اگر وہ خاتون نہ ہوتیں جنہوں نے اس کی ماں کو بیٹی بنایا تھا ماں کے جانے کے بعد وہ عورت اس کا حوصلہ بنی رہی۔ اسے سمجھاتی رہی، حوصلہ دیتی رہی۔

اس کے باپ نے سمجھا تھا عنقریب وہ دوسری شادی کر لے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا، مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا، دوسرا حادثہ اس کے باپ کا ٹرک ایکسیڈنٹ جس میں اس کی ٹانگیں ضائع ہو گئیں ماں کا جو بچا کھچا زیور تھا۔ وہ باپ کے علاج پر چلا گیا۔ اس کا باپ کچھ بہتر ہو کر گھر آگیا تھا۔ مگر معذوری اور محتاجی نے ساری امید توڑ دی۔ تب بھی وہ زندگی سے ہاری نہیں تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اپاہج باپ کی خدمت اور دو چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال اور ساتھ میں اس کی پڑھائی جسے کسی صورت وہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

ابھی تو وہ صرف ساتویں میں تھی ۔۔۔ ابھی تو اسے بہت پڑھنا تھا۔ بہت آگے جانا تھا اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے۔ کبھی وہ لکھ رہی ہوتی اور وہ دونوں رونا شروع ہو جاتے ۔۔۔ وہ پریشان ہو جاتی۔

"ابا! آفاق فیڈر نہیں پی رہا۔ حرا مسلسل روئے جا رہی ہے۔"

اور وہ اسے جھڑک دیتا ۔۔۔ اپنی بیماری کا سارا غصہ اس پر نکال دیتا۔ سارا دن بڑبڑاتا رہتا اور چھوٹے بچوں کو برا بھلا کہتا رہتا جو کبھی اس کی خواہش تھی اب اس کے لیے عذاب اور بوجھ بن گئے تھے۔ پھر وہ بڑی اماں کی طرف دوڑ لگاتی۔

"بڑی اماں! آفاق فیڈر نہیں لے رہا۔ حرا روئے جا رہی ہے ۔۔۔ میں کیا کروں؟" انہیں اس معصوم سی ماں پر رحم آجاتا اور وہ آکر اس کے ساتھ کچھ دیر بچوں کو سنبھالتیں جب تک وہ کچھ اور بنا کر آتی۔

بڑی مشکل سے وہ تین سال روتے روتے گزرے ۔۔۔ اب اسے یہ تسلی تھی کہ وہ دونوں بڑے ہو رہے ہیں۔ کچھ تو وہ آسانی سے گھر کا کام کر لے گی یا پڑھ لے گی۔ بورڈ کے امتحانات اس نے کس افراتفری میں دیے یہ صرف اسے پتا تھا۔ ابا کہتا تھا پڑھائی چھوڑ دے مگر وہ کیسے چھوڑ دیتی، اس کا بہت سا پڑھنا اس کی ماں کا خواب تھا۔ اگر وہ نہ پڑھتی تو اپنے بہن بھائیوں کو کیسے پڑھاتی۔

ایک دن وہ بھی آیا۔ جب وہ دونوں آہستہ آہستہ چیزیں پکڑ کر چلنے لگے اور بات کرنے لگے ۔۔۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ دوڑ کر بڑی اماں کے پاس جاتی۔ "آج آفاق نے یہ جملہ بولا۔ آج حرا نے یہ کہا ۔۔۔ وہ تیز تیز دوڑتی ہے۔" وہ اسے خوش دیکھ کر خوش ہو جاتیں۔

ابا کو کچھ بتاتی تو الٹا بیزاری دیکھنے کو ملتی۔ اسے یہی فکر تھی کہ بچے بڑے ہو رہے ہیں تو ساتھ خرچے بڑھ رہے ہیں۔ گو کہ اس نے سمجھ داری کے ساتھ خرچے کا حساب رکھا ہوا تھا۔ اپنی ضرورتوں سے بچا بچا کر ان کے لیے رکھتی اور ان کی ضرورتیں پوری کرتی۔

ایک دن وہ بھی آیا جب وہ دونوں کے ہاتھ پکڑے اسکول لے جا رہی تھی جب ان دونوں کے ہاتھ میں کتاب تھی اور اس کی خوشی کا تب بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ کتابوں کی بائنڈنگ کرتی تھی۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی اور ان پیسوں سے وہ ان دونوں کے لیے رنگین کہانیوں کی کتابیں، کلر پنسلز اور کورس کی کتابیں لیتی، وہ ساری چیزیں جو لینے کے لیے اس کا دل کرتا تھا اور وہ لے نہ پائی تھی۔ وہ ساری چیزیں وہ ان کے لیے لیتی تھی۔ ویسے کپڑے جو اسے نہیں ملے تھے۔ وہ ان کو دلاتی تھی۔

پانچویں کے بعد اس نے ان دونوں کو ایک درمیانے درجے کے پرائیویٹ اسکول میں ڈال دیا تھا اور اپنی خواہشیں تو کیا ضرورتیں بھی مار کر وہ ان کا خرچا پورا کرتی تھی۔

رات کو سوتے وقت وہ دونوں اس کے بازو پر لیٹ کر کہانی سنتے ہوئے سو جاتے تھے اور وہ دیر تک جاگتی رہتی اور اپنے ذہن میں سارے اخراجات، پیسے، ارادے اور خواب ترتیب دیتی رہتی ۔۔۔ گنتی پھر الٹی ہو جاتی۔

وہ پھر سے نئے حساب کتاب میں جت جاتی۔ اسے اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے بہت تھوڑی رقم رکھنی ہوتی باقی اضافی اپنے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔

وہ تقدیر کے بنائے سیدھے راستے پر چلتی رہی۔ مگر آگے اس کے لیے مشکلات کا دور تھا۔ رنگین چکا چوند دنیا تھی، کالج کا دور اور لڑکیوں کے لیے حسین ترین تھا مگر اس کے لیے ایک کڑا امتحان۔

زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا جب اس کی نسبت اس کے ماموں زاد طاہر کے ساتھ طے ہوئی۔ کہنے کو اک اور نئی بات سوچنے کو اک اور فکر۔ دیکھنے کو اک اور خواب۔ جھیلنے کو ایک اور مصیبت۔ لوگ۔

لڑکیاں۔ سہیلیاں۔ کالج فرینڈز باتیں۔ سرگوشیاں۔
خواب اور چھوٹی چھوٹی خواہشیں ایک طرف ۔۔۔ اور
دوسری طرف ۔ گھر دو بہن بھائی (بچے) ابا۔ کام کاج
ذمہ داریوں کا بوجھ فکر احساس پڑھائی اور پل پل رنگ
بدلتی زندگی' ایک فکر نہیں ہٹتی تو دوسری سر اٹھاتی۔
ایک امتحان ختم نہیں ہوا تو دوسرا شروع' ایک
ضرورت پوری نہیں ہوئی تو سو ضرورتیں اور نکل
آئیں' مگر ان سارے مسائل کے ہوتے ہوئے چند
مسکراہٹیں تھیں' ان بچوں کی حوصلہ تھا۔ عزم تھا اور
زندگی میں نیا آنے والا ایک شخص جو بالکل اجنبی تھا۔
جسے جاننا باقی تھا۔ گو کہ زندگی گزارنے کا کوئی ایک بہانہ
نہیں تھا۔ سو بہانے تھے۔

☆ ☆ ☆
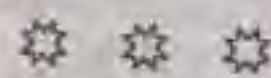
وہ پہلی بار ملنے کے لیے آیا تھا اور اس کے پاس
بولنے کے لیے جیسے کچھ تھا ہی نہیں' وہی مسلسل بولتا
رہا تھا۔

"میری ماں تمہیں اتنا پسند نہیں کرتیں' ان کی نظر
میں تم میرے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ مگر میرے
ابا تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔۔۔ ان کی نظر میں تم
سے زیادہ لائق فائق شاید ہی کوئی ہو اور میری نظر میں
تم کیا ہو؟ کیا یہ نہیں پوچھو گی؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا بھولپن سے۔

اسے سخت برا لگا تھا اس کا ایسا کرنا۔

"تم واقعی اتنی بھولی ہو یا ڈراما کر رہی ہو؟"

"مجھے ڈراما کرنا نہیں آتا۔" اب کی بار وہ خفگی سے
بولی۔

"تو پھر بولو نا جو تمہارے دل میں ہے میرے لیے
اچھا برا جو بھی؟"

"میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔" اس نے صاف
گوئی سے کام لیا تھا۔

"تم مجھے پسند کرتی ہو یا ناپسند ۔۔۔ یہی بتا دو۔" وہ
آسان زبان پر اتر آیا۔

"نہ پسند نہ ہی ناپسند۔" اس کا وہی انداز تھا۔

"تم میرے بارے میں کچھ تو سوچتی ہو گی نا!" وہ
عاجز آگیا۔

"کچھ بھی نہیں سوچتی۔۔۔"

"کیا تم سوچتی ہی نہیں ہو سرے سے؟"

"میں سوچتی ہوں اور بہت سی باتیں۔۔۔"

"تو پھر وہی بتا دو۔۔۔" اس کی شکل دیکھنے والی تھی۔

"حرا کے لیے کتابیں کتنی ہیں' آفاق کے لیے
کپڑے چاہئیں۔ کل ٹوٹل اتنا خرچ ہوا' ابا کی دوائیاں
لانی ہیں۔ فائنل امتحانات سر پہ کھڑے ہیں۔ وغیرہ
وغیرہ۔ یہ سب سنتے ہوئے آپ کو ذرا مزا نہیں آئے
گا۔" اس بار وہ خود کہتی ہوئی مسکرائی تھی۔

"چلو تمہیں یہ تو پتا ہے کہ یہ سب سنتے ہوئے مجھے
مزا نہیں آئے گا۔ اچھا میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟" وہ
سیدھا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"ٹھیک لگتے ہیں۔"

"بس ٹھیک۔" اس کا منہ لٹک گیا "یونیورسٹی میں
بہت لڑکیاں مجھ پہ مرتی ہیں۔
دیکھو میں اسمارٹ ہوں' پڑھا لکھا ذہین بندہ ہوں۔
ایک خوش حال گھرانے سے تعلق ہے میرا کیا تمہیں
مجھ میں ایک بھی اچھائی نظر نہیں آتی؟"

"آپ اپنی تعریف سننا چاہتے ہیں لڑکیوں کی طرح۔"

"نہیں لڑکیوں کی طرح نہیں۔ ہر انسان اپنی
تعریف سننا چاہتا ہے۔
اچھا چلو چھوڑو۔ میں تمہیں بتاؤں' ہماری شادی
کب ہو گی؟" وہ رکا۔ "میری پڑھائی کے ڈھائی
سال باقی ہیں' پھر میں جاب کروں گا اندازاً تین چار
سال تو لگ جائیں گے ابھی میں بائیس کا ہوں پھر میں
چھبیس کا ہو جاؤں گا تم ابھی انیس کی ہو گی یا اٹھارہ کی تم
بھی کچھ بڑی لگنے لگو گی۔ پھر ہم شادی کریں گے ٹھیک
ہے۔ چار سال لمبا عرصہ ہے نا!" وہ کافی افسوس سے یہ
سب بتانے لگا۔

"مجھے ایف اے نہیں کرنا۔ مجھے ایم اے کرنا ہے
اور کمیشن کا امتحان دینا ہے میں بہت پڑھنا چاہتی ہوں۔

"چلو پھر تم پی ایچ ڈی کر لینا، بھلے جب تک میں بوڑھا ہی ہو جاؤں۔"

"نہیں میں اس سے بھی زیادہ پڑھوں گی۔" وہ جان بوجھ کر مسکرائی۔

"تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

"میں اب چلتی ہوں بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔ ابا نے کھانا نہیں کھایا ہوگا۔" وہ فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی اور بغیر کچھ کہے سنے چل دی۔

پہلی ملاقات کچھ اچھا تاثر نہ قائم کر سکی تھی۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرا تھا۔ ان کے درمیان کا رشتہ بہت مضبوط اور پائیدار ہوتا جا رہا تھا۔

کالج کی لڑکیاں اسے سو مشورے دیتی تھیں اور خود اس نے اپنی ہم عمر لڑکیوں کو ایسا ہی پایا تھا۔ اس کے پڑوس کی لڑکیاں آئے دن رنگ گورا کرنے والی کریمیں فارمولے بنواتیں۔ سج سنور کر باہر جاتیں۔ شوخ چنچل ادائیں، ذو معنی جملے۔ اسے کبھی کبھار افسوس سا ہوتا ان سب پر۔۔۔ مگر اسے اپنے کام سے کام تھا۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے کئی باتیں تھیں۔ کئی مسئلے تھے۔ کالج سے یونیورسٹی کا سفر اور اس کی بڑھتی ہوئی بے شمار ذمہ داریاں۔

☼ ☼ ☼

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ بہت دیر سے فائل ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔

"کام کے متعلق تو ہم بات کر چکے ہیں عمیر صاحب!"

"نہیں کام سے ہٹ کر در اصل میری اماں اور باجی آپ کے گھر آنا چاہتی ہیں۔ آپ کے بڑوں سے ملنے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں نیچے تھیں۔

"میرے تو کوئی بڑے نہیں ہیں۔" وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

"آپ کی بہن اور بھائی۔۔۔ بھائی کا ایڈریس دے دیں۔ میں مل لوں گا۔"

"میری بہن لاہور میں ہوتی ہے اور بھائی بھی مجھ سے چھوٹا ہے آپ کو کیا بات کرنی ہے ان لوگوں سے، جو بات کرنا ہے مجھ سے کر لیں۔"

"وہ بات یہ ہے کہ۔" اس کے ہاتھ اب باقاعدہ کانپنے لگے تھے۔

"ٹائم ختم ہو رہا ہے، مجھے گھر کے لیے نکلنا ہے۔ آپ سوچ لیں پھر بات کر لیجئے گا۔" وہ فوراً" ہی اٹھی تھی سیٹ سے۔

"میڈم! میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ فٹ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے اٹھتے ہی۔

"بہت برا مذاق ہے۔" اسے برا لگا تھا۔

"مذاق نہیں ہے حقیقت ہے۔"

"آپ نارمل نہیں ہیں عمیر صاحب! جاتے ہوئے ڈاکٹر کی طرف ہو آئیے گا۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ اگر آپ کو سوچنے کے لیے وقت چاہیے تو لے لیں۔"

"آپ ٹھیک نہیں ہیں۔۔۔ جائیں آرام کریں۔ شاباش گھر جائیں۔"

"میڈم پلیز، میں سنجیدہ ہوں۔" اس کی شکل رونکھی سی ہو گئی۔

"آپ کو شادی ہی کرنی ہے نا!" وہ دروازے کے پاس رک کر بولی۔

وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"اس شہر میں آپ کو اپنی عمر کی کئی لڑکیاں مل جائیں گی۔ میرے ساتھ آئندہ ایسا مذاق نہ کیجئے گا۔"

"مگر مجھے آپ۔۔۔"

"کام۔۔۔ دفتر میں صرف کام ہوتا ہے اوکے!" وہ اس کی بات کاٹ کر آگے بڑھی۔

"میں آپ کے گھر آجاؤں گا بات کرنے کے لیے۔"

"کوشش بھی مت کیجئے گا آنے کی میں اکیلی رہتی ہوں۔"

"اپنی اماں کو بھیج دوں گا یا باجی کو پلیز۔۔۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میری طرف سے قطعی انکار ہے۔" وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔

"دماغ خراب ہے لوگوں کا۔ شادی کر لیں۔ پاگل لڑکا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل آئی اور گاڑی میں بیٹھی گاڑی اسٹارٹ کی۔ جب اسی ہوٹل کے سامنے سے گزری تو عجیب سا احساس ہوا۔

ہوٹل کے باہر گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے سامنے سے گزرتی ہوئی گاڑی دیکھ کر وہ گاڑی بھی اس کے پیچھے پیچھے گھر تک آئی تھی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے گاڑی دیکھی تھی اسے لگ رہا تھا۔ عمیر اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہو گا۔۔۔ مگر نہیں اس میں اتنی ہمت کہاں تھی۔ یہ وہی تھا جو اس کے پیچھے آیا تھا۔ اتنی ہمت اسی کی تھی۔

☼ ☼ ☼

آفاق نے بورڈ میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی، حرا مناسب نمبروں سے پاس ہو گئی تھی وہ بہت خوش تھی، اس نے پہلی مرتبہ طاہر کو فون کیا اور بتایا وہ دونوں کے لیے تحفے لے آیا تھا، طاہر ان کے ساتھ گھل مل گیا تھا، وہ گھر آتا تو یہ دونوں اسے گھیر کر بیٹھ جاتے اور گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے، وہ دور بیٹھی مسکراتی رہتی، طاہر بھی قہقہے لگا رہا ہوتا تو کبھی بری بری شکلیں بناتا۔ وہ ان تینوں کے چٹکلوں سے محظوظ ہوتی رہتی۔

فارغ اوقات میں وہ دونوں کو اپنے ساتھ گھمانے پھرانے لے جاتا، وہ ہر طرح سے مطمئن اور خوش تھی طاہر کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور وہ جاب کی تلاش میں تھا۔

وہ ہر ہفتے لمبی کال کر کے اسے جاب مل جانے کی دعا کے لیے کہتا، اسے ہر ہر بات بتاتا۔ بظاہر بے معنی فضول سی باتیں تھیں جن میں وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ مگر لہجہ اور تعلق سب سے اہم تھا، وہ اسی تعلق میں بندھتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

طاہر کو جاب مل گئی تھی اور اس نے شور مچایا ہوا تھا۔ اب اس کا آخری بہانہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ مگر ان ہی دنوں ابا کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اور کچھ دن بعد علالت کے دوران ان کا انتقال ہو گیا تھا، کچھ دن وہ بہت ڈسٹرب رہی، بہت زیادہ، وہ جیسا بھی تھا اس کا باپ تھا اور ان دنوں وہ اس سے بہت باتیں کرتا تھا۔ اسے لگا وہ اکیلی سی ہو گئی ہے، مگر وہی کام جھمیلے ذمہ داریاں تھیں جو اپنے پاس کھینچ لیتی تھیں آفاق اور حرا کے اداس چہرے تھے، جس کی وجہ سے اور بھی مضبوط بننا پڑا تھا۔

کچھ ماہ بعد پھر طاہر کی طرف سے شادی کی رٹ شروع ہو گئی تھی اس نے بڑی مشکل سے منا کر اس سے وقت لے لیا تھا اپنی تعلیم مکمل ہونے تک، وہ بہت خفا تھا مگر کچھ دن بعد اس کا رویہ کچھ نارمل ہو گیا تھا۔ اس کی ناراضی بہت لمبی چلتی تھی، مگر جب وہ مان جاتا تو اس سے اچھا کوئی اور نہ ہوتا بات یہ نہ تھی وہ عجیب تھا۔ اہم بات یہ تھی وہ خاندان کے سارے لڑکوں سے اچھا تھا، شکل میں بھی، کردار میں بھی، حیثیت میں بھی، کیریئر میں بھی وہ ہر طرح سے مطمئن تھی اسے لگتا تھا کہ سب کچھ اسی طرح چلتا رہے گا ان دونوں کے درمیان کوئی ایسی دیوار حائل نہیں ہو گی وہ سب کچھ ٹھیک کر لے گی۔ بس کچھ عرصہ۔ تھوڑا وقت۔

وہ اس کی زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا۔ اسے یونیورسٹی کی طرف سے لیکچرر شپ کی آفر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو تھے اس نے طاہر کو سرپرائز دینے کے لیے بلایا۔ اسے پتا تھا وہ بہت خوش ہو گا۔ وہ ٹھیک شام چار بجے پہنچ گیا تھا۔ حرا اور آفاق گھر پہ نہیں تھے آفاق حرا کو فارم دلوانے لے گیا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت اچھی سی چائے اور گرما گرم سموسے لے کر آئی تھی اور ساتھ ہی یہ خوش خبری سنا ڈالی۔ طاہر کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

"تم خوش ہو نا طاہر؟"

"تو اب تم جاب کرو گی؟" اس نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا۔

"ہاں میں تو سمجھ رہی تھی جاب کے لیے مجھے بہت

انتظار کرنا پڑے گا بہت دھکے کھانے پڑیں گے۔ طاہر نہ پوچھو آج میں کتنی خوش ہوں۔"

"تمہیں شادی نہیں کرنی؟" وہ سپاٹ لہجے میں پوچھنے لگا۔

"شادی تو ہونی ہے۔ جاب اور شادی الگ الگ باتیں ہیں۔"

"الگ نہیں ہے کچھ بھی۔۔۔ تم یہ بتاؤ، تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہے یا یہ جاب کرنی ہے؟" اس کا لہجہ ویسا ہی تھا۔

"تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو طاہر؟" اسے یہ سب سننے کی امید نہ تھی۔

"میں اسی ماہ شادی کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے امی سے بات کرلی تھی۔ میں نے ڈیٹ بھی سوچ لی تھی۔ میں تم سے یہی بات کرنے آیا تھا کل مجھے کارڈز چھپوانے پریس جانا تھا۔ اس کے بعد مجھے تم سے کچھ مشورے کرنے تھے۔۔۔ پھر تمہیں شاپنگ کے لیے لے جانا تھا۔ تمہیں اپنے ٹرانسفر کا بتانا تھا۔ ٹھیک سولہ دن بعد میں ایک نئی زندگی شروع کرنے جارہا تھا۔ میرے پاس کاموں کی فہرست تھی۔ مگر میں نے یہ سب ترتیب دے رکھا تھا میں بہت تھکا ہوا تھا۔ مگر میں نے سوچا یہ تھکن کچھ وقت کی ہے۔ مگر مجھے ابھی تم نے بتایا کہ سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم نے سوچا ہوتا ہے۔"

اس کا چہرہ بہت اترا ہوا تھا تھکن زدہ سا۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔ وہ چھت کو گھورنے لگا تھا اس نے مبینہ کے چہرے سے آنکھیں ہٹالی تھیں۔

"طاہر! تم نے جو سوچا ہے وہی ہوگا۔" وہ اٹھ کر اس سے کچھ فاصلے پر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ جو اپنے گھٹنوں پر رکھے تھے۔ ان ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"کیا تم صرف چند منٹ خاموش ہو کر میری بات سن لوگے؟" اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔

"طاہر! میں بڑی مشکل سے گھر کے اخراجات پورے کر رہی تھی۔ اپنے دونوں بہن بھائی کی تعلیم کے لیے میں نے پہلے جو قرضہ لے رکھا ہے وہ بھی اتارنا ہے۔ میں پریشان تھی کہ یہ سب کیسے ہوگا۔"

وہ سانس لینے کو رکی۔ اس کے ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھوں کو جکڑے ہوئے تھے۔ اسے ڈر تھا وہ بات ختم کرے گی اور وہ یہاں سے اٹھ جائے گا' وہ اسے روک لینا چاہتی تھی۔

"تم نے کبھی مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ مجھے کچھ بتاؤ۔" اس کا شکوہ بجا تھا اپنی جگہ۔

"میں نے کبھی اپنی پریشانیوں سے تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہا۔"

"تم نے کبھی مجھے اپنا ہی نہیں سمجھا۔" اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ مبینہ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کل رات میں نے رو رو کر اپنے اللہ سے دعا کی۔ پہلی مرتبہ میں نے اس سے کہا کہ میری ہمت جواب دے رہی ہے۔ پہلی مرتبہ کہا کہ میں تھک گئی ہوں۔ اس سے پہلے سوچتی تھی کہ میں کرلوں گی۔ میں سہ لوں گی صبح بھی میں بہت پریشان تھی جب پروفیسر صاحب نے مجھے بلایا تھا۔ وہاں جا کر یہ خوش خبری ملی تم نہیں جانتے یہ میرے لیے معجزہ تھا۔ دعا اتنی جلدی قبول ہو سکتی ہے میں نے کبھی اپنی زندگی میں معجزوں کو نہیں ہوتے دیکھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے تمہیں فون کیا۔ میں نے حرا اور آفاق کو بھی نہیں بتایا۔"

"تم نے کبھی دعا میں مجھے نہیں مانگا۔ اس لیے کہ میں تمہارے پاس تھا یا پھر اس لیے کہ تمہیں میری اس قدر ضرورت نہ تھی۔ یا پھر اس لیے کہ تمہیں میری قدر ہی نہیں۔" اس نے آنکھیں کھول کر ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے تمہاری قدر ہے طاہر۔ میں صرف تمہیں اتنا بتا رہی تھی کہ مجھے اس جاب کی کس قدر ضرورت ہے تم اس کے علاوہ جو کہو میں ماننے کے لیے تیار ہوں۔

میں شادی کر رہی ہوں تم سے اسی تاریخ کو بس ایک شرط کہ میں یہ جاب کروں گی۔ اس لیے کہ مجھے اپنا قرضہ اتارنا ہے۔"

"میں تمہارا قرضہ اتار دوں گا۔"

"یہ قرضہ میں ہی اتاروں گی میرے بہن بھائی تمہاری ذمہ داری نہیں ہیں طاہر!"

"تم نے ان کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ یہ سب انہیں خود کرنا چاہیے۔ سوچنا چاہیے کہ تمہیں اپنا گھر بسانا ہے۔ بہرحال میں دعوا نہیں کرتا مگر جہاں تک ہوسکا ان کی مدد کردوں گا۔ میرے کچھ قریبی دوست بھی اس سلسلہ میں مدد کرسکتے ہیں۔"

"بس کرو طاہر!" اس کے ہاتھ کھسک سے گئے۔

"انہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مر نہیں گئی۔ وہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

"تمہیں انتخاب کرنا ہوگا۔ وہ اور جاب میں اور میری محبت۔"

"طاہر! میرے لیے مشکلات مت بڑھاؤ میں نے پالا ہے انہیں میں ہی ان کا سب کچھ ہوں۔"

"اور میں کہیں نہیں ہوں، کچھ نہیں ہوں۔" وہ بپھر گیا تھا۔

"تم جو سوچتے ہو۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ ایسا مت کرو طاہر! فضول ضد کی خاطر ہمارے رشتے کو کمزور مت کرو۔"

"ضد بھی تم نے کی ہے اور کمزور بھی تم نے بنایا اس رشتے کو، مجھے کل تک تمہارا آخری جواب چاہیے۔ ہاں یا نہ۔"

"طاہر! میری بات تو سنو۔۔۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہے مبینہ! مجھے بس اپنا آخری جواب دے دینا۔ ہوگا وہی جو تم چاہو گی۔ مجھے کوئی وضاحت نہیں چاہیے۔ بہت انتظار کیا ہے میں نے۔ ہر ضد مانی ہے تمہاری ہر بات اگر ہم اس قدر متضاد ہیں

تو کوئی ایک فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ اور فیصلے کا حق میں تمہیں دیتا ہوں کل شام تک۔" کیسی سنگدلی سے وہ کہہ کر چلا گیا۔ حالانکہ اس کی آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

اور آنکھیں تو اس کی بھی نم تھیں۔ وہ کھلے دروازے بند کرتا چلا گیا۔ کل شام تک کا وقت دے کر

باقی کا وقت اس پر قیامت کی طرح گزرا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے سمجھا تھا طاہر کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ مان لے گا اس کی ہر بات اس کا غصہ وقتی ہے وہ اسے منا لے گی۔

مگر یہ صرف اس کی سوچ تھی ٹھیک اسی تاریخ پر طاہر کی شادی ہوئی مگر اس کے ساتھ نہیں کسی اور کے ساتھ۔ اس کی ماں کی مرضی سے' طاہر شادی کے فوراً" بعد اس شہر سے کہیں اور چلا گیا جہاں اس کا ٹرانسفر ہوا تھا۔

زندگی نے اسے جو دکھ دیے تھے یہ دکھ سب سے بڑا تھا پھر بھی سہ ہی لیا۔ اس سب سے یہ ہوا کہ اس کا مردوں کے اوپر سے اعتماد اٹھ گیا تھا اور وہ اب بھی کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی تھی۔ اس کی توجہ کا واحد مرکز وہی تھے جن کی خاطر اب تک وہ جیتی آرہی تھی۔ آفاق بہت محنت سے پڑھ رہا تھا۔

جبکہ حرا نے ایف اے بمشکل پاس کیا اور گھر بیٹھ گئی۔ ان ہی دنوں حرا کی دوست کے بھائی کا رشتہ آیا تھا اس کے لیے لڑکے والوں کا اصرار دیکھ کر اس نے ہامی بھرلی اور شادی ہو گئی۔ حرا بہت خوش نظر آرہی تھی' اسے اطمینان تھا کہ اس کی شادی اس کی مرضی سے ہوئی ہے۔ اب آفاق کا مسئلہ تھا اس نے بھی یونیورسٹی کی ایک لڑکی پسند کرلی تھی آفاق کے کہنے پر وہ اس کا رشتہ لے کر گئی پہلی ملاقات میں تو علینہ کی ممی نے بہت عجیب باتیں کی تھیں اسے بہت دکھ ہوا مگر آفاق کی خاطر اسے بار بار وہاں جانا پڑا۔ ان کی شرط تھی کہ وہ شادی سے پہلے شہر میں کسی اچھے سے علاقے میں شفٹ ہوں۔ یہ اس کے لیے بہت مشکل تھا مگر آفاق کی ضد پر اسے گھر تبدیل کرنا پڑا شادی آفاق کی تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد ہوئی تھی۔ علینہ کی ممی کی سفارش پر علینہ کے بھائی نے آفاق کو اپنے دفتر میں جاب دے دی۔ ان دونوں نے مل کر چھوٹا سا بزنس بھی شروع کر دیا تھا۔ بزنس اچھا چل رہا تھا حالات پہلے سے بہت بہتر تھے۔ اس نے ایک فلیٹ بھی لے لیا تھا اور اسے کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ آفاق شادی کے بعد خوش تھا۔ اس نے علینہ کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کی تھی۔ نہ اس پہ کوئی گھر کی ذمہ داری ڈالی نہ دباؤ۔ دو سالوں بعد جب اس کے ہاں خوش خبری آئی تو اس نے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا اسے' پھر علی کے پیدا ہوتے ہی کئی کام اس نے اپنے ذمے لے لیے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ مگر اچانک علینہ کو جانے کیا ہوا کہ سب کچھ بگڑتا گیا پتا نہیں کیوں وہ اس کا صرف ہونا بھی برداشت نہیں کر پائی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیوں آئے ہو یہاں تم؟" اسے نہ چاہتے ہوئے بھی دروازہ کھولنا ہی پڑا تھا کہ وہ مسلسل باہر کھڑا بیل پہ بیل بجا رہا تھا۔ وہ اندر آگیا۔

"تمہیں اتنے عرصے بعد دیکھا تو رہا نہ گیا۔ بہت ڈھونڈا تھا تمہیں۔ تمہیں پتا ہے میں کئی سالوں سے تم سے ملنے کی دعا کرتا رہا ہوں۔" وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بول رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" وہ دروازہ بند کر کے اندر آگئی۔

"شکریہ۔۔۔ مبینہ جو ہوا بہت غلط ہوا۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کیسے وضاحت دے۔

"کیا غلط ہوا۔ میرا تم پر بھروسا کرنا۔ تم سے درخواست کرنا یا پھر تمہارا اچانک دھوکا دینا۔" وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں نے ایسا کبھی سوچا تک نہ تھا کہ۔۔۔"

"جو کچھ سوچا نہیں وہ کر دکھایا۔۔۔ بہت خوب!"

"کاش تم میری بات مان لیتیں یا پھر کاش میں ضد نہ کرتا۔"

"تمہارا کیا بگڑا ہے طاہر یہ تو بتاؤ۔ شادی ہو گئی بچے بھی ہوں گے۔"

"ہاں۔ ایک بیٹی آٹھ سال کی۔ بیٹا نو دس سال کا۔"

"مکمل فیملی۔ نوکری' پیسہ' بچے کیا کچھ رہتا ہے۔۔۔؟"

"کچھ اب بھی رہتا ہے مبینہ! دوستی بھروسا محبت' پہلی محبت جو کبھی بھلائی نہیں جاتی ہے۔"

"اچھا ڈراما ہے۔"

"کیا تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا تھا۔"

"بس کرو طاہر! تب میں اور اب میں بہت فرق ہے۔ ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ تم دو بچوں کے باپ بن چکے ہو اب ایسی باتیں سوٹ نہیں کرتیں تم پر۔"

"اڑا لو مذاق۔۔۔ حق ہے تمہیں۔" وہ پھیکا مسکرایا۔

"تمہیں مجھ سے کیا بات کرنی تھی؟" وہ چاہ رہی تھی وہ بات کر کے جلدی سے جائے۔

"معافی مانگنا چاہتا تھا تم سے۔۔۔ تمہیں دکھ دیا میں نے۔"

"کر دیا معاف اب تم جا سکتے ہو۔" لہجہ رکھائی لیے ہوئے تھا۔

"اتنی آسانی سے؟ میں تو سمجھ رہا تھا تم مجھ سے لڑو گی۔ مجھے برا بھلا کہو گی کچھ تو کہو تاکہ میرا دل بھی ہلکا ہو۔"

"اس سب کا کوئی فائدہ نہیں ہے اب۔۔۔ میرے کچھ بھی کہنے سے وہ مشکل وقت واپس نہیں آئے گا نہ آسان ہو گا۔"

"مجھے احساس ہے مبینہ! اسی لیے یہ بے چینی مجھے مکمل خوش ہونے نہیں دیتی نہ سکون سے رہ پاتا ہوں۔"

"میں بہت خوش ہوں اب تم سکون سے رہنا۔۔۔ اب تم جاؤ۔"

"بار بار جانے کو کہہ رہی ہو۔ کیا چائے بھی نہیں پلاؤ گی مجھے؟"

"آخری بار میں نے چائے پلانی چاہی تھی وہ کپ جو ویسا کا ویسا پڑا رہ گیا تھا۔"

"مجھے اس کپ کی اب ضرورت ہے۔"

"تمہاری بیوی کو چائے بنانا نہیں آتی۔۔۔؟" وہ اٹھی تھی۔

"وہ باتیں بنا لیتی ہے' اتنا کافی ہے۔" وہ ہنسا تھا اس کی بات پہ۔

"شوہر کبھی بیویوں سے خوش نہیں ہوتے۔"

"بیویاں بھی کبھی شوہروں سے خوش نہیں ہوتیں۔"

"میں بالکل بھی نہیں چاہوں گی کہ تم اپنی بیوی کی برائیاں کرو اور میں سنوں۔" وہ کچن میں آگئی تھی۔

"اور لوگ کہاں ہیں؟" وہ باہر آتے ہوئے اردگرد دیکھنے لگا اور اس کے پیچھے کچن میں آیا۔

"کون لوگ؟" وہ چائے کے لیے پانی رکھنے لگی۔

"آفاق' حرا شادی ہوئی ان میں سے کسی کی؟"

"حرا کی ایف اے کے فوراً" بعد شادی ہو گئی تھی۔ دو بچے ہیں اس کے۔۔۔ آفاق کا ایک بیٹا ہے دو سال کا ہو گا اس ماہ۔"

"تمہارے ساتھ نہیں رہتے۔ کہاں ہیں؟"

"اپنے اپنے گھر میں ہوتے ہیں۔ حرا لاہور میں ہے آفاق اسی شہر میں۔"

"تم آفاق کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟"

"میں ان کی فیملی میں مخل ہونا نہیں چاہتی۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ کیا اس کی بیوی کو اعتراض ہے؟"

"تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس لیے کہ میری بیوی کو بھی میری ماں کے ساتھ رہنے پر اعتراض ہے۔"

"میں ماں نہیں ہوں ان لوگوں کی۔"

"ہاں تب ہی تم نے اتنی قربانیاں دیں ان کے لیے۔"

"میں نے اپنا فرض نبھایا تھا۔"
"اور جب ان کے فرض نبھانے کا ٹائم آیا تو۔"
"اپنی باری پر کون پیش ہوتا ہے۔ تم بھی تو چلے گئے تھے۔" اس نے چائے کپ میں ڈال کر اسے پیش کی۔
"تمہارے فریج میں کوئی کھانے کی چیز نہیں' میں صبح سے بھوکا ہوں۔" اس نے خود ہی فریج کھول لیا تھا اور دیکھنے لگا۔ پھر ایک سیب صاف کرکے کھانے لگا۔ وہ اس کی بے تکلفی پر حیران تھی۔
"ایک بات پوچھوں مبینہ..... شادی کیوں نہیں کی؟"

"تمہارے بعد کسی سے محبت ہی نہیں ہوئی۔ کوئی اچھا ہی نہیں لگا۔ یہی سننا چاہتے ہو نا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہے۔ تمہارے دھوکے کے بعد کسی مرد پر اعتبار نہیں آیا۔ کئی رشتے آئے۔ کئی لوگ۔ آج صبح بھی میرے ایک کولیگ نے مجھے پروپوز کیا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر عجیب تھکی تھکی سی مسکراہٹ تھی۔
"تو کرلو نا شادی؟" وہ کھاتے کھاتے رکا۔
اس بار وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔
"کب کررہی ہو پھر شادی۔"
"سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے۔" اس نے صاف جھوٹ بول دیا۔
"اچھی بات ہے زیادہ دیر مت لگانا۔" وہ مسکرا کر چائے کے گھونٹ لینے لگا۔
"بلانا ضرور۔" اس نے چند منٹ میں کپ خالی کردیا۔
"ضرور بلاؤں گی۔" وہ اس کے ساتھ کچن سے باہر آئی تھی۔
"اپنے بچوں کو میرا پیار دینا۔ اللہ حافظ۔"
"میں پھر آسکتا ہوں؟" عجیب بات تھی' وہ پوچھ رہا تھا جبکہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ اب یہاں نہیں آسکتا تھا۔
"مبینہ! اپنا خیال رکھنا۔ ایک بات کہوں۔ آفاق نے اچھا نہیں کیا۔"

"پتا نہیں کس نے اچھا نہیں کیا اور سنو پلیز آئندہ یہاں مت آنا۔ میں نہیں چاہتی کوئی یہاں فضول باتیں کرے میرے لیے۔"
"سمجھ گیا۔ بات تو ہو سکتی ہے نا۔ میرا کارڈ رکھ لو۔"
اس نے کارڈ جیب سے نکال کر تھمایا جو مبینہ نے لاپروائی سے میز پر پھینک دیا اس کے سامنے ہی۔
"تمہارا نمبر۔" اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔
اس نے پرس سے کارڈ نکال کر پکڑا دیا۔ حالانکہ اسے پتا تھا اس نے کبھی فون نہیں کرنا۔
اس کے باہر نکلتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور لمبی سانس لی۔ تنہائی عذاب ہوتی ہے۔ کسی کی کہی ہوئی بات یاد آئی تو مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس نے رسٹ واچ اتار کر ڈریسنگ پر رکھی' کوٹ اتار کر پھینکا' دوپٹہ بیڈ پر ڈالا اور بال باندھنے لگی' چہرے پر سالوں کی تھکن چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور کھلی دراز میں کچھ ٹٹولنے لگی۔
کھویا کیا تھا۔ شاید کچھ بھی نہیں یا پھر شاید بہت کچھ۔

☆ ☆ ☆

"آپا! رکیں آپا! مجھے ذرا آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ لاؤنج کے دروازے کے پاس کھڑی تھی جب وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آرہا تھا۔
"بولو..... کالج سے دیر ہو رہی ہے مجھے۔" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو آدھا گھنٹہ پہلے ہی لیٹ تھی۔
"آپ بیٹھ جائیں ذرا دو منٹ میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔" وہ تیزی سے اترنے کی وجہ سے ہانپ رہا تھا' بات کرتے ہوئے۔
"خیریت ہے نا چلو تو پھر گاڑی میں بات کر لیتے ہیں۔" اس کی عجلت اور فکر مندی سے اسے لگ رہا تھا کوئی کاروباری مسئلہ ہو گا۔

"ڈرائیور کے سامنے میں پرسنل میٹر تو ڈسکس

نہیں کر سکتا نا..... آپ بیٹھ جائیں بس پانچ منٹ پھر شام میں ویسے بھی مجھے علینہ کو باہر لے کر جانا ہو گا وہ بہت خفا ہے مجھ سے۔" وہ کہتے ہوئے صوفے کی طرف بڑھا۔
"کیوں وہ کیوں خفا ہے؟" وہ کچھ نا سمجھتے ہوئے بیٹھ گئی۔
"میں بہت دنوں سے اسے لے جانے کا کہہ رہا ہوں اس کی ممی کے پاس مگر وقت نہیں ملتا کہ سے ٹائم نہیں دے پاتا میں۔" اس کا لہجہ عجیب تھا۔
"بات کیا کرنی ہے بتاؤ۔"
"آپا..... وہ بات یہ ہے کہ دیکھیں' میری پوری بات سنیے گا۔"
"تمہیں اگر کہنے میں اتنی دیر لگے گی تو ہم رات کو بات کر سکتے ہیں۔"
"نہیں..... اچھا' سنیں آپ کی علینہ سے کوئی بات ہوئی ہے؟"
"علینہ سے..... کس قسم کی بات؟"
"دیکھیے آپا وہ شاید جا رہی تھی اپنی ممی سے ملنے اور آپ نے اسے منع کردیا۔ آپ نے کیوں ایسا کیا؟"
"میں کیوں اسے منع کروں گی اور میرے منع کرنے پر اسے کون سا رک جانا ہے۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ تمہیں بتا کر جائے یا پوچھ کر ہم گھر پہ جو نہیں تھے پھر علی کی طبیعت خراب تھی میں نے کہا رات میں باہر نکلو گی تو بچے کو ٹھنڈ لگ جائے گی احتیاط کرے اس نے تم سے کہا کہ میں نے منع کیا ہے؟" اسے تعجب ہو رہا تھا۔
"اس نے تو اور بھی بہت کچھ کہا ہے مجھے۔"
"مثلاً؟" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔
"مثلاً" یہ کہ آپ اسے ہر چھوٹی بڑی بات پہ ٹوکتی ہیں' روکتی ہیں ہر چیز میں دخل اندازی کرتی ہیں' وہ ڈسٹرب ہوتی ہے آپا..... وہ ایسے ماحول سے نہیں آئی جہاں گھر کے فرد ایک دوسرے کے مسائل اور پرائیویسی میں دخل دیتے ہوں۔ مڈل کلاس لڑکیوں کی طرح ہر کام پوچھ کر کرنے کی عادت نہیں ہے اسے۔"

"اگر نہیں ہے تو اس نے ایک مڈل کلاس لڑکے سے شادی کیوں کی؟"
"آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔"
"کیوں نہیں کہنا چاہیے..... ہم مڈل کلاس سے ہی تعلق رکھتے ہیں میرے بھائی! یہ بات الگ ہے کہ اب ہماری کلاس بدل رہی ہے۔ بہرحال میں کسی کلاس والاس کو نہیں مانتی میں صرف رولز اور اقدار کو مانتی ہوں۔ تم نے کلاس کی بات کی تو میں نے تمہیں تمہاری زبان میں جواب دے دیا۔ بہرحال اب میں چلتی ہوں تم نے ایک بیکار بحث کے لیے میرا وقت خراب کردیا۔ آج میری میٹنگ تھی ضروری....."
"میری ایک بات سن لیں آپا! آپ پلیز اس کے کسی معاملے میں مت بولا کریں نہ ٹوکا کریں' وہ جہاں چاہے آئے جائے یا کسی کو بلائے یا کچھ پکائے کھائے..... کچھ بھی ہو یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ اس کے شوہر کا گھر ہے اسے پورا حق ہے اپنی مرضی سے جینے کا۔"
"میں نے کب کہا کہ یہ میرا گھر ہے..... یہ اس کے شوہر کا گھر ہے اور اس کا گھر ہے۔" اسے اس کا یہ ایک جملہ بہت برا لگا تھا۔
"مجھے پتا ہے آپ ہر بات کا الٹا مطلب لیتی ہیں..... مگر پلیز میں آپ کو کہہ رہا ہوں کہ اسے اپنی مرضی سے یہاں رہنے دیں میرا گھر ان باتوں کی وجہ سے ٹوٹے یہ میں نہیں چاہتا۔"
"کس قدر فضول اور جاہلانہ بات کی ہے تم نے بالکل اپنی بیوی کی طرح..... مجھے نہیں اندازہ تھا کہ تم ایسی ہلکی بات کرو گے۔" وہ بے دلی سے اٹھی اس کے تیور دیکھتے ہوئے۔
"آپ نے مجھے مجبور کردیا ہے بات کرنے پر..... میں چاہتا ہوں آئندہ آپ اسے شکایت کا موقع نہ دیں تاکہ مجھے آپ سے ایسی کوئی بات نہ کرنی پڑے جس پر آپ کو افسوس ہو اور بعد میں مجھے بھی ہو۔" وہ کافی سخت لہجے میں کہتا ہوا اس کے ساتھ ہی باہر آیا تھا۔
"چلیں بیٹھ جائیں' میں چھوڑ دوں۔" اس کا لہجہ اب بھی ویسا تھا۔

"بہت شکریہ چلی جاؤں گی میں ٹیکسی سے۔"
"روز ٹیکسی سے جاتی ہیں کیا؟" وہ طنزیہ طنز کر رہا تھا۔
"اب جایا کروں گی۔" وہ گاڑی کے پاس سے گزر کر آگے بڑھی۔
"میں کہہ رہا ہوں بیٹھ جائیں۔" وہ زور سے حکمیہ لہجے میں بولا تھا۔
"اس لہجے میں اپنی بیوی سے بات کر کے دیکھ لینا۔ جواب مل جائے گا۔" وہ کہتی ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے ہٹ گئی۔
"شوق سے دھکے کھائیے۔" وہ با آواز بلند کہتا ہوا بیٹھ گیا ڈرائیور حیرت سے اس کے لہجے اور پھر بات سن رہا تھا۔
"جانا نہیں ہے کیا" وہ ڈرائیور کو گھورنے لگا۔
"جی بیٹا! چلنا ہے۔" انور بابا نے بے بسی سے گاڑی اسٹارٹ کی آج پہلی مرتبہ اس نے آفاق کا یہ روپ دیکھا تھا۔ اس لیے حیرت زدہ تھا۔
آج وہ دیر تک فٹ پاتھ پر کھڑی رہی۔۔۔ جیسے کبھی کچھ سال پہلے وہ کھڑی ہوتی تھی۔ تب تو اس نے سوچا تھا کہ اب اسے فٹ پاتھ پر کھڑا ہونا نہیں پڑے گا کچھ سالوں بعد۔۔۔
اسے یاد تھا ایک دفعہ اس نے اپنی گود میں سر رکھ کر لیٹے ہوئے چودہ سالہ آفاق سے کہا تھا۔ "تم پڑھ لو' تم بڑے ہو جاؤ' پھر ہماری ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ پھر مجھے دیر تک فٹ پاتھ یا اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔" اس کی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔ دھندلی آنکھوں سے پاس سے گزرتی ہوئی آفاق کی گاڑی کو دیکھا جو تیزی سے گزر گئی تھی۔ اس نے دھندلی آنکھوں کو صاف کیا اور سامنے سے آتی ٹیکسی کو روکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ شام میں آئی تو کافی دیر ہو چکی تھی اور وہ دونوں کہیں جا رہے تھے۔
"السلام علیکم!" اس نے خود ہی سلام میں پہل کی تھی۔
"وعلیکم السلام۔۔۔" وہ نظریں چرا رہا تھا۔
"کہیں جا رہے ہو تم لوگ؟"
"آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" علینہ ترش لہجے میں بولی۔
"مجھے کیوں اعتراض ہو گا۔ علی کا خیال رکھنا' باہر سردی بہت ہے۔"
وہ نا چاہتے ہوئے کہنے سے رک نہ سکی کہ چھوٹے بچے کی فکر ہو رہی تھی۔
"میں اس کی ماں ہوں مجھ سے زیادہ کوئی اس کا خیال کیسے رکھ سکتا ہے۔"
"مجھے اندازہ ہے۔" اسے ہنسی آگئی اس کی بات پر۔
"آپ چاہیں تو علی کو آپ کے پاس چھوڑ جاتے ہیں اگر آپ ڈسٹرب نہ ہوں تو۔" آفاق علی کو گود میں لیے اس کی طرف بڑھا تھا۔
"پہلے بھی اسے میرے پاس چھوڑ کر جاتے رہے ہو۔ ہمیشہ یہ پوچھتے ہو کیا؟"
"ہم رات دیر سے لوٹیں گے۔ اسے سلا دیجیے گا۔" وہ اسے پکڑا کر کہنے لگا پھر اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ علینہ کے چہرے پر ناگواری تھی۔
وہ علی کو کندھے سے لگا کے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔
"مجھ سے پوچھنا تو گوارا کر لیا کرو۔" علینہ کا لہجہ تیز تھا۔
"اس سے ہمیں آسانی ہوتی ہے' ہم مرضی سے گھر آتے ہیں۔ باہر پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ چھوٹا بچہ ہے یار!" ان دونوں کی آواز با آسانی سن سکتی تھی وہ' اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آ کر رک گئی۔
"امی کے پاس چھوڑ دیتے۔" وہ ہر دفعہ باہر جاتے ہوئے بحث کرتے تھے۔
"ہاں تاکہ وہ ساری رات روتا رہتا اور ان کے فون پہ فون آتے رہتے۔ بھئی اپنے بچے کو لے جاؤ بہت پریشان کرتا ہے۔"

"یہ کب کہا انھوں نے۔" اسے اچھا نہیں لگا
"ہمیشہ کہتی ہیں۔ جیسے تمہیں تو پتا نہیں ہے۔" وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔
"کیا ضرورت تھی ان کے سامنے کہنے کی۔" وہ باہر آ کر بگڑی۔
"کیا کہا ہے۔" وہ کندھے اچکا کر آگے بڑھا گاڑی کی طرف۔
"تم ہمیشہ اپنی بہن کے سامنے میری انسلٹ کرنا ضروری کیوں سمجھتے ہو۔" وہ بیٹھتے ہوئے اسے گھورنے لگی۔
"یقین نہیں آ رہا ہے تم کہہ رہی ہو جس کی خاطر ہمیشہ ان کی انسلٹ کر دیتا ہوں۔" وہ گاڑی گیٹ سے نکالنے لگا۔
"پتا ہے مجھے۔۔۔ صبح ان سے کی بات؟"
"تمہارے کہنے پر لڑ کر آیا تھا۔ اب تو خوش ہو جاؤ۔" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔
"یقین تو نہیں آتا۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"آج پہلی مرتبہ وہ پیدل گئیں اسٹاپ تک' پتا نہیں کب گاڑی ملی ہو گی۔۔۔ آج بہت تیز ہو گیا تھا میں بات کرتے ہوئے۔۔۔ سوری کہنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی۔"
"ان کے رویے سے تو ایسا کچھ نہیں لگ رہا تھا۔" اسے یقین نہیں تھا۔ "یہی تو ایک ماں کی اعلیٰ ظرفی ہوتی ہے۔" وہ پس پشت اس پر فخر کرتا تھا۔
"ماں اور بہن میں بہت فرق ہے۔" اس نے فوراً ٹوکا تھا۔
"مجھے نہیں پتا ماں کیا ہوتی ہے' میں نے ماں کے روپ میں بھی اسی صورت کو دیکھا اور بہن کے روپ میں بھی۔"
"ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے اس کے علاوہ۔" وہ اس کی بات پر بے بسی سے مسکرا کر رہ گیا۔
"اب کیا ہے؟" وہ کافی دیر سے منہ پھلائے بیٹھی تھی چپ۔
"تم کرو بات میں سن رہی ہوں۔"
"میں کروں گا تو تمہیں برا لگے گا اس لیے تم کرو۔"
"طنز کرنا ضروری ہے؟"
"یہ طنز نہیں ہے۔ ایک بات بتا دو علینہ! تم کب مجھ سے خوش ہو گی۔ کب کہو گی کہ میں تمہارے لیے بہت کچھ کرتا ہوں۔ کب مانو گی؟"
"جب تم واقعی میرے لیے کچھ کرو گے اور پھر تمہیں میرا احساس ہو گا۔"
"سچ کہتے ہیں۔۔۔ سب سے جلدی خوش ہونے والی ہستی ماں کی ہے اور ہمیشہ ناخوش ہونے والی بیوی کی۔"
"تمہاری یہی باتیں مجھے ناپسند ہیں۔" اس کا موڈ بری طرح سے خراب ہو گیا تھا۔
"سچ جو ہیں' بری تو لگیں گی سیانے کہتے ہیں سچ کا ٹیسٹ بہت کڑوا ہوتا ہے۔" وہ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ ہنسا تھا اور اس کا موڈ اور خراب ہوا تھا۔
"اب موڈ ٹھیک کر لو ہم پہنچ گئے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے گاڑی پارک کرنے کی جگہ دیکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆
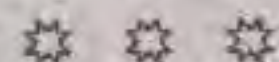
وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی علینہ کے تیزی سے بدلتے رویے کی اصل وجہ کیا ہے وہ لاکھ تجربہ کار سہی مگر اس کے اندر کی چال کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔
وہ آخر یہ سب کر کے چاہتی کیا ہے مختلف بہانے ڈھونڈ کر وہ بات کو بڑھا دیتی تھی' اس کا تو معمول تھا کالج کے بعد وہ گھر آ کر علی کو اپنے پاس لے آتی۔ اس کے ساتھ کھیلتی' اسے کھلاتی پلاتی' اکثر وہ اسی کے پاس سو جایا کرتا تھا اور ان دونوں کو کوئی پروا نہ ہوتی تھی۔ وہ جب سے پیدا ہوا تھا آدھے سے زیادہ علی کی ذمہ داری اسی پہ تھی وہ دونوں اپنی زندگی میں خوش تھے وہ ان دونوں کے لیے کسی قسم کی ڈسٹربنس کا سبب نہ تھی' بلکہ اس کے ہوتے ہوئے وہ ہر ذمہ داری سے بچے ہوئے تھے' گھر کیسے چلتا تھا۔ گھر کی صفائی ستھرائی ملازموں سے کام لینا۔ سبزی دینا کھانا پکانا۔ راشن کی خریداری

سب کچھ اس کے ذمے تھا۔ آفاق دفتر کے بعد گھر آکر سو جاتا اور شام میں یہ دونوں کہیں باہر چلے جاتے اور رات دیر تک واپسی ہوتی وہ اس گھر میں کئی سالوں سے اکیلی رہ رہی تھی جیسے۔

اس نے کبھی کسی قسم کا کوئی شکوہ نہیں کیا تھا آفاق کے ساتھ۔

پھر اس کا صبح والا سلوک جس پہ وہ ساری رات جاگ کر سوچتی رہی تھی۔ شام کو آفاق کا رویہ دیکھ کر اس کے دل سے کچھ بوجھ ہٹا ضرور تھا مگر علینہ کا دن بدن بدلاؤ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

کچھ دیر پہلے بھی وہ علی کو اس سے لے گئی۔ اس نے نوٹ کیا وہ اب علی کو اس کے پاس رہنے نہیں دیتی تھی حالانکہ وہ اسے ٹھیک طرح سے کھلاتی پلاتی بھی نہیں تھی۔ وہ کمزور ہو رہا تھا اور اسے فکر ہو رہی تھی اس نے سوچا علینہ سے کوئی مناسب موقع دیکھ کر بات کر لے۔

شام میں جب علینہ کچن میں کھڑی تھی تو وہ اس کے پاس آئی۔

"کھانا تو میں نے بنا دیا ہے۔ تم کیا کر رہی ہو علینہ؟"

اس نے نوٹ کیا تھا وہ جب فارغ ہو کر کچن سے جاتی تھی تو تب وہ کچن میں آتی تھی۔ اس کی موجودگی میں نہ وہ لاؤنج میں بیٹھتی تھی نہ کچن میں نہ باہر۔ جہاں وہ ہوتی علینہ وہاں سے کھسک لیتی۔ اسے اس کی یہ بچکانہ حرکتیں سخت زہر لگ رہی تھیں۔ اب بھی اس کی بات کا جواب دیے بغیر وہ کام کر رہی تھی۔

"میں پوچھ رہی ہوں تم کیوں کھانا بنا رہی ہو۔ میں نے بریانی بنائی ہے آج تم لوگوں کے لیے۔"

"بہت شکریہ آپ کا... آئندہ یہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں اپنے لیے خود بناؤں گی اب کھانا۔"

"اچھا... علی کہاں ہے؟ اس نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔"

"اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔ میں اس کی ماں ہوں۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھ سکتی ہوں۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو علینہ؟"

"جو آپ سمجھنا نہیں چاہتیں۔"

"دیکھو اگر تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے تو..."

"کوئی شکایت نہیں ہے۔" اس نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"تو پھر تم یہ سب کیوں کر رہی ہو...؟"

"اس لیے کہ اب آپ ہماری جان چھوڑیں اور ہمیں سکون سے جینے دیں۔"

"کیا چھوڑ دوں میں؟" وہ افسوس سے اسے دیکھنے لگی۔

"میرے میاں کو چھوڑ دیں۔ مت بھرا کریں اس کے کان۔ زندگی زہر کر دی ہے آپ نے میری سہ سہ کر تھک گئی ہوں میں اس کا تلخ رویہ، اس کی باتیں۔ اس کی ڈانٹ۔"

"وہ تمہیں ڈانٹتا ہے... میں بات کروں گی اس سے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے کہہ رہی ہوں نا ہمیں جینے دیں کل کو اگر میرا گھر ٹوٹا تو اس کی وجہ آپ ہوں گی۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم علینہ! میں کیوں ایسا چاہوں گی میں نے تو ہمیشہ تمہیں سپورٹ کیا ہے اس کے سامنے۔ وہ اگر تمہارے ساتھ ناانصافی کر رہا ہے تو میں بات کروں گی۔"

"ہاں تاکہ وہ مزید مجھے ذلیل کرے۔ یہی چاہتی ہیں آپ۔"

"میں ایسا کیوں چاہوں گی۔ تم کیوں ایسا سوچ رہی ہو۔"

"اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں یہ گھر چھوڑ کر نہ جاؤں تو خدا کے لیے آفاق سے کچھ مت کہیں اور نہ مجھ سے بات کریں۔ میں مزید کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتی۔ اب آپ یہاں سے جائیں گی یا میں یہاں سے جاؤں۔"

وہ خاموشی سے وہاں سے نکل آئی... اسے کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

رات میں آفاق اسے ملا تھا لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے۔

"تم جاگ رہے ہو آفاق!" اسے نیند نہیں آ رہی تھی روز علی کو ساتھ سلا کر سوتی تھی۔

"جی... آپ بھی جاگ رہی ہیں۔"

"ہاں... وہ علی سو گیا کیا؟"

"پتا نہیں، رو رہا تھا بہت چڑچڑا ہو رہا ہے۔ بہت دنوں سے۔"

"ٹھیک طرح سے کھانا نہیں کھائے گا تو چڑچڑا تو ہو گا ہی۔"

"آپ کہنا چاہ رہی ہیں وہ اسے کچھ نہیں کھلاتی۔ میرے سامنے سیریلیک کھلانے کی کوشش کی وہ کھاتا ہی نہیں۔"

"ضروری نہیں وہ سیریلیک نہ کھائے تو اسے کچھ نہ کھلایا جائے۔ فروٹ کھلاؤ اسے، کیلا تو شوق سے کھاتا ہے وہ۔ اب دو سال کا ہونے کو آیا ہے میں فش بوائل کر کے کھلاتی تھی تو کھا لیتا تھا۔ چاولوں کی کھیر بھی شوق سے کھاتا ہے۔ بچے کو مختلف خوراک دی جاتی ہیں اگر وہ ایک چیز سے چڑ جائے تو۔"

"اب یہ سب میں تو نہیں کر سکتا۔" وہ بیزار سا تھا۔

"میں کرتی ہوں۔ مگر وہ بہت دنوں سے علی کو میرے پاس نہیں چھوڑ رہی حالانکہ وہ دور سے دیکھ کر روتا ہے۔ اشارے کرتا ہے بلاتا ہے مجھے۔"

"آپ کے پاس نہ چھوڑنے کی اس کے پاس کوئی وجہ ہو گی نا۔ وہ کہتی ہے آپ اسے بڑوں کے کھانے کھلاتی ہیں۔ وہ اسی لیے نمکین چیزیں پسند کرتا ہے۔ کوئی چیز ڈھنگ سے نہیں کھاتا۔"

"یہ بچے کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ نمکین چیزیں زیادہ پسند کرتا ہے۔ تم بھی ایسے تھے، دو بچوں کو پال چکی ہوں میں۔"

"آپ اس سے بھی یہی کہتی ہیں۔"

"کیا کہتی ہوں میں اسے۔" وہ حیران رہ گئی۔

"مجھے نہیں پتا آپ کو پتا ہو گا۔ بہرحال میں بیزار ہو گیا ہوں اس صورت حال سے ایک طرف آپ ہیں دوسری طرف وہ۔ میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔"

"میں نے تو تمہیں کچھ نہیں کہا آفاق۔"

"یہ سب جو آپ کہہ رہی تھیں... وہ یہ کرتی ہے وہ یہ نہیں کرتی۔"

"میں نے تو صرف علی کی بات کی تھی۔"

"تو میں بھی علی کی ہی بات کر رہا ہوں۔ دیکھیے وہ اس کی ماں ہے جو کرتی ہے کرنے دیں۔ آپ ایک ماں سے اس کی اولاد نہیں دور کر سکتیں۔ آپ جو سوچ رہی ہیں وہ سب غلط ہے۔ ماں کیا ہوتی ہے۔ آپ کو کیا نہیں پتا؟؟"

"مجھے پتا ہے ماں کیا ہوتی ہے۔ تمہیں نہیں پتا کہ ماں کیا ہوتی ہے نہ ہی اسے پتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے نہیں پتا نہ ہی اسے پتا ہے۔ آپ کو پتا ہے تو آپ ہی سمجھ داری سے کام لیں۔ چھوڑ دیں اسے پلیز ورنہ وہ چلی جائے گی یہاں سے گھر ٹوٹ جائے گا میرا... مت کریں ایسا۔"

"آفاق! میں کیوں چاہوں گی تمہارا گھر ٹوٹے۔ تم دونوں ایسا کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ۔ ایک طرف وہ الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے ایک طرف تم۔ ہو کیا گیا ہے تم لوگوں کو۔"

"ہم دونوں برے۔ آپ اچھی بس۔" وہ لاؤنج سے جانے لگا۔

"آفاق! میری بات تو سنو۔"

"آپا پلیز... بہت پریشان ہوں میں پہلے ہی... میں صرف اتنا سمجھتا ہوں آپ اگر میری ماں ہوتیں تو ایسا نہ کرتیں میرے ساتھ۔" وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔

"میں اگر تمہاری ماں ہوتی۔" وہ وہیں صوفے پہ بیٹھ گئی۔

اس کا ایک ہی جملہ گونج رہا تھا سماعتوں میں اور اس کا دماغ اس ایک جملہ سننے کے بعد کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا جیسے...

"آپ اگر میری ماں ہوتیں۔"

دل ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"وہ کیوں گھر چھوڑ گئی ہے آفاق۔۔۔ سب ٹھیک تو ہے؟" وہ کل سے بہت پریشان تھی جب پتا چلا کہ وہ سوٹ کیس بھر کرلے گئی ہے' آفاق کل سارا دن غائب تھا شاید اس کے پاس تھا۔ ابھی وہ گھر آیا تھا اور اسے بات کرنے موقع ملا۔

"وہ گھر نہیں آئے گی اب میں علی کو دیکھنے گیا تھا۔"

وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

"کیا کہتی ہے وہ اسے پرابلم کیا ہے آخر۔۔۔؟"

"وہ کہتی ہے وہ آپ کے ہوتے ہوئے یہاں نہیں آئے گی۔"

"میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟"

"مجھے نہیں پتا آپا!" وہ تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔

"اسے سمجھاؤ آفاق! ایسے نہیں ہوتا ہے۔"

"وہ بہت ضدی ہے' نہیں آئے گی۔"

"تو اس کی ممی سے بات کرو۔ وہ سمجھائیں اسے مجھ سے کیا پرابلم ہے بھلا۔"

"میں کہتا تھا نا آپ کو مت ٹوکیں اسے مت ایسا کریں۔ مگر آپ بھی میری بات نہیں مانتی تھیں نا میں اسی دن سے ڈرتا تھا۔"

"خوب تو گویا وہ تمہیں بلیک میل کررہی ہے۔"

"وہ جیسی بھی ہے' بیوی ہے میری چھوڑ نہیں سکتا میں اسے۔ ایک بچے کا باپ ہوں میں۔"

"میں نے تم سے نہیں کہا۔ تم اسے چھوڑو۔"

"تو پھر میں کیا کروں یہ تو بتائیں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"وہ چاہتی کیا ہے؟" اسے خوب اندازہ ہورہا تھا۔

"آپ یہاں سے چلی جائیں۔۔۔ یا ہم کہیں اور شفٹ ہوجائیں۔"

"تم بھی یہی چاہتے ہو؟" دل کٹنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے اسے اچھی طرح پتا چل رہا تھا۔

"میں صرف سکون چاہتا ہوں۔"

"مجھے بتاؤ۔۔۔ کہاں جاؤں؟" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"فلیٹ جو کرائے پر دے رکھا ہے۔۔۔ وہ خالی ہو سکتا ہے۔"

"تو گویا تم پہلے سے ہی سب کچھ طے کرچکے ہو۔"

"میں یہ سب نہیں چاہتا آپا مگر میں کیا کروں میں مجبور ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔" اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"جتنی جلدی ہو فلیٹ خالی کرادو۔ میں پیکنگ شروع کرتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اتنی جلدی خالی نہیں ہوگا۔۔۔ کچھ روز لگیں گے جب تک آپ رہ لیں۔"

"وہ آجائے گی کل یہاں؟"

"نہیں' اس نے کہا ہے آپ جائیں گی تو ہی وہ گھر میں قدم رکھے گی۔"

"کل میں حرا کے پاس چلی جاؤں گی لاہور۔۔۔ تم اسے لے آنا۔"

"جیسے آپ ٹھیک سمجھیں۔"

اس نے صرف ایک لمحہ رک کر اس کے چہرے پر کچھ ڈھونڈنا چاہا تھا' دکھ' پشیمانی' افسوس۔۔۔ کچھ نہیں تھا سوائے اطمینان کے۔۔۔ یہ وہی آفاق تھا اسے یقین کرنے میں بہت مشکل ہورہی تھی۔ وہ آفاق کچھ سال پہلے ہی اس نے کھودیا تھا۔

کہاں۔۔۔ خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"رات کو تیز ڈرائیو کرکے پہنچا تھا اور تم نے دروازہ نہیں کھولا۔"

وہ دفتر سے آئی تو اپنا سیل فون چیک کیا جس پر چوبیس مس کالز تھیں اور کئی میسج۔۔۔ اس نے سارے ٹیکسٹ باری باری چیک کیے تھے اور پھر اسے کال بیک کی۔

"تم کیوں تیز ڈرائیو کرکے پہنچے تھے وہ بھی رات کے وقت۔"

"پورے بارہ بجے میں تمہارے گھر پہنچا' آدھے گھنٹے تک بیل بجاتا رہا کیک لایا تھا تمہارے لیے۔ رات تمہاری برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنا چاہی تھی۔"

"تمہیں یاد ہے۔ مجھے تو یاد بھی نہیں رہتا اب۔"

"مجھے کبھی نہیں بھولا یہ دن۔ میں ہمیشہ کیک کاٹتا ہوں اس ڈیٹ پہ کیا تم آج میرے ساتھ سیلیبریٹ کر سکتی ہو؟ دیکھو پھر تو تمہاری شادی ہوجائے گی' پھر میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گا کبھی بھی۔"

"تمہیں بہت دکھ ہوا ہے میری شادی کا سن کر؟"

"نہیں اطمینان ہوا ہے کہ تم نے اپنے لیے بھی تو کچھ سوچا۔"

"شکریہ تمہارے نیک جذبات کے لیے۔"

"کیا ہم مل سکتے ہیں کہیں باہر۔"

"کس حیثیت سے طاہر! تم شادی شدہ ہو اور میری شادی ہونے والی ہے۔"

"پلیز آخری بار۔۔۔ میں تمہارے ساتھ بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مناسب سمجھو تو گھر آجاؤں۔"

"نہیں گھر نہیں۔۔۔"

"پھر کہیں باہر۔۔۔"

"کہاں؟" اس نے لمبی سانس لی۔ وہ اس شخص کے آگے کیوں نرم پڑجاتی تھی۔۔۔ اسے خود پہ غصہ آتا تھا۔

"جہاں تم کہو۔"

"سمندر پر۔" وہ فون کے اس طرف مسکرایا تھا کہ مسکراہٹ اس طرف پہنچی تھی۔

"سمندر پر۔۔۔ دو گھنٹے بعد۔۔۔ پہنچ رہی ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے فون بند کیا۔

"بہت شکریہ۔"

وہ اپنے کمرے میں آکر وارڈ روب کھول کر کھڑی ہوگئی اور کپڑے دیکھنے لگی۔ پہلی بار انتخاب مشکل لگا تھا۔۔۔ ورنہ وارڈ روب کے آگے تین چار منٹ سے زیادہ نہیں رکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یاد ہے کبھی تم نے کہا تھا کہ جب ہم بہت بڑے ہوں گے تو وقت بہت بدل چکا ہوگا سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہوگا' سب کچھ ٹھیک ہوچکا ہے شاید پر ہم بدل گئے ہیں۔" اس نے کافی کا کپ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"مگر تم نہیں بدلے۔۔۔ ابھی بھی کافی کپ میں چھوڑ دیتے ہو۔ ہر کام ادھورا کرتے ہو۔۔۔ یہ بتاؤ کتنی نوکریاں چھوڑی ہیں۔"

"اب تک صرف چار۔۔۔"

"اب تک صرف چار۔۔۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔۔۔ چار کم ہیں۔ اب تو نوکریاں ملتی ہی نہیں ہیں۔"

"مجھے ہر کام کی جلدی پڑی رہتی ہے۔ سوچتا ہوں جلدی جلدی سب کچھ ہوجائے۔ انتظار میری جان لے لیتا ہے۔ تم سے شادی بھی تو جلدی کرنا چاہی تھی پھر۔۔۔" وہ کپ کی سطح پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

"جلدی جلدی سب ہو تو گیا۔ شادی' بچے سب کچھ۔۔۔"

"ہاں سب ہوگیا۔ اب لگتا ہے جیسے دل خالی' خالی سارہ گیا ہے۔"

"ایسا کیوں سوچتے ہو۔ ہو نا ناشکرے۔"

"ٹھیک سوچتا ہوں۔ مگر بدلی تم بھی نہیں اب تک اتنی ہی اتنی ہی ست۔۔۔ ہر کام دیر سے کرتی ہو۔ شادی بھی اتنی لیٹ۔"

"ایک بات کہوں طاہر! میں شادی نہیں کررہی۔"

"کیا۔۔۔ مگر تم نے تو کہا ہے کہ کسی نے پرپوز کیا تھا اور۔۔۔"

"ہاں کیا تھا۔۔۔ پر میں نے تب ہی منع کردیا تھا۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔"

"مگر کیوں نہیں کرنی یار! تم اکیلی ہو۔ کیسے گزرے گی زندگی نہ بھائی ساتھ نہ بہن۔۔۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے مبینہ۔۔۔ اپنے لیے سوچو پلیز۔"

"بس اس کی کوئی ایک وجہ نہیں ہے۔"

"یہ زیادتی کررہی ہو اپنے ساتھ۔۔۔ کاش ہماری

شادی ہو جاتی۔"

"اچھا ہوا نہیں ہوئی میں ہر کام میں سستی کرتی ہوں۔ تم ہر کام میں تیز جوڑ نہیں بنتا روز لڑائی ہوتی۔"

وہ زبردستی مسکرائی تھی۔

"یاد ہے تم کہتی تھیں کہ میں کھانا بنانے میں دیر لگاؤں گی تمہیں دفتر سے دیر ہو جائے گی پھر تم بگڑو گے ہماری لڑائیاں ہوں گی۔" وہ کہتے ہوئے ہنسا تھا۔

"ہاں یاد ہے۔" وہ بھی ہنسی۔

"مبینہ! بہت اکیلا ہوں میں۔۔۔ شادی کرو گی مجھ سے؟"

"ابھی تو تم نارمل تھے کیا ہو گیا؟" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں اب بھی نارمل ہوں اور پورے ہوش و حواس کے ساتھ کہہ رہا ہوں پلیز مان لو۔"

"تمہارا ایک گھر ہے' فیملی ہے' بیوی بچے ہیں۔ تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"کیا زندگی پر میرا اپنا کوئی حق نہیں ہے۔۔۔ کیا میں اپنے لیے نہیں جی سکتا۔۔۔ سب کچھ دیا ہے میں نے بیوی کو بچوں کو اب کچھ دن اپنے لیے جینا چاہتا ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے گھر جاؤ آرام کرو میں بھی اب چلتی ہوں۔" وہ اٹھی تھی فوراً۔

"میں سنجیدہ ہوں مبینہ۔ مجھے جواب چاہیے۔" وہ بھی اٹھا اس کے ساتھ۔

وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس نے طاہر کو صاف صاف جواب دے دیا تھا۔

وہ نہ اس کی کال اٹھا رہی تھی نہ میسج کا جواب دے رہی تھی۔

یہ سچ تھا کہ زندگی تھوڑی نہیں بہت مشکل تھی۔

یہ بھی سچ تھا کہ اکیلے رہنا مشکل تھا۔ ماحول' باتیں' لوگ۔

وہ ساری چیزوں کو نظر انداز کرتی رہی تھی۔ کئی دفعہ دیر سے آتے ہوئے گاڑی خراب ہوئی تھی۔ کئی دفعہ وہ اکیلی بیچ سڑک کھڑی رہتی تھی۔ مگر کسی سے لفٹ لینے یا مدد لینے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

صرف ایک تنہائی تھی جس نے اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا اسے۔ اس کے ساتھ کوئی اچھا دوست تک نہیں تھا جس کے ساتھ کچھ وقت گزار کر وہ تازہ دم ہو جاتی۔ اس کی بہن کئی کئی مہینے اسے فون نہیں کرتی تھی۔ خود وہ ٹائم نکال کر کرتی تب بھی اس کے ساتھ زیادہ بات نہ ہو پاتی وہ بار بار اسے جتاتی کہ غیر شادی شدہ بندہ شادی شدہ لائف کے بارے میں نہیں سمجھ سکتا۔ وہ اسے جتاتی کہ بے وقت فون سننا اس کے لیے مشکل ہے۔

اس نے فون کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

اور جو اس کا بھائی تھا اس نے تو پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی یہ تھے اس کے اپنے جن کی خاطر اس نے زندگی قربان کی۔

طاہر نے پھر بھی اتنا برا تو نہیں کیا اس کے ساتھ' جتنا وہ لوگ کر رہے تھے۔

مگر پھر بھی اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ طاہر کی اپنی فیملی تھی وہ کیسے ان سب کی مجرم بن جاتی۔

وہ خاموش تھی۔ طاہر کئی بار دروازے سے لوٹ گیا تھا۔ دو چار چکر اس نے دفتر کے لگا لیے۔ آخر کار مجبور ہو کر اس نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ وہ اپنے بہن بھائی سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے آفاق کو بلایا مگر وہ نہیں آیا۔ دو دن بعد وہ خود اس کے گھر پر گئی۔ علی نے بہت دنوں بعد دیکھا تھا مگر لپٹ گیا۔ اس کی گود سے اتر نہیں رہا تھا۔

اس نے علینہ کو اگنور کر دیا تھا کیوں کہ اس کا رویہ ویسا ہی عجیب تھا۔ اس نے ڈائریکٹ آفاق سے بات کی تھی۔

"آپ شادی کر رہی ہیں؟" وہ حیران ہو گیا تھا۔

علینہ نے طنزیہ نظروں سے پہلے اسے پھر آفاق کی طرف دیکھا تھا۔

"اس عمر میں آپ کو شادی کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔"

عادت سے مجبور علینہ چپ نہیں رہ سکی تھی۔

"میں اپنے بھائی سے بات کر رہی ہوں۔"

"آپ کو واقعی کیا ضرورت ہے آپا۔۔۔ آپ اچھی جگہ رہتی ہیں اچھا کھاتی ہیں خوش ہیں۔" وہ بھی بیوی کے ساتھ متفق تھا۔

"میں اکیلی رہتی ہوں۔ مجھے کئی مسائل ہیں۔ طاہر بہت فورس کر رہا ہے۔"

"وہ دھوکے باز۔۔۔ آپا! کیا کیا تھا اس نے آپ کے ساتھ۔ کچھ یاد ہے۔"

"اچھا تو میرے ساتھ کسی نے نہیں کیا۔ اگر میں سب یاد کرتی رہوں تو زندہ کیسے رہوں گی بھلا۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی۔۔۔ مگر میں نہیں سمجھتا یہ شادی کامیاب ہو گی۔"

یہ اس کا بھائی تھا جو پہلے سے شادی کی ناکامی کی پیش گوئی کر رہا تھا بجائے کوئی دعا دینے کے بجائے حوصلے کے۔

وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کو اب اگر اتنا ہی شوق ہوا ہے شادی کا تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں بھلا۔" یہ وہی زہر اگلنے والی بلا تھی۔

"میرا خیال ہے۔ میں چلتی ہوں۔" علی گود سے اتر کر کھیلنے لگا تھا وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"شادی پر تو بلائیں گی نا۔" علینہ کا لہجہ ویسا ہی تھا۔

"ضرور!" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

گھر آتے ہی اس نے سب سے پہلا فون طاہر کو کیا تھا۔ اور پھر حرا کو۔۔۔ بیل مسلسل جا رہی تھی۔

تیسری چوتھی بیل پر اس نے فون اٹھا ہی لیا تھا۔

"ہاں آپا! بولیں شرجیل کے کپڑے چھوڑ آئی ہوں پریس کرنے لگی تھی۔ پر فون بج رہا تھا رنگ پہ رنگ سب خیریت ہے نا؟" وہی سلام دعا کے بغیر عجلت بھرا لہجہ۔

"بہت ضروری بات کرنی تھی تم سے۔۔۔ میں شادی کر رہی ہوں۔"

"کس کے ساتھ؟"

"طاہر کے ساتھ۔۔۔"

"ہیں۔۔۔ آپا۔۔۔ ہوش میں ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"حرا میں ٹھیک ہوں بالکل سب ٹھیک ہے۔ میں اپنے ہوش میں ہوں۔"

"آپا شادی اب۔۔۔ اب کیا فائدہ؟"

"کیا مطلب؟ کیا فائدہ۔"

"مطلب یہ کہ آپا اتنی عمر میں پرابلم ہوتی ہے۔ بچے۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"حرا! میں شادی بچوں کے لیے نہیں اپنی تنہائی کی وجہ سے کر رہی ہوں۔"

"آپا مگر اس عمر میں۔۔۔؟"

"اسی عمر میں تو کسی اپنے کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا آپا!"

"تم اپنے کمزور دماغ پر زور مت ڈالو۔ یہ بتاؤ آسکو گی یا نہیں؟"

"آپا! میرے میاں کیا کہیں گے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ آپ نے کچھ تو سوچ لیا ہوتا۔" یہ بھی اس کی سگی بہن تھی۔

"ٹھیک ہے حرا! یہی کہنا ہے یا اور بھی کچھ باقی ہے؟"

"میرا تو دماغ کام نہیں کر رہا آپ کی بات سن کر۔"

"اور میرا دل کام نہیں کر رہا تم لوگوں کی باتیں سن کر۔"

اس نے فون رکھ دیا اور بیٹھ گئی۔ یہ تھے اس کے اپنے اور یہ تھے لوگ۔ شادی کی بات سنتے ہی اعتراضات کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ حیران تھی۔ حالانکہ اب اسے حیران ہونے کی ضرورت نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے ان چند دنوں میں لوگوں کے مزید رنگ دیکھ لیے تھے کہ جب کوئی اپنی زندگی بنانے جا رہا ہوتا ہے تو لوگ کیا کرتے ہیں ہاتھ سے نہیں روک سکتے' عمل سے نہیں روک سکتے مگر زبان سے کوشش ضرور کرتے

ہیں۔

اور سب سے زیادہ بات کرنے اور انگلی اٹھانے والے کون تھے خود اس کے اپنے بہن بھائی۔ جو رشتے دکھ سکھ کے ساتھی کہلاتے ہیں۔ وہی رشتے اسے برا بھلا کہہ کر مزید خون جلا رہے تھے۔

ایک دن اسے طاہر اپنے ساتھ شاپنگ پر لے گیا اور مال میں علینہ اور آفاق مل گئے۔ علینہ باز نہیں آئی تھی پاس سے گزرتے ہوئے بھی دل جلا گئی کہ اسے ایسے کاموں میں کمال حاصل تھا۔ آفاق کتنا انجان تھا۔ اسے ایک دفعہ احساس ہوا کہ اس سے پوچھے بات کرے کہ اسے کہے کہ وہ اس کا چھوٹا بھائی ہے جسے بچوں کی طرح اس نے پالا ہے اور یہاں تک پہنچایا ہے۔

مگر اس کے پاس وقت ہی کہاں تھا اس کے لیے رک کر بات سننے اور سمجھنے کے لیے۔

وہ اسے دور تک جاتا دیکھتی رہی تھی۔

"چلیں مبینہ!" طاہر اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

"ہاں چلیں۔۔۔" وہ چپ چاپ اس کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔

"ان لوگوں کی خاطر تم ضائع کر رہی تھیں خود کو۔" وہ گاڑی میں بیٹھتے اسے جتانے لگا۔

"تب وہ لوگ نہیں بچے تھے۔ اب لوگ بنے ہیں۔"

"جانے دو تم تو پھر بھی۔۔۔"

"طاہر! میں سب کچھ بھلا دینا چاہتی ہوں۔ ہر حوالے سے۔"

"او کے۔۔۔ تو آگے کے کیا پلان ہیں پھر۔۔۔؟"

"نہیں طاہر! اب کوئی تیاری نہیں پلیز۔۔۔ سادگی سے چند لوگوں کی موجودگی میں نکاح ہو گا۔ میں دفتر کے لوگوں کو بلا لوں گی۔ تم اپنے ایک آدھ کسی دوست کو بلا لینا۔"

"تاریخ کیا سوچی تم نے؟"

"اٹھائیس ٹھیک ہے۔"

"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے پورے بائیس دن ہیں۔ زیادہ نہیں؟"

"بہت کم ہیں طاہر بائیس دن۔"

"بائیس دنوں میں تو بہت کچھ ہو جاتا ہے یار!"

"کچھ نہیں ہوتا طاہر! اتنے سالوں میں کچھ نہیں ہوا۔۔۔ بائیس دنوں میں کیا ہو جائے گا بھلا؟"

"تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہے تمہیں فلیٹ پر چھوڑ دوں؟"

"ہاں پھر تمہیں اپنے گھر بھی جانا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے پاس۔ وہ سب ویٹ کر رہے ہوں گے نا تمہارا۔۔۔ ہے نا؟"

"پلیز مبینہ! کیا ہم ایک ساتھ رہتے ہوئے صرف اپنی بات نہیں کر سکتے۔"

"یہ ایک حقیقت ہے۔۔۔" اس کی مسکراہٹ میں تھکن تھی "تم نے سوچا ہے طاہر! تم کیسے مین ٹین کرو گے سب کچھ۔"

"تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کر لوں گا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اس بات کو بنیاد بنا کر ہمارے بیچ میں کوئی تلخی آئے۔۔۔ دیکھو مبینہ جب میں تمہارے پاس ہوں تو صرف تمہارا ہوں گا۔"

"اور جب ان کے پاس ہو گے تو صرف ان کے ہو گے۔" وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

"پلیز مبینہ۔۔۔!" وہ الجھے ہوئے انداز میں باہر دیکھ رہا تھا شیشے سے۔

"ہمارے آنکھیں بند کر لینے سے کچھ نہیں بدلے گا طاہر!"

"مبینہ پلیز تم چاہتی ہو میں کہیں گاڑی دے ماروں۔" وہ چلایا تھا۔

"تم ایموشنل کیوں ہو رہے ہو طاہر؟"

"دیکھو میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا اب ان ساری باتوں کو بنیاد بنا کر، تم ایسی باتیں مت کرو ٹینشن ہوتی ہے مجھے۔"

"اچھا او کے بس آخری سوال۔"

"کہو۔" وہ بے بسی سے دیکھنے لگا اسے۔

"اپنی فیملی کو شادی کے بارے میں بتایا ہے؟"

"بتا دوں گا۔" وہ فوراً ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

"تم نے اب تک بتایا نہیں؟" وہ تعجب سے دیکھنے لگی۔

"میں ضروری نہیں سمجھتا۔"

"پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔۔۔ کیا ہو گا؟" اس نے سیٹ سے سر ٹکا لیا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ ہم شادی کریں گے اب۔۔۔ اور خوشی خوشی اپنا گھر بنائیں گے۔" وہ اسے بہلا رہا تھا۔

"کاش یہ سب اس قدر آسان بھی ہوتا جیسے ہم کہہ رہے ہیں۔"

"آسان اگر نہیں ہو گا تو ہم آسان بنا لیں گے۔"

"پتا ہے طاہر! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح تم مجھے بھی کمزور کر دو گی۔"

"میں سوچ رہی ہوں طاہر۔۔۔"

"پلیز کچھ نہیں سوچنا اب۔" وہ اس کی بات کاٹ گیا۔

"اب سب کچھ پلان کے مطابق ہو گا۔ تم کام نبٹا لو گھر سے ہو آؤ۔ وہاں دیکھو کس چیز کی کمی ہے۔ دیکھو ہم وہ گھر بیچیں گے نہیں۔ کبھی کبھار رہنے جائیں گے وہاں۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ کچھ بے دلی سے مسکرائی۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا مگر ایک دل تھا۔

جو ایسے موقع پر خطرے کا الارم بجاتا ہے شاید ڈراتا ہے۔ وسوسے ڈالتا ہے۔ دل بھی اپنے کام میں ماہر ہے۔ اپنے ہر کام میں۔

وہ ہفتے کا دن تھا جب اسے طاہر کی بیوی کی کال موصول ہوئی تھی۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی برس پڑی تھی۔ کیسی غلط زبان استعمال کی تھی اس نے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا کیا قصور بھلا، یہاں پڑھے لکھے لوگوں کا یہ حال تھا۔

وہ صرف سنتی رہی تھی اور فون بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد روز اسے کوئی دھمکی آمیز ٹیکسٹ موصول ہوتا۔ میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ۔ ورنہ کے آگے ڈراوے لکھے ہوتے دھمکی آمیز۔ جن پر یا تو وہ کڑھتی یا پھر افسوس سے سر جھٹک کر رہ جاتی تھی۔

طاہر کا کہنا تھا وہ ان چیزوں پر دھیان نہ دے۔۔۔ یہ سب رکاوٹیں ہیں اور اس بار کوئی رکاوٹ ان کا رستہ روک نہیں پائے گی۔

اس کے پاس کوئی خواب نہ تھا نہ خواہش۔ وہ بس سکون اور تحفظ بھری زندگی چاہتی تھی۔ ایک پر سکون گھر۔

کیا وہ ایک پر سکون گھر بنا سکے گی۔۔۔ اس کے خود سے کتنے سوال تھے پہلے سے ہی۔۔۔ کتنے خدشے، کتنی بے سکونی کتنی بے یقینی۔

کیسا گھر بنانے جا رہی تھی وہ۔ تھکن جیسے پور پور میں اتر رہی تھی۔

حالانکہ ابھی بہت کام باقی تھے۔

☼ ☼ ☼

پورے اٹھارہ دن پر لگا کر اڑے تھے۔ ان کی شادی مزید ایک ہفتہ لیٹ ہو گئی تھی۔ طاہر کچھ مصروفیات میں پھنسا ہوا تھا۔

وہ بتا رہا تھا دفتر میں نیا پروجیکٹ ملا ہے۔ بہت سارا کام ہے۔

اس نے سوچا چلو وہ بھی کچھ ستا لے گی۔

وہ روز اسے میسج کر کے حال احوال پوچھتی۔ پورے سولہ دنوں سے ان کی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہاں مصروف تھا۔

آج وہ ساحل سمندر پر آئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کچھ فریش ہوا جائے۔

اس نے کہا تھا اتوار کو ملیں گے۔۔۔ وہ اتوار کی شام اس کے انتظار میں یہاں بیٹھی تھی۔

"کہاں ہو طاہر۔۔۔ تمہارے بیٹے کی طبیعت کیسی ہے اب؟" وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا اس نے میسج کر دیا اسے۔

"ابھی بھی بخار ہے اسے میں دفتر میں ہوں میٹنگ میں۔"

"طاہر! آج سنڈے ہے۔" وہ لکھتے لکھتے رک گئی کیوں کہ وجہ سامنے تھی۔

وہ اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہ اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ سمندر پر موجود تھا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس کی بیوی کے چہرے پر کھلکھلاتی مسکراہٹ تھی۔ اور وہ خود کتنا مطمئن تھا۔ کتنی مکمل فیملی تھی۔ کتنا سکون تھا۔ سب کچھ تو تھا ایک مکمل فیملی۔ ایک مکمل گھر۔

کیا کمی تھی۔ سب کچھ تو تھا۔ پھر وہ ان سب میں کہاں تھی۔ کس جگہ تھی..... اس کا کیا مقام تھا وہ کہاں کھڑی تھی۔ کیا حیثیت تھی اس تعلق کی ایک طرف مکمل گھر اور ایک طرف صرف وہ..... وہ کتنے دنوں سے نہیں آیا تھا۔

اس نے ان دنوں میں اسے کتنا یاد کیا..... آواز دی اور..... وہ جھوٹ پہ جھوٹ بولتا جا رہا تھا۔ ایک جھوٹ دو جھوٹ۔ کتنے جھوٹ۔ کل ملا کر کتنے جھوٹ۔ وہ ایک جھوٹ کی بنیاد پر گھر بنا رہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو کیوں بہے تھے۔

اسے دکھ کیوں ہوا تھا۔

وہ الٹے قدموں واپس پلٹی تھی۔

"دفتر میں ہوں۔ میٹنگ ہے۔ کام ہے۔" اس کا ٹیکسٹ کھلا ہوا تھا۔

"آج تو سنڈے ہے طاہر! آج بھی دفتر میں ہو..... آج بھی کام ہے۔" سمندر تو اس کے اندر ٹھاٹھیں مار تا رہا۔ دکھ کا سمندر.....

وہ رو رہی تھی پر وہ رونا نہیں چاہتی تھی
اس نے آج بہت تیز ڈرائیو کیا تھا
پلیئر آن کر دیا
شام سے پہلے آنا

پھول سارے کھل رہے ہوں
دھوپ ساری ڈھل رہی ہو
موسم سارے لے آنا
پھر وہی دن آئے ہیں
جانے کیا لے آئے ہیں
جیون میرا..... سارا تیرا.....
جینا تو اک بہانہ ہے.....

"شادی کرو گی مجھ سے؟"

"ایک شرط پر....."

"وہ کیا؟"

"تم کافی کا پورا کپ پیو گے۔"

"اور؟"

"اور یہ کہ نوکری نہیں چھوڑو گے۔"

"بس اتنا..... قبول ہے۔"

"جھوٹ نہیں بولو گے؟"

"نہیں بولوں گا۔"

"مجھ سے ہمیشہ محبت کرو گے۔"

"ہمیشہ کروں گا....."

"مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے؟"

"کبھی نہیں۔"

ایک تیرے آجانے سے
مل رہے ہیں زمانے سے
جیون میرا..... سارا تیرا.....
دور اب کیا جانا ہے
شام سے پہلے آنا.....

شام تیزی سے ڈھل رہی تھی۔ شام اس کے اندر اتری ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہال رنگین روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔
آج وہ بھی یہاں انوائٹڈ تھا۔ اسے ایک میسج کیا۔

"پتا نہیں کہاں ہو تم۔"

"ہو کہاں مصروف؟"

"مجھے پتا ہے ناراض ہو جب ہی کوئی جواب نہیں دیا۔"

"بدلہ لے رہی ہو نا..... چلو لے لو خوش ہو جاؤ۔"

"میں آتا ہوں ملنے اور منانے۔ ایک ہفتے سے مصروف تھا۔"

وہ کسی میسج کا جواب نہیں دے رہی تھی۔

"پتا ہے مبینہ! آج ہماری شادی کی ڈیٹ فکس ہوئی تھی نا۔ سوری میری مصروفیت کی وجہ سے سارا کچھ لیٹ ہو گیا ہے۔"

"تمہیں کہا بھی تھا کہ بائیس دن بہت ہیں..... مگر تم بھی نا..... چلو کوئی بات نہیں ہم اب دور کی ڈیٹ نہیں رکھیں گے۔ ایسا کرتے ہیں کل ہی مولوی کو بلا کر نکاح پڑھوا لیتے ہیں..... کیا خیال ہے؟"

"یار جواب تو دو نا.....!"

وہ ہال میں بیٹھا بور ہو رہا تھا' ابھی دولہا دلہن بھی نہیں آئے تھے وہ شاید وقت سے پہلے آگیا تھا۔ یا دیگر مہمان لیٹ ہو گئے تھے۔

"دیکھو اب میں تیز ڈرائیو نہیں کرتا مبینہ!"

"آج میں نے کافی کا پورا کپ پیا تھا۔ یہ مت پوچھنا کہ کافی کس نے بنائی تھی اور یہ بھی مت پوچھنا کہ بنی کیسی تھی؟"

وہ اسے جواب دینے کے لیے اکسا رہا تھا۔

"اچھا نوکری بھی نہیں چھوڑوں گا اب۔"

"اچھا سنو نا! جواب تو دو..... میں یہاں شادی میں بیٹھا ہوا ہوں۔"

"دولہا دلہن نہیں آئے۔ آؤ دونوں یہاں بیٹھ کر نکاح پڑھوا لیں کیسا آئیڈیا ہے..... تمہارے گھر سے قریب ہے یار..... آجاؤ نا مبینہ!"

"اچھا چلو ٹھیک ہے میں ہی آجاتا ہوں کچھ دیر میں..... بس عمیر سے مل لوں' اس کا بھائی میرا بہت اچھا دوست ہے۔"

سینٹ آئٹم بھرا ہوا تھا۔ اور ان باکس خالی تھا ایک بھی جواب نہیں آیا تھا اس نے لمبی سانس بھری اور دوسری طرف متوجہ ہوا۔

دولہا دلہن آرہے تھے۔ دولہا بہت خوش لگ رہا تھا۔

دلہن کا گھونگھٹ نکلا ہوا تھا۔ یقیناً وہ بہت خوب صورت ہو گی۔ وہ سوچتے ہوئے اسٹیج تک آیا۔ عمیر سے گلے ملا اسے مبارک باد دی پھر نیچے آ گیا۔

کھانے کے بعد رخصتی تھی۔ رخصتی کی گھڑی بھی عجیب ہوتی ہے۔ وہ عمیر کے بھائی کے ساتھ ہال کے گیٹ پر کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ جب دولہا دلہن ساتھ ساتھ چلتے آرہے تھے۔

مووی والے کی ہدایت پر کسی نے دلہن کا دوپٹہ اٹھا کر ٹھیک کیا تھا۔ اس کی نظر اٹھی تھی اور.....

کیا وہ وہی تھی..... یا اس سے ملتی جلتی؟

مگر یہ تو بہت حسین تھی۔

"بھابھی عمیر سے بڑی ہیں کچھ سال۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ عمیر سے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہیں ہیں نا۔" عمیر کی بہن کہہ رہی تھی۔

"اچھا۔ اللہ ان دونوں کو خوش رکھے۔ مبینہ بھابھی بہت اچھی خاتون ہیں۔ مل چکا ہوں میں بہت دفعہ۔" عمیر کا بھائی اس سے مخاطب ہوا تھا۔

وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑا تھا۔

"اتنا بڑا دھوکا میرے ساتھ..... اتنی بڑی گیم مبینہ! کھیلا ہے تم نے میرے ساتھ..... دھوکا کیا ہے۔" کچھ دیر بعد سینٹ آئٹم میں ایک اور میسج کا اضافہ ہوا تھا۔

اس سے کھڑا ہوا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا جب سیل فون بجا۔ مبینہ کالنگ۔ جگمگا رہا تھا۔

"تم نے اتنا بڑا دھوکا کیا میرے ساتھ..... یہ ڈیٹ تو ہماری شادی کی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھ سے اس طرح بدلہ لو گی؟" وہ برس پڑا تھا۔

"میں نے نہ تم سے بدلہ لیا ہے طاہر! نہ گیم کھیلا ہے۔ میں نے تو اس گیم کو انجام تک پہنچایا ہے جسے تم ادھورا چھوڑ گئے تھے۔

گیم تو تم کھیل رہے تھے میرے ساتھ تب بھی اور اب بھی..... ہر بار اپنی باری کھیل کر تم ہٹ جاتے تھے میں نے تو صرف اپنی باری کھیلی ہے۔ اب ڈراما ختم اور زندگی شروع۔"

فون ساکت تھا۔ وہ ساکت تھا۔ ہر چیز ساکت تھی کیونکہ ڈراما ختم تھا اور زندگی تو اب شروع ہوئی تھی!

☼

سمیرا حمید

پہلے پہل تو ماں بہنوں کو لڑکی پسند ہی نہیں آتی اور جب ایک قسمت کی ماری (بعد ازاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ بے چاری قسمت کی ماری ہی تھی) پسند آ ہی جاتی ہے تو پھر وہ بہو بھابھی بن کر پسند آنا "بس" ہو جاتی ہے۔ ایک ہی لڑکی ایک ہو کر دو کیسے ہو جاتی ہے؟؟

اچھی لڑکی۔ بری بری بہو۔ اچھی بیوی۔ بری بھابھی۔ اچھی ماں اور پھر بھی جنجال۔ یہ تو ہوئی اچھی لڑکی اور باقی کی برائیاں۔ رشتوں کے جوڑ میں بھی وہ کم نہیں ہوتی یعنی اچھا شوہر۔ بری بیوی۔ خدا ترس ساس۔ خدا کی مار پڑی بہو۔ کم گو بے چاری نندیں۔ اور تڑ تڑ کرتی بھی اپنی، میری آپ کی "بھابھی"۔

اچھی لڑکی اور اتنا کچھ برا؟؟؟

عبدالکریم۔ عرف کریم بھائی۔ مختصراً "کریم بھاء۔ اور اس سے بھی مختصر تر بھا۔ بھا۔

کریم بھاء جن کے بارے میں خاندان کے اسی فیصد لوگوں کی سرگوشیاں گواہ تھیں کہ ان کی چال زنانہ ہے۔ انداز زنانہ تر۔ اور اصول و ضوابط تو۔ لیں جی الفاظ ختم۔

کریم بھاء کو شدنی بھی کہا جاتا لیکن وہ صرف پکی عمروں کے لوگ کہتے، لیکن ایک اکیلے کریم بھا ہی شدنی نہیں تھے۔ بڑی اماں المختصر بڑماں ان کی چھ عدد جوان جہاں ڈشکری بیٹیاں۔ اور۔ اور۔ بس ابھی اتنا ہی۔

تو کریم بھاء "ہاے بہن" سے بات شروع کرتے اور مرن جوگی پر ختم کرتے۔ گوالمنڈی میں ایک دکان کے مالک و مختار تھے۔ نان چنے کی دکان۔ بس اسی ایک دکان پر، ان نان چنوں پر سب نے اپنے اپنے شملے اٹھا رکھے تھے۔ تو ایسے ہرے بھرے تاریخی لذتی بازار میں جو ایک ریڑھی بھی لگاتا ہے وہ بھی کم سے کم اپنی بیٹی منسٹر کے یہاں بیاہنے اور بہو وزیراعظم کے ہاں سے لانے کا تو سوچ ہی لیتا ہے۔

اور وہ جس کی اپنی ایک ذاتی دکان ہو جیسے اپنے کریم بھاء کی، وہ اوباما سے کمتی کیا ہی سوچیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ اوباما کی بیٹیاں بڑی ہو کر ہی نہیں دے رہیں اور کم بخت نامعلوم شادیاں کب کرواتی ہیں اور تو اور کب اوباما ان کے رشتے ڈھونڈنے نکلے گا۔ کب رشتے والیاں وائٹ ہاؤس بلائی جائیں گی تو انہوں نے اوباما پر چار حرف بھیجے اور رشتہ ڈھونڈنے نکلیں۔ جو نکلیں جو نکلیں کہ ایک پورا عشرہ بیت گیا۔ دوسرا چڑھ آیا۔ آدھا وہ بھی بیت گیا۔ کوشش جاری رہی۔

تو کریم بھاء عرف اسی فیصد سرگوشیاں کی اس دوران تین بہنیں بیاہی گئیں، خاندان کی کئی کاکیاں مائیں بن گئیں۔ صرف ایسا ہی نہیں تھا اس دوران ان کی تین جگہ بات پکی ہوئی۔ جو بعد ازاں ناموں بدلی، چار جگہ منگنی ہوئی اور وہ بھی بعد ازاں ٹوٹ گئی۔ بقول چاروں لڑکیوں والوں کا مشترکہ الگ الگ بیان "آ کر کھا کر چلے جاتے ہیں۔ دو روپے کی تیلی بھی آج تک لڑکی کے لیے نہیں لائے۔"

دو روپے کی تیلی بھلاوہ کیوں دیتے وہ۔ وہ تو۔ شادی میں سونے کا تاج پہنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

بہنیں کہتی پھرتیں کہ انہیں کریم بھاء کے لیے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آ رہی۔ جوان کے قد کے آس پاس ہو۔ یہی کچھ ساڑھے چار فٹ سے ذرا سی زیادہ۔ رنگ کریم کی طرح کریمی ہو۔ گلابی ہو، پھلجھڑی جیسا سفید نہ ہو۔ کم بولتی ہو۔ کریم بھاء تو ایک جھانپڑ جڑ دیں تے پٹر پٹر بولنے والی کو۔ جھانپڑ جڑنا بنتا بھی تھا یا کریم بھاء بول لیں یا وہ۔ خیر آئے تو سہی، کریم بھاء وہ جھانپڑ دینے کو تیار تھے۔ لمبا چوڑا خاندان نہ ہو۔ ماں ہو تو باپ مر مرا گیا ہو۔ باپ ہو تو ماں کو یاد کر کے لڑکی روتی ہو (دلی دلی خواہش)۔ ایک آدھ بھائی ہو۔ اور بہنیں مطلب سالا۔ سالیاں۔ یہ تو ہوں ہی نہ۔ پہلے پہل ڈیفنس گلبرگ کہتے تھے۔ آج کل گوالمنڈی تک محدود ہو گئے تھے کہ یہیں آس پاس کی ہو کہ کریم بھاء کا پیٹرول نہ لگے میکے لے جاتے ہوئے، پیدل ہی چلے جایا کریں دونوں، ساتھ یہ بھی عقل آئی کہ گوالمنڈی کے ہی ہوں گے تو انہیں معلوم ہو گا کہ گوالمنڈی والے کیا کیا شوق سے کھاتے ہیں۔ مثلاً "گرمی سردی سردار مچھی والے سے مچھی (مچھلی نہیں۔ نہ۔) شیدے نائی کے مکھن والے نان۔ فی نان تئیس روپے۔ جیلے کا چرغہ۔ حلیمی کا حلیم۔ آوجی آو کی رس ملائی۔ باجی کے گھریلو کھانے، بریانی پلاؤ، پائے، پالک گوشت، چانپیں۔ بکرے کے تکے کباب۔ بس یہی چھوٹی بڑی چیزیں۔ بات منگنی تک پہنچ جائے تو مچھلی۔ روسٹ رانیں۔ بس بس باقی کا اوپر کا مینو۔ اور لین دین الگ سے۔

تو عین اسی فریم میں ایک لڑکی شافیہ آن فٹ ہوئی۔ بیچ بیچ۔ ساڑھے چار فٹی۔ گلابی مائل کریمی رنگ۔ ایک بھائی۔ باپ فوت شدہ۔ اور ہاں۔ ہائے اماں پارلر والی۔ یہ نان چنے والے وہ سرخی پاوڈر والی۔

نان چنے کھائے کھائے نہ کھائے تو نہ سہی لیکن پارلر۔ کیا مجال کہ خواتین ناغہ ڈالیں۔ اپنی کمانوں یعنی بھنووں پر ایک بھی بال اگ آنے پر تڑپ کر پارلر نہ بھاگیں۔ آٹا دال گھر ہو نہ ہو کمانوں پر ایک بال نہ ہو۔ ہاں جی۔

تو یوں نان چنے اور پارلر کی دکانیں آمنے سامنے کے ترازو میں آ گئیں اور جیت "پارلر" ہوئی "جہاں زن وہاں دھن نا۔

منگنی ہوگئی۔

شافیہ ننھی سی بیس بائیس سال کی میٹرک یافتہ لڑکی۔ پارلر میں ماں کی مددگار۔ ڈیڑھ دو انچ کی ہیل پہننے والی۔ آئے دن اپنے بالوں کا رنگ اور اسٹائل بدلنے والی۔ اس کے گمان میں بھی ایسی منگنی نہ تھی۔ یعنی لڑکے والے انگوٹھی۔ پھولوں کے ہار۔ زیورات نہ لائے۔ پانچ جوڑے اور سلامی میں نوٹوں کے ہار پہنا دیے۔ جو اب لاہور بھر میں کہیں سے نہیں ملتے تھے۔ نئی صدی کی لڑکی نہ ہوئی انیس سو نوے کے کمہاروں کا لڑکا ہوگیا۔ یہ نوٹوں کے ہار خاص کوئی جاکر گوجرانوالہ سے لایا تھا۔ دو دو سو کے ہاروں میں جو کریم نان چنے والے کے سربراہان خاندان کے ہاتھوں پہنائے گئے تھے اسے ناک تک چھپا دیا۔

میڈم فوزیہ کی بے چاری قریب قریب ممی ڈیڈی بیٹی کا یہ حال۔ شادی تک صبر کے گھونٹ پی لیے دونوں نے پینے پڑے۔ میڈم فوزیہ نے قدرت سے شکوہ کیا کہ اس کی اکلوتی بیٹی کا قد ذرا سا بڑا ہو جاتا اور وہ کپڑے کو تیرے نہ کہا کرتی تو شاید بہت اچھا رشتہ انہیں بھی مل ہی جاتا۔

جیسا کہ منگنی پر ہوا تھا۔ گھر کے بیس افراد کے آنے کا کہا تھا اور پورے ستر آئے تھے بچے الگ تو انہوں نے بارات کے ڈیڑھ سو کو خود ہی تین سو کر لیا۔ لیکن۔ چچ چچ۔ اتنی ہوشیاری بھی کام نہ آئی۔ وہ کم نہ زیادہ پورے سات سو باراتی لے کر آئے۔

کریم بھاء عرف سرگوشیاں المعروف نان چنے والوں کے بڑے سپوت کی شادی تھی نا۔ تو ایسے راجا اندر کی شادی میں آدھی گوالمنڈی کیوں نہ آتی؟؟۔

"بھئی۔ ہم کس کس کو انکار کرتے سب کا منہ کریم بھاء کریم بھاء کہتے نہ تھکتا ہے۔ ہم سے نہیں ہوا انکار۔" بعد ازاں نندیں کہتی پائی گئیں۔

بس دس تو ڈیڑھ سو لوگوں کے لیے ہی کروائی تھی۔ باقی کے باراتی چاند گاڑیاں (موٹر سائیکل رکشہ) کروا کروا کر میڈم فوزیہ کی اکلوتی بیٹی کی شادی میں پہنچ گئے۔ حد تو یہ کہ جن سے چوڑیاں لی تھیں، جوتے لیے تھے، جس سے گھر کی سفیدی کروائی تھی۔ نان چنے کی دکان پر جو سو پچاس مستقل گاہک تھے، وہ تک اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ بارات میں شریک تھے۔

برہاں منہ پر ہاتھ رکھ کر کبھی کھی کھی کرنے لگیں۔ کھڑے کھڑے پچاس ساٹھ لونڈے برہاں سے پوچھ گئے تھے۔

"برہاں! ہم بھی چلیں کریم بھاء کی بارات میں۔ اتنا چاؤ تھا کریم بھاء کی شادی کا۔ آپ نے تو بلایا ہی نہیں۔ ہمارے بھی کریم بھاء ہیں وہ۔ ایسے کیسے۔؟؟"

برہاں نزاکت سے سرہلاتی رہیں۔

"آجاؤ آجاؤ تم بھی۔ بھائیا عقل کہاں تک ساتھ دے ان شادی کے کاموں میں۔ بس بیٹا! بھول گئی تمہیں بلانا۔ آجاؤ بس۔ پتا ہی ہوگا کہاں ہے میڈم فوزیہ کا گھر۔"

لڑکے موٹر سائیکلوں پر پانچ پانچ، چھ چھ بیٹھ کر کریم بھاء کی بارات کی پریڈ میں شامل ہوگئے۔

نند نے فون کروا دیا۔ "آپا فوزیہ! بارات کچھ زیادہ ہوگئی ہے۔" "جی وہی بے چاروں کا ڈیڑھ سو کو ڈبل کرنے کا فارمولا اطمینان سے کہا۔

"کوئی نہیں کوئی نہیں جی۔ آپ آنے کا کریں۔ رات کے بارہ بج چکے ہیں۔"

کریم بھاء کے اس جلوس عظیم کو دیکھ کر بھنوؤں کے بیس بیس، پچیس پچیس لے کر جمع کرنے والی میڈم فوزیہ غش کھا کر گری۔ بارات کا استقبال بہنوں نے بڑی مشکل سے کیا۔ ہاتھ پیر پھول گئے تھے سب کے۔ میڈم فوزیہ ہوش میں آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اکلوتی بیٹی تھی نا شافیہ۔ صدمہ تو ہوگا ہی۔

اپنے چالیس پچاس مہمانوں کی منت کی کہ کھانا کھلے تو مت کھانا، جس منہ بولے ماموں کے ہاتھ میں کھانے کا انتظام تھا۔ جل کر اس نے پالک گوشت میں جمال گوٹا ملا دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

یہ نان چنے والوں کا ہی فرمان تھا۔ کچھ ہو نہ ہو پالک گوشت ضرور ہو۔ پالک گوشت ڈٹ کر کھایا۔ اور پھر جو ہوا اس پر کافی جھگڑے چلے۔

☆ ☆ ☆

لڑکی گھر آگئی بغیر فریج ٹی وی کے۔ برہاں تو ہزار بار اعلان کر چکی تھیں۔

"اے بھائی! ہم ہمارے باپ دادا انبالے سے ہیں، یہ بڑی بڑی حویلیاں چھوڑ آئے وہاں۔ یہاں آکر جھونپڑیوں میں رہے۔ درویش تھے ہمارے باپ دادا درویش۔ لعنت بھیجتے ہیں جہیز پر۔"

برہاں نے لعنت یوں بھیجی کہ ایک ایک کارٹن کھول کھول پلاسٹک کے ڈونگے، پلیٹ اٹھا اٹھا چیخ چیخ کرتی رہیں۔ سارا اتوار بازار کا مال تھا۔ اور۔ درباروں کے میلے سے لیے دس دس بیس بیس کے چھوٹے بڑے توے چمٹے۔

"اے لو لڑکی بیاہی کہ گڈی۔ ہماری نرگس نے اکٹھا کیا تھا چھوٹے ہوتے اپنی گڑیا کا ایسا جہیز۔"

ساری شادی میں کہتے پھرتے تھے نا گڈی سی ہے دلہن تو۔ بالکل گڑیا سی۔ وہ جو انگریز بچیاں ہاتھ میں لیے نہیں گھومتیں وہ۔" بڑی نند لہک کر کہتی۔ "بس جیسے اس ویلیس میں چھوڑ گئے وہ شافیہ گڈی کو۔ ایسی جوڑی بنی ہے کریم کے ساتھ طوطا اور مینا۔"

گڈی سے گڑیا کو انہوں نے ولیمہ پر پوری باراتوں میں نچانے والی گھوڑی بنا دیا۔ یہ بڑا اونچا زرا ندوز (سونے کا ملمع کیا ہوا) محراب نما تاج بالکل پرانے وقتوں کے دولہوں کے سہرے کے تاج سے مشابہ اور دونوں کانوں کی طرف جھولتے تاج سے لٹکتے سہرے (چھوٹے فانوس نما)

تو اب عالم یہ تھا کہ پیشانی سے بالوں کا پہاڑ سا اٹھا کر اس پر یہ اونچا تاج ٹکا دیا۔ سب نے کہا "یہ وہ لڑکی تو نہیں لگتی جو کل بارات میں دلہن بنے دیکھی۔"

"وہی تو ہے ہم کیا دلہنیں بدل رہے ہیں" چھوٹی ثریا ہنسی۔

"وہ تو بڑی پیاری گڑیا سی لگ رہی تھی۔"

"تو آج کیا بھوت لگ رہی ہے۔" ثریا برا مان گئی۔

اپنی طرف سے سب نے تاج کا دھماکا کیا تھا دھماکا اتنا شدید ہوا کہ دلہن کے گھر والوں پر بجلی بن کر گرا۔ دلہن پر کیا گزری ہوگی وہ تو عمر لڑکیاں بالیاں بخوبی جان سکتی تھیں۔ نہ جانے کس زمانے میں یہ تاج کریم بھاء کے خاندان نے کہیں دیکھ لیا تھا کہ اس تاج کو بنوا کر ہی چھوڑا، جیولرز بھی کہے "آپا جی! ہم نے تو یہ تاج داج بنائے نہیں۔ ہاں کچھ امیر لوگ اپنی گھوڑیوں کے لیے بنوا کر لے جاتے ہیں پر وہ کچھ اور ہوتا ہے۔ آپ ڈیزائن لا دیں ہم بنا دیں گے۔"

تلاش بسیار کے بعد ایک جیولر نے عین برہاں کی پسند کے مطابق بنا دیا۔ اب اس تاج میں سب کی جان تھی۔ بچہ بچہ اسے ہر روز اس تاج میں دیکھنا چاہتا تھا۔ ادھر میڈم فوزیہ کان میں کہہ جاتی۔

"خبردار جو تو تاج لگا کر آئی۔ فردوس کے یہاں تو بالکل لگا کر نہ جائیو۔"

چلو تاج ہوا، بارات کا جلوس عظیم ہوا، کھانے میں جمال گوٹا ہوا، ننھا منا جہیز ہوا، ان سب چھوٹی بڑی بدمزگیوں کے باوجود کریم بھاء اور شافیہ خوش تھے۔

ہاں وہ کمرے کی بات تو رہ ہی گئی۔ کریم نان چھولے جو جناب ابو بابا کے یہاں سے رشتے کے انتظار میں تھے نے پہلی بڑی بہو کو تیسری منزل پر پدّا سا کمرہ دیا۔ ہاتھ پھیلاؤ دیواریں، ہاتھ اٹھاؤ چھت چھو لو اور تو اور چھت کا بارش کا پانی اس کمرے کے فرش سے ہو کر کمرے کی دیوار کے سوراخ سے بنا کسی پائپ کے بوچھاڑ کی طرح نیچے گرتا۔ ایک بیڈ تھا جو کمرے میں آیا پھر کچھ اور نہ آیا۔ بیڈ ایسے دیواروں میں فٹ ہوگیا کہ انگلی برابر جگہ خالی نہ رہی، دروازہ جو باہر کی طرف کھلتا۔ کھولو اور بیڈ کی پائنتی کی طرف پیر اٹھا کر چڑھ جاؤ۔ بس۔ فنش۔ کمرہ ختم ہی۔

یہی کمرہ کیوں۔؟؟

انبالے سے تھے نا۔ بڑی بڑی حویلیوں میں رہتے تھے۔ بڑے بڑے ہال نما کمروں میں تو سارے بڑے کمروں کا ایک ہی بڑا کمرہ نیچے بنا رہا تھا، وہاں سب کا آنا جانا تھا اور اتنا تھا کہ لگتا کوئی چیز تقسیم کی جارہی ہے۔ دوسری منزل پر ویسا ہی ایک بڑا کمرہ سب کے سونے

کے لیے تھا۔ تین کنواری نندوں دو چھوٹے دیوروں۔ ساس سسر۔ سب کے لیے وہ ایک تھا۔

تو مسٹر کریم اور مسز کریمی کو تیسری منزل پر ہی آنا تھا نا۔ ویسے بھی اب رواج تو تھا نہیں گھونگھٹ کا۔ تو شرم و لحاظ کا تقاضا تھا کہ دونوں کو بہت اوپر سب سے الگ رکھا جائے' سامنے کے گھر کا کبوتروں کا پنجرہ بھی ان کے کمرے سے کہیں زیادہ بڑا نکلا۔

خاندان والوں کا خیال تھا کہ بجاں کی کچھ یوں سوچ ہوگی۔

"گھٹ گھٹ کر مریں یہ کم بخت ماری بہوئیں' یہ نہ ہو کہ پھدک پھدک (کھتک ناچ) کر اپنے شوہروں کو لبھائیں۔"

"ارے لو انبالے والے تو خوب رہے۔ دنیا بھر کی توپوں کے سلام۔ شادی میں ہوئی بدمزگیاں دہرائی جاتی رہیں۔ بار بار بڑے شوق سے دہرائی جاتیں جیسے ہی شافیہ اوپر سے نیچے آتی' بجاں بڑبڑانے لگتیں۔

"سونے سے گھڑاون مہنگی" (اتنے کا مال نہیں جتنا اوپر لگ گیا) ساتھ ہی "تو ہم منہ اندھیرے اٹھتے تھے اور کام کاج میں جت جاتے تھے۔"

وہ منہ اندھیرے کس کے لیے اٹھتی۔ چھوٹے بڑے سب دن چڑھے اٹھتے فخر سے بتاتے "ہمارے یہاں تو ناشتہ بارہ ایک بجے سے پہلے نہیں ہوتا" اتنے طریقے سلیقے والے تو لوگ تھے۔ کریم بھاء دکان پر ہی ناشتہ کرتے۔

دعوتیں ہونے لگیں۔ شافیہ باتھ روم میں رو آتی پھر آکر تاج لگالیتی' کئی بار بے چاری نے بڑی منت سے کہا کہ آج نہیں لگاتی' سر بھاری ہو رہا ہے پہلے ہی درد سے۔ "ایسے ہی چلتے ہیں۔" زنانہ اصول و ضوابط کے حامل کریم بھاء بولتے۔

"ارے ایک کپ چائے پی لو۔ ہو جائے گا۔ سردرد ٹھیک۔ قدر کرو۔ لڑکیاں تو ترستی ہیں ایسے زیورات کو۔ نیلے سوٹ پر تو خوب جچے گا۔"

کسی کسی گھر لڑکیاں اس کے گرد اکٹھی ہو جاتیں "بھابھی ایس کریں' اتار پھینکیے اس مغلئی تاج کو۔ توبہ آپ کی جگہ میں ہوتی تو شاہی قلعے کی دیوار پر چڑھ کر کود جاتی یا ناچ رہے گایا میں۔"

شافیہ سب سن کر رہ جاتی۔

آہستہ آہستہ شادی شدہ نندوں نے ایک ایک کر کے شافیہ کے میکے سے دیے کپڑے واپس کر دیے۔

"ہمارے درزی کہتے ہیں بہن جی ایسے تو آپ نے کبھی ایسے گھٹیا کپڑے نہیں پہنے' یہ والا کہاں سے اٹھا لائیں۔"

لو درزی۔ اس شافیہ کا لہنگا تک تو نندوں نے مل بیٹھ کر سیا تھا اور اپنی ولیمہ کی ساڑھیاں بھی بات کر رہی تھیں درزی کی جس کی کبھی شکل نہ دیکھی تھی۔ شافیہ نے کپڑے سمیٹے اور ماں کو دے آئی۔

وہ کہتی ہیں "اچھے والے دیں۔" پیغام بھی دے دیا۔

میڈم فوزیہ نے خاموشی سے کپڑے رکھ لیے۔ مطلب بھاڑ میں جائیں وہ۔ اتوار بازار' درباروں کے میلوں سے خریدا جہیز گھر بھر میں سیٹ ہو گیا۔ باورچی خانے میں بھی سج گیا۔

بڑا ماں کہتیں "ارے ثریا! مجھے ان سستے برتنوں میں کھانا نہ دیا کر۔"

شافیہ شرمندہ ہو کر چینی کی پلیٹ میں کھانا لے جاتی' تو بڑاماں کے ہاتھ سے وہ پلیٹ ہی پھسل جاتی۔ کبھی پکڑی نہ تھیں نا' یہ پلاسٹک چینی کی پلیٹیں۔ سونے چاندی کے برتنوں میں کھایا تھا۔ پروسا تھا۔

"ارے تو یہ سیٹ تو بے کار ہوا۔ باورچی خانے میں لگادو اب اسے۔ کیا شوکیس میں سجا کر رکھتی ہو۔ دو پلیٹیں' ڈونگا تو ٹوٹ گیا۔"

سیٹ باورچی میں آگیا۔

کریم نان چنے والے۔ چچ چچ۔

☆ ☆ ☆

خاندان بھر میں شافیہ کی خوبصورتی کے چرچے ہوئے ایک ماموں زاد نے کہہ دیا۔

"لڑکی کا باپ زندہ ہوتا تو ان کم بختوں کو لڑکی کبھی نہ دیتا۔"

چلو اب تو کم بختوں کو لڑکی مل چکی تھی نا اور وہ کافی کم بختیاں دکھا رہے تھے اس کے ساتھ۔

شافیہ کو روز کے دس روپے دیے جانے لگے۔

دس روپے؟

کریم بھاء کو عادت تھی' کہتے ہیں دادا مرحوم سے یہ وصف لیا تھا۔ وہ کام پر جانے سے پہلے دو روپے سب میں تقسیم کر جاتے۔ ابا جی جب تک دکان سنبھالتے تھے تو بہن بھائیوں' اماں کو ایک ایک روپیہ دے جاتے' کریم بھاء اسے دس روپے پر لے آئے۔

یہی دس روپے شافیہ کا جیب خرچ تھا' یہی کپڑے تھے' یہی جوتے تھے۔

ہاں بھئی بہت۔ بہت تھے دس روپے۔

بجاں نے کہا "کمیٹی ڈال لو۔ ہم سب نے تو اپنے اپنے دس روپے کی کمیٹی ڈال رکھی ہے۔ تم اور ثریا مل کر ہزار روپے ماہوار کی کمیٹی نرگس کے یہاں کرلو۔"

شافیہ دنگ رہ گئی۔ پانچ خواتین کی وہ بھنویں بناتی تھی تو اس سے زیادہ کمالیتی تھی۔

کریم نان چنے والے۔ واللہ۔

ٹیڑھا میڑھا جو بھی تھا۔ کم زیادہ ہو کر سسرال سے تعلق چل رہی رہا تھا اس دوران ایک بار طیش میں آکر بڑی نند نے شافیہ کے گال پر جھانپڑ جڑ دیا وجہ وہی پٹر پٹر چلتی زبان۔

سارا گھرانہ جڑ کر دو گھنٹے سے بارات کے کھانے کو لے کر رو رہا تھا۔ ہفتے میں تین چار بار اور رات کو سونے سے پہلے بڑے کمرے میں یاد بارات کو ضرور دہرایا جاتا۔ ولیمہ میں تو کیا مجال کہ کارڈ بھیج کر بلائے گئے سے زیادہ ایک چڑیا کا بوٹ بھی گھس آیا ہو شامیانے میں۔ سسر کرسی رکھ کر شامیانے کے باہر بیٹھ گئے تھے' دو چار بچے جو قد نکال کر بڑے ہو چکے تھے ان کو ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا۔ ان کے ماں باپ نے خوب ہنگامہ کیا۔ کرتے رہیں ہنگامہ۔ اچھا ہوا بیس پچیس لوگ اور کمتی ہو گئے۔

بارات کے کھانے کو لے کر نندیں اور بجاں رو رہی تھیں۔ شافیہ نے کہہ دیا۔

"آدھا لاہور تو اٹھا لائے تھے بارات بنا کر۔ کھانا کم نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟؟"

جھانپڑ پڑا ایسی زبان درازی پر۔ شافیہ گھوم کر رہ گئی۔ بجاں نے بڑی ہائے وئیلا کی۔

"ماں کی جگہ ہوتی ہیں بڑی بہنیں۔ پر تم تو اپنی ماں کو ماں نہیں سمجھتی ہوگی' نندوں کو کیا سمجھوگی۔"

غلطی کی۔ شافیہ کو انہیں مائیں سمجھ لینا چاہیے تھا۔ الٹا ناراض ہو کر میکے جا بیٹھی۔ صلح صفائی ہو کر تین ہفتوں بعد واپس آئی۔

جھانپڑ سے جیسے غیر اعلانیہ لیکن اعلانیہ باقاعدہ سسرال بمقابلہ شافیہ خرانٹ شدنی بہو دنگل کا آغاز ہو گیا۔

اب پتا چلا کہ وہ توتلی ہے۔ کپڑوں کو تپڑوں' کمرے کو تمرہ۔ قمیص کو تمیص کہتی ہے' تھوڑا مسئلہ تھا اس کی زبان میں۔ سسرال آکر بہت بڑا ہو گیا۔

نندیں کچھ یوں بات کرتیں۔

"ارے ثریا! یہ تپڑا پکڑا۔ میں تمرے میں رکھ آوں۔"

اماں تماتر نہیں ہیں فریج میں۔ "تریم بھا سے کہو لادیں۔"

اور تو اور میڈم فوزیہ ہوئی دوری مائی۔ بھائی زکوٹا جن' ماموں گاما چی گاما' جیرا پہلوان۔ اور نانی پیاری نانی۔ جمنا دیوی۔ بے چاری سر ڈھانپ کر رکھتی تھیں اور ہاتھ سے پلو تھامے رکھتی تھیں نا۔ باقی ادھر ادھر کے چھوٹے موٹے کدو' کنالی' لوٹا' عینکو الگ سے بارات کے اگلے ہی دن سب کو یہ نام مل گئے تھے۔

صبح اٹھنے کے بعد رات کو سونے سے پہلے شافیہ کا غیبت مارٹم کیا جاتا۔ خاندان میں کہیں جاتے یا خاندان سے کوئی آتا "شافیہ غیبت مارٹم" آب و تاب جاہ و جلال سے کیا جاتا۔

اس کے ہر سالن میں نمک مرچ کم زیادہ ہوتا۔ اس کے دھوئے ہر کپڑے پر داغ دھبے ہوتے۔ دیواروں

سے کان لگا کر وہ ان بے چاروں کی سادہ سی باتوں کو سنتی۔ اور تو اور کریم بھاء کو کمرے سے نکال کر ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے کے لیے کہتی۔ کریم نان چنے والے سارے کے سارے گواہ تھے اس واقعہ کے۔ مختصر بلکہ مختصر تر شافیہ زنبیل عمر عیار تھی جس میں سے ہر نقص نکالا جا سکتا تھا۔

یہ ساری باتیں ایک طرف ' ایک خاص بات کہ کریم نان چنے کے آجو باجو کہیں کوئی مدرسہ بن گیا۔ جناب عبدالوہاب صاحب ناشتہ کر جاتے۔ آدھ پون گھنٹے کا لیکچر دے جاتے۔

کریم نان چنے والا مسلمان ہو گیا۔ مطلب اس نے سیکھا کہ "بھئی میاں یہ کیا بے غیرتی ہے کہ یہ عورتیں منہ سر پھاڑ بازاروں گلیوں میں دندناتی پھریں۔ حد ہے۔ کوئی ہے جو انہیں لگام ڈالے۔" کریم بھاء تھے نا۔

پہلی فرصت میں بازار جا کر برقع لائے اور شافیہ کے آگے رکھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"برقع ہے۔ پہن کے دیکھو بلکہ مجھے دکھاؤ۔ گھٹنے نظر نہ آئیں۔"

"کیوں دکھاؤں؟" وہ ہنسی۔

"اے ری۔ سنا نہیں۔ پہن کر دکھا۔"

ہنسی گم ہوئی۔ اس نے پہن کر دکھا دیا۔

"بس اب ایسے ہی جایا کر اسے پہن کر۔"

"میں اسے کیوں پہنوں؟" آواز ذرا سی کانپی۔

"کیوں کیا لگا رکھی ہے۔ بس کہہ دیا نا!"

"میں تو نہیں پہنتی۔"

وہ کہہ کر باورچی میں چلی گئی بات آئی گئی ہو گئی جیسے' لیکن بات آئی تھی مگر گئی نہ تھی۔ شہر کے حالات کو دیکھتے ہوئے تاج عظیم سے جان چھوٹ گئی تھی لیکن اب تو بہشت کا مسئلہ تھا۔ کریم بھاء کو بہشت چاہیے تھی اور بہشت کو ایک ہی راستہ جاتا ہے۔ ہاں جی یہی برقع۔ پردے کا۔ صرف عورت کے پردے کا۔

"میں نہیں پہنوں گی اماں جی!" شافیہ میکے جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ بھائی لینے آیا تھا۔ کریم برقع پہننے کو کہہ رہا تھا۔

"اے بی بی! پہن لو۔ چار دن کا شوق ہے کریم کا۔ اتر جائے گا۔"

"میں چادر سے نقاب کرتی تو ہوں۔ اسکارف لے آؤں گی۔ وہ پہن لیا کروں گی۔ اور بڑی چادر منگوا لوں گی۔"

"تو بی بی! برقع پہننے میں کیا جاتا ہے۔"

"پورا پردہ کروں گی۔ برقع نہیں پہنوں گی۔"

"اے جاہل عورت۔ برقع کے سوا پردہ کیسے ہو گا؟"

کریم بھاء بھڑکے۔

"پردہ منہ سر جسم ڈھانپنا ہی ہے نا۔ وہ میں ڈھانپ لوں گی۔ کوئی نہیں دیکھے گا میری صورت۔"

"مرگی پڑتی ہے برقع کا پردہ کرتے۔؟"

"ہاں پڑتی ہے۔" وہ رونے لگی۔

بڑی چادر میں بھائی کے ساتھ چلی گئی۔

شادی سے لے کر اب تک اس کی سہیلیوں نے ہزاروں بار اس کا مذاق اڑایا تھا۔ کم عمر یہ کم عمر وہ۔

"بڑے بال کٹا کر پری بنی پھرتی تھی۔ کریم بھاء نے تاج پہنا کر گھوڑی ہی بنا ڈالا۔"

اس رات وہ ساری رات روتی رہی تھی جب فردوس کے یہاں سے دعوت سے آئی تھی وہیں باقی سہیلیاں بھی آگئی تھیں۔ بہت دیر تک اس کا توا الٹا رہا تھا۔

"اگلی بار یہ پٹھانی برقع میں آئے گی۔ آنکھوں کی جگہ دو سوراخ ہوں گے اور ان سوراخوں پر عینک۔ کالی سیاہ عینک۔"

"ہاں تو پہن لوں گی برقع۔ پردے میں کیا برائی ہے۔"

"پردے میں برائی نہیں بی بی! وہ کریم بھاء جس زور زبردستی سے کروائے گا وہ ضرور برا ہو گا۔"

تو اس زور زبردستی پر اسے رونا آیا۔

"میرے ساتھ جائے گی تو برقع میں ہی جائے گی۔"

کریم نے دھمکی دی۔

شافیہ کے منہ بولے ماموں آگئے۔
"بچی ہے 'سمجھ جائے گی۔ ابھی چادر میں ہی رہنے دیں اور دین میں تو جبر بھی نہیں۔ ہدایت وہ جو اچھے طریقے سے دی جائے۔"
"اب یہ بے لباس ہو کر بازاروں میں گھومے تو ہم یہی رٹا لگائے رکھیں کہ جی دین میں جبر نہیں۔"
"شافیہ کی نندیں کرتی ہوں تو شافیہ بھی کرلے بیٹا۔"
کریم بھاء بھڑک اٹھے "میری بہنوں کا نام نہ لو جی۔ میری ماں جائے انہیں۔ میری ذمہ داری صرف شافیہ ہے۔"
"کرلے گی بیٹا۔ کرلے گی۔ بس ذرا اچڑتی ہے۔"
"دوزخیوں کی نشانیاں ہیں یہ تو پھر جی!" کریم بھاء ہونہہ کے انداز میں بولے۔
"منہ سر ڈھانپ کر رکھتی ہے کریم بیٹا۔"
"برقع نہیں تو پردہ نہیں بس۔"
"پیار سے سمجھاؤ۔ سمجھ جائے گی۔"
"دین کے معاملے میں میں برداشت نہیں کروں گا۔ ہاں جی۔ اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ ہمیں تو ڈر ہے بھئی۔ آپ کی آپ جانیں۔ اس گھر میں واپس آئے گی تو صرف اسی ایک برقع کو پہن کر۔ دین کے نام پر مجھے سو طلاقیں منظور۔"
ماموں چلے گئے۔
ادھر سے کریم بھاء کو بھڑکایا۔ ادھر شافیہ کو سمجھایا لیکن بات بگڑتی ہی چلی گئی۔
شافیہ کہتی ثریا' شکیلہ گلے میں دوپٹے ڈال کر گھر گھومتی ہیں۔ انہیں کیوں نہیں روکتا کریم؟"
ادھر بریاں اپنی پلٹن سمیت کسی نہ کسی کے آگے رونا رو رہی ہوتیں۔
"تو ایک برقع ہی تو ہے۔ عورتیں کیا کیا نہیں کرتیں اپنے شوہروں کے لیے۔ جاہل عورت 'ماڈرن بننے کا بھوت سوار ہے۔ نا بھئی نا' کہے دیتی ہوں۔ کبھی نہ بیاہ کر لاؤ یار لڑوالیاں۔ آدھی آستین پہن کر چھت پر بنا دوپٹے کے گھومتی تھی۔ میاں نے کچھ دیکھ کر ہی برقع کا کہا ہے۔ عزت تو ہمارے ہی گھر کی ہے نا۔ اب کیا کیا بتاؤں۔"
پلٹن سمیت بریاں کے خطبات بنام شافیہ 'محترمہ بہو' بننے کے باوجود خاندان والوں نے ان پر خوب خوب باتیں کیں کہ بریاں سنجیدہ ہو کر شافیہ کو لینے گئیں۔
"ہے بی بی! برقع پر اب کیا واقعی ہی طلاق لوگی۔؟؟؟"
میڈم فوزیہ نے بھی یہی کہا۔ شافیہ گھر آگئی۔ برقع پہننے سے پہلے خوب جی لگا کر روتی۔ کریم سے تھپڑ کھاتی۔ بریاں' ثریا' شکیلہ' انیلا منہ چھپا چھپا کھی کھی کرتیں۔ آہ ٹھنڈ پڑ جاتی دل میں۔

☼ ☼ ☼

ایک دن کریم ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اسٹیج پر اداکارہ ناچ رہی تھی۔ شافیہ نے باورچی سے نکل کر ٹی وی بند کر دیا۔
"گناہ ہے یہ ناچ گانا دیکھنا۔" کہہ کر پلٹ گئی۔ کریم نے جھٹ اٹھ کر اس کی چٹیا پکڑی۔
"ذلیل عورت! تیری یہ جرات!"
بریاں نے کانوں کو ہاتھ لگائے "توبہ توبہ ان عورتوں کی بہادریاں"
صحن میں اسے وہ مار پری' وہ مار پڑی کہ محلے والوں نے دیر تک نہ صرف چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا بلکہ تھک ہار کر کوئی بچہ میڈم فوزیہ کے پار لڑوڑایا۔
بریاں چلاتی رہیں "کم بخت ماری کہتی ہے۔ برقع نہیں پہنوں گی۔ نہ پہن بھئی نہ پہن۔ کریم کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ ایسے قاتلانہ حملے تو نہ کر۔"
میڈم فوزیہ بھاگی آئی۔ غسل خانے کا دروازہ بند کر کے بیٹھی تھی۔ ماں نے آکر دروازہ کھلوایا۔ دروازہ کھلا اور جو اس پر نظر اٹھی۔ میڈم فوزیہ غش کھا کر گر گئی۔ منہ بولے بھائی بھابھی نے لپک کر دونوں کو سنبھالا۔
"خلع کا پہلا نوٹس آگیا۔"
سپہ سالار بریاں نے گھڑ سواروں ثریا' شکیلہ' انیلا' نرگس' نجمہ' حمیدہ کی پلٹن ترتیب دے سارے میں مشہور کر دیا کہ۔
"برقع نہیں پہنتی تھی۔ بس یہیں سے بات بگڑی۔ کافر تھی۔ بنا وضو کے قرآن پاک پڑھتی تھی۔ توبہ توبہ۔ چھت پر چڑھی رہتی تھی۔ کئی بار پکڑا بھئی آنکھ مٹکا کرتے۔ کیا کیا کرتوت بتائیں اس کے۔ بہت دیکھا ان آنکھوں نے پر اپنی عزت کو چپ رہے۔ پار لڑوالیاں ہوتی ہی حرام کار ہیں۔ ان کے گھر نہیں بستے۔ ہمیں تو یقین ہے 'باپ مرا نہیں ہے۔ ماں نے کوئی گل کھلایا ہوگا بھاگ گیا ہوگا۔ اتوار بازار کا سارا پلاسٹک جہیز بنا کر اٹھا لائی تھی۔ ہم نے تو پھر بھی کچھ نہ کہا۔ ہونہہ۔! کانوں کو ہاتھ لگائی ہوں پر کتے بلیاں ہی کھاتے ہوں گے ایسے برتنوں میں۔"
میڈم فوزیہ جس نے پائی پائی جوڑ کر بچی کا جہیز جمع کیا تھا اور تن تنہا بڑی مشکلوں سے اپنی بیٹی بیاہی تھی کو سب نے کہا کہ خلع کا نوٹس واپس لے لے۔ لیکن وہ چپ سادھے رہی۔ نوٹس واپس نہ لیا۔
جو نوٹس واپس لینے کا کہہ رہے تھے' وہ غسل خانے میں بند شافیہ کو دیکھ لیتے تو کریم کو قتل کرنے کا کہتے۔
ایک اسی مار کی بات نہیں تھی۔ ان ڈیڑھ سالوں میں بہت کچھ ہوا تھا۔ شافیہ نے ایک صابر بچی کی طرح بہت کچھ برداشت کیا تھا۔ میڈم فوزیہ اب اس کی موت پر صبر کرنے کا حوصلہ نہیں پاتی تھی خود میں' بہرحال طلاق ہو گئی۔ سارے میں مشہور کر دیا گیا کہ برقع ہی فساد بنا ہے۔ کافر تھی۔ سمجھتی نہیں تھی۔
اتوار بازار سے خرید آگیا جہیز اسٹور میں بند کر دیا بعد ازاں اسے ڈبوں میں بند کر کے ثریا کے جہیز کے لیے رکھ دیا گیا۔ چینی کا ڈنر سیٹ نرگس آپا لے گئیں' دو رضائی گدے' ایک کمبل نجمہ آپا۔ باقی کے چھوٹے بڑے پلاسٹک کے برتن کچھ حمیدہ کے 'کچھ انیلا کے حصے میں آئے۔ کام والے کھلے ڈھیلے سوٹ بریاں نے لے لیے۔ شلواروں پر فیتے ڈال لیے۔ لو جی ماپ کے کپڑے تیار ہو گئے۔
ماموں شرافت سے جہیز لینے آئے تو کریم بھاء نے محلے کے لڑکوں سے پٹوا لیا۔ بعد ازاں لڑکوں کو سردار کی مچھی کھلائی۔ سونے کے چار تولے کے سیٹ کے لیے دو بار پولیس لائی میڈم فوزیہ' پر زیور گھر سے نہ نکلا۔ کریم پولیس والوں کو پیسے لگا آیا جو میڈم فوزیہ نہ لگا سکی۔
شافیہ کی جان بچی۔ باقی سب پر میڈم فوزیہ نے صبر کرلیا۔
شافیہ کے باقی کے زیورات اور کپڑے نوعمر بھانجیوں کو کانٹ چھانٹ کر پہنا دیے۔ بیڈ کور قالین پر بچھنے لگے۔ اس پر گاؤ تکیے رکھے ٹیک لگائے کریم نان چنے والے دو دوری مائی کے ان قصوں پر ہنستے جو دوران طلاق عدالت میں جج کے روبرو پیش آتے رہے۔
کریم نان چنے والے۔ چشم بدور۔
دوسری بیوی مسز کریم کالے جادو والی نکلی۔ اس کی ماں کہیں کسی فیکٹری میں کھلونے بناتی تھی۔ دو چار وہ بھی رکھ کر لے آئی۔ بس ہو گئی جادو گرنی۔
تیسری کی زبان بہت لمبی تھی۔ کہتی تھی۔
"کافر ہو تم سب کے سب۔ بے غیرت۔ جانور ہو جانور۔ یہ زنانہ کریم' ہیرا منڈی جاتا ہے۔ چنوں میں تقریبات کا جھوٹا گوشت ڈالتا ہے۔ اور یہ بریاں اندھی بنی بیٹھی رہتی ہے۔ دیکھتی نہیں ادھر ادھر کے لڑکے کیسے ان کی چھتوں پر پہنچ جاتے ہیں اور نیچے سے ثریا انیلا غائب ہو جاتی ہیں۔ ہونہہ۔ سب کے سب بے غیرت۔"
توبہ اتنی لمبی زبان۔ خرانٹ تھی خرانٹ۔
ہاں اب چوتھی کی تلاش جاری ہے۔ محلے والے اپنی بیٹیوں کو دعا دیتے ہیں۔
"خدا رحمان کریم' نان چنے والے جیسے لوگوں کے شر سے ہمیں اور ہماری بچیوں کو بچانا۔ آمین۔"

ناولٹ

گیارہویں قسط

آمنہ ریاض

تماہ سم

باقر لودھی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہر وقت بدحرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی ساحر کو اس سے شدید جلن ہے۔ وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

ساحر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا ساحر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہر وقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑوا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستا نہ بنانے پر اس نے ساحر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام ساحر پر لگا دیا کہ ساحر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر، ساحر کو دو تھپڑ مار دیتے ہیں۔ ساحر کو بہت دکھ ہوا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔

تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

شفا عمیر کو ساری بات بتا کر ان سے اور ساحر سے اپنی پچھلی تمام باتوں پر معافی مانگ لیتی ہے۔ عمیر اسے معاف

کردیتے ہیں مگر ساہر 'شفا سے بیر باندھ لیتی ہے اور غلط بیانی کرکے دونوں بہن بھائی میں غلط فہمیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ عمیر کے منع کرنے کے باوجود جھوٹ بول کر شفا کو کالج ٹرپ پر بھجوادیتی ہے۔

کاسٹنگ ڈائریکٹر جاثم تقی کو اپنے ڈرامے میں لیڈنگ رول کی آفر کرتا ہے۔ تقی اپنے ابا کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہوجاتا ہے۔

تقی اور سمیر بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ مری جاتے ہیں اور اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے ہیں 'جہاں شفا کا گروپ ٹھہرا ہوتا ہے۔ وہاں سمیر کو ثمر پر اپنی منگیتر کا گمان ہوتا ہے۔ ٹرپ کے دوران دونوں گروپوں کے درمیان ہلکے پھلکے ٹاکرے ہوتے رہتے ہیں۔ اور باقاعدہ منگنی پر دونوں کو پتا چلتا ہے کہ وہ واقعی ثمر ہے۔ وہ دونوں منگنی تو کرلیتے ہیں مگر سخت غصے میں ہوتے ہیں۔ منگنی کے بعد سمیر ٹرپ کے دوران مذاق میں کہی شفا کی بات کہ "ثمر کا نکاح ہوچکا ہے" اپنی ماں کو بتا کر منگنی توڑ دیتا ہے۔ ثمر کے والد شکیل صاحب سمیر کے والد سے سخت ناراض ہوجاتے ہیں۔ ثمر کی والدہ یہ جان کر کہ ثمر کے نکاح کی افواہ شفا نے اڑائی ہے۔ وہ شفا سے خفا ہوجاتی ہیں۔ ساہر انہیں مزید بھڑکاتی ہے۔ ساہر اور عمیر تقی سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ مہک 'تقی کا پورٹ فولیو بنوالیتی ہے۔ تقی کو آفرز آنے لگتی ہیں۔ وہ ایک دو کمرشلز میں کام کرلیتا ہے۔ رضی کی بدولت مہک کے والد سے باقر لودھی کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ تقی کے لیے مہک کو پسند کرلیتے ہیں۔ جری کے میڈیکل میں ایڈمیشن ہونے کی خوشی میں باقر لودھی ایک چھوٹی سی تقریب کرتے ہیں۔ انہیں تقی کے شوبز جوائن کرنے کی خبر مل جاتی ہے۔ وہ بھری محفل میں اسے سخت بے عزت کرتے ہیں اور چھڑی سے مہمانوں کے سامنے خوب پٹائی لگاتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں۔

وہ متضاد سوچوں میں گھر جا رہا تھا' اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ عمیر اسے اپنے ہاں لے آتے ہیں اور جب تک گھر کا بندوبست نہیں ہوجاتا' اسے اپنے گھر رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ تقی ممنون اور شرمندہ سا ان کے گھر رہنے لگتا ہے۔ شفا اور وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں 'مگر زیادہ بات چیت نہیں کرتے۔ شفا کو عمیر کی نظروں میں گرانے کی ساہر کی سازش کا اسے علم ہوجاتا ہے۔ وہ ساہر کو منع کرتا ہے 'مگر ساہر بجائے شرمندہ ہونے کے 'اسے اس معاملے سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہے۔ وہ کمرشلز اور ڈراموں میں مصروف ہوجاتا ہے۔ سمیر کے آفس میں ثمر انٹرن شپ کے لیے آتی ہے۔ سمیر اس کی طرف مائل ہونے لگتا ہے 'مگر وہ اس کی جانی دشمن بنی ہوئی ہے۔

ساہر 'شفا سے انتقام لینے میں اتنی آگے بڑھ جاتی کہ اپنی دوست کے بھائی روحیل کو شفا کا موبائل نمبر اور تصاویر دے کر اس کے پیچھے لگا دیتی ہے۔ وہ شفا کو بلیک میل کرنے لگتا ہے اور عمیر کو بھی اطلاع دے دیتا ہے جبکہ وہ اپنی تصاویر لینے کے لیے مجبوراً" اس سے ملنے آتی ہے۔ اس کے بعد روحیل کو گھر پر بلوالیتی ہے۔ روحیل الٹا ساہر سے بے تکلف ہونے لگتا ہے۔ ان ہی دنوں ان کے گھر عمیر کے دور کے تایا آئے ہوئے تھے۔ وہ چھت پر مردانہ سایہ دیکھ کر فائر کردیتے ہیں۔ روحیل بھاگ جاتا ہے اور ساہر 'عمیر کے گھر کود جاتی ہے۔ دوسری طرف تایا شور مچا دیتے ہیں کہ شفا چھت پر کسی مرد سے بات کررہی تھی۔ تقی کو ساہر کی ان منصوبہ بندیوں کا علم ہوتا ہے۔ وہ عمیر کی عزت کے خیال کرتے ہوئے اپنی شوٹنگ ادھوری چھوڑ کر گھر آجاتا ہے 'جس کا خمیازہ اسے شفا سے نکاح کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ پھر تایا کے اصرار پر رخصتی بھی کردی گئی۔ ساہر نے تقی کے گھر فون کرکے بتا دیا۔ لودھی صاحب مزید بگڑ گئے مگر شفا کو اپنے گھر لے گئے مگر دوسرے دن تقی سے پھر جھگڑ پڑے۔ تقی شفا کو لے کر جوہر ٹاؤن والے گھر میں منتقل ہوجاتا ہے۔ وہ دونوں وہاں اجنبیوں کی طرح رہنے لگتے ہیں۔ تقی پر شدید غصے کے سبب ساہر 'مہک کو بھی اس کے نکاح سے باخبر کردیتی ہے۔ وہ جوہر ٹاؤن پہنچ جاتی ہے اور شفا کو دیکھ کر تقی سے شدید غصے کا اظہار کرتی ہے اس کے ناراض ہونے پر تقی کو شفا پر غصہ آتا ہے۔ لڑائی میں شفا بتا دیتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ چھت پہ راحیل کے ساتھ ساہر بھابھی تھیں۔ اس لیے وہ آئندہ اس پر یہ احسان نہ جتائے کہ اس نے شفا کی عزت رکھی ہے۔ تقی اس کو باور کرا دیتا ہے کہ وہ اسے مستقبل میں ساتھ نہیں رکھے گا۔ شفا ذہنی طور پہ تیار ہے

شفا نے دروازہ کھولا 'سامنے مہک کھڑی تھی۔

"آؤ۔" شفا نے خوش دلی سے استقبال کرتے ہوئے دروازہ کچھ اور کھول دیا تھا۔

مہک اندر آگئی 'لیکن اس کے تاثرات سرد مہر تھے۔

"مجھے کیوں بلایا ہے؟" اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"دروازے پر ہی سارے سوال پوچھوگی؟" شفا مسکرائی۔ "اندر تو چلو' اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

وہ دوستانہ انداز میں بولتی اندر کی طرف چل دی' ناچار مہک کو اس کی پیروی کرنا پڑی 'ورنہ جیسے اس کے تاثرات تھے 'صاف پتا چلتا تھا وہاں تک آتو گئی ہے' لیکن دروازے سے آگے جانا نہیں چاہتی۔

"کھانا کھاؤگی مہک؟ میں دراصل ابھی اسکول سے واپس آئی ہوں' تم نے آنا تھا تو ہاف لیو لے کر آگئی۔ کھانا کھا رہی تھی۔" وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو رہی تھی۔ یہ بات مہک کو کچھ خاص پسند نہیں آئی۔

"تمہیں جو بات کرنی ہے۔ ذرا جلدی کرلو پلیز۔ تمہیں پتا ہے۔ میں یہاں صرف تمہارے اصرار پر آئی ہوں۔ ورنہ یہاں آنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مجھے۔" مہک نخوت سے کہہ رہی تھی۔ شفا ذرا دیر کے لیے چُپ سی رہ گئی۔

منتیں تو واقعی بہت کی تھیں اس نے۔ تقی ایک تو مصروف بہت ہوگیا تھا۔ دوسرے مہک کے لاتعلقی برتنے پر تھوڑا غصے میں بھی آگیا تھا۔ لیکن شفا دل سے ان دونوں کے مابین حائل بدگمانی دور کرنا چاہتی تھی۔

جانے کو تو وہ بھی جاسکتی تھی 'لیکن ایک تو نئی نئی ملازمت کی مصروفیات 'دوسرے جوہر ٹاؤن سے اٹھ کر گلبرگ جانے میں اسے دانتوں پسینہ آجاتا۔ مہک یو سی پی آتی تھی۔ اس کے لیے یہاں تک آنا آسان تھا۔

"اچھا' تم بیٹھ تو جاؤ۔ بات جلدی بھی کرنا ہو تو بیٹھ کر بھی کی جاسکتی ہے۔"

مہک بڑا احسان جتاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"ویسے میں سمجھ نہیں پارہی 'تم مجھ سے کہنا کیا چاہ رہی ہو۔ تقی کو تو تم نے چھین ہی لیا۔ اب یہ ساری ڈرامہ بازی کس لیے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اسے میرے لیے چھوڑنا چاہ رہی ہو؟" اس کا انداز اچھا خاصا تمسخرانہ تھا' لیکن شفا کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔"

"اوف۔ ڈونٹ ٹیل می۔" مہک ایک دم سے بھڑک اٹھی۔ "ایک شخص 'جو مجھ سے محبت کا دعوے دار ہے' اچانک ایک روز تم سے شادی کرلیتا ہے اور اب تم کہہ رہی ہو کہ تم اسے چھوڑ دوگی۔ یہ انتہائی بکواس بات ہے۔"

"تم زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہو۔ میری بات سنو تو سہی۔ میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔"

شفا نے تحمل سے کہا اور پھر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں اسے ہر بات بتاتی چلی گئی۔

کن حالات میں ان کا نکاح ہوا اور اب تک وہ کن حالات میں ساتھ رہ رہے ہیں۔ اس نے ایک ایک بات مہک کو بتادی۔

"تقی تم سے بہت محبت کرتا ہے اور میں جانتی ہوں' تمہارے دل میں بھی اس کے لیے بہت محبت ہے۔ جہاں محبت ہو' بدگمانیوں کو وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ میرا اور تقی کا الگ ہونا تو اول دن سے طے تھا۔ پھر میری وجہ سے تم لوگ اپنا رشتہ کیوں خراب کررہے ہو۔ تم اپنی ناراضی دور کرلو مہک! ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا۔ میں یہ نہیں چاہتی۔"

مہک خاموش رہی' لیکن اس کے تاثرات ایسے تھے جیسے کسی سوچ میں گم ہو۔

"اچھا۔ تم بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

مہک اس بار بھی خاموش رہی۔

☆ ☆ ☆

شفا کچن میں آکر چائے بنانے لگی' زیادہ دیر نہیں گزری کہ مہک وہیں آگئی۔

"تم دونوں اتنے دن سے ساتھ ہو۔ میں کیسے مان لوں۔ تم دونوں میاں بیوی کی طرح نہیں رہتے۔"

شفا چائے چھان رہی تھی۔ اس سوال پر ہاتھ سے چھلنی ہی گر گئی۔ چائے بھی سلیب پر چھلک گئی۔

"جس کلاس سے میں اور تقی تعلق رکھتے ہیں۔ اس کلاس میں آخری دم تک رشتے نبھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارا نکاح کسی ایگریمنٹ کے تحت نہیں ہوا تھا لیکن نکاح کے بعد ہم نے طے کیا کہ حقیقت واضح ہونے کے بعد الگ ہو جائیں گے۔ تمہارے خیال میں اگر میں تقی کے ساتھ اس رشتہ میں اتنا آگے بڑھ گئی ہوتی تو کیا تمہیں قائل کرتی کہ اس کی زندگی میں دوبارہ آؤ۔ نہیں مہک! میں کبھی یہ کوشش نہ کرتی، بلکہ میری کوشش ہوتی کہ تم اب تقی سے ساری زندگی نہ ملو۔ تاکہ اس کے دل میں بے ہوش ہوئی تمہاری محبت کبھی ہوش میں نہ آسکے۔"

بات میں دم تو تھا۔ مہک دل سے قائل ہوئی۔ لیکن اس کے دل میں سو شبہات تھے جو اس کے چہرے سے جھلک رہے تھے۔

"میں کوئی ثبوت تو نہیں دے سکتی۔ صرف زبان سے گواہی دے سکتی ہوں۔ دل راضی ہو تو اعتبار کرلو ورنہ۔۔۔ ورنہ تمہاری مرضی۔" شفا نے سلیب صاف کرتے ہوئے بڑے آرام سے کہا تھا۔

اتنے ستھرے جواب پر مہک کی طبیعت صاف ہی ہو گئی۔

"آؤ۔ میں تمہیں اپنا بیڈ روم دکھاتی ہوں۔" شفا نے اسے چائے کا مگ پکڑاتے ہوئے کہا تھا۔ مہک نے اس کی تقلید کی۔

"یہ میرا کمرہ ہے۔ وہ سامنے والا تقی کا۔"

سادہ سے کمرے۔۔۔ محدود سامان۔

مہک زیادہ دیر نہیں رکی۔

"کیا میں امید رکھوں۔۔۔ تم تقی سے رابطہ کرو گی؟" شفا کے لیے اس کے تاثرات سے کوئی اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا، سو پوچھ لیا۔

مہک نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شفا کو خوشی ہوئی۔

"اچھا سنو۔" شفا نے کہا۔ "تم اس بات کا ذکر تقی سے مت کرنا کہ میں نے تمہیں فون کیا تھا یا ہماری کبھی ملاقات ہوئی تھی۔"

"کیوں۔۔۔؟" مہک حیران ہوئی۔

"تقی تم سے بہت محبت کرتا ہے۔۔۔ جس سے ہم بہت محبت کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں، وہ آنکھیں بند کرکے ہمارا اعتبار کرے، بنا کسی جسٹیفکیشن کے ہماری اچھائی کو مانے۔۔۔ تقی کو بھی اچھا لگے گا کہ تم نے اس پر اعتبار کیا۔۔۔ ہاں ممکن ہے اگر اسے یہ پتا چلے کہ تم نے میری باتوں کے بعد اس پر بھروسا کیا ہے تو شاید وہ ہرٹ ہو۔۔۔ اور۔۔۔ ممکن ہے، یہ بات آنے والی زندگی میں تم دونوں کے درمیان حائل ہو۔" وہ بڑی سادگی سے اپنا نقطہ نظر واضح کرتی چلی گئی۔

مہک چپ چاپ اسے کچھ دیر کھوجتی نظروں سے دیکھتی رہی۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" مہک نے کہا۔ "بیوی کی طرح تم تقی کے ساتھ رہتی نہیں ہو۔۔۔ جس طرح میرے اور اس کے درمیان بدگمانی دور کرنے کی کوشش کر رہی ہو، اس سے پتا چلتا ہے کوئی ایموشنل اٹیچمنٹ بھی نہیں ہے۔۔۔ پھر وہ کیا چیز ہے جو تمہیں تقی کے لیے اتنا ٹچی بنا رہی ہے کہ تمہیں اس کے ہرٹ ہونے کی بھی پروا ہے؟"

مہک نے آنکھیں گھما کر یا مٹکا کر نہیں کہا تھا۔ شفا پر نظریں گاڑی بھی نہیں تھیں، لیکن کچھ تھا جو اس کے انداز و سوال سے جھلکتا تھا۔

شفا مسکرائی۔

"احسان مندی۔۔۔ صرف اور صرف احسان مندی۔" اس نے ترنت کہا تھا۔

اب کی بار مہک نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"یہ احسان مندی ہی رہے تو اچھی بات ہے۔۔۔ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرنا۔"

وہ چلی گئی، شفا نے سکھ کا سانس لیا۔

✡ ✡ ✡

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ان سب میں شامل ہوتی چلی گئی، نہایت خاموشی سے اس کی جگہ لودھی ہاؤس میں مستحکم ہو رہی تھی جو دور اندیش تھے، وہ خوب سمجھتے تھے اور جو نہیں تھے، وہ اپنے حال میں مست تھے۔ یعنی تقی شوٹنگز میں اور شفا اپنی نوکری اور گھر میں۔

شطرنج کی چال پر چال چلی جاتی اور کبھی رضی اور جری بھی شامل ہو جاتے۔ چائے کا دور چلتا، پکوڑے تلے جاتے۔ جیتتا خواہ کوئی بھی آئس کریم لودھی صاحب کھلاتے۔

بچھی ہوئی بساط کے دوران ہی کبھی چال چلنا بھول کر اپنے دور کا کوئی قصہ سنانے لگتے۔ شفا ہمہ تن گوش ہو کر سنتی۔ قصہ سناتے سناتے وہ تقی کی برائی کر جاتے تو اور زیادہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتی۔ اکثر ابا اس سے اپنی سپر ویژن میں کوئی نئی ڈش بنواتے۔ امی کھاتے ہوئے خوب منہ بناتیں اور آخر میں جتاتیں کہ صرف شفا کی وجہ سے کھا رہی ہیں۔ ورنہ لودھی صاحب کا بنایا کھانا کھانے کا مطلب زہر پھانکنے سے کم نہیں۔

ابا اس بات پر انہیں یاد دلاتے کہ انہوں نے بھی کئی بار بیگم کے ہاتھ کا بنا کھانا کھا کر ایسا ہی سوچا ہے۔ وہ امی کو چڑاتے۔ امی چڑتیں تو بچوں کی طرح لطف اندوز ہوتے۔ سب محسوس کر رہے تھے۔ ان میں ایک بڑی مثبت تبدیلی آرہی تھی۔

موڈ خوشگوار ہی رہتا۔ اکثر ہنستے ہوئے پائے جاتے۔ ایک روز تقی نے دیکھ لیا۔ مانو جان جل کر خاک ہی ہو گئی۔

"ابا کچھ زیادہ ہی خوش لگ رہے ہیں نہیں۔۔۔ امی؟" امی سے تائید بھی چاہی۔

"ہاں تو کیوں نہ خوش ہوں۔۔۔ بیٹیوں جیسی بہو جو مل گئی ہے۔" امی نے پیار بھری نظروں سے پتا نہیں شفا کو دیکھا تھا یا اپنے سرتاج کو۔

تقی بدمزا ہو گیا۔

"اونہہ بہو۔۔۔! کبھی مجھ سے تو اتنا ہنس ہنس کر بات نہیں کی۔"

"تم نے کبھی بیٹھ کر ان کے ساتھ شطرنج بھی تو نہیں کھیلی۔" امی نے دوبدو کہا۔

"مجھ سے اتنی بورنگ گیم نہیں کھیلی جاتی۔ سوچتے رہو۔۔۔ نا بھئی، ہمارا اتنا اسٹیمنا نہیں۔۔۔ ہاں اگر شطرنج میں بھی چیئر لیڈرز آجائیں تو بات دوسری ہے۔ بھئی کچھ تو رنگینی ہو اس سڑی ہوئی گیم میں۔" اس نے خود ہی اپنی بات کا لطف لیا تھا۔

"ہیں۔۔۔ کون آجائیں؟" امی کے پلے خاک نہ پڑا اور اچھا ہی ہوا کہ نہ پڑا۔۔۔ ورنہ ان کی جوتی تقی کے کندھے پر پڑتی۔

"کوئی نہیں بھئی۔۔۔ امی! مجھے تو لگتا ہے، معاملہ کچھ اور ہے۔۔۔ یہ ابا کے دانت ایسے ہی نہیں نکل رہے۔"

"اب کوئی بے تکی ہی ہانکنا۔" امی نے اندازہ لگایا۔

"مجھے تو لگتا ہے، بات کچھ اور ہے۔۔۔" اس نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "آپ مانیں یا نہ مانیں۔۔۔ ابا کا افیئر چل رہا ہے۔" اس نے نتیجہ نکال لیا اور نئے دور کی امی اب اتنی بھی نابلد نہیں تھیں کہ افیئر کا مطلب ہی نہ معلوم ہو، سر ہی پیٹ لیا۔

"تم نہیں سدھر سکتے تقی! ہزار بار کہا ہے، سوچ سمجھ کر بولا کرو۔"

"افیئر ابا کا چل رہا ہے۔ دانت ان کے منہ کے اندر جانے کا نام نہیں لے رہے اور سدھارنا آپ مجھے چاہ رہی ہیں۔۔۔ بھئی یہ کھلا تضاد ہے۔ ہر وقت مجھے کہتی رہتی ہیں۔ سدھر جاؤ، سدھر جاؤ۔۔۔ اتنا دھیان ابا کی تربیت پر دیا ہوتا تو یقین مانیں، آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔۔۔ میں تو کہتا ہوں، ابھی بھی وقت نہیں گزرا۔۔۔ تھوڑا کنٹرول کرلیں، ورنہ جتنے باغ و بہار آج کل ابا نظر آرہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے، عنقریب دوسری شادی کا لڈو لاکر آپ کا منہ میٹھا کروا رہے ہوں گے۔"

"بکو مت۔۔۔ یہ کام تو انہوں نے تب نہ کیے جب عمر تھی۔۔۔ اب اس عمر میں کیا دوسری شادی کریں گے۔ میں تو کہتی ہوں بیٹے! تم بھی یہ خیال دل سے نکال دو۔ شفا کس قدر بہترین لڑکی ہے۔ ساری زندگی

اسی کے ساتھ گزارو۔۔۔ دوسری شادی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بے شک مرد کو چار کی اجازت ہے' لیکن فی زمانہ ایک کی ضروریات پوری کرلیں تو بہت ہے۔"
امی گھما پھرا کر اپنے پسندیدہ موضوع پر آ گئیں۔
لیکن وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔
"اے دوراندیش خاتون! آپ مجھے دوسری شادی کے سائیڈ ایفیکٹس نہ گنوائیں' بلکہ اپنے سرتاج کے چال چلن پر غور کریں۔ میں بتا رہا ہوں' آپ نے ایسے ہی ابا کو بے دھیان رہنے دیا تو وہ کوئی نہ کوئی چاند چڑھا کر چھوڑیں گے۔ میں نئی امی کو "ممی" کہا کروں گا' پہلے بتادوں۔" تھنک کرتا یا گیا اور کیا اب بھی امی اپنے ہاتھ کو جوتی اٹھانے سے روک لیتیں؟

☼ ☼

شفا سب سے ہی گھل مل گئی تھی' حتی کہ سمیر سے بھی بھائیوں والا حساب کتاب ہو گیا تھا۔
وہ تقی کی موجودگی میں ہی آتا۔۔۔ پھر وہ دونوں مل کر شفا کو ایک دوسرے کے بچپن' لڑکپن کے قصے سناتے اور ایسی ایسی ایک دوسرے کی کھنچائی کرتے کہ شفا کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل ہی پڑ جاتے۔
اس روز بھی سمیر شام کو آ گیا۔ امی بھی یہیں تھیں۔۔۔ بارش کچھ دیر پہلے ہوئی تھی۔ شفا اسی مناسبت سے پکوڑے بنانے لگی۔ امی کو اس نے زبردستی ٹی وی کے سامنے بٹھا دیا۔ تقی اور سمیر دونوں ہی اس کی مدد کے خیال سے کچن میں آ گئے۔ اب مدد کیا کر رہے تھے۔ پکوڑوں پر ہاتھ ہی صاف ہو رہا تھا۔ تقی نے فرمائش کر کے سمیر سے کافی بنوائی۔ شفا نے "احتیاطاً" پہلے ہی انکار کر دیا۔ لیکن تقی نے قسم کھا کر بتایا کہ سمیر ویسی کافی نہیں بناتا جیسی اس نے بنائی تھی۔
اسی دوران تقی کو مہک کا فون آ گیا۔ اس کا سیل فون سلیب پر پڑا تھا۔ مہک کا نام شفا نے بھی دیکھ لیا۔ لیکن ظاہر نہیں ہونے دیا۔ تقی اس کا نام دیکھ کر حیران ہوا تھا۔۔۔ لیکن۔۔۔ ابھی آیا کہہ کر کچن سے باہر نکلنے لگا تو سمیر نے اس کا ہاتھ دبوچ لیا۔
"بھائی صاحب! کافی میں بناؤں گا۔ لیکن پھینٹنا تو آپ کو ہی پڑے گی۔"
"سمیر بھائی! کافی میں پھینٹ دیتی ہوں۔" شفا نے جلدی سے مگ اٹھا لیا' وہ نہیں چاہتی تھی کہ تقی اور مہک کے درمیان کوئی آئے۔
تقی نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔
سمیر نے شفا کی پھرتی اور تقی کا سرعت سے نکل جانا نوٹ کیا تھا اور اس پر حیران ہوا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس نے فوری کچھ کہا نہیں۔
"آپ رہنے دیں بھابھی! میں تو تقی کو تنگ کر رہا تھا۔" اس نے شفا کے ہاتھ سے مگ لے لیا اور تن دہی سے کافی پھینٹنے لگا۔
"بھابھی! میں آپ سے ایک فیور چاہ رہا تھا۔" سمیر نے جھجکتے ہوئے کہا۔
شفا نے ایک آن کے لیے اسے دیکھا اور بولی۔
"ثمر کے بارے میں بات کرنا چاہ رہے ہیں؟"
"واللہ۔۔۔" سمیر کا منہ کھل گیا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا۔۔۔ کیا آپ کے پاس مؤکل ہیں؟" تقی کا دوست تھا' سنجیدہ کیسے ہوتا۔
شفا اس بات پر ہنسی۔
"تقی کسی مؤکل سے کم تو نہیں ہے۔" وہ پکوڑے کڑاہی میں ڈال کر اس کی طرف مڑی۔
"مجھ سے تقی نے بھی کہا تھا کہ میں ثمر سے آپ کے متعلق بات کروں اور سچ تو یہ ہے کہ۔۔۔ میں نے بات کی بھی تھی۔" وہ جھجکتے ہوئے بولتی خاموش ہو گئی۔ اس خاموشی نے سمیر پر مایوسی کا ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔
"اوہ۔۔۔ میں سمجھ گیا۔"
"آپ اتنا بھی مایوس نہ ہوں۔" اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر شفا نے جلدی سے کہا۔
"یہ سچ ہے کہ میں نے بات کی تھی۔ لیکن ثمر نے پوری بات نہیں سنی۔ اس کی امی کا فون آ گیا تھا تو بات بیچ میں ہی رہ گئی۔۔۔ پھر میں نے ڈر کر بات ہی نہیں چھیڑی۔۔۔ دراصل ثمر اپنے خیالات میں بہت سخت مزاج ہے۔ میں نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو' میرے منہ سے آپ کا نام سن کر وہ میرا سر ہی پھاڑ دے۔" وہ شرمندہ سی بول رہی تھی۔
"تو پھر اب آپ دوبارہ بات کریں گی؟" سمیر نے بہت آس سے پوچھا۔
"میں رسک نہیں لے سکتی۔۔۔ ثمر میری بیسٹ فرینڈ ہے' لیکن اس کے غصے سے مجھے بھی خوف آتا ہے۔"
"پھر۔۔۔؟" اس نے اتنی مایوسی سے کہا تھا کہ شفا کا نرم دل ہمدردی سے بھر گیا۔
"آپ کو ثمر سے سچ مچ محبت ہے؟"
سمیر کا گول مٹول سر ایسے اثبات میں ہلا جیسے شاخ سے لٹکا ہوا ناریل بس گرنے کو ہو۔
"پہلے صرف اچھی لگتی تھی۔۔۔ میں نے تو بہت کوشش کی تھی' لیکن پھر بھی محبت ہو گئی۔"
شفا "عادتاً" ہنسی۔
"ٹھیک ہے۔۔۔ پھر جب محبت ہے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔۔۔ لیکن ہمت آپ کو ہی کرنا پڑے گی۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ میرے پاس ایک آئیڈیا ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی طرح میں آپ کی اور ثمر کی ایک ملاقات کروا دیتی ہوں۔۔۔ اس دوران آپ نے اسے قائل کرلیا تو ٹھیک۔۔۔ ورنہ۔۔۔"
"ورنہ کیا؟"
"ورنہ یہ کہ ثمر کا ایک اور پرپوزل آیا ہوا ہے۔۔۔ کوئی پتا نہیں کہ ثمر غصے میں اسی پرپوزل کے لیے ہاں کہہ دے۔" اس نے اچھی خاصی سنسنی ہی پھیلا دی تھی۔
"اگر ایسا ہوا تو میں بتا رہا ہوں بھابھی! اسی کھولتے ہوئے گھی کی کڑاہی میں کود کر خودکشی کرلوں گا۔" وہ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔
"خودکشی کریں آپ کے دشمن۔" شفا نے ہنس کر کہا۔ "تقی سے اچھے سے ڈائیلاگز کا اسکرپٹ تیار کروالیں۔۔۔ وہ اپنے کسی ڈرامے کا اسکرپٹ آپ کو دے ہی دے گا۔ لیکن ایسا ہو کہ ثمر آپ کو ریجیکٹ نہ کرسکے۔"
"جی نہیں۔۔۔ اس کی مدد تو میں ہرگز نہیں لوں گا۔ تاریخ گواہ ہے جب بھی میں نے تقی کی مدد لی۔۔۔ بنتے کام بھی بگڑے ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ رکا۔ "اگر ثمر نے میرا ہی سر توڑ دیا؟"
"ثمر کی محبت میں اس کڑاہی میں خود کود کر خودکشی کرنے کا حوصلہ ہے آپ میں۔۔۔ لیکن سر تڑوانے کا نہیں۔۔۔ کیسی محبت ہے بھئی۔"
سمیر نے سر تان کر خود کو اس لمحے کے لیے تیار کرلیا۔ پھر دونوں مل کر ہنسے۔
"آپ کی سہیلی ویسے ہے خون خوار۔۔۔ کوئی پتا نہیں سچ مچ میرا سر توڑ دے۔"
سمیر نے اب کی بار مسکراتے ہوئے۔۔۔ لیکن سنجیدگی سے کہا تھا۔
کچن کے دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑا تقی نہ صرف انہیں ہنستا دیکھ چکا تھا' بلکہ ایک نتیجے پر بھی پہنچ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

امی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ لیکن پندرہ منٹ سے نوٹ کر رہی تھیں کہ ان کا ہونہار بیٹا فون سے چپکا ہوا ہے۔
آواز تو نہیں آ رہی تھی۔۔۔ انداز البتہ سب کچھ بتا رہے تھے۔ وہ پہلے ہی اس کی طرف سے فکرمند تھیں۔ اب چھٹی حس نے اشارہ دیا تو پہلو پر پہلو بدلنے لگیں' لیکن تقی کی پتا نہیں کون سی باتیں تھیں جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔
انہیں اب غصہ آنے لگا' لیکن اس سے پہلے کہ غصہ سوا نیزے پر پہنچتا' تقی کے راز و نیاز ختم ہو ہی گئے۔
"کس کا فون تھا؟" وہ لہکتا سیٹی پر دھن بجاتا ہوا ان

کی طرف آیا تھا۔ جب انھوں نے غصہ پیتے ہوئے ٹی وی پر نظریں جما کر کڑک کر پوچھا۔
"آپ کی ہونے والی بہو کا۔" وہ گرنے کے انداز میں ان کے ساتھ صوفے پر نیم دراز ہوا اور ان کے کندھے پر لاڈ سے بازو بھی پھیلا لیا۔
امی کے پیر میں سات نمبر کی جوتی مچلنے لگی۔ انہوں نے گردن موڑ کر غضب ناک نظروں سے اسے گھورا۔
"میری بہو کچن میں ہے۔"
ان کے انداز پر وہ ہنس دیا۔
"میری بات کان کھول کر سن لو تقی! میری بہو شفا ہی ہے اور بس۔ اس سے آگے اور کوئی بات نہیں ہوگی۔" ان کا لہجہ دو ٹوک تھا۔
"آپ کو نہیں لگتا امی! آپ کو شفا سے کچھ زیادہ ہی محبت ہو گئی ہے؟" وہ گو کہ ہنس رہا تھا، لیکن اس بار وہ سنجیدہ تھا۔
"ہاں۔۔۔ تو وہ ہے ہی محبت کے قابل۔" امی نے ترنت کہا۔
"ایسی بات نہیں ہے۔" وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ آپ کو مجھ سے بہت محبت ہے، جو بھی میری زندگی میں آئی، آپ کو اس سے محبت ہو ہی جانی تھی۔ شفا پہلے آ گئی تو اس سے محبت ہو گئی۔ مہک آ جائے گی تو اس سے بھی ہو ہی جائے گی۔" وہ اچھا خاصا پُریقین تھا۔
"ایسی بات بھی نہیں ہے۔" انھوں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔ "تمہاری زندگی میں پہلے تو مہک ہی آئی تھی۔ لیکن سچ کہوں تو میں تمہاری پسندیدگی کا سن کر خاموش رہی، ورنہ وہ اس وقت بھی مجھے کچھ خاص اچھی نہیں لگی تھی۔ یہ نہیں کہہ رہی کہ لڑکی بری ہے، صرف یہ سمجھا رہی ہوں کہ وہ جس ماحول میں پلی بڑھی ہے، وہ ہمارے گھرانے سے بالکل مختلف ہے۔ وہ تمہاری بیوی بن بھی گئی تو یاد رکھنا۔ ہمارے ماحول میں رچ بس نہیں سکے گی۔ پھر مسائل پیدا ہوں گے تو تم بھی اکتاؤ گے۔
ہاں، جہاں تک شفا کا معاملہ ہے تو وہ مجھے پسند ہے۔ کیسی موہنی صورت ہے۔ کتنا میٹھا مزاج ہے۔ کھانا اتنا بہترین بناتی ہے کہ مہک سو سال محنت کرے تب بھی اس کے ہاتھ میں ایسا ذائقہ نہیں آ سکتا۔ وجہ جانتے ہو کیا ہے؟ صرف یہ کہ شفا کی نیت نیک ہے۔ وہ کسی کو متاثر کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتی، بس چپ چاپ اپنا کام کیے جاتی ہے۔ نہ کسی کو جتایا، نہ سمجھایا۔ کام کر کے آگے رکھ دیا۔ طبیعت کا اخلاص بہت معنی رکھتا ہے بیٹے۔ یہ بات اب نہیں مانو گے تو کچھ سال بعد مانو گے، لیکن یہ طے ہے کہ مانو گے ضرور۔۔۔
اتنے اچھے دل کی ہے کہ ساہر کو معاف کر دیا۔ ورنہ اس کے لیے کیا مشکل تھا کہ سچ بول کر ساہر کا منہ توڑ دیتی اور اپنے بھائی کے سامنے سچی ہو جاتی۔ بڑا دل اللہ کی نعمت ہوتا ہے اور شفا کے پاس بڑا دل ہے۔ بڑا اخلاص ہے۔ تم کبھی غور کرنا، وہ اتنی پر خلوص ہے کہ صلہ کی توقع کیے بغیر بھلائی کر جاتی ہے اور جتاتی بھی نہیں ہے۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے پیار سے بول رہی تھیں۔
تقی بالکل خاموش تھا۔
"مہک بہت زیادہ محبت کرتی ہے تم سے۔ اسی لیے اس کا ری ایکشن بھی شدید ہے۔ ناراضی ختم ہو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جتنی جلدی ہو سکے، اسے منا لینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو وقت ہاتھ سے نکل جائے۔" وہ سن امی کو رہا تھا، لیکن اس کے کانوں میں شفا کی آواز گونج رہی تھی۔ مہک کے حق میں اسے قائل کرتے ہوئے شفا نے کہا تھا۔
امی کی آواز اسے کھینچ لائی تھی۔
"میری مانو، اتنی اچھی لڑکی کو تم زندگی سے نکال دو گے تو پچھتاؤ گے۔ اتنی پُر خلوص لڑکی اللہ نے تمہاری کسی نیکی کے عوض تمہیں دے ہی دیا ہے تو اس کی قدر کرو۔ نہ کہ علیحدہ ہو کر ناقدری کے مرتکب ہو۔ اور پھر سچ کہوں، شفا مجھے پیاری بھی بہت ہو گئی ہے۔ وہ اتنی اچھی ہے تو میرا دل چاہتا ہے۔ اسے شوہر

بھی بہترین ملنا چاہیے اور ظاہر ہے میرے بیٹے سے زیادہ تو میری نظر میں کوئی بھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ تم نے اسے چھوڑ دیا تو جو شخص اس کی زندگی میں آئے نہ جانے کیسا ہو۔ اس کا دل اتنا بڑا ہے۔"

"لیکن امی! میں نے تو سنا ہے' دل کا بڑھ جانا بھی ایک بیماری ہے۔" ان کا جملہ کاٹ کر اس نے اتنی معصومیت سے پوچھا تھا کہ امی کا دل ہی جل کر خاک ہو گیا' یعنی ان کے اتنے لمبے لیکچر کے جواب میں ایسی بات۔ تف ہے بھئی۔

"یہ اپنا دس من کا سر اٹھاؤ اور بھاگ جاؤ یہاں سے۔ تم سے تو بندہ بھلائی نہ ہی کرے تو اچھا ہے۔ شفا کے لیے میں خود کوئی بر ڈھونڈ لوں گی۔"

"یہ بات۔" وہ تالی بجاتا اٹھ بیٹھا۔ "مجھے پتا ہے' میری امی اتنی ٹیلنٹڈ ہیں کہ شفا کے لیے کوئی بہت بہترین بندہ ڈھونڈ ہی لیں گی۔ اسی لیے میں اس کے لیے سوچ ہی نہیں رہا۔ ضرورت بھی کیا ہے جبکہ مہک موجود ہے۔"

"میری بات سنو تقی۔"

"آپ میری بات سنیں امی! شفا کے لیے اتنی بھی جذباتی نہ ہوں' کیونکہ شفا خود بھی یہی چاہتی ہے کہ ہم الگ ہو جائیں۔ وہ مجھے کنوینس کر رہی تھی کہ میں مہک سے بات کروں اور اسے بتاؤں کہ ہمارا نکاح کس صورت حال میں ہوا ہے۔"

"وہ نا سمجھ ہے۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔"

"کیوں؟" وہ چڑ گیا۔ "جبکہ میں ہی اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ ہمدردی کی تھی اس کے ساتھ۔ اب ساری زندگی کے لیے تو گلے کا ہار نہیں بنا سکتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بری ہے۔ لیکن۔۔۔ امی۔۔۔ میں نے اس کے بارے میں ایسا سوچا ہی نہیں۔۔۔ میں سوچ ہی نہیں پاتا۔ ایک معاملہ جو ہم دونوں کی باہمی رضامندی سے حل ہو سکتا ہے۔ آپ اسے کیوں الجھا رہی ہیں۔ ہاں جہاں تک اس کی زندگی میں آنے والے کسی اور شخص کی بات ہے تو مجھے یقین ہے کوئی اچھا ہی ہو گا۔ اتنی اچھی لڑکی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ نے اس کے لیے کچھ برا سوچا ہو۔ آپ ڈھونڈ لیجیے گا۔ یا مل کر ڈھونڈ لیں گے۔ بات ختم۔ اب دوبارہ اس ایشو پر بات نہ کریں' نہ ہی اتنی ٹینشن لیں۔ آپ نے تو شفا کا غم دل سے ہی لگا لیا ہے۔"

وہ جان چھڑاتا وہاں سے اٹھا اور کچن کی طرف آ گیا۔ دروازے میں ٹھٹک کر رک گیا۔ شفا اور سمیر کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

تقی کے دماغ میں ایک خیال کا شعلہ چمکا اور سارا دماغ روشن ہو گیا۔

"تقی! گدھے۔۔۔ پاجی۔۔۔! یہ خیال تجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔" اس نے ہتھیلی پر ہاتھ مارتے ہوئے خود کو لتاڑا۔

"اسے کہتے ہیں لڑکا بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔۔۔ امی بے وجہ پریشان ہو رہی تھیں۔۔۔ یہ اپنا سمیر کس دن کام آئے گا۔۔۔ بھئی واہ۔"

وہ اپنے ہی خیال پر اش اش کر اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼
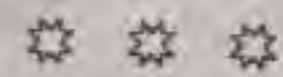
ادھر اس نے دل میں ارادہ باندھا' ادھر امی نے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔

جب تقی نہ سمجھا تو شفا کا پیچھا لیا۔ ان کی بات سن کر پہلے تقی ہنسا تھا۔ اب شفا ہنسی اور خوب ہنسی۔

"میں نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہے' جو ہنسے جا رہی ہو۔" وہ برا ہی مان گئیں۔

"آپ خفا ہو کر اور بھی پیاری لگتی ہیں۔" وہ ان سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔

"پیچھے ہٹو۔۔۔ ساس ہوں میں تمہاری۔ یہ جھوٹی سچی تعریفیں کر کے تم مجھے قابو نہیں کر سکتیں۔"

"قابو تو میں نے آپ کو کر ہی لیا ہے۔ نہ یقین آئے تو یہی بات میری طرف دیکھ کر کہیں۔" وہ اتنی پر یقین تھی کہ امی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیوں اپنا نقصان کرنے پر تلی ہو۔ ادھر تقی ہے کہ کچھ نہیں سنتا۔ ادھر تم پاگل پن کی باتیں کر رہی ہو۔ میں اپنے بیٹے کی تعریف نہیں کر رہی' لیکن تقی جیسا اچھا شوہر تمہیں نہیں ملے گا۔"

"مجھے تقی جیسا اچھا شوہر چاہیے بھی نہیں' بس آپ جیسی اچھی ساس مل جائے۔ کافی ہے۔" وہ تھی کہ سنجیدہ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ "اور آپ میری بات پر بھروسا کریں' مہک بہت اچھی بہو ثابت ہو گی۔"

"مجھے تمہارے جیسی بہو چاہیے۔" انہوں نے زور دے کر کہا۔

"مجھے بیٹی بنا لیں۔۔۔ پھر ساری زندگی آپ سے مل سکوں گی۔"

"بیٹی تو تم ہو میری۔۔۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کوئی نقصان اٹھائے' اسی لیے چاہتی ہوں کہ تقی اور تم ہمیشہ ساتھ رہو۔"

"امی!" شفا نے دونوں ہاتھوں سے ان کا ہاتھ تھام لیا' پھر ان کے ہاتھ پر محبت سے بوسہ دیا۔

"میں آپ کی محبت کی قدر کرتی ہوں۔۔۔ لیکن جو آپ چاہتی ہیں۔۔۔ وہ ممکن نہیں ہے۔"

"تم سے دوگنی بڑی عمر کی ہوں میں۔ جتنی زندگی گزاری ہے' اس میں یہ ایک بات بہت اچھی طرح سیکھ چکی ہوں کہ دنیا میں ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ ہر مرد زندگی میں چھوٹی موٹی محبتیں پالتا ہے۔ بیوی اچھی مل جائے تو پرانی محبتوں کا رنگ اترنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔"

"مہک بہت اچھی لڑکی ہے۔۔۔ تقی اس کے ساتھ بہت خوش رہے گا اور آپ کی بہت اچھی بہو ثابت ہو گی وہ۔" وہ اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔

"تمہیں کیسے پتا' وہ اچھی ہے؟" امی ٹھٹکیں۔ "تم مل ہو کیا اس سے؟"

شفا کو چاہیے تھا کہ مکر جاتی' لیکن بے دھیانی میں اس کا سر اثبات میں ہل گیا اور امی ہکا بکا رہ گئیں۔

"کیا۔۔۔!" اتنی زور کا "کیا" تھا کہ شفا ڈر ہی گئی۔

"یعنی یہ تمہارا کارنامہ ہے۔۔۔ یا میرے اللہ۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ "وہ تقی افلاطون کم تھا جو تم بھی مل گئیں۔۔۔ نہ۔ میں پوچھتی ہوں' تمہیں ضرورت کیا تھی' مہک سے رابطہ کرنے کی۔۔۔ ان دونوں کا رابطہ ختم تھا تو رہنے دیتیں۔ تم نے ضرور ثالثی کرنی تھی۔"

"امی! تقی کا احسان اسی طرح اتار سکتی تھی میں۔" وہ منمنا کر بولی تھی۔ امی نے ڈپٹ کر کہا۔

"تم دونوں ابھی نا سمجھ ہو۔ اب تو مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" انہوں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور اس روز اور تن دہی سے لسے تیار کروایا۔ اب درمیان میں کوئی پردہ تو رہا نہیں تھا سو شفا نے صاف انکار کر دیا۔

"تقی۔۔۔ مذاق اڑاتا ہے۔ بکری کہتا ہے مجھے۔" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"کہنے دو۔۔۔ تقی کو عادت ہے مذاق کرنے کی۔۔۔ بس اللہ جلدی سے خوش خبری سنا دے تو میرے دل سے پریشانی دور ہو۔"

وہ خود سے ہی بات کرتی' وہاں سے چلی گئیں۔ شفا نے سر پیٹ لیا۔

فریقین کی طرف سے اتنے واضح اور دو ٹوک جواب کے باوجود وہ "خوش خبری" کی آس لگائے بیٹھی تھیں۔ بڑی ہی خوش امید خاتون واقع ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

یہ اس سے کچھ روز بعد کی بات ہے۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے اس کے کمرے کا دروازہ بری طرح دھڑ دھڑایا گیا۔ وہ گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ چند منٹ تو حواس ہی بحال نہ ہوئے' جب ذرا دماغ حاضر ہوا تو جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

تقی کھڑا تھا' بلکہ کھڑا کیا تھا' مسلسل ہل ہی رہا تھا۔ کوئی بے چینی لاحق تھی اسے۔

"کیا بات ہے؟ میں سو رہی تھی۔ مر نہیں گئی تھی جو اتنی زور سے دروازہ بجا رہے تھے' لے کے ڈرا ہی دیا۔"

"پندرہ منٹ سے میں دروازہ بجا رہا ہوں۔۔۔ ایک منٹ کے لیے تو ایسا ہی لگا کہ کسی مردے کو جگانے کی

غلطی کر بیٹھا ہوں۔" شفا کو لگا وہ اس سے زیادہ چڑ کر بولا ہے۔

"اب جاگ ہی گئی ہو تو دیر مت کرو۔ چلو میرے ساتھ۔" تقی نے عجلت سے کہا تھا۔

شفا حیران ہوئی، لیکن اس سے قبل کہ کوئی سوال جواب کرتی، تقی باہر کی طرف چلا گیا۔ شفا جلدی جلدی سلیپر پہن کر اس کے پیچھے آئی۔

"رات کے اس وقت؟ جانا کہاں ہے تقی۔" اتنی ٹھنڈ تھی۔ شفا پر باہر آتے ہی کپکپی سی طاری ہوئی۔

"سوال جواب مت کرو نالائق لڑکی! جلدی سے چلو۔" وہ بائیک باہر نکالنے لگا۔

"اتنی سردی میں کیسے جا سکتے ہیں اور کہاں؟" وہ اس کی عجلت پر حیران ہو رہی تھی۔

"اوہو... ایک تو تم سوال بہت پوچھتی ہو... اور..." اس نے شفا کی طرف دیکھا، پھر سر پر ہاتھ مارا ۔بھاگ کر گیا اور اندر سے اپنی لیدر کی جیکٹ اٹھا لایا۔

"یہ پہنو..."

"یہ تو تمہاری ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟ میری جیکٹ اگر تم پہن لوگی تو اس جیکٹ کو دوبارہ پہنتے ہوئے میری شان میں کمی نہیں آئے گی۔ اس لیے تم آرام سے پہن سکتی ہو۔" ہنگامی صورت حال میں بھی وہ پوائنٹ مارنے سے باز نہیں آیا تھا۔

شفا کو فوری طور پر جوابی حملے کے لیے کوئی جملہ سجھائی نہیں دیا تو جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے جیکٹ لے لی۔

تقی کو اس کے ردِ عمل کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس پر تو کوئی اور ہی دھن سوار تھی۔ جلدی جلدی بائیک باہر نکال کر گیٹ بند کیا اور بائیک اسٹارٹ کر کے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"جانا کہاں ہے تقی! مجھے کچھ تو بتا دو۔"

"او بھئی بیٹھ جاؤ... سوال پہ سوال... سوال پہ سوال... تم لڑکیاں مر رہی ہو گی، لیکن سوال کرنے سے باز نہیں آؤ گی۔"

"اگر ہم لڑکیوں کو پہلے سوال پر ہی جواب مل جائے تو سوال پہ سوال کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔" ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی اور پھر بائیک ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ شفا نے لاکھ دہائیاں دیں۔ چیخیں ماریں۔ تقی کے کندھے کو اتنی زور سے دبوچا کہ اس کی اپنی بھی چیخ نکل گئی، لیکن مجال ہے جو بائیک کی رفتار کم ہوئی ہو۔

ایک چوراہے پر لا کر اس نے بائیک روک دی۔ ایک طرف ایم ایم عالم روڈ جا رہا تھا۔ دوسری طرف بیدیاں روڈ۔

آدھی رات کا وقت تھا، لیکن لاہور سوتا نہیں ہے جاگتا ہی رہتا ہے سو یہاں بھی دن والی گہما گہمی تو خیر نہیں تھی، لیکن کوئی ایسا سناٹا بھی نہیں تھا۔

"وہ دیکھو۔"

شفا اسے کوستی ہوئی اُتری تھی اور اپنے حواس بحال کر رہی تھی، جب تقی نے چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا۔

شفا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک منٹ کے لیے اسے اپنی بصارت پر شک ہوا، پھر اس کی آنکھوں میں سر خوشی پھیل گئی۔

شہر کے اس سب سے بڑے چوراہے کے سب سے بڑے بل بورڈ پر تقی کی تصویر تھی۔ سرخ رنگ کے بیک گراؤنڈ میں چائے کا سرخ ہی کپ منہ کے بالکل قریب پکڑے اپنی بہترین مسکراہٹ کے ساتھ... ہاں وہ تقی ہی تھا۔

اپنے خوابوں کی تکمیل کی طرف ایک اور قدم اٹھا ہوا۔

شفا نے دیکھا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔

وہ خوشی سے دیوانہ ہوتا شور مچا رہا تھا، چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔ پاس سے کوئی گاڑی گزری، جس کے میوزک سے کان پھٹتے تھے تو وہ دیوانہ ہو کر ناچنے لگا۔

سڑک کنارے بیٹھے خانہ بدوش بچے اس کے ساتھ ناچنے لگے۔

شفا اسے ناچتا دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ تقی نے اسے بھی تو اشارا کیا۔ شفا نے نفی میں سر ہلا دیا، لیکن وہ دونوں خوش تھے۔

یہ خوشی ان دونوں کی ہو گئی تھی۔

پوری کائنات جیسے پس منظر میں چلی گئی تھی۔ منظر پر صرف وہ تھے اور ان کی خوشی کے یہ لمحات۔

ان پر جھکا رات کا آسمان آج کی رات بہت روشن، بہت پُر نور ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور عین اس لمحے جب تقی اپنی کامیابی کی خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ شفا کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔

وہ ٹھٹکی... اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

وہ چونک سی گئی، پھر اگلے ہی پل اس نے سنبھل کر نظروں کا رخ پھیر لیا۔

جس دیس نہیں جانا۔ اس کے کوس گننے سے فائدہ؟

پہلے ہی بڑے زخم اٹھا لیے تھے۔ اب دل بھی دغا دے جاتا تو وہ تو بالکل خالی ہاتھ رہ جاتی۔

وہ احسان فراموش کہلانا چاہتی تھی، نہ ہی خائن۔

سو دل کو بھی سمجھا لیا اور نظروں پر بھی پہرہ بٹھا دیا۔

لیکن دل اتنی آسانی سے سمجھ اور سنبھل جاتے تو کیا دنیا میں محبت کے نام پر اتنی تباہی آتی؟

شفا بھی پاگل ہی تھی۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے کھوکھے سے چائے لی اور تازہ مونگ پھلی کے پیکٹ بنوا لیے۔

"یہ میری کامیابی کی ٹریٹ ہے... ابھی اسی پر گزارا کرو ذرا امیر ہو جاؤں گا تو تمہیں تمہاری پسند کی جگہ ڈنر کرواؤں گا۔" اس نے مونگ پھلی ٹونگتے ہوئے کہا اور وہیں کھوکھے کے قریب فٹ پاتھ پر ایسے بیٹھ گیا جیسے دیر تک اٹھنے کا ارادہ نہ ہو۔

ہوا تیز ہو گئی تھی اور ٹھنڈ بھی بڑھ گئی تھی۔ شفا نے ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے کہا۔ "گھر چلتے ہیں تقی! رات بہت ہو گئی ہے۔ اتنی دیر تک باہر رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"تمہارے ساتھ ایک گبھرو جوان موجود ہے... جو ایک پنچ مار کر سامنے والے کے دانت توڑ سکتا ہے۔ اس لیے تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔" بڑا لاپروا سا انداز تھا۔

"شکر ہے تم نے پنچ کہا، پھونک نہیں کہہ دیا۔" وہ مسکرا کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور چائے کا ڈسپوزیبل کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"میں نے گبھرو جوان کہا ہے، سلطان راہی نہیں۔"

تقی نے بے ساختہ کہا تھا۔ اس بات پر وہ دونوں مل کر ہنسے۔

پھر وہ ہاتھوں کا بوجھ پیچھے ڈال کر آرام سے بیٹھ گیا اور سر گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

رات کا مخصوص ماحول تھا۔ اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

"مجھے یہ وقت ہمیشہ سے پسند رہا ہے۔ ایک عجیب سا سکون ہے رات کے اس پہر میں... جب میں اور سمیر ہوسٹل میں ہوتے تھے تو چپکے سے اس وقت باہر نکل جایا کرتے تھے۔ سڑکوں پر پھرتے تھے۔ ریس لگاتے تھے۔ شور مچاتے تھے۔ پھر میں گھر واپس آ گیا تب بھی اکثر گھر سے نکل جایا کرتا تھا اور ابا کو جب بھی پتا چلتا وہ میری درگت بناتے۔" وہ پرانے دنوں کو یاد کرتا بتاتا چلا گیا۔

شفا دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"ٹھیک ہی کرتے تھے... یہ کوئی وقت ہے گھر سے نکلنے کا۔" شفا نے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے، دراصل ابا کو ہر اس چیز سے، ہر اس شوق سے چڑ رہی ہے جو مجھے پسند ہو۔" تقی نے فوراً "ناک چڑھا کر کہا تھا۔

"ارے... ایسا کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"پتا نہیں۔" اس کا انداز کسی چھوٹے بچے کی طرح پُر سوچ تھا۔ "یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی

کہ ابا ایسے کیوں ہیں؟ انہیں ہر دوسرے انسان سے اختلاف رہتا ہے۔ دراصل انہیں دوسروں کے ساتھ پیر باندھے رکھنے کا شوق ہے۔ اور میں۔۔۔ میں ہمیشہ سے ان کی ہٹ لسٹ پر رہا ہوں۔"

"تمہارے باقی دونوں بھائی بھی تو ہیں۔۔۔ ابا ان کے ساتھ ایسا کیوں نہیں کرتے؟"

"میں شروع سے ہی تھوڑا باغی رہا ہوں۔۔۔ ذرا اپنی مرضی کرنے والا۔۔۔ رضی اور جری ابا کی بات خاموشی سے مان لیتے تھے۔ وہ ان کے بیبے بچے ہیں۔ اگر ابا دن کو رات کہہ دیتے تو وہ دونوں سو جاتے تھے اور رات کو دن کہتے تو اٹھ کر ناشتا کرنے لگتے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"ناشتا تو خیر میں بھی کر لیتا تھا' لیکن اتنا اچھا میں کبھی نہیں بن سکا کہ رات اور دن کی تبدیلی کو صرف ابا کے کہنے پر مان لوں۔"

"پھر غلطی تو تمہاری بھی ہوئی نا۔ خوامخواہ تم ہر وقت ابا کو غلط ٹھہراتے رہتے ہو۔" شفا نے آرام سے کہا۔

"سب یہی کہتے ہیں۔" تقی نے تھوڑی سی مایوسی کے ساتھ کہا۔ وہ آج کسی اور ہی موڈ میں تھا۔ "لیکن میں نے بھی کبھی جان بوجھ کر ان کی مخالفت نہیں کی۔ یہ خود بخود ہوتا ہے کہ ہمارے اختلاف ہوتے رہتے ہیں۔ ابا کو ویسے بھی سینیارٹی کا ایڈوانٹیج حاصل ہے۔ میں بھی شاید جب اس عمر کو پہنچوں تو سب میری بات بھی اسی طرح مانیں گے جس طرح ابا کی مانی جاتی ہے۔"

"تم نے اپنی ساری باتوں کا جواب خود ہی دے دیا۔" شفا نے خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

"ساری دنیا کے باپ کم و بیش ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے تمہارے ابا ہیں۔۔۔ ہر باپ کو لگتا ہے اس کا بیٹا اس کے جتنا تجربہ نہیں رکھتا' اس لیے اسے خود اپنے بیٹے کو گائیڈ کرنا چاہیے۔ اسے زندگی میں سروائیو کرنے کا طریقہ بتانا چاہیے۔ دوسری طرف بیٹے کو لگ رہا ہوتا ہے وہ تو خود بہت ہوشیار ہے۔ اسے سب پتا ہے۔ بس ایسی ہی باتوں پر اختلاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ان باپ' بیٹے میں محبت ہی نہیں ہے۔ اب تمہیں کیا لگتا ہے' کیا تمہاری کامیابی پر ابا خوش نہیں ہوں گے۔"

"ہرگز نہیں۔" تقی نے ترنت کہا۔ "بلکہ وہ جل کر خاک ہو جائیں گے جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ میں ایک مشہور پراڈکٹ کا برانڈ ایمبیسڈر بن گیا ہوں۔۔۔ مزا تو تب آئے گا جب انہیں اپنے ہر اسٹور پر میری تصویروں والے پبلسٹی پوسٹرز لگانے پڑیں گے۔" وہ بہت زیادہ سنجیدہ تو کبھی رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ اپنی ہی بات کا لطف لے رہا تھا۔ شفا نے ہنستے ہوئے ایسے سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو' تم نہیں سدھر سکتے۔

☼ ☼ ☼

چائے ختم ہوئی تو وہ دونوں چہل قدمی کرنے لگے۔ بائیک کو تقی ساتھ ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔ گھر جانے کی اب دونوں کو ہی جلدی نہیں تھی۔

ایک جگہ رک کر تقی نے شفا کی فرمائش پر اسے آئس کریم لے کر دی۔

"تم نہیں کھاؤ گے؟" شفا نے آئس کریم پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"ایک کے ہی پیسے ہیں۔" وہ اس بات پر شرمندہ نہیں تھا' لیکن شفا کو مایوسی ہوئی۔

"اتنی بڑی آئس کریم ہے' تم اکیلی کیسے کھاؤ گی۔ یہی شیئر کر لیتے ہیں۔" تقی نے کہا اور اس کی مرضی جانے بغیر آئس کریم اس کے ہاتھ سے لے کر بڑا سا بائٹ لے لیا۔ پھر واپس اس کے ہاتھ میں پکڑائی اور آگے چل دیا۔

شفا ایسی بے تکلفی پر منہ ہی دیکھتی رہ گئی' پھر اس کے پیچھے چل پڑی۔

تقی کو ایک جگہ پھر اپنا پوسٹر نظر آ گیا تھا۔ وہ وہیں رک کر واری صدقے جانے والی نظروں سے اپنی ہی تصویر دیکھنے لگا تھا۔

"تم نے مہک کو اس بارے میں بتایا؟" شفا کو اچانک خیال آیا تھا۔

تقی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تمہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ تمہاری کامیابی کا سن کر خوش ہوتی۔"

نہ جانے کیوں تقی سوچ میں پڑ گیا' پھر سر جھٹک کر بولا۔

"صبح بتا دوں گا۔ مجھے دراصل خیال ہی نہیں آیا۔ پہلا خیال تمہارا آیا تھا تو تمہیں ہی بتا دیا۔"

"لیکن تمہیں سب سے پہلے اسے ہی بتانا چاہیے تھا۔ لڑکیاں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت اہم سمجھتی ہیں۔"

"اس لیے کیونکہ لڑکیاں بدھو ہوتی ہیں۔" ہر دوسرے مرد کی طرح تقی صاحب کا بھی یہی خیال تھا۔

"جی نہیں۔۔۔ اس لیے کیونکہ لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں۔" شفا نے اس سے زیادہ زور دے کر کہا تھا۔

"میں نے سب لڑکیوں کا کیا کرنا ہے۔۔۔ میرے لیے ایک مہک ہی کافی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا تھا۔

"اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ ہر چیز کو اپنی لاپروائی کی نذر مت کیا کرو۔۔۔ خیال رکھا کرو اس کا۔"

وہ تاکید کر کے چند قدم دوسری طرف چلی گئی۔ تقی اسے دیکھتا رہا۔

وہ عجیب لڑکی تھی۔ تقی کو ہمیشہ اس کے بارے میں کوئی بات محسوس ہوتی تھی' جسے وہ کوئی نام نہیں دے پاتا تھا' نہ ہی اس احساس کو سمجھ پاتا تھا۔ وہ بھی شاید اس لیے کیونکہ اس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ لیکن ابھی ابھی اس نے دل سے مان لیا کہ وہ اچھی لڑکی ہے۔ تب ہی تو اسے اور مہک کو ملوانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تقی نے دل ہی دل میں اسے سراہا کہ منہ پر تعریف کر کے اس کے سر چڑھنے کا خدشہ تھا۔

اب یہ اچھی لڑکی ایک اچھے انسان کی ہی مستحق تھی اور وہ اچھا انسان سمیر سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔ تقی اس سے یہ بات کرنے کے لیے ابھی مناسب جملے تلاش کر ہی رہا تھا کہ شفا کو بھی یہی خیال آیا۔

"میں سوچ رہی ہوں' سمیر بھائی اور ثمر کی ایک ملاقات کروا دوں۔"

"کس لیے؟" وہ حیران ہوا۔

"میں نے ثمر سے سمیر بھائی کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ ایک لفظ بھی سننے پر راضی نہیں ہوئی۔ سمیر بھائی اسے پسند کرتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں اس سے۔ مجھے لگتا ہے' خود بات کریں گے تو اسے کنوینس کر ہی لیں گے۔"

"ایک بات بتاؤ۔۔۔ ثمر' سمیر میں انٹرسٹڈ نہیں ہے نا؟"

"نہیں۔" وہ اس سوال پر حیران ہوئی تھی۔

"بس پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر جوش سے کہا۔

"کیا مطلب؟" شفا نے الجھ کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ تم رہنے دو ان ملاقاتوں کے چکروں کو۔۔۔ جب ثمر راضی نہیں ہے تو کیا ضرورت ہے پیچھے پڑنے کی۔ سمیر کو میں سمجھا لوں گا۔ ویسے بھی میرے پاس ایک اچھا آپشن ہے۔ سمیر کے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔"

شفا نے یکایک آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا' چند لمحے توقف کیا' پھر بولی۔ "کون سا آپشن؟"

"میرا خیال ہے' سمیر دولہا بن کر تمہاری سہیلی کے ساتھ نہیں بلکہ تمہارے ساتھ کھڑا زیادہ اچھا لگے گا۔" اپنے ازلی لاپروا پن سے اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔

"جب ہم الگ ہوں گے تو میں تو مہک سے شادی کر لوں گا۔ لیکن تم بھی ایک اچھا انسان ڈیزرو کرتی ہو' اسی لیے میں تمہیں سمیر کا مشورہ دے رہا ہوں۔ ثمر کو تو اس میں دلچسپی ہے نہیں' جہاں تک سمیر کی بات ہے تو لڑکوں کو ایسی محبتیں ہوتی رہتی ہیں۔۔۔ کچھ عرصہ بعد وہ ثمر کو بھی بھول جائے گا۔ میری بات مانو شفا! اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے کچھ بولڈ اسٹیپس لینے پڑتے ہیں۔۔۔ سمیر کو ہم دونوں کے بارے میں سب پتا ہے۔

اب تم مجھے بتاؤ اگر راضی ہو تو میں سمیر سے بات کرتا ہوں۔"

وہ بڑا معتبر بن کر بات کر رہا تھا اور یوں کر رہا تھا جیسے اسے یقین ہو' شفا فوراً" اس کی بات مان ہی لے گی۔

شفا بالکل خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ تقی نے بات مکمل کرتے ہی آئس کریم کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ شفا نے اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے یکدم آئس کریم ایک طرف پھینک دی۔

تقی ابھی اس کی اسی حرکت پر حیران ہو رہا تھا کہ شفا نے ہاتھ دے کر قریب سے گزرتا رکشا رکوا لیا۔

"رکشا کیوں رکوایا ہے؟ بائیک ہے تو..." شفا کو رکشا والے کو گھر کا ایڈریس سمجھاتے دیکھ کر تقی نے پوچھا۔

"میں گھر جا رہی ہوں' تم بائیک پر آجانا۔" اس نے پتھر پھوڑ لہجے میں کہا۔

تقی حیران ہی ہو گیا تھا۔ اس نے رکشہ والے سے کہا۔ "تم تو جاؤ بھائی! اور تم بیٹھو بائیک پہ۔" وہ زبردستی اسے بائیک پر بٹھا کر گھر لے آیا۔

☼ ☼ ☼

راستہ بھر وہ خاموش رہی' تیز بائیک چلانے پر ایک چیخ بھی نہیں ماری۔

تقی نے بات کرنا چاہی تو بھی جواب میں خاموشی ہی ملی' لیکن گھر پہنچ کر اس کی برداشت ختم ہو گئی۔

"اس میں اتنا برا ماننے کی کیا بات ہے۔ میں کوئی تمہیں زبردستی تو سمیر کے ساتھ رخصت کروانے نہیں لگا۔ ایک آئیڈیا ہی دیا ہے۔ نہیں پسند تو انکار کر دو... یہ کیا کہ منہ پھلا لیا اور بس..."

"برا ماننے کی بات نہیں ہے؟" وہ یکدم پلٹ کر اسے پھاڑ کھانے کو دوڑی تھی۔ "جس انسان کو میں بھائی کہہ رہی ہوں' جس سے اپنی بہنوں جیسی دوستی کا تعلق مضبوط کرنا چاہ رہی ہوں۔ تم چاہتے ہو میں اسی کے بارے میں یہ سوچوں کہ اس سے خود شادی کر لوں... اتنا گھٹیا سمجھ رکھا ہے مجھے۔"

"اس میں گھٹیا پن کی کیا بات ہے۔ یہ دنیا ہے۔ ہر کوئی اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ تمہیں بھی اپنا فائدہ ہی دیکھنا چاہیے۔ سمیر کون سی تمہاری سگی بہن ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

"تم اتنا کیوں سوچتے ہو تقی! خدارا مت سوچا کرو۔" وہ پھر سابقہ انداز میں بولی تھی۔ اس بار تقی چپ ہی رہا۔

"اپنا اچھا برا سوچنے کے لیے میں خود موجود ہوں۔ ایک احسان کیا تھا مجھ سے نکاح کر کے۔ اب مزید کوئی احسان مت کرو۔" وہ طنزیہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"اور تمہیں کس بات کی فکر ہے؟ تمہیں لگتا ہے میں ساری زندگی کے لیے تمہارے سر پر سوار ہو جاؤں گی؟ تمہیں ساری زندگی مجھے اپنے گھر میں رکھنا پڑے گا؟ یا جب تم مجھے چھوڑنے کی بات کرو گے تو میں روؤں گی۔ تمہاری منتیں کروں گی کہ مجھے مت چھوڑو؟ اسی لیے تم میرے سامنے سمیر بھائی کے نام کا آپشن رکھ رہے ہو کہ جلد از جلد مجھ سے پیچھا چھڑا سکو؟ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا جب دل چاہے چھوڑ دینا۔ اب پھر کہہ رہی ہوں۔ تم پابند نہیں ہو' چاہو تو صبح ہی چھوڑ دو' تمہارے بعد میرا کیا ہو گا' کوئی مجھ سے شادی کرے گا یا نہیں۔ کوئی اچھا انسان مجھے ملے گا یا نہیں... تم اس فکر میں مت پڑو' مہک سے شادی کرو اور خوش رہو۔"

"شفا! میری بات سنو۔"

تقی نے کہنا چاہا' شفا نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر اسے بولنے سے روک دیا۔ وہ فوری طور پر خود بھی کچھ بول نہیں پائی تھی۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا تھا۔

"مجھے پتا ہے تقی! تم مجھ سے نکاح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ قسمت نے مجھے مسلط کیا ہے تمہارے سر پر۔ میری سیلف رسپکٹ کو کچلنے کے لیے یہی ایک بات کافی ہے... نئے سے نئے آپشن میرے سامنے رکھ کر اسے اور ہرٹ مت کرو... مہربانی ہو گی تمہاری۔"

اس نے کمرے میں جا کر تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔

تقی اچھل کر پیچھے نہ ہٹتا تو دروازہ اس کے منہ پر لگتا۔

"میرا یہ مطلب تو نہیں تھا شفا!"

اپنی پیشانی پر نمودار ہوتے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے اس نے شرمندگی سے زیر لب کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عمیر! ہدیہ کی اسکول وین خراب ہو گئی ہے۔ ڈرائیور کا ابھی فون آیا تھا... آپ اسے واپسی پر پک کر لیں گے؟"

ساہر نے عمیر کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

عمیر آفس کے لیے تیار تھے اور اخبار پڑھ رہے تھے۔

"میرے لیے اس ٹائمنگ میں آفس سے نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ تم چلی جانا ہدیہ کو لینے۔" عمیر نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' آج تو میں چلی جاؤں گی اور واپسی پر کچھ دیر کے لیے امی کی طرف بھی جاؤں گی لیکن آپ ذہن میں رکھیے گا۔ اگلے کچھ روز آپ کو ہی ہدیہ کو پک اینڈ ڈراپ دینا پڑے گی۔ میرے لیے روز روز گھر سے نکلنا مشکل ہو گا۔" اس نے کہا۔

"کسی طرح مینج کر لو ساہر!... میں آفس کی ٹائمنگ میں سے وقت نہیں نکال سکتا۔" عمیر کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ ساہر کا اپنی چائے میں چینی حل کرتا ہاتھ رک گیا۔

"وقت نکال نہیں سکتے یا نکالنا چاہتے ہی نہیں ہیں؟" ساہر کا انداز تیکھا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ صرف شفا نہیں تھی آپ کی فیملی میں... آپ کی بیوی آپ کے بچوں کا بھی آپ پر کوئی حق ہے۔" اس کا انداز پہلے جیسا ہی تھا۔ عمیر نے اخبار رول کرتے ہوئے اسے گھورا۔

"شفا کا یہاں کیا ذکر؟"

"اس کے ذکر کے بغیر تو ہماری زندگی گزر ہی نہیں سکتی۔" وہ ترخ کر بولی۔ "وہ چلی گئی اس گھر سے لیکن آپ کے بیوی بچے تو ہیں۔ اس کے غم میں ہمیں کیوں اگنور کرنے لگے ہیں آپ۔"

"پاگلوں جیسی باتیں مت کرو ساہر!" عمیر نے ڈپٹ کر کہا اور رول کیا ہوا اخبار میز پر پٹخ کر اٹھ گئے۔

"یہ پاگلوں جیسی باتیں نہیں ہیں۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "جب سے شفا گئی ہے' آپ نے کسی بھی چیز میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دی ہے جیسے بس وہی سب کچھ تھی۔ ہم لوگ کچھ ہیں ہی نہیں۔"

اس کا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ عمیر اپنا آفس بیگ اٹھا کر باہر نکل گئے۔

ساہر ایک پل کے لیے ہکا بکا رہ گئی پھر اس نے بری طرح زچ ہوتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا چمچ میز پر پٹخ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اور وہ مہک...؟" ثمر کچن سلیب پر چڑھی بیٹھی تھی۔ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔ شفا نے اصرار کر کے اسے اپنی طرف بلوایا تھا۔ "وہ کیسی لگی تمہیں؟"

"مہک۔" شفا نے کپ ہاتھوں میں گھماتے ہوئے پرسوچ انداز میں کہا۔ "سچ کہوں تو بہت اچھی نہیں لگی... خوب صورت ہے' اسٹائلش ہے لیکن... پتا نہیں کیوں اچھی نہیں لگی مجھے۔" اسے مہک کے انداز یاد آ گئے تھے۔

"پھر بھی تم چاہتی ہو' تقی کی امی اسے اپنی بہو بنانے کا سوچیں؟"

"دیکھو' میرے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب سے اہم تقی کی پسند ہے اور مہک اسے پسند ہے... یہ حقیقت ہر بات پر بھاری ہے۔" اس نے بسکٹ کو چائے میں غوطہ دیتے ہوئے کہا۔

"شادی کے بعد ویسے بھی تقی اسے اپنے رنگ میں ڈھال لے گا۔۔۔ بہت گٹس ہیں اس میں۔" یہ بات اس نے ہنس کر کہی تھی۔

"اچھا۔۔۔ اور ان دونوں کی شادی کے بعد تم کیا کرو گی۔۔۔ یہ سوچا ہے؟" ثمر کا انداز طنزیہ تھا۔ شفا سمجھی نہیں۔

"بعد کا تو ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔ عمیر بھائی کی ناراضی ختم ہو گئی تو ان کے پاس چلی جاؤں گی۔۔۔ ورنہ ۔۔۔ کوئی نہ کوئی ہوسٹل دیکھ لوں گی۔۔۔ بلکہ میں تو آج کل ہوسٹل ڈھونڈ بھی رہی ہوں۔" وہ کسی قدر فکر مندی سے بولی۔

ثمر نے ناراضی کے اظہار کے طور پر کپ سلیب پر پٹخ دیا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو شفا! اپنا گھر توڑ کر مہک کے گھر کی بنیاد رکھ رہی ہو۔۔۔ کس سیارے سے آئی ہو بھئی تم؟"

"تقی کا گھر میرا گھر نہیں ہے ثمر! یہ گھر تو پہلے دن سے مہک کا تھا۔ میں تو اتفاقاً" آگئی یہاں۔" اس نے نرمی سے کہا۔

ثمر نے ایسے سر پر ہاتھ مارا جیسے اس کی باتوں سے عاجز آگئی ہو۔

"بہت سارے لوگوں کی شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں جیسے تمہاری اور تقی کی ہوئی۔ ہاں اس طرح ہنگامی کیفیت میں نہیں ہوتیں لیکن ان کے پیچھے خیال یہی ہوتا ہے۔ ہر انسان لو میرج تھوڑی کرتا ہے بہت سے ارینج میرج کرتے ہیں اور بہت اچھی زندگی گزارتے ہیں۔۔۔ اگرچہ پہلے پہل وہ ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے۔ محبت وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتی جاتی ہے۔۔۔"

"لو یا ارینج میرج کی بات نہیں ہے۔" شفا نے تحمل سے کہا۔ "یہ ساری باتیں جو تم مجھے سمجھا رہی ہو میں خود بھی سمجھتی ہوں۔ تقی کی امی بھی کئی بار سمجھا چکی ہیں۔۔۔ لیکن کوئی میری پوزیشن بھی تو سمجھو۔۔۔ میں پہلے دن سے جانتی تھی کہ تقی مہک کو پسند کرتا ہے۔ اپنی زندگی اس کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔ تقی نے میری مدد کی۔ نکاح کر لیا کہ میں کسی پاگل سے نہ بیاہ دی جاؤں۔۔۔ میں کیسے اس کی زندگی میں رہنے کا سوچوں ۔۔۔ احسان فراموشی ہو جائے گی یہ کہ وہ اپنی پسند سے شادی نہ کرے اور میرے نام کا ڈھول اپنی گردن میں لٹکائے رکھے۔"

"خود کو ڈھول مت کہو۔۔۔" ثمر نے ناراضی سے کہا۔ "مہک اس کے لیے کبھی تم سے زیادہ اچھی بیوی ثابت نہیں ہوگی۔"

"یہ تو خیر تم اپنی محبت میں کہہ رہی ہو۔" شفا نے پیار سے کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تقی کو مہک سے محبت ہے مجھ سے نہیں۔۔۔ اور جس سے محبت ہوتی ہے وہ اچھا نہ بھی ہو تو اچھا لگتا ہے۔"

"اور تم؟" ثمر نے اسے بغور دیکھا۔ "تقی کے دل میں تو مہک کی محبت ہے اور تمہارے دل میں کیا ہے؟"

"میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔" شفا نے برتن سنک میں رکھے۔

"اگر ایسی بات ہے تو تقی کا ذکر آتے ہی تمہارا چہرہ اتنا چمکنے کیوں لگتا ہے؟" ثمر نے مزے سے کہا تھا۔

شفا اس سوال پر ٹھٹک سی گئی۔

"بلکہ آج کل تو کچھ زیادہ ہی چمک رہا ہے۔"

شفا کو ایسا لگا اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ اس نے گھبرا کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"فیئر نس کریم استعمال کر رہی ہوں آج کل۔ اسی کا اثر ہے۔" اس نے بات کو ہنسی میں اڑانا چاہا۔ شکر ہے اسی وقت ڈور بیل بجی تو وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

"یہ بات تم ان کو بتانا جنہوں نے کبھی فیئرنس کریمیں استعمال نہ کی ہوں۔" ثمر نے شرارت سے اس کے پیچھے آواز لگائی تھی۔

"امانت میں خیانت 'احسان فراموشی۔۔۔ ہونہہ ۔۔۔ شفا لی بی! ہم سے کم اس بار میں تمہیں اپنا نقصان کرنے نہیں دوں گی۔"

اس نے تہیہ کر لیا۔ اس بات سے بے خبر کہ کوئی ایسا ہی ارادہ شفا بھی اس کے بارے میں کیے بیٹھی ہے۔

☼ ☼ ☼

توقع کے عین مطابق دروازے پر تقی اور سمیر ہی تھے۔

"بڑی جلدی آگئے سمیر بھائی!" اس نے دروازہ کھولتے ہی شرارت سے کہا تھا۔ تقی کی طرف تو وہ دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

"ثمر آگئی ہے کیا؟۔۔۔ آپ نے اسے میرے بارے میں بتایا؟" وہ بہت زیادہ کنفیوز لگ رہا تھا اور بار بار اپنے ہاتھ مسل رہا تھا۔ شفا کا انکار سن کر اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

"میں اچانک سامنے گیا تو وہ تو میرا سر ہی پھاڑ دے گی۔"

شفا نے اسے تسلی دینا چاہی لیکن اس سے پہلے تقی بول پڑا۔

"میرا ہیلمٹ ساتھ لے جاؤ۔" وہ بولنے سے کہاں باز آسکتا تھا۔

"سمیر بھائی! آپ بے فکر رہیں۔ اتنی بھی خونخوار نہیں ہے ثمر! اور اتنا گھبرائیں گے تو بات کیسے کریں گے۔"

"گھبرا تو نہیں رہا میں۔۔۔ وہ تو بس ویسے ہی۔" سمیر نے ایک گہرا سانس بھر کر اپنا اعتماد بڑھانا چاہا۔

"جھوٹ مت بولو۔۔۔ ابھی راستے میں تو کہہ رہے تھے۔ ڈر کے مارے رات بھر نیند بھی نہیں آئی اور اب اتنی غلط بیانی۔"

"سمیر بھائی! آپ اندر چلیں۔۔۔ میں ثمر کو بلاتی ہوں۔"

وہ تیزی سے کچن میں آئی۔

"ثمر! تم ذرا لاؤنج میں آؤ۔۔۔ سمیر بھائی کو تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

سمیر کا نام سن کر ثمر بری طرح اچھلی تھی۔ ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"اس نے کیا بات کرنی ہے مجھ سے؟"

"اب یہ تو مجھے نہیں پتا۔۔۔" اس نے انجان بننے کی کوشش کی اور ناکام رہی۔

"شفا کی بچی! تم اسی لیے مجھے فورس کر رہی تھیں ناں کہ میں تمہارے گھر آؤں۔"

اس نے خوفناک تاثرات کے ساتھ چمٹا اٹھا لیا تھا۔ شفا نے ترنت اس کے ہاتھ سے چمٹا گھسیٹا۔

"میں مانتی ہوں۔ سمیر بھائی نے جو کیا برا کیا۔۔۔ لیکن وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ سو فیصد سچی۔۔۔ ایک بار ان کا پوائنٹ آف ویو بھی سن لو۔ دل راضی نہ ہو تو انکار کر دینا۔"

"تم نے آج تک کتنی محبتیں کی ہیں۔۔۔ جو سچی اور جھوٹی محبت میں فرق کرنا آگیا؟" ثمر نے تنک کر پوچھا تھا۔

"ایک تو تم سوال بہت پوچھتی ہو۔" شفا نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔

"دنیا میں کسی جذبے کی کوئی پہچان نہیں ہوتی ۔ بس جس پر دل راضی ہو جائے اسی پر لبیک کہہ دینا چاہیے۔۔۔ عورت کے اندر تو ویسے بھی اللہ نے قدرتی ڈیٹیکٹر فٹ کیا ہوتا ہے جو اسے سامنے والے بندے کی پوری حقیقت نہ بھی بتائے تو اشارہ ضرور دے دیتا ہے۔"

"تم اور تمہارے فلسفے۔۔۔ ایسا کرو بیٹھ کر اس فلسفے کا اچار بناؤ اور اس سمیر کے بچے کو بھی کھلاؤ۔ میں گھر جا رہی ہوں۔" وہ اپنا پرس اٹھاتی تیر کی طرح باہر نکلی تھی' شفا افتاں و خیزاں اس کے پیچھے۔

گیٹ کے پاس ہی سمیر اور تقی کھڑے تھے۔ ثمر نے اسے اتنی بری طرح گھورا کہ بے چارہ مزید گھبرا کر نہ صرف سلام کر بیٹھا بلکہ حال بھی پوچھ لیا۔

"میری خیریت چھوڑو۔ اپنی خیر مناؤ۔"

"ثمر! تم ایک بار سمیر بھائی کی بات تو سن لو۔" شفا نے منت سے کہا۔

"ہاں ثمر! تمہیں ایک بار تو سمیر کو موقع دینا ہی چاہیے۔" تقی نے سنجیدگی اور بڑے پن سے کہا تھا۔

"وہاں مری میں جو بھی ہوا اس میں سمیر کی اتنی غلطی نہیں ہے۔ وہ تو میں نے ہی اسے اکسایا تھا لیکن وہ صرف ایک شرارت تھی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم سمیر کو کوئی لوفر لفنگا ہی سمجھ لو۔"

سمیر نے بھی ہمت کر کے تقی کا جملہ کاٹا تھا۔ "اور باقی جو کچھ بھی ہوا۔۔۔ میرا مطلب ہے منگنی کے بعد ۔۔۔ وہ سب ایک بڑی مس انڈر اسٹینڈنگ تھی۔"

"مس انڈر اسٹینڈنگ۔۔۔" ثمر پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

"وہ سب کچھ مس انڈر اسٹینڈنگ کا نتیجہ تھا؟ تمہاری امی کا ہمارے گھر آنا۔۔۔ میرے بارے میں فضول باتیں کرنا۔"

"میں سب کو حقیقت بتا دوں گا۔۔۔ معافی مانگ لوں گا۔۔۔ تم مان جاؤ۔۔۔ باقی سب کو منانا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔"

اس نے بڑی چاہ سے کہا تھا۔

تقی نے شفا کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں چپکے سے وہاں سے ہٹ گئے۔

اب ثمر اور سمیر وہاں اکیلے تھے اور ثمر کی بدگمانیاں تھیں اور سمیر کی محبت۔۔۔ جس نے ان بدگمانیوں کو زیادہ دیر وہاں ٹکنے نہیں دینا تھا۔ اس بات کا شفا اور تقی دونوں کو ہی یقین تھا۔

۞ ۞ ۞

کچن میں آ کر شفا چائے بنانے لگی۔ تقی ساتھ کچھ فریشمنٹ کا سامان لایا تھا۔ خاموشی سے پلیٹوں میں نکالنے لگا۔ وہ کن اکھیوں سے بار بار اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہم کو ذرا باہر کا بھی دھیان رکھنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو ثمر واقعی کوئی چیز اٹھا کر سمیر کو دے مارے۔" تقی نے ہنس کر بات برائے بات کہا تھا۔ شفا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تقی خفت سی محسوس کر کے خاموش ہو گیا۔

شفا کے کان مستقل باہر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ وہ جان بوجھ کر چائے بنانے میں تاخیر کر رہی تھی تاکہ سمیر کو دیر تک بات کرنے کا موقع ملا رہے۔

کچن چونکہ چھوٹا سا تھا، اس لیے بار بار وہ اور تقی ایک دوسرے کے سامنے آ رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک بھی بار شفا نے نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

تقریباً" آدھ گھنٹے بعد وہ چائے لے کر باہر جانے لگی تو تقی یکدم اس کے سامنے آگیا۔

"سوری۔"

شفا ایک طرف سے ہو کر باہر جانے لگی تو وہ دوبارہ سامنے آگیا۔

"میں نے کہا سوری۔۔۔ ای ای۔" اب مسکینا سا بن رہا تھا۔

شفا نے اسے بہت سرد نظروں سے گھورا۔

"تم نے مجھے غلط سمجھ لیا۔۔۔ میرا ارادہ کوئی غلط یا تم سے جان چھڑانے کا ہرگز نہیں تھا۔۔۔ میں تو اپنی طرف سے تمہاری بھلائی ہی سوچ رہا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا تمہیں اتنا برا لگ جائے گا۔"

"ویسے تو ہر معاملے میں بہت دماغ چلتا ہے تمہارا۔ یہاں آ کر کیا ہوا؟" اس نے بھی لہجہ دھیما ہی رکھا یعنی معافی مانگ لی تو کیسی ناراضی۔

"دماغ تو یہاں بھی چلایا تھا۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ الٹی پڑ گئی۔۔۔ خیر، مجھے اندازہ ہے۔ میں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے۔ اس لیے ایک بار پھر سوری۔۔۔ لیکن اب دوبارہ سوری نہیں بولوں گا۔ تین دفعہ تو ہو گیا۔ اب اتنا بھی کیا نخرا کہ کسی کو شرمندہ ہوتا دیکھ کر آنکھیں ہی ماتھے پر رکھ لیں۔ ہاں یہ وعدہ ہے کہ اگلی بار جو بھی رشتہ لاؤں گا، وہ سمیر سے بہتر ضرور ہو گا۔"

وہ کہاں باز آنے والوں میں سے تھا۔ شرارت سے بول گیا۔

شفا نے ایسے نفی میں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو "تم ناقابل علاج ہو۔"

"تم ساری زندگی یہی کرنا۔۔۔ پہلے غلط باتیں کرنا پھر معافی مانگتے رہنا۔" وہ سرد لہجے میں طعنہ مار کر آگے بڑھی۔

"ہم نے کون سا ساری زندگی ساتھ رہنا ہے کہ۔۔۔

معافی تلافی کا سلسلہ چلے۔۔۔ تم بھی ناں شفا! بونگی ہی ہو۔" اس نے ٹرے میں سے بسکٹ اٹھایا اور مزے سے کھاتا باہر نکل گیا۔ اس کے لیے اتنا اطمینان ہی کافی تھا کہ وہ اب اس سے ناراض نہیں ہے۔ وہ اسے ہرٹ کرنے کے بعد معافی مانگ کر اپنا فرض پورا کر چکا تھا۔

پیچھے شفا تنہا ہی کھڑی رہ گئی۔

"واقعی۔۔۔ ہم نے کون سا ساری زندگی ساتھ رہنا ہے۔"

اس نے بوجھل دل کے ساتھ زیر لب کہا اور اس خیال سے پیچھا چھڑانے کے لیے جلدی سے باہر نکل گئی۔

۞ ۞ ۞
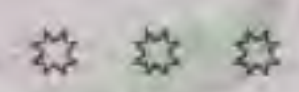
چائے ایسے پی جا رہی تھی جیسے کوئی پریشانی کی خبر آ گئی ہو۔

شفا اور تقی مستقل ثمر اور سمیر کے تاثرات ٹٹولتے اور کسی بھی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام ہو کر ایک دوسرے کی طرف مایوسی سے دیکھتے۔

ثمر نے چائے آدھی پی اور کپ رکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلتی ہوں شفا!" اس نے کسی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ جلدی سے باہر نکل گئی۔

شفا فکر مند ہو کر اس کے پیچھے دوڑی۔

"خفا ہو کے جا رہی ہو۔۔۔؟" اس نے اتنی بے قراری سے پوچھا تھا کہ ثمر کو ہنسی آ گئی۔

"ارے نہیں بدھو۔۔۔ خفا کیوں ہوں گی۔ بس اب چلوں۔ کافی دیر ہو گئی۔۔۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"اچھا۔۔۔" شفا نے اس کی ہنسی سے کوئی اندازہ لگانا چاہا۔

"خفا نہیں ہو تو یہ تو بتا دو۔۔۔ سمیر بھائی کو کیا جواب دے کر آئی ہو؟ کہیں "جواب" ہی تو نہیں دے آئیں۔"

ثمر اس بات پر مزید ہنسی۔

"میں تمہیں فون پر بتاؤں گی۔" ثمر نے اسے ٹالا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے، لیکن انکار مت کرنا۔ میرا یقین مانو سمیر بھائی تمہارے لیے پرفیکٹ چوائس ہیں ۔۔۔ تمہیں ایسا نہیں لگا؟"

"مجھے سوچنے دو شفا! ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

اس نے گہری سانس بھر کر کہا تھا لیکن اس کا دھیما انداز بہت کچھ سمجھا رہا تھا مگر قبل از وقت کچھ بھی کہنا مشکل تھا اور یہ بھی حیران کن بات تھی کہ اندر سمیر کی لڈی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی نہ صرف یہ بلکہ وہ تقی سے بھی اصرار کر رہا تھا کہ اس کا ساتھ دے۔

شفا اندر آئی تو خوشگواریت کے ساتھ متعجب ہوئی۔

"یہ سمیر بھائی کو کیا ہوا ہے؟"

"میرا خیال ہے، ثمر کے صاف انکار کا صدمہ اس بیچارے کے دماغ کو چڑھ گیا ہے۔"

"ثمر نے انکار نہیں کیا۔۔۔ لڈی ہے جمالو پاؤ۔۔۔ لڈی۔۔۔ ہے جمالو۔"

"تو کیا "ہاں" بول گئی ہے۔" شفا کو جھٹکا لگا۔ "لیکن اس نے تو مجھے نہیں بتایا۔"

"ہاں بھی نہیں کہا۔۔۔ لڈی ہے جمالو۔۔۔"

"میں نے کہا تھا ناں، صدمہ اس کے دماغ کو چڑھ گیا ہے۔"

"جلنے والے تیرا منہ کالا۔۔۔"

"او بھائی! آخر یہ میراثیوں کی طرح ناچنا بند کر کے ہمیں بتا کیوں نہیں دیتا، ثمر سے تیری کیا بات ہوئی ہے؟" تقی کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔

"باتوں کو چھوڑو تم بس یہ سوچو۔۔۔ میری بارات پر شہہ بالا بن کر ساتھ جاؤ گے یا دوست بن کر۔۔۔؟"

"کیا؟" ان دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"جی ہاں۔" وہ لہرا کر صوفے پر گرا تھا۔ اندرونی خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"لیکن ثمر نے تو کوئی جواب نہیں دیا سمیر بھائی! اس نے تو کہا فون پر بتائے گی۔"

"آپ کو فون پر بتائے گی۔۔۔ لیکن آپ کا بھائی

آپ کو بتا رہا ہے کہ لڑکی راضی ہے ۔۔۔ ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گن لینے والوں میں سے ہیں۔ لڑکی کے دل میں کیا چل رہا ہے۔ یہ کیسے نہ جان پاتے۔" اس نے کالر جھاڑتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔

"یہ ہوئی نا بات ۔۔۔" تقی نے جوش سے کہا۔ "جاہل آدمی! اتنی دیر سے ناچ رہا ہے۔ اصل موقع تو اب آیا ہے۔"

اب وہ دونوں مل کر ناچنے لگے۔ شفا البتہ اپنی ہنسی پر ہی قابو پانے کی کوششوں میں بے حال ہوئے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شام کا وقت تھا۔ لودھی صاحب چہل قدمی کے لیے نکلے تو شفا بھی ساتھ ہی آ گئی۔

وہ اسے اپنی جوانی کا کوئی قصہ سنانے لگے۔ شفا کی اور ان کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا۔ سسر بہو کا رشتہ ہے۔ باپ بیٹی لگتے تھے۔

"تقی کی واپسی کب تک ہے؟" پارک میں آ کر بیٹھے تو انہوں نے پوچھا۔ تقی شوٹنگ کے سلسلے میں بنکاک گیا ہوا تھا۔ شفا نے دیکھا تھا۔ وہ جتاتے بے شک نہ ہوں لیکن تقی کی خیر خبر ضرور رکھتے تھے۔

"ابھی تو گیا ہے۔ دس دن کا کہہ رہا تھا لیکن ابھی تک شوٹنگ شروع بھی نہیں ہوئی ۔۔۔ تو ہو سکتا ہے زیادہ دن لگ جائیں۔"

"بہت غیر ذمہ دار لڑکا ہے ۔۔۔ پتا نہیں کب سدھرے گا۔" وہ زیر لب بڑبڑانے لگے۔

"ارے ۔۔۔ ابا! آپ نے تقی کا ایڈ دیکھا؟" اسے یکدم یاد آیا تو پرجوش ہو کر پوچھنے لگی۔

"ہوں۔" ابا نے بری سی شکل بنالی۔

"میں نے کئی بار منع کیا اس لڑکے کو' یہ مراثیوں والے کام شروع نہ کرے مگر اس نے میری ایک نہیں سنی ۔۔۔ اب دیکھ لو' ناچ ناچ کر دودھ بیچ رہا ہے۔ کوئی مجھے بتائے کیا دودھ بیچنے کے لیے ناچنا ضروری ہے اگر ایسا ہے تو اب تک سارے گوالے بغیر ناچے دودھ کیوں بیچتے رہے؟"

شفا ان کے اعتراض پر مسکراتی رہی۔

"یہ تو پبلسٹی کمپین کا حصہ ہوتا ہے ابا! جو کمپنی کی ڈیمانڈ ہو' وہ ماڈل کو پوری کرنا پڑتی ہے ۔۔۔ آپ یہ نہ دیکھیں۔ تقی ناچ رہا ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ اس نے اچھی پرفارمنس دی ہے۔ کتنا نام کما رہا ہے۔"

"ہمیں نہیں پسند بس یہ کام ۔۔۔ اور میرا تو خیال تھا۔ تمہیں بھی ناپسند ہو گا۔ تم اتنی سلجھی ہوئی لڑکی ہو۔ میری تو ابھی تک یہی حیرانی نہیں گئی۔ تم نے تقی جیسے نالائق کو کیسے پسند کر لیا اور اب یہ کام۔"

شفا اس بات پر کھل کر ہنسی۔

"سچی بات ہے۔ پسند تو مجھے بھی نہیں ہے۔ لیکن میری پسند ناپسند سے کیا فرق پڑتا ہے ابا! یہ تقی کی زندگی ہے۔ اسے خود فیصلہ چاہیے اس کے لیے کیا صحیح کیا غلط ہے ۔۔۔ میں کیوں اس پر اپنی پسند ناپسند امپوز کروں ۔۔۔ ہاں' جہاں تک تقی جیسے نالائق کو پسند کرنے کی بات ہے تو ۔۔۔ تو وہ ہے ہی اس قابل کہ اسے پسند کیا جائے۔ میں یہ بات اس کے سامنے نہیں کہتی کہ سر چڑھ جائے گا لیکن میری زندگی میں تو وہ فرشتہ ہی بن کر آیا۔ اتنی بڑی مصیبت سے نکال لایا مجھے اور کیا چاہیے ۔۔۔ آپ کو تو فخر ہونا چاہیے کہ تقی آپ کا بیٹا ہے۔"

"ایں ۔۔۔" وہ حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگے۔

"کس مصیبت سے نکال لایا تمہیں؟ اس نے تو میرے خاندان کا نام ہی خاک کر دیا۔ نالائق' نابنجار ۔۔۔ جو کچھ اس نے تمہارے ساتھ کیا۔ اس کے بارے میں سوچ کر تو میں تم سے نظریں نہیں ملا پاتا کجا کہ اس پہ فخر کرنا۔" غیض سے ان کی آواز ہی کانپنے لگی۔

شفا چونک سی گئی۔ بات واضح نہیں تھی لیکن اس کی چھٹی حس نے اشارہ دے دیا تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ غلط ہوا ہے۔ کوئی غلط فہمی پھیل کر بدگمانی میں ڈھل چکی ہے اور ساہر سے تو کچھ بھی بعید نہیں تھا وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کچھ بھی کہہ سکتی تھی۔ خدا معلوم ابا سے بھی کیا کہہ دیا ہو۔

"میرا خیال ہے ابا! آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔" اس نے نرم لہجے میں کہا اور خود پر بیتی کتھا انہیں سناتی چلی گئی۔ ذرا سی بھی بات بچا کر نہیں رکھی۔ سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

ابا جوں جوں سنتے گئے۔ ان کے تاثرات بدلتے گئے۔

"اس کا مطلب تقی کی اس سب میں کوئی غلطی نہیں تھی؟ یہ سب ساہر کا کیا دھرا ہے۔" وہ ہکا بکا ہو گئے تھے۔

"جی ہاں بالکل ۔۔۔ یہ ساری فرضی کہانی ہے جو انہوں نے آپ کو سنائی۔ وہ بھی صرف مجھ سے دشمنی نبھانے کے لیے ۔۔۔ انہوں نے تو اپنے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا ۔۔۔ مجھے پتا ہوتا' آپ تقی کے بارے میں کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہیں تو یقین مانیں' یہ باتیں میں آپ کو بہت پہلے ہی بتا چکی ہوتی۔"

"تقی بہت اچھا ہے ابا! آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔ بہت احترام کرتا ہے ۔۔۔ آپ سمجھتے رہے' وہ جان بوجھ کر آپ کے خلاف جاتا ہے جبکہ ایسا نہیں تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں برابر نہیں ہوتیں تو ساری اولاد ایک جیسی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہر انسان کو اللہ اس کی الگ فطرت پر بناتا ہے ۔۔۔ بس اتنی سی بات ہے کہ رضی بھائی اور جری کے مقابلے میں تقی ایک الگ فطرت' الگ مزاج لے کر پیدا ہوا اور آپ اسے اپنا مخالف سمجھ بیٹھے ۔۔۔ اور آپ دونوں کے درمیان فاصلے پیدا ہوتے چلے گئے۔ اس فاصلے کو نہ آپ نے سمیٹنے کی کوشش کی نہ اس نے ۔۔۔ میں آپ کو ہر معاملے میں غلط نہیں کہہ رہی لیکن تقی کو یہاں ایڈوانٹیج حاصل ہے' آپ بڑے تھے' وہ چھوٹا۔ وہ یہ بات نہیں سمجھ سکا۔ آپ کو تو سمجھنا چاہیے تھی کہ باپ بیٹے کے مابین ایسا تعلق نہیں ہونا چاہیے جس میں صرف شکایتیں اور بدگمانیاں ہی ہوں ۔۔۔ ساہر بھابھی نے آپ سے تقی کے متعلق جو بھی جھوٹ بولا آپ کو وہ پہلا شخص ہونا چاہیے تھا جو ان کی بات کا یقین نہ کرتا ۔۔۔ آپ کو اپنے خون پر بھروسا ہونا چاہیے تھا۔ آپ کو اپنی تربیت پر مان ہونا چاہیے تھا لیکن آپ اپنے دل میں طے کر چکے تھے کہ تقی غلط ہی ہو گا۔ سو آپ نے فوراً" ساہر بھابھی کی بات مان لی۔ آپ نے ایک بار بھی نہیں سوچا' جب یہ بات تقی کو پتا چلے گی تو وہ کتنا دکھی ہو گا۔"

اس نے لودھی صاحب کی طرف دیکھا اور گھبرا گئی۔ ان کی رنگت غیر معمولی حد تک زرد ہو رہی تھی۔

"ابا! ۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں ناں ۔۔۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" انہوں نے بامشکل کہا۔ شرمساری کے احساس نے انہیں بے کل کر دیا تھا۔

"چلو گھر چلتے ہیں۔"

انہوں نے اٹھنے کی کوشش میں اپنی چھڑی پر زور ڈالا لیکن آن کی آن آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا اور وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عہدِ الست

تنزیلہ ریاض

مکمل ناول

روشنی کو حکم تھا کہ وہ اس کے پورے وجود کو اپنی بانہوں میں بھر کر اس کا اوڑھنا بچھونا ہو جائے۔ روشنی کی بساط نہ اوقات کہ وہ اس کے حکم سے انکار کرتی' سو اس نے فقط پلکیں جھپکی تھیں اور ایک معصوم وجود کو تاریکی سے روشنی میں دھکیل دیا گیا تھا۔

اسے زندگی عطا کر دی گئی تھی۔ وہ پیدا ہو چکا تھا۔ ایک ایسی دنیا میں' جو تخلیق ہی اس کے لیے کی گئی تھی' تاکہ وہ اس طرح جی سکے جس طرح جینے کا حکم ہے۔

اسی لیے وہ مطمئن اور پر سکون تھا۔ اسے زندگی کی نعمت دان کر دی گئی تھی۔ اس کے معصوم چہرے کا ایک ایک نقش' اس کے جسم کا ایک ایک عضو اور اس کے خون کی ایک ایک بوند اس نعمت پر شکر گزاری کے جذبے سے سرشار تھی۔ وہ چند لمحے قبل دنیا میں آیا تھا۔ لیکن اس کی حسیات مکمل تھیں۔ وہ سوچ سکتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

"کیا واقعی "دنیا" ایک حقیقت ہے؟"

☼ ☼ ☼

"کیا بنا رہے ہیں؟" زین العابدین نے موزے اتارتے ہوئے بنا اسے مخاطب کیے پوچھا تھا۔ نور محمد مختصر سے ہال اور کچن کے درمیان بنے مشترکہ کیبنٹس کے قریب کھڑا ماربل شیلف پر پڑی ٹوکری میں سے سلاد بنانے کے لیے سبزیاں منتخب کر رہا تھا۔

"چکن چیز سینڈوچ۔ نوڈلز اور سلاد وائٹ ساس کے ساتھ۔"

اس نے بائیں ہاتھ سے کچھ سبزیاں منتخب کر کے چوپنگ بورڈ پہ رکھتے ہوئے جواب دیا اور ساتھ ہی لحہ بھر کے لیے زین العابدین کا چہرہ دیکھا تھا کہ آیا وہاں ناگواری کے اثرات تو نہیں ہیں' پھر اسے ——— تساہل سے صوفے پہ پھیلا دیکھ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

بہت مہارت سے اس نے شملہ مرچ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا تھا اور اسے کترنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ بہت نفاست اور مہارت سے بورڈ پر چل رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے سب سبزیاں کتر لی تھیں۔ سینڈوچ کی تیاری کے لیے وہ ضرورت کی سب چیزیں نکالنے کے لیے فریج کی طرف مڑنے لگا تو اسے احساس ہوا تھا کہ اس کا روم میٹ آج کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا لگ رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے ٹانگیں بازو پھیلائے صوفے پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ اس کے میلے موزے ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبے تھے۔

"تم کچھ لو گے چائے کافی؟" اس نے بظاہر فریج کے اندر جھانکتے ہوئے زین العابدین سے پوچھا تھا مایونیز' پنیر' انڈے' کیچپ ایک کے بعد ایک' اس نے یہ سب چیزیں بھی درمیانی شیلف پر منتقل کر لی تھیں۔ زین العابدین نے مندی مندی سی آنکھیں

کھولی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنی نیند سے خاموش لڑائی لڑ رہا ہے۔

"نہیں شکریہ۔ ڈنر کروں گا آپ کے ساتھ۔"

زین العابدین نے اپنا عندیہ بھی سوئے جاگے انداز میں ظاہر کیا۔ نور محمد نے منہ سے کچھ کہا تھا نہ اثبات میں گردن کو زحمت دی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ ڈنر میں شریک ہوگا۔ وہ جو کچھ بھی تیار کر رہا تھا اس کی مقدار اس نے اتنی ضرور رکھی تھی کہ نا صرف وہ اور زین العابدین بلکہ ان کے باقی دو روم میٹس بھی چاہتے تو بخوشی ڈنر میں شامل ہو سکتے تھے۔ ویسے تو کھانے پینے کے معاملے میں وہ چاروں اپنی اپنی مرضی کے مالک تھے۔ کوئی کسی پر بھی انحصار نہیں کرتا تھا، لیکن نور محمد جب بھی کچن میں مصروف نظر آتا تو ان لوگوں کو اندازہ ہو جاتا کہ آج انہیں خود سے محنت نہیں کرنا پڑے گی۔

"نہیں کچھ مدد کروں آپ کی؟" زین العابدین نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے انداز میں تھکاوٹ سی محسوس ہوئی تھی، نور محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ہمیشہ اپنا کام اکیلے ہی کرنا پسند کرتا تھا۔ زین العابدین دوبارہ صوفے پر گر گیا تھا۔ نور محمد نے فریج والے ساکٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر ہال کی اضافی لائٹ بند کر دی تھی۔ اب وہاں صرف ہلکی سی روشنی موجود تھی جو اس ٹیوب لائٹ سے آ رہی تھی، جو کچن میں لگی تھی یا پھر کوریڈور کی طرف ایک چھوٹا بلب تھا۔ جس سے روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں ہال میں لیٹے زین العابدین کے وجود پر پڑ رہی تھیں۔

"مجھے تو آج زیادہ آرام نے تھکا دیا ہے۔ سچ کہا کسی نے فراغت ہر ایک کو راس نہیں آتی۔"

وہ جیسے غنودگی کے عالم میں بولا۔ نور محمد نے اس کی بات پر بھی کوئی تاثرات ظاہر نہیں کیے تھے۔ وہ بائیں ہاتھ سے چھری پکڑے اس کی تیز دھار سے ڈبل روٹی کے موٹے کنارے علیحدہ کر رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ زین العابدین کو فراغت نہیں ڈپریشن تھکا رہا تھا۔

اسے اس کی شام کی شفٹ والی ڈیوٹی سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ اس کی اضافی آمدنی کا ایک ذریعہ بند ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ کافی پریشان تھا، مگر وہ اپنی پریشانی کا کھل کر اظہار نہیں کرتا تھا۔

صرف وہی نہیں یہاں زیادہ تر لوگ ایسے ہی تھے۔ نور محمد ہر روز ایسے کتنے ہی لوگوں سے ملتا تھا جن کے چہرے اس قسم کی پریشانیوں نے کملا رکھے تھے۔ وہ اپنی پریشانیوں کو، اپنے مسائل کو اپنی اولاد کی طرح پال رہے تھے۔ یعنی ہر گزرتا دن ان کو بڑھاپے کی طرف لے جا رہا تھا اور مسائل تھے کہ دن بدن تنومند ہوتے جا رہے تھے۔ نور محمد کو ان سب پر ترس آتا تھا۔

زین العابدین بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ وہ ایرانی تھا اور تبریز کا رہنے والا تھا۔ ڈیڑھ سال قبل وہ اسٹڈی ویزے پر انگلینڈ آیا تھا۔ لیکن نور محمد نے کبھی اسے کسی قسم کی اسٹڈی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نو مہینے سے اس کے ساتھ رہ رہا تھا اور اس نے اسے گدھوں کی طرح کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ دو، دو جگہ پہ ڈیوٹی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اوور ٹائم بھی کرتا تھا۔ چھٹی کے دن بھی وہ سیکورٹی گارڈ کے طور کسی جگہ کام کرتا تھا۔ اتنی سخت محنت کے باوجود وہ بمشکل چند پاؤنڈز فی گھنٹہ کما پا رہا تھا۔ اس کے خاندان میں اس کی بیوی اور ایک بیٹے سمیت بارہ افراد تھے۔ اس کا باپ ایک حادثے میں معذور ہو گیا تھا، اس کی ماں، بوڑھی تھی، اس کے بھائی چھوٹے تھے اور اس کی بہنیں تیزی سے جوان ہو رہی تھیں اور زین العابدین سب سے زیادہ اپنی بہنوں کے لیے ہی پریشان نظر آتا تھا۔ وہ تمام رقم اپنے گھر تبریز بھجوا دیا کرتا تھا جہاں اس کی ماں اس رقم سے اس کے بھائیوں کو پڑھا رہی تھی اور اس کی بہنوں کا جہیز بڑھا رہی تھی۔ یہی چیز زین العابدین کے لیے اطمینان بخش تھی۔

"بچیاں بہت جلدی بڑی ہو جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں جلدی سوچنا پڑتا ہے۔"

وہ اکثر خود کلامی کے سے انداز میں کہا کرتا تھا۔

یہاں زیادہ تر لوگ اسی انداز میں بات کرنے کے عادی تھے، کیونکہ یہاں بات کرنے والے زیادہ اور سننے والے بہت کم تھے۔ نور محمد بھی زیادہ لمبی چوڑی بات کرنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھار ہی زین العابدین کی ایسی باتوں پر تبصرہ کرتا تھا۔

"یہ قانون فطرت ہے زین العابدین! اسے بدلنا آسان نہیں ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، فطرت اپنے اصول کبھی نہیں بدلتی۔۔۔ بدلتی ہے۔۔۔ بوقت ضرورت بدل لیتی ہے۔ مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، مگر پالک کو کبھی مقناطیس کی طرف کھنچتے نہیں دیکھا گیا، حالانکہ پالک میں بھی تو فولاد ہوتا ہے۔ مقناطیس اپنی فطرت بدلتا ہے نا۔۔۔ جب باپ معذور ہو جائیں تو بیٹیوں کو بھی جوان ہوتے تھوڑا سا تو سوچنا چاہیے۔ مجھے اس سے زیادہ کی خواہش ہے ہی کب۔۔۔ برادر نور محمد۔"

وہ اکثر جذباتی ہو کر ایسی غیر منطقی باتیں کیا کرتا تھا۔ نور محمد چاہتا تو اس کو بہت زیادہ تسلی بخش جواب دے کر مطمئن کر سکتا تھا۔ اسے گفتگو کے فن پر انتہا کا عبور حاصل رہا تھا، لیکن اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ زین العابدین کی صرف مالی مدد کر سکتا تھا اور وہ کر دیا کرتا تھا۔ اس کے پاس دو چیزیں وافر تھیں۔۔۔ پیسہ اور دوسروں پر پیسہ خرچ کرنے کا حوصلہ۔ اس کے پاس ماں، باپ، بہن، بھائی اور بیوی، بچوں کے الفاظ والی کوئی ڈکشنری نہیں تھی۔ اس کے کندھے ہر قسم کی ذمہ داری کے بوجھ سے آزاد تھے۔ وہ جہاں رہ رہے تھے یہ دو بیڈز کا فلیٹ اس کا اپنا تھا۔ ایک کمرہ اس نے ایک عرب طالب علم کو دے رکھا تھا جو اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ یہ روم شیئر کر رہا تھا۔ نور محمد اور زین العابدین دونوں ایک کمرے میں رہتے تھے۔ اس گھر میں کارپٹ سے لے کر فرنیچر تک اور برتنوں سے لے کر اپلائنسز تک، بہت سی چیزیں نور محمد کی ملکیت تھیں۔ انرجی بلز سے لے کر گروسری تک کافی چیزوں کی ادائی اس کی جیب سے ہوتی تھی۔

یہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ رہنے والے اسے کچھ بھی نہیں دیتے تھے۔ وہ جو کچھ بھی سہولت سے اسے دیتے تھے، نور محمد بلا چوں چراں کیے رکھ لیتا تھا اور اگر کسی مہینے وہ کچھ بھی نہ ادا کرتے تو وہ مطالبہ نہیں کرتا تھا۔ یہ شاید اتنی بڑی بات نہ لگتی، لیکن برطانیہ جیسے مہنگے ملک میں یہ کافی بڑی صلہ رحمی تھی۔ اس صلہ رحمی کے جواب میں نور محمد کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ اس کے ساتھ جو بھی رہے، وہ مسلم ہو۔ اس سے زیادہ اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ وہ ویسے بھی کسی سے زیادہ گھلتا ملتا نہیں تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اس کے لیے صرف دو چیزیں اہم تھیں۔ اس کی کتابیں اور اس کی مسجد۔۔۔ کتابیں اس کا شوق تھا اور مسجد اس کا جنون۔ وہ لوٹن کی جامع مسجد میں مؤذن کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ وہ ان ہی دو چیزوں کے درمیان پنڈولم کی طرح جھولتا رہتا تھا اور اگر ان دو چیزوں کے علاوہ اس کی زندگی میں کچھ تھا تو کسی کو اس کی خبر نہیں تھی۔

سینڈوچز میں آمیزہ لگانے کے بعد نور محمد نے مایونیز اور کریم کو مکس کر کے سلاد تیار کرنی شروع کی تھی۔ سینڈوچز اس نے تیار کر کے اوون میں رکھ دیے تھے تاکہ گرم رہیں پھر سلاد کا کام نمٹا کر اس نے دائیں ہاتھ سے چمچہ بھر کر اسے منہ میں رکھا تھا۔ نمک، کالی مرچ اور لہسن کے ہلکے سے ذائقے کے ساتھ سلاد مکمل تیار تھی۔ اس نے اس ڈھانپ کر دوبارہ فریج

میں رکھ دیا تھا۔ اب صرف نوڈلز کا کام باقی تھا۔ اس نے ہال میں دیکھا تھا، وہاں اب زین العابدین نہیں تھا۔ اسے اپنے کاموں میں اس کے جانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس نے برنر کے سائیڈ والے کیبنٹ کھول کر اس میں سے انسٹنٹ نوڈلز کے دو کپ نکالے تھے۔ بجلی کی کیتلی میں سے ابلتا گرم پانی کپوں میں ڈالتے ہوئے اس نے عقب میں زین العابدین کی آواز سنی۔

"کتنی دیر ہے برادر؟" اس نے مڑ کر دیکھا۔ زین العابدین شاید منہ ہاتھ دھو کر آیا تھا اور اب صوفے کے ساتھ رکھی میز پر پڑی چیزیں سمیٹ کر رکھ رہا تھا۔

"ڈنر تیار ہے۔" نور محمد نے اطلاع دی تھی۔ نوڈلز کے کپ کو کیپ لگا کر صرف اوپر نیچے کرنا تھا اور نوڈلز تیار تھیں۔

"میں میز لگاتا ہوں۔" اس نے کہا تھا، پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

"آج مسجد میں نماز عشاء کے بعد کچھ لوگ آپ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔"

پتا نہیں وہ بتا رہا تھا یا پوچھ رہا تھا۔ نور محمد بائیں ہاتھ سے نوڈلز کو کپ میں ڈال رہا تھا۔ اس نے یکدم چونک کر زین العابدین کا چہرہ استفہامیہ انداز میں دیکھا تھا۔

"مجھے استقلال بیگ نے کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں۔ آپ شاید آج مسجد سے جلدی واپس آ گئے تھے۔" زین العابدین آج کل نماز عشاء مسجد میں ہی ادا کرتا تھا۔

"مجھ سے ملنے... مجھ سے ملنے کون آ سکتا ہے؟" نور محمد کے چہرے کے تاثرات کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔ وہ کافی گھبرا گیا تھا۔

"مجھے نہیں پتا... میں نے نہیں دیکھے... شاید پاکستانی تھے۔" وہ اپنے دھیان میں مگن کہہ رہا تھا۔ نور محمد کے قدموں تلے سے جیسے زمین نکل گئی تھی۔

"پاکستانی... کون پاکستانی؟" وہ ہڑبڑا کر پوچھ رہا تھا۔ بایاں ہاتھ بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ اس نے مزید قریب ہو کر نوڈلز والا کپ شیلف پر رکھ دیا تھا۔

"میرے بارے میں کیوں پوچھ رہے تھے؟ مجھ سے کیا کام تھا ان کو؟" اب کی بار اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ دل ہی دل میں جیسے یہ بات خود سے پوچھ رہا تھا۔ عجیب سے خدشات تھے جنہوں نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔ اسے اپنا آپ کمرۂ امتحان میں موجود اس طالب علم کی طرح لگ رہا تھا جس کا وائیوا لیا جانے والا ہو اور اس سے پہلے والا امیدوار وائیوا دینے جا چکا ہو۔ اس کی باری آنے ہی والی تھی، جبکہ وہ خود کو حوصلہ دے رہا ہو کہ اس میں ڈرنے والی بات کچھ بھی نہیں ہے۔

"آپ کے بارے میں اس لیے پوچھ رہے ہوں گے کہ کوئی دم درود والا مسئلہ ہو گا۔ یہ پاکستانی، ہندوستانی مسلمان سب کے سب بڑی ہی بدعتوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ کوئی بیماری کوئی پریشانی کوئی مسئلہ ہو جائے دوڑے جاتے ہیں بابوں کے پاس تعویذ لینے، دم کروانے۔ یہ نہیں کہ بندہ خدا! تم خود قرآن پڑھو، دعا مانگو، اللہ بہتر مدد کرنے والا ہے۔" زین العابدین اپنے مخصوص متکبرانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ اسے اپنے ایرانی مسلمان خون پر بہت فخر تھا۔ بات کرتے ہوئے وہ کچن والے حصے میں ہی آ گیا تھا۔ پھر اس نے کافی کے لیے دو مگ اٹھائے تھے۔ نور محمد نے اس کی جانب دیکھا۔

"میرے لیے کافی مت بنانا... تم ڈنر کر لو۔ سب کچھ تیار ہے۔"

نور محمد نے نوڈلز والا کپ اٹھا کر اس کا ڈھکن کھولا۔ پھر سینڈوچ میں کی گئی فلنگ کا تھوڑا سا بچ جانے والا حصہ اس کپ میں ڈال کر اسے زین العابدین کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ زین العابدین نے حیرانی سے اسے دیکھا، کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔ نور محمد سے اس کے رویے کی وجہ پوچھنا بے کار تھا۔ نور محمد اپنی مرضی سے بولتا تھا۔ اپنی مرضی کے سوالوں کا جواب دینا پسند کرتا تھا۔ اس نے صرف ایک مگ میں ہی پانی لے کر کافی پھینٹنا شروع کر دی تھی۔ نور محمد کے ایسے معمولات اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ وہ اکثر نہایت بدمزاج ہو جاتا تھا اور تب اس کی نیلی آنکھیں بے حد بے حس لگنے لگتی تھیں۔

"ڈنر تیار کر دیا، مگر خود ساتھ بیٹھ کر نہیں کھائیں گے۔ شاید بھوکے ہی سو جائیں۔ کتنی بار کہا ہے بائیں ہاتھ سے کام مت کیا کرو برادر! بے برکتی ہوتی ہے۔ اب بتاؤ ایسے طعام کا فائدہ جس کا ایک لقمہ بھی کھانا نصیب نہ ہو۔"

نور محمد کو اپنے کمرے کی جانب جاتا دیکھ کر اس نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ نوڈلز کے کپ سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تین سینڈوچ، دو چائے، ایک ایپل جوس اور ایک باؤنٹی (چاکلیٹ)" کیفے ٹیریا کے کاؤنٹر کے گرد کھڑے آرڈر کرتے ہوئے اس نے سرسری غیر ارادی نگاہ اس سمت میں ڈالی تھی، جہاں سے کچھ دیر پہلے اٹھ کر وہ آرڈر دینے آیا تھا۔ عمر ابھی بھی سابقہ شاہانہ انداز میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا جبکہ امائمہ کھڑی ہو چکی تھی، چونکہ شہوز کی جانب اس کی پشت تھی، اس لیے وہ سمجھ نہیں پایا کہ وہ کھڑی ہو کر کیا کر رہی ہے۔ چند لمحوں بعد اس نے اسے کرسی کی پشت پر لٹکا اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر کندھے پر لٹکاتے اور ڈیپارٹمنٹ کے رستے کی طرف قدم بڑھاتے دیکھا۔ وہ واپس جا رہی تھی۔

"ہیلو... ایکسکیوزمی... کدھر...؟" اس نے ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی، لیکن فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ اس کی نگاہ وہاں تک پہنچ رہی تھی، لیکن آواز کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اوپن ایئر کیفے ٹیریا میں دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے بھی کافی لوگ موجود تھے۔ اس لیے اس نے نام لے کر امائمہ کو نہیں پکارا تھا۔ حالانکہ امائمہ کے رویے نے اسے کچھ الجھا دیا تھا۔ ان کی کلاس تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ امائمہ کو کنوینس کا کچھ پرابلم تھا۔ شہوز اسے گھر تک ڈراپ کرنے والا تھا۔ اسی لیے وہ بہروز بھائی سے گاڑی مانگ کر لایا تھا۔ ورنہ اسے اس کی بائیک کافی تھی اور امائمہ اس کے ساتھ بائیک پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ گاڑی میں بھی وہ اسے اکیلا ڈراپ نہیں کرنے والا تھا، بلکہ اس کی دو عدد کلاس فیلو بھی ہمراہ جانے والی تھیں۔ پہلے بھی وہ کبھی کبھار امائمہ اور اس کی فرینڈز کو گھر تک چھوڑ دیا کرتا تھا۔ سب کچھ تو ٹھیک ٹھاک تھا۔ پھر اب وہ اس طرح اٹھ کر کیوں چلی گئی تھی۔ یہ سوال اسے شاید اتنا نہ الجھاتا، اگر عمر اس ٹیبل پر موجود نہ ہوتا۔

"امائمہ چلی گئی؟" مطلوبہ چیزوں کی ٹرے لے کر اپنی جگہ تک آتے ہوئے وہ اسی کے متعلق الجھ رہا تھا۔ اس لیے آتے ہی پہلا سوال بھی یہی کیا۔

"نظر آ رہی ہے کیا؟" عمر نے جواب دینے کے بجائے اس سے سوال کیا تھا۔ شہوز نے اس کے انداز کو زیادہ پسندیدگی سے نہیں دیکھا تھا۔

"میرا مطلب ہے... کیا ہوا... کیوں چلی گئی وہ... کوئی پرابلم؟" وہ عمر کے انداز کو برداشت کرتے ہوئے دوبارہ پوچھ رہا تھا۔

"تمہیں یہ سوال امائمہ سے پوچھنا چاہیے... نہیں؟" اب وہ اس ٹرے کو دیکھ رہا تھا جو شہوز لے کر آیا تھا۔ شہوز نے اسے دل ہی دل میں گالی دی۔ گالی وہ اسے منہ پر بھی دے دیتا تھا، لیکن پبلک پلیس اور پھر یونیورسٹی میں ڈیسنٹ امیج کو برقرار رکھنے کی خاطر وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ بھوک بھی بے حد لگ رہی تھی۔ اسی لیے وہ لائبریری میں بیٹھنے کے بجائے کینٹین تک آیا تھا۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ عمر صاحب ٹپکنے والے ہیں تو شاید وہ ایسا نہ کرتا۔ عمر کو آج کل نجانے کیوں یونیورسٹی آنے کا بہت شوق ہو گیا تھا۔ اگرچہ پہلے بھی وہ شہوز کا سایہ بنا رہتا تھا، لیکن نوبت یہاں تک نہیں آئی تھی کہ وہ اسکول اور کالج میں بھی اس کا پیچھا کرتا رہے۔ یہ نہیں تھا کہ ان کے درمیان دوستی نہیں تھی۔ دوستی تو مثالی تھی عمروں، مزاجوں اور دلچسپیوں میں فرق کے باوجود وہ گہرے دوست تھے۔ اس دوستی نے ان کے درمیان خون کے رشتے کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس دوستی کو جھگڑوں اور خفگیوں کا تڑکا لگتا رہتا تھا۔ شہوز کے چاچو کی فیملی ایک عرصہ سے انگلینڈ میں مقیم تھی اور ہر تین یا چار

سال بعد چاچو لوگ دو تین مہینے کی چھٹی پاکستان میں ضرور گزارتے تھے۔ اسی لیے ان کے بچے بڑے ہو کر بھی اسی روایت پر چل رہے تھے۔

عمر تو اب اکیلا بھی پاکستان آجایا کرتا تھا' جبکہ عمر سے چھوٹا عمیر نہیں آتا۔ اس کا دل اپنے والدین کے بغیر پاکستان میں نہیں لگتا تھا۔ عمر نے بی اے آنرز کیا تھا اور اب تو جاب بھی کرنے لگا تھا' لیکن پھر بھی اس کی طبیعت میں سنجیدگی نہیں تھی' جس کی وجہ سے شہوز چڑ جایا کرتا تھا۔

اس دفعہ بھی وہ دو مہینے کے لیے آیا تھا۔ ایک مہینہ ہو چلا تھا آئے ہوئے اور اس ایک مہینے میں وہ شاید آٹھویں یا نویں دفعہ شہوز سے ملنے یونیورسٹی آگیا تھا۔ حالانکہ وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ یونیورسٹی کے بعد شہوز سارا وقت اسے دیتا تھا' لیکن پھر بھی وہ اسے غصہ دلانے کے لیے آجاتا تھا۔ ابھی تو باقاعدہ کلاسز نہیں ہو رہی تھیں۔ اس لیے شہوز بھی ہفتے میں دو' تین بار سے زیادہ نہیں آتا تھا' اگر آتا ہوتا تو شاید عمر بھی روز اس کے ساتھ آجاتا۔

آج سے پہلے شہروز نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا تھا' مگر امائمہ کے اس طرح اٹھ کر چلے جانے کے بعد وہ یہ سوچ سوچ کر تپ رہا تھا کہ عمر کیوں آگیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کے اور امائمہ کے درمیان کوئی ایسا تعلق تھا کہ کسی تیسرے کی موجودگی ناگوار گزرتی۔ امائمہ اس کے لیے بے حد قابل عزت تھی۔ اسی وجہ سے اسے خدشہ تھا کہ عمر نے کچھ ایسا نہ کہہ دیا ہو جو اسے برا لگا ہو۔

عمر کافی منہ پھٹ واقع ہوا تھا۔ اس کی طبیعت میں بے حد لاپروائی تھی۔ اسے پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سے کیا بات کرنی ہے۔ وہ لڑکے اور لڑکیوں سے ایک انداز میں بات کرتا تھا۔ گھر کی حد تک تو ٹھیک تھا' لیکن امائمہ ایک مختلف لڑکی تھی۔ وہ اس کی کزن تھی نہ کلاس فیلو تھی اور ابھی ابھی شہوز کو یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ آج بھی جب اس نے عمر کو آتے دیکھا تھا تو ناگواری کی جھلک اس کے چہرے پر در آئی تھی جسے تب شہوز نے کچھ خاص اہمیت نہیں دی تھی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" پہلا سینڈوچ ختم کرکے اس نے عمر کی جانب دیکھا۔ وہ بھی کھانے میں مگن تھا۔

"امائمہ نے تم سے کچھ کہا؟" بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے شہوز نے پوچھا۔ عمر سینڈوچ ختم کرچکا تھا۔ اس کے ریپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس نے ٹرے میں موجود چاکلیٹ اٹھانا چاہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ شہوز کے سوال کو سن کر بھی ان سنی کر رہا ہے۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

"یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔" اسے چاکلیٹ اٹھاتے دیکھ کر شہوز نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"اوہ۔ سوری۔" وہ پیچھے ہٹ گیا اور چائے کا کپ اپنی جانب سرکالیا۔ شہوز کوفت میں مبتلا ہو رہا تھا۔

"میں نے پوچھا امائمہ نے تم سے کچھ کہا؟" شہوز نے دہرایا۔ عمر سیدھا ہوا' پھر انجان بن کر بولا۔

"اس نے مجھ سے "کچھ" کہنا تھا؟" اس کا انداز ایسا تھا کہ عمر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ عمر لاپروا تھا' منہ پھٹ تھا' کچھ بولڈ بھی تھا' لیکن فلرٹ نہیں تھا۔ شہوز نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اس نے تم سے کہا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنے والی ہے؟" وہ سنبھل کر بولا تھا' مگر سامنے بھی شہوز تھا جو اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عمر کو آسانی سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کی عادت نہیں ہے۔ اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ غلط کرچکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں کا غلطی کا تصور کچھ مختلف تھا۔ عمر کا خیال تھا کہ شہوز ہر شرارت کو غلطی قرار دیتا ہے' جبکہ شہوز کو یقین تھا کہ عمر شرارت کے نام پر ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔

"اس طرح کیوں گھور رہے ہو مجھے؟" شہوز کو مسلسل اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے ناک چڑھا کر پوچھا شہوز نے کچھ کہنے کے بجائے ایک اور کڑی نظر اس پر ڈالی۔ اسکائی بلیو رنگ کی آدھی بازوؤں والی ٹی شرٹ اور ڈارک بلیو جینز میں ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ گندم کے دانوں کی طرح چمکتا اس کا یہ کزن نجانے اس کے ساتھ کون سا گیم کھیل رہا تھا۔

"خدا کے لیے مجھے اس طرح گھورنا بند کرو۔۔۔ میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔۔۔ میں نے ایک جنرل بات کی تھی اور اسے پتا نہیں۔۔۔"

شہوز کی نظروں سے خائف ہو کر وہ اگل رہا تھا کہ شہوز نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ مجھے وہ جنرل بات بتانا پسند کریں گے؟"

شہوز کا چائے کی طرف بڑھتا ہاتھ درمیان میں ہی رک گیا تھا۔ بلی آدھی تھیلے سے باہر آچکی تھی اور اس آدھی بلی نے ہی شہوز کو غصہ دلا دیا تھا۔ اس کے مزاج کی سنجیدگی صاف ظاہر کر رہی تھی کہ وہ عمر پر برسنے کو تیار ہے۔

"غصہ مت کرو۔۔۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ آج کل زمانہ بھی عجیب ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ گرل فرینڈز بیٹھی رہتی ہے اور بوائے فرینڈز نوکروں کی طرح چائے پانی لانے پر لگے رہتے ہیں۔ اس کیفے ٹیریا کی صورت حال ہی دیکھ لو۔۔۔ سب لڑکیاں بیٹھی ہیں اور لڑکے چائے سموسے لے لے کر آرہے ہیں۔۔۔ اتنا ہی کہا تھا میں نے۔۔۔ بس پھر۔۔۔"

"بیڑا غرق۔" شہوز نے اپنی پیشانی پر عورتوں کے سے انداز میں ہاتھ مارا تھا۔ وہ جسے تھیلے کی بلی سمجھا تھا' وہ باہر آنے کے بعد ہاتھی بن چکی تھی۔ اس طرح کے کمنٹس کا تو کوئی بھی لڑکی برا مان سکتی تھی' تبھی کبھی جو لڑکوں کے ساتھ کینٹین میں آتی ہی اس لیے تھیں اور یہ تو امائمہ تھی جو لڑکے تو لڑکے' لڑکیوں کے ساتھ بھی زیادہ دیر کیفے ٹیریا میں بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ لڑکے تو کیا کسی لڑکی کی بھی مجال نہیں تھی کہ وہ امائمہ اور اس کی فرینڈز سے ان کی حدود سے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرے۔

"کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟" عمر اس کے تاثرات سے خائف ہوئے بنا پوچھ رہا تھا' چہرے پر معصومیت اتنی تھی جیسے پتا ہی نہ ہو کہ صحیح اور غلط میں فرق کیا ہے۔

"اتنے بھی بچے نہیں ہو تم کہ یہ نہ پتا ہو۔۔۔ تمہیں یہ بکواس کرنے کی ضرورت کیا تھی؟" شہروز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا ہی کھا جائے۔

"اب تم برا مان جاؤ۔۔۔ ایک تو یہ بہت پرابلم ہے یہاں پہ۔۔۔ سچ بولو تو بھی لوگ بوتھا سجا لیتے ہیں۔۔۔ ایک بات بتاؤ اگر میں واقعی غلط ہوں تو پھر کاؤنٹر کے گرد جو اتنے لڑکے کھڑے ہیں اور وہ جو چائے کے کپ اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں اور یہ جو ٹیبلز کے گرد لڑکیاں ہی لڑکیاں بیٹھی ہیں اور پھر اپنی ا مائمہ بیگم کو کرسی پر بٹھا کر تم جو آرڈر پیش کرنے کاؤنٹر پر گئے تھے۔ وہ سب کیا ہے۔ کبھی کبھی سچی بات آرام سے ہضم کر لینی چاہیے۔۔۔ مان لو شہروز بیٹا! کہ پاکستانی لڑکے لڑکیوں کی چاکری کرنا پسند کرتے ہیں۔"

"بکواس مت کرو عمر۔۔۔" شہروز نے اسے روکنا چاہا تھا، لیکن وہ نہیں رکا تھا۔

"کیوں۔۔۔ اب تمہاری باری ہے؟ فکر مت کرو، تمہیں بھی بکواس کرنے کا موقع ملے گا، لیکن اس سے پہلے میرا ایک مفت مشورہ ہے۔"

اب وہ کرسی پر مزید سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"چھوڑ دو اس لڑکی کو۔۔۔ بڑی نخریلی ہے۔۔۔ شوخی۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں اپنے لیے ایک بہتر گرل فرینڈ تلاش کرنی چاہیے۔"

"وہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔ ڈیم اٹ۔" شہروز غرایا تھا۔

"ہاں ہاں، وہی کلاس فیلو۔" عمر کا انداز اب بھی سابقہ تھا۔ ان کے درمیان اس طرح ہی بات ہوا کرتی تھی۔ ایک دوسرے کو چڑانا، غصہ دلانا ان دونوں کو ہی پسند تھا اور عمر تو اس کام میں ماہر تھا۔

"اٹھو۔۔۔ اٹھو یہاں سے۔۔۔ اور دفع ہو جاؤ۔۔۔ خبیث! تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے بات کی جائے۔ ال میرڈ۔۔۔ تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ کسی لڑکی سے کس طرح بات کرتے ہیں۔۔۔ تم جاؤ یہاں سے۔۔۔ ابھی کے ابھی چلے جاؤ۔"

شہروز اسے انگلی سے وارننگ دے رہا تھا، لیکن اس پر مطلق اثر نہیں ہوا۔

"کیوں چلا جاؤں۔۔۔ یہ جگہ گورنمنٹ نے تمہارے ابا کو الاٹ کر دی ہے؟ اور ہاں بائی دا وے کس طرح بات کرتے ہیں لڑکی سے۔۔۔ الٹا لٹک کر؟ سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے۔۔۔ لڑکی ہے کہ تھانے دارنی۔۔۔ ہم سے نہیں ہوتا یہ سب۔۔۔ ہم ال میرڈ ہی ٹھیک ہیں۔"

عمر کا اطمینان نجانے کیوں پہلی بار شہروز کو چونکانے کا باعث بن رہا تھا۔ اسے ایک دم ہی احساس ہوا تھا کہ جیسے عمر کا اطمینان مصنوعی ہے۔ وہ اتنا مطمئن نہیں تھا، جتنا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی بے چینی کو چھپانا چاہ رہا ہے۔ اس لیے بلاوجہ سارا ملبہ شہروز پر ڈال رہا ہے اور اسے یہ بھی لگ رہا تھا جیسے وہ شہروز پر اپنا راز عیاں ہو جانے کے خوف سے ادھر ادھر کی ہانک کر اس کی توجہ خود پر سے ہٹانا چاہ رہا ہے۔

کچھ ایسا انوکھا پن ضرور تھا عمر کے انداز میں، جس سے بار بار شہروز ٹھٹک رہا تھا۔

"اوہو کم آن۔۔۔ مجھے گھورنا تو بند کرو۔۔۔ اوکے۔ کیا کروں میں؟ ایکسکیوز کروں تمہاری گرل سے۔"

اسے اپنی جانب ـــــ مسلسل دیکھتا پا کر عمر گویا زچ ہو کر بولا تھا، لیکن چونکہ عادت سے مجبور تھا۔ اس لیے اتنا کہہ کر لمحہ بھر کے لیے رکا، پھر بولا۔ "میرا مطلب ہے تمہاری کلاس فیلو سے؟"

اس موقع پر شہروز اسے آزما سکتا تھا، مگر وہ چوک گیا۔

"آج تو تم مجھے حیران کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ نا صرف اپنی غلطی مان رہے ہو بلکہ معافی مانگنے پر بھی تیار ہو۔"

استہزائیہ مسکراہٹ خود بخود اس کے چہرے پر پھیلی تھی۔

"غلطی؟ کون سی غلطی؟ میں نے کوئی غلطی نہیں کی میرے بھائی۔۔۔ اور معافی مانگ رہا ہوں تیری خاطر۔۔۔ تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ سچ بات کرتا ہوں۔۔۔ پرفیکٹ لوگ کبھی غلط نہیں ہوتے۔"

اپنی مدح سرائی میں وہ ہمیشہ کتاب لکھنے کو تیار رہتا تھا۔ شہروز اس کے انداز پر مزید کھل کر مسکرایا۔

تابوت کی آخری کیل اگرچہ باقی تھی، مگر تابوت اس کے بغیر بھی بند تھا۔ آخری کیل نہ بھی لگتی، تب بھی تابوت کے کھلنے کا امکان نہیں تھا، لیکن شہروز کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

"معاف کیا۔۔۔ کیا یاد کرو گے تم بھی۔۔۔ کسی کی خاطر معاف کیا تمہیں۔"

"احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں نے کہا نا، میں اس سے ایکسکیوز کرنے کو تیار ہوں۔"

اس نے گلے میں لٹکائے سن گلاسز آنکھوں پر ٹکائے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ شہروز اسے کڑی نگاہوں سے گھور رہا ہے، مگر وہ یہ نہیں سمجھا تھا کہ شہروز اس کا راز کھوجنے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے تئیں اس میں آدھا کامیاب بھی ہو چکا ہے۔

"بے کار میں وقت ضائع مت کرو۔۔۔ ویسے بھی وہ تمہارے انتظار میں نہیں بیٹھی ہو گی۔۔۔ گھر جا چکی ہو گی۔"

شہروز نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی تھی۔

"نہیں۔۔۔ ابھی نہیں گئی۔۔۔ اگر گئی ہوتی تو مجھے نظر آجاتا اور ویسے بھی اسے تم ڈراپ کرنے والے تھے نا۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا رخ مین گیٹ کی طرف تھا، جہاں کئی اسٹوڈنٹس اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹس سے داخلی راستے کی جانب رواں دواں تھے۔ ان کے ڈیپارٹمنٹ سے اس راستے کی طرف جانے کے لیے کیفے ٹیریا کے سامنے والی روش سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ بے شک یہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا، لیکن اتنا کم بھی نہیں تھا کہ وہاں موجود ایک کرسی پر بیٹھ کر کسی کو جاتا دیکھ کر پہچانا جا سکتا۔ یہ تب ہی ممکن تھا جب کوئی مسلسل اس سمت میں دیکھتا رہتا اور اسے جانے والے کے کپڑوں کے رنگ وغیرہ کی پہچان ہوتی۔ شہروز نے بمشکل اپنی حیرانی کو چھپایا تھا۔ اسے اپنے اندازوں کی سو فیصد مثبت رپورٹ ایک انجانی سی خوشی میں مبتلا کر رہی تھی۔ عمر کو تنگ کرنے اور اس کا ریکارڈ لگانے کا اچھا خاصا بہانا ہاتھ لگا تھا اس کے۔

"ہاں۔۔۔ لیکن تمہیں کیسے پتا۔۔۔ آئی مین میں اسے ڈراپ کرنے والا ہوں؟"

وہ بھی جینز کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوہو اسٹوپڈ! تم کیسے احمقانہ سوالات پوچھ رہے ہو۔۔۔ آف کورس۔ تم نے بتایا تھا رات۔۔۔ اسامہ بن لادن تو فون کرنے سے رہا مجھے۔"

عمر اس کے سوال سے کم اندازے سے زیادہ چڑ رہا تھا۔ شہروز نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا رہا تھا۔ یہ ذو معنی مسکراہٹ عمر کو خجل بھی کر رہی تھی۔

"بڑا یاد رکھا جناب نے۔۔۔ میں نے تو سرسری سا ذکر کیا تھا۔" شہروز کی آنکھیں شرارتی انداز ـــــ میں سکڑی تھیں۔ اب کی بار عمر نے اس کی جانب بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں پر گلاسز تھے۔ اس لیے اس کی آنکھیں پڑھنا فی الوقت شہروز کے لیے مشکل تھا، مگر وہ ٹھٹک چکا تھا۔

"اوئے۔۔۔ کدھر۔۔۔ کیا سوچ رہا ہے تو۔۔۔ تیری ٹرین زیادہ دور نہ نکل جائے۔ اس لیے پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ غلط اسٹیشن کی طرف جا رہا ہے تو اور اتنا سڑا ہوا اسٹیشن تجھے ہی مبارک ہو۔۔۔ میں چلتا ہوں۔"

وہ خفگی سے بولتے ہوئے واقعی گیٹ کی جانب چل دیا تھا، اس مصنوعی خفگی نے شہروز کو گہری طمانیت بھری مسکراہٹ سے دوچار کیا۔ اس کے ہاتھ عمر کا بہت بڑا سیکرٹ لگ چکا تھا۔ مسکراتے ہوئے وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹرے میں پڑی چاکلیٹ اٹھا کر اس نے ہاتھ میں پکڑلی تھی۔ چند لمحے اس چاکلیٹ کی جانب دیکھنے کے بعد اس نے اس کا ریپر پھاڑا تھا۔ چاکلیٹ اسے کچھ خاص پسند نہیں تھی۔ لیکن فی الحال منہ میٹھا کرنے کے لیے کچھ اور میسر نہیں تھا۔

"اور میں سمجھتا تھا تو واقعی میری خاطر آتا ہے دوست!" چاکلیٹ کا بائٹ لیتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے بال ٹرم کروا لیے۔" موبائل فون کان سے لگاتے ہی زارا کی افسردہ سی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ شہروز نے منہ کا برا سا زاویہ بنا کر گہرا سانس بھرا۔ موبائل کی اسکرین پر اس کا نام چمکتا دیکھ کر وہ جس خوش گوار احساس میں مبتلا ہوا تھا' اس کا اثر یک دم کم ہوا۔ زارا کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ اچھے موڈ میں نہیں ہے۔ اس نے اس قدر زود رنج طبیعت پائی تھی کہ اس وقت شہروز کسی ناگواری کا اظہار کرتا تو شاید وہ گھنٹوں روتی رہتی۔

"آہا۔ بڑی فرصت نکالی اپنے لیے... اور میرے لیے بھی کہ مجھے اطلاع بھی دی جا رہی ہے... ویسے اچھے لگ رہے ہوں گے... ہے نا... کون سا کٹ کروایا ہے؟"

لہجے میں مصنوعی بشاشت پیدا کر کے اس نے رائے کا اظہار بھی کیا اور استفسار بھی۔ اس کی طبیعت سے کسی قدر چڑنے کے باوجود یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا اور اب جبکہ وہ اس کی مصدقہ منگیتر بن چکی تھی تو اتنی دل جوئی تو فرض تھی اس پر۔

"مشروم کٹ۔" زارا کی آواز میں افسردگی کا لیول کم نہیں ہوا تھا۔

"یہ اچھا کیا تم نے... مجھے ویسے بھی زیادہ چھوٹے بال پسند نہیں ہیں۔" بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اپنی دانست میں اس نے اسے خوش کرنا چاہا تھا' حالانکہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ مشروم کٹ کون سا ہیئر کٹ ہے۔

"مشروم کٹ وہی ہیئر کٹ ہے جو میں نے پہلے کروا رکھا تھا۔" زارا کے لہجے میں افسردگی کے ساتھ طنز بھی جھلکا تھا جسے شہروز سمجھ نہیں پایا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر الٹے ہاتھ سے جوگرز کے تسمے کھول رہا تھا۔ کچھ دیر قبل وہ اور عمر جم سے واپس آئے تھے۔ اس کے منہ کا ذائقہ زارا کی بات سن کر کڑوا ہو گیا۔

زارا کا پرانا ہیئر کٹ اسے سخت ناپسند تھا' پسند تو وہ زارا کو بھی نہیں تھا' بلکہ اس کی تو دلی خواہش تھی کہ وہ بالوں کو بڑھائے' ان کی چوٹی بنائے' ان میں پراندہ ڈالے اور پھر جھومتی پھرے' مگر اس کو کبھی بال بڑھانے ہی نہیں دیے گئے تھے۔ وہ جب بھی ایسی کوشش کرتی' کزنز کے مذاق کا نشانہ بنتی تھی اور اس کی ماما یعنی شہروز کی پھپھو تو ویسے ہی اس کے لمبے بال دیکھ کر ڈپریشن کا شکار ہو جاتی تھیں۔

ان کا خیال تھا کہ میڈیسن کی مشکل پڑھائی کے لیے لمبے بال ناموزوں ہیں۔ وہ زارا کی ضد اور ناپسندیدگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے ہر مہینے دو مہینے بعد پارلر لے جا کر اس کے بال کٹوا دیا کرتی تھیں اور اب کی بار جو اس نے بال بڑھانے کی کوشش کی تھی تو یہ خاص شہروز کی فرمائش پر منگنی کے بعد کی تھی۔ شہروز اسے سمجھاتا رہتا تھا کہ اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

"اپنے لیے وہی چیز اپناؤ جو تمہیں پسند ہو۔"

شہروز کا کہنا تھا۔ تب ہی گزشتہ ایک سال سے وہ بالوں کی لمبائی بڑھانے میں لگی ہوئی تھی اور جب بھی اس کی شہروز سے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اپنے بالوں کو لہرا کر پوچھنا نہیں بھولتی تھی کہ وہ کیسی لگ رہی ہے۔ شہروز اس سوال کا جواب کیا دیتا' وہ تو اسے ہر حال میں اچھی لگتی تھی۔ یہ اور بات کہ اسے چڑانے کے لیے اس نے کبھی کھل کر پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ زیادہ خود ترسی کا شکار ہوتی تھی' جس کی اسے عادت تھی تو وہ اس کی دل جوئی کی خاطر تعریف ضرور کیا کرتا تھا۔ اب بھی اس نے یہی کیا۔

"زبردست... تم اچھی لگ رہی ہو گی۔"

وہ اب اپنی جرابیں اتار رہا تھا۔

"اچھی... اونہہ... میں ایک بار پھر اسٹوپڈ چائلڈش ہیری پوٹر لگنے لگی ہوں۔"

اس کا لہجہ گلوگیر مگر انداز استہزائیہ تھا۔ شہروز نے خفگی سے اپنے موبائل فون کی جانب دیکھا۔ ناگواری کی ہلکی سی لہر اس کے اندر سر اٹھا رہی تھی۔ زارا کے اس بچپنے سے اسے چڑ ہوتی تھی۔ اکلوتی ہونے کی بنا پر جہاں اسے بے پناہ پیار ملا تھا' وہیں بے پناہ حساسیت بھی اس کی طبیعت میں خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ بات

بعد میں پوری ہوتی تھی' آنسو آنکھ میں پہلے آجاتے تھے۔ والدین اور کزنز وغیرہ کے لاڈ پیار نے اسے مغرور بنانے کے بجائے احساس کمتری کا شکار بنا دیا تھا۔

"نو پرابلم یار۔۔۔ مجھے ہیری پورٹر اچھا لگتا ہے۔" اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔ وہ اپنی خفگی کو فی الحال ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تمہیں اچھا لگتا ہے تو میں کیا کروں۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔" جواب میں وہ ترخ کر بولی تھی۔ شہروز بستر پر لیٹنے لگا تھا' مگر زارا کی بات سن کر اٹھ بیٹھا۔ وہ جھگڑے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے ایسی کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ اسے زارا کا انداز برا لگا۔

"نہیں۔ اچھا لگتا تو مت کرنا اس سے شادی۔۔۔ مجھ سے جھگڑا کیوں کر رہی ہو یار۔" وہ رسانیت سے بولا۔

"میں تم سے جھگڑا نہیں کر رہی۔۔۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں اور مجھے تمہارے کسی مشورے یا نصیحت کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا چل چکا ہے کہ تم میرے کتنے ہمدرد ہو۔"

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھی۔

"واٹ ربش۔۔۔ تم بات کس طرح کر رہی ہو۔۔۔؟ میرا خیال ہے' مجھے فون بند کر دینا چاہیے۔ ابھی تمہارے مزاج شریف کچھ درست نہیں لگ رہے۔ جب طبیعت ٹھیک ہو جائے تب دوبارہ فون کر لینا۔"

اب کی بار وہ بھی اپنا غصہ چھپا نہیں پایا تھا۔ زارا نے اس سے کبھی اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔

"میں دوبارہ فون نہیں کروں گی۔۔۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں نے بال ٹرم کروا لیے ہیں اور میں نے یہ سب تمہاری وجہ سے کیا ہے۔" زارا کا لہجہ بھی پہلے سے زیادہ خفگی کا تاثر لیے ہوئے تھا۔

"میری وجہ سے؟" وہ حیران ہوا۔ "میں نے تم سے کب کہا کہ بال کٹوا دو۔۔۔ بلکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ بال مت کٹوانا۔ مجھے لڑکیوں کے لمبے بال اچھے لگتے ہیں اور اگر تمہیں یاد ہو تو میں نے یہ بھی کہا تھا کہ چلو بہت لمبے نہ سہی مگر اتنے لمبے بال تو ہوں کہ کندھوں تک آئیں اور یہ اسٹوپڈ کھبی کٹ جو تم نے کروایا ہے کتنا زہر لگتا ہے مجھے اور پھر۔۔۔ چلو چھوڑو۔۔۔ میں نے کچھ کہا تو تمہیں برا لگ جائے گا' اس لیے بہتر ہے میں خاموش رہوں۔"

وہ دل کی بھڑاس نکال کر خاموش ہو گیا۔ دوسری جانب بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ کچھ لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا' پھر اس نے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا تھا۔ کال ابھی کٹ نہیں ہوئی تھی۔ شہروز کو یک دم ہی خاموشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

"اوئے تم رو رہی ہو؟" وہ چڑ کر پوچھ رہا تھا۔ وہ واقعی رو رہی تھی' شہروز کو شرمندگی سی ہوئی۔ وہ بہت بار اس کے سامنے رو چکی تھی' لیکن اس کی وجہ سے شاید آج پہلی مرتبہ روئی تھی۔

"او یار۔۔۔ پلیز۔ ایسے مت کرو۔" وہ اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا' لیکن زارا اس کی ہمدردی پا کر مزید شیر ہو گئی اور زیادہ رونے لگی۔ شہروز اس کے چپ ہونے کا انتظار کرتا رہا' لیکن وہ چپ نہ ہوئی تو مزید غصے میں آگیا۔

"رونا بند کرو زارا۔۔۔ تم کو کس احمق نے کہا تھا کہ بال ٹرم کروا لو۔۔۔ خود ہی تو تم نے کہا تھا کہ اب بال نہیں کٹواؤ گی تو پھر اب کیوں کٹوا دیے۔۔۔ جب اپنی مرضی ہی کرنی ہوتی ہے تو مجھ سے مشورہ کیوں کرتی ہو۔۔۔ اوئے اسٹوپڈ! رونا تو بند کرو۔۔۔ یا خدا! میں اس لڑکی کا کیا کروں؟"

وہ اس کے رونے سے عاجز آ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا' پھر اس کی خاموشی سے جھنجلا گیا۔

"یار۔۔۔ میری بات سنو۔ ابھی میں ذرا مصروف ہوں۔۔۔ مجھے عامر کی طرف جانا ہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں لگاتا ہوں تمہاری طرف چکر۔۔۔ میں تمہیں دیکھ کر بتاؤں گا کہ تمہارے بال اور تم خود کیسی لگ رہی ہو۔۔۔ اور اگر تمہارے بال اچھے نہیں لگ رہے۔۔۔ میرا مطلب ہے فرض کر لو کہ اگر تمہارے بال اچھے نہیں لگ رہے تو۔۔۔ یار بڑھ جائیں گے بال۔۔۔ لمبے

ہو جائیں گے۔۔۔ اب مت کٹوانا۔۔۔ او کے۔"

اس کے آنسوؤں سے زچ ہو کر وہ تحمل و نرمی سے بولا تھا۔

"شہروز! پرابلم یہ نہیں ہے کہ میں کیسی لگ رہی ہوں۔۔۔ اگر میں بری لگ رہی ہوں تو بھی نو پرابلم۔۔۔ یہ میرا مسئلہ ہے۔۔۔ میں اس وجہ سے ہرٹ نہیں ہوئی۔ میں تمہاری وجہ سے ہرٹ ہوئی ہوں۔۔۔ تم اپنے منہ سے مجھے یہ سب بتا سکتے تھے۔ تمہارا اور میرا ریلیشن شپ اتنا کمزور نہیں ہے کہ تم مجھے میری کمزوریوں اور خامیوں سے آگاہ نہ کر سکو۔ میں جانتی ہوں' میں کیسی ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ سب کزنز مجھے "ڈاکٹر منی" کہہ کر چھیڑتے ہیں' لیکن میں کیا کروں' اگر میں دبلی پتلی ہوں' میں کیا کروں اگر میں اپنی عمر کی لڑکیوں سے چھوٹی لگتی ہوں۔ مجھے اپنی سب خامیوں کا پتا ہے۔

شہروز۔۔۔ لازمی تو نہیں ہے نا کہ تم سب کزنز مجھے ہی ڈسکس کرو اور پھر شہروز! میں تمہیں ناپسند تھی تو ماموں کے اصرار پر تمہیں مجھ سے انگیجمنٹ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم پہلے فرینڈز اور پھر کزنز ہیں۔۔۔ آئی ایم ہرٹ۔۔۔ آئی ایم رئیلی ہرٹ اینڈ۔۔۔"

"شٹ اپ!" شہروز دھاڑ کر بولا تھا۔ زارا چپ کی چپ رہ گئی۔

"بہت کر لیا تم نے اپنا یہ میلو ڈراما۔۔۔ تم سے کس نے کہا یہ سب۔۔۔ اس کا نام بتاؤ مجھے۔" اس کی بات کاٹ کر وہ نہایت سنجیدہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ زارا کچھ نہیں بولی' وہ واقعی شہروز کی باتوں سے ہرٹ ہوئی تھی۔

"زارا۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہو' اچھا آئی لو یو۔۔۔ یہی سننا چاہتی تھیں نا تم' میں نے آج تک۔۔۔"

وہ اتنا عاجز ہو چکا تھا کہ وہ بھی کہہ گیا جو کہنا اس کے خیال میں غیر ضروری سی بات تھی۔ ان دونوں کے درمیان باقاعدہ اظہار محبت والی کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔

"او ہو شہروز! میں یہ کب کہہ رہی ہوں تم سے۔۔۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو شہروز! میں چھوٹی بچی نہیں ہوں' لفظوں سے بہل جاؤں گی۔"

وہ واقعی چھوٹی نہیں تھی۔ وہ بے وقوف تھی۔

"زارا یار! تم میری انسلٹ کر رہی ہو۔" شہروز کو واقعی برا لگا۔

"میں تمہاری انسلٹ نہیں کر رہی' بلکہ عمر کے ساتھ یہ سب باتیں کر کے تم نے میری انسلٹ کی ہے۔ تمہیں کسی تیسرے کے ساتھ ہم دونوں کی بات ڈسکس نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

زارا کے لہجے میں مان بھری شکایت تھی۔ شہروز نے گہری سانس بھری۔ ساری بات سمجھانے کو عمر کا نام ہی کافی تھا۔ اس نے یونیورسٹی والی بات کا بدلہ لیا تھا۔

"عمر نے کہا تم سے یہ سب؟" وہ بے وجہ تسلی کے لیے پوچھنے لگا تھا۔

"اور میں کیا کہہ رہی ہوں تم سے' اب تم اس سے جھگڑنا نہ شروع کر دینا۔ اس نے تو سرسری سا ذکر کیا تھا' وہ تو میں نے ہی۔۔۔"

"ہاں' ہاں۔ تمہاری ذہانت پر تو مجھے پورا بھروسا ہے' یہ بتاؤ' اس نے اور کیا کہا۔ اس نے امائمہ کا نام بھی لیا ہو گا؟"

اس کی بات کاٹ کر وہ طنزیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"بات میری ہو رہی ہے۔ وہ بھلا امائمہ کا نام کیوں لے گا۔" زارا چڑ کر بولی۔

"اس نے ذکر نہیں کیا' میری کسی گرل فرینڈ کا؟" شہروز نے کھوجنے والے انداز میں پوچھا تھا۔ عمر کی عقل پہ اسے زیادہ بھروسا نہیں تھا۔ مگر اس کی اس حرکت نے شہروز کو مزید مشکوک کر دیا تھا۔ وہ شہروز کے اندازوں سے بڑھ کر تیز رفتاری دکھا گیا تھا۔

"گرل فرینڈ؟ کیا مطلب؟ امائمہ تمہاری گرل فرینڈ۔ وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے؟" زارا کا لہجہ حیرانی و پریشانی سے چور تھا۔ یہ تو واقعی افتاد والی بات تھی۔

"او بھائی! کوئی اس حماقتوں کے اپیچی کیس کا لاک تو لگا دے۔۔۔ تم بھی جب بھی بولو گی' بے تکا ہی بولو گی۔ اب رونے مت لگ جانا' خاموش رہ کر بات سنو میری'

بتاتا ہوں تمہیں اس عمر بن احسان کا قصہ۔"
وہ چڑ کر عمر کا راز اس سے شیئر کرنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شہروز! تمہیں یقین ہے کہ یہی بات ہے۔" کیبنٹ میں سے گلاس نکال کر میز پر اس کے سامنے رکھتے ہوئے زارا نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔ اسے آئے بمشکل پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے اور اس دوران وہ تین مرتبہ یہ سوال پوچھ چکی تھی۔

"حیرانی سے فوت ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کب کہا کہ مجھے یقین ہے۔ میں نے کہا، مجھے شک ہے۔"

کن آنکھوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے شہروز ڈرائنگ روم یا لاؤنج میں بیٹھنے کے بجائے اس کے ساتھ کچن میں ہی چلا آیا تھا اور اب کارنر میں پڑی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھا اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرون ڈریس میں وہ بڑی منفرد سی لگ رہی تھی۔ شکل کی بری تو وہ کبھی بھی نہیں تھی۔ دراصل اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ ذرا کم تھا۔ پھر میڈیسن کی پڑھائی کو ہمیشہ سر پر سوار رکھ کر ایسی چیزوں میں دلچسپی بھی کم لیتی تھی، لیکن جب بھی دل لگا کر تیار ہوتی تھی تو اچھی لگتی تھی۔

شہروز کے جواب سے چڑ کر وہ فریج کی جانب بڑھ گئی۔ یہ بھی شہروز کو اہمیت دینے کا ایک انداز تھا کہ انگیجمنٹ کے بعد جب بھی وہ زارا سے ملنے پھپھو کے گھر آیا تھا۔ زارا اسے چائے، کافی یا جوس خود ہی سرو کرتی تھی اور شہروز کو دل ہی دل میں اس کی یہ ادا اچھی بھی لگتی تھی، مگر منہ سے وہ کبھی شکریہ بھی ادا نہیں کہتا تھا۔ اب بھی نظریں تو اس کا تعاقب کر رہی تھیں، مگر وہ اس پر ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ آج وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ ان دونوں کے درمیان کافی دن بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ شہروز کو یونیورسٹی اور زارا کو میڈیکل کی پڑھائی نے مصروف کر رکھا تھا۔ فون پر تو بات ہو جاتی تھی، مگر ملاقات کافی دن بعد ہو رہی تھی۔

شہروز کو اتنے دنوں بعد اس سے ملنا اچھا لگ رہا تھا، لیکن زارا کو فی الحال عمر کے متعلق ہونے والے انکشاف میں زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ شہروز کے اندازوں سے زیادہ پرجوش ہو رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" فریج سے پائن ایپل کیک اور جوس نکال کر میز کی جانب آتے ہوئے زارا نے پھر وہی بات دہرائی تھی۔ وہ شہروز کے ساتھ والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی تھی اور جوس کی بوتل کا ڈھکن کھولتے ہوئے بولی۔

"کہاں ائمہ کہاں عمر۔ ایک مشرق، دوسرا مغرب۔ مجھے تو سن کر ہی کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ آئی مین یقین نہیں آرہا۔"

وہ گلاس میں جوس انڈیلنا ترک کر کے شہروز کی طرف دیکھنے لگی۔ شہروز نے آنکھوں کے اشارے سے اسے اس جانب متوجہ کیا تو دوبارہ سے گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"شہروز! مجھے یہ سوچ کر اچھا بھی لگ رہا ہے۔ ائمہ بہت اچھی ہے۔ وہ ہماری فیملی کا حصہ بن جائے گی تو بہت اچھا لگے گا۔" بات مکمل کر کے وہ شہروز کی تائید حاصل کرنا چاہتی تھی۔ شہروز کچھ چڑ سا گیا۔

"کیا سارا وقت ان دونوں کے متعلق بات کرتی رہو گی؟" کرسی کا رخ اس کی جانب موڑ کر وہ پوچھ رہا تھا۔ زارا نے نا سمجھی کے انداز میں اس کی جانب دیکھا اسے عادت ہی نہیں تھی۔ شہروز کے ایسے لہجے کی۔ وہ جب بھی ملتے تھے۔ آدھا وقت زارا اپنے پرابلم شیئر کرنے میں گزارتی تھی باقی کا آدھا وقت شہروز ان پرابلمز کا حل نکالنے میں ضائع کر دیتا تھا اور اگر اس دوران کوئی محبت بھری بات ہونے لگتی تھی تو ان دونوں کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ وہ دونوں روایتی منگیتر بن ہی نہیں پائے تھے۔ دراصل ان دونوں کی انگیجمنٹ کسی لمبے چوڑے افیئر کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ بزرگوں کے درمیان یہ بات ان کے بچپن سے ہی چل رہی تھی۔ ان کے کانوں میں بھی پڑتی رہتی تھی۔ اس لیے دونوں کی پسندیدگی بھی تھی یہ اور بات ہے کہ شہروز، زارا کے

سامنے پسندیدگی کا اعتراف کم ہی کرتا تھا اور چونکہ بچپن سے ہی اس قسم کا ریلیشن شپ تھا کہ لڑائی جھگڑے اور نوک جھونک زیادہ ہوتی تھی۔ اس لیے انگیجمنٹ کے بعد بھی اس میں فرق نہیں آیا تھا۔

"کیا مطلب۔ باتیں نہ کروں۔ کھانا لگا دوں۔ بھوک لگ رہی ہے؟ ممی ڈیڈی کو تو آلینے دو۔"

شہروز کے ٹوکنے پر زارا یہی سمجھی تھی کہ وہ بھوکا ہے اور اس کی باتوں سے اکتا رہا ہے۔ جبکہ شہروز پہلے سے زیادہ جھنجلایا۔

"اوئے ہوئے۔ قسمت خراب۔" اس نے عورتوں کی طرح ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ "کیسی لڑکی ہو تم۔" عمر ٹھیک کہتا ہے، تمہیں ساشے پیک۔ جتنا چھوٹا قد، اتنا ہی چھوٹا دماغ۔"

وہ منہ کا زاویہ بگاڑ کر بولا، پھر اس کے چہرے پر پھیلی خفت کو دیکھ کر ذرا توقف کیا اور بدقت مسکرایا۔ وہ اسے ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ زارا کے چہرے پر اتنے بے چارے سے تاثرات تھے کہ شہروز کو ہنسی آگئی۔ آنکھوں کا تاثر بھی بدل گیا تھا۔

"اچھی لگ رہی ہو اس کلر میں، بلکہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

شہروز نے یک دم زور دے کر کہا تھا۔ وہ کبھی برملا اس کی تعریف نہیں کرتا تھا۔ اس لیے زارا پہلے چونکی پھر کھل اٹھی۔

"سچ؟" اس نے اپنی کرسی پوری کی پوری اس کی جانب گھما ڈالی۔ "تم میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے نا؟" وہ مشکوک تھی۔ شہروز کا گزشتہ ریکارڈ ایسا ہی تھا۔ شہروز نے دلچسپی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا تھا۔ زارا کی خوشی دیدنی تھی۔

"مجھے لگا تھا تم کہو گے کہ میں بہت بری لگ رہی ہوں۔ تمہیں یہ ہیئر کٹ پسند نہیں ہے نا۔"

"وہ پرانی بات تھی، اب یہی ہیئر کٹ میرا فیورٹ ہے۔" وہ ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔ زارا کے چہرے پر پھیلی خوشی اسے بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اس کے رویے نے زارا کو ہی نہیں اسے بھی حیران کر دیا تھا۔

مگر وہ اسے اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ وہ خود کو یہ سب کہنے سے روک نہیں پایا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی اتنی ملائمت، اتنی نرمی چھلک رہی تھی کہ زارا جھینپ سی گئی۔ اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتا، زارا نے اسے ٹوکا۔

"زیادہ رومیو مت بنو شہروز! تمہیں پتا ہے نا، مجھے جلدی نظر لگ جاتی ہے۔"

"تم نظر کو لگ جایا کرو۔" شہروز اب بھی اسے سابقہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

"میں چھوت کی بیماری نہیں ہوں۔" وہ اپنے ناخنوں کی جانب دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔ شہروز کو ہنسی آگئی۔

"دھت تیرے کی۔ کر دیا نا بیڑا غرق میرے رومانٹک موڈ کا۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر سامنے رکھا جوس کا گلاس اٹھا لیا۔

"کیا یار۔ کتنی بورنگ ہو تم۔ ایک اچھا بھلا ہینڈسم۔ اسمارٹ لڑکا تم سے رومانس جھاڑ رہا ہے اور تم اتنی بری بری شکلیں بنا کر دیکھ رہی ہو۔" اس نے جوس کے گھونٹ بھرنے شروع کر دیے تھے۔

"اس کے بعد شکایتیں بھی کرو گی۔ عمر نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ تم نے ماموں کے اصرار کی وجہ سے مجھ سے انگیجمنٹ کی ہے نا۔ تم مجھے پسند نہیں کرتے، مجھے سب پتا چل گیا ہے۔"

وہ اس کی نقل کر رہا تھا۔ زارا خجل سی ہو کر مسکراتی رہی۔

"میں کیا کرتی، اس نے اتنے پُریقین لہجے میں کہا تھا کہ مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا میرا۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ آنکھیں کھلی رکھا کرو، ورنہ عمر کی طرح سب لوگ تمہیں۔ "ڈاکٹر بونگی۔" کہنا شروع کر دیں گے۔"

شہروز نے جوس ختم کر کے گلاس رکھا۔ زارا نے ہمیشہ کی طرح اس کی نصیحت کو بڑے دھیان سے سنا اور اس سے بھی زیادہ دل جمعی سے بھلا دیا تھا۔ گھر میں اس

وقت ملازم ہی تھے۔ پھپھو اور پھپھا جی طب کے شعبے سے منسلک تھے اور ان کے گھر میں ٹھہرنے کے اوقات بڑے تنگ سے تھے۔ ان دونوں کے آنے پر ہی کھانا لگنا تھا اور شہروز کھانے کے ارادے سے ہی آیا تھا۔ ان کا انتظار کرتے اور عمر کے متعلق باتیں کرتے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ڈنر کے بعد جب شہروز اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا تو عمر کا فون آگیا۔ اس نے آج کا سارا دن اپنی امی کے حکم دینے پر اپنی خالہ کے گھر گزارا تھا اور اب وہ شہروز کو پک کرنے پھپھو کے گھر آرہا تھا۔ وہ جب پہنچا تو زارا اور شہروز گھر کے باہر مین سڑک پر واک کر رہے تھے۔ ساڑھے دس بج رہے تھے، مگر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ عمر بھی سائیڈ میں گاڑی پارک کرکے ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔

"واؤ ئے ساشے پیک! تم تو بڑی اچھی لگنے لگی ہو۔"

اس کا اشارہ زارا کے بالوں کی طرف تھا کیونکہ اس کے بالوں پر قینچی پھروانا اسی کی کارستانی تھی۔

"ہذا من فضل ربی۔۔۔ کبھی غرور نہیں کیا۔" وہ مسکرا کر بولی تھی عمر پھڑک اٹھا۔

"واہ بھائی! کوئی مجھے پکڑے۔۔۔ یہ لفظ اس ساشے پیک کے منہ سے ہی نکلے ہیں نا۔" وہ بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کرنا چاہ رہا تھا، مگر سڑک پر ہونے کی وجہ سے کر نہیں پایا۔

"میں نہیں مانتا، یہ تم کہہ سکتی ہو زارا۔۔۔ میرا خیال ہے تم صرف منہ ہلا رہی ہو، ڈبنگ شہروز کروا رہا ہے۔"

وہ زارا کو کندھا مار کر بولا۔ وہ دونوں کچھ نہیں بولے، بلکہ خاموشی سے مسکراتے رہے۔

"یار! تم لوگ خاموش کیوں ہو۔۔۔ دیکھو، خواہ مخواہ مجھے کباب کی ہڈی مت سمجھو، کیونکہ میں خود بھی ایسا کچھ نہیں سمجھتا۔"

وہ اب شہروز کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ موسم بڑا اچھا سا ہو رہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی میں سڑک پر چلنا ان تینوں کو ہی اچھا لگ رہا تھا۔

"عمر اتنی بک بک کرکے تو تھکتا نہیں ہے؟" شہروز نے خفگی سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔" اس نے وسیم اکرم کے مشہور کمرشل کا مشہور زمانہ فقرہ دہرا لیا۔ وہ تینوں ہی ہنس پڑے تھے۔ اسی دوران ایک آئس کریم والا سائیکل ان کے پاس سے گزرا تھا۔ زارا کی فرمائش پر عمر نے تینوں کے لیے آئس کریم لے لی۔

"اس کی بک بک کی وجہ سے تو میں نے بال کٹوائے، ورنہ میں نے پکا عہد کر لیا تھا کہ اب کی بار بال لمبے کرکے ہی چھوڑنے ہیں۔ لمائمہ سے شرط لگائی تھی، میں نے کہ اس سے زیادہ لمبے بال بڑھاؤں گی۔"

آئس کریم کا ریپر کھولتے ہوئے زارا نے بے ساختہ کہا تھا۔ شہروز نے دل ہی دل میں اسے داد دی۔ اس نے بروقت لمائمہ کا نام لیا تھا۔

"اس کے بال لمبے ہیں؟" عمر کے لہجے میں دلچسپی اور تجسس تھا۔ شہروز نے اس کی آنکھوں سے جھلکتے ان جذبوں کو بغور خاص نوٹس کیا۔ وہ لمائمہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ لمائمہ چونکہ دوپٹے سے سر ڈھانپ کر رکھتی تھی۔ اس لیے عمر بے خبر تھا کہ اس کے بالوں کی لمبائی کتنی ہے۔

"تم جانتے ہو لمائمہ کو؟" زارا نے حیران ہونے کی بھرپور اداکاری کی، جبکہ عمر اس سوال پر محتاط سا ہو گیا۔

"ہاں۔۔۔ تمہیں میرا مطلب ہے۔ وہ شہروز کی کلاس فیلو ہے نا۔۔۔ اسی کی بات کر رہی ہو نا تم۔۔۔ اسے تو میں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ یہ شہروز ہر وقت اسی کا ذکر کرتا رہتا ہے اور جب کبھی بھی میں اس سے ملنے یونیورسٹی گیا۔ یہ اس سڑیل لڑکی کے ساتھ بیٹھا نظر آتا ہے۔"

وہ شہروز کی سائیڈ پر چل رہا تھا۔ بات کرتے کرتے زارا کی سائیڈ پر آگیا۔

"تمہیں تو کوئی فکر ہی نہیں ہے، اب تمہاری فکر بھی مجھ غریب کو کرنی پڑے گی۔ پہلے ہی تایا ابو نے اتنی مشکل سے شہروز کو تم سے شادی کرنے کے لیے رضامند کیا ہے۔ اب اگر یہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تو مجھے پتا ہے میرے ابو نے مجھے تم پر قربان کر دینا ہے۔ انہیں ویسے بھی میرے لیے ہمیشہ وہ چیز پسند آتی ہے جو سائز میں چھوٹی ہو اور بے کار ترین ہو۔۔۔ تمہیں مس ساشے پیک؟" کوئی اور موقع ہوتا تو زارا نے فٹ سے اس کی آخری بات پر منہ لٹکا لینا تھا، لیکن شہروز کے محبت بھرے انداز نے جو حوصلہ دیا تھا، اس نے فی الحال اسے ایکٹیو کر دیا تھا۔

"مجھے شکر قندی کی قربانی چاہیے بھی نہیں۔" وہ تڑخ کر بولی تھی۔ شہروز کا قہقہہ چھوٹ گیا۔ اسے عمر کے لیے یہ نام "شکر قندی" بڑا مناسب لگا تھا۔

"شکر قندی کی قربانی جائز ہوتی ہے شہروز؟" عمر اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ سب کزنز میں اپنی ان ہی خوبیوں کی بنا پر ڈھیٹ ابن ڈھیٹ مشہور تھا۔

"میں جا رہا ہوں یہاں سے۔۔۔ تم دونوں بیچ سڑک پر بیٹھ کر لڑتے مرتے رہو۔" شہروز واقعی واپسی کے لیے مڑا تھا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے چلے آئے تھے۔

"میری بات یاد رکھنا لڑکی! ورنہ نقصان میں رہو گی۔ حفاظت کرواپنے منگیتر کی۔" ایسا لگ رہا تھا کہ عمر جان بوجھ کر بات کا رخ اس طرح موڑ رہا ہے۔ اب تو زارا بھی مشکوک سی ہو رہی تھی کہ عمر کا لمائمہ کی طرف جھکاؤ ہے۔

"میرا دماغ مت کھاؤ عمر۔۔۔! میں لمائمہ کو اچھی طرح جانتی ہوں، وہ بہت اچھی لڑکی ہے اور وہ جانتی ہے کہ شہروز میرا منگیتر ہے۔"

زارا کا انداز ناک سے مکھی اڑانے والا تھا۔ شہروز عمر کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"تم جانتی ہو اسے۔۔۔ کیسے؟" عمر نے بے حد سرسری لہجے میں پوچھا جو واضح طور پر مصنوعی محسوس ہوا۔ شہروز نے زارا کو جتانے والے انداز میں دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ عمر بلا وجہ کسی کے متعلق انکوائری نہیں کرتا۔

"فرینڈ ہے میری۔۔۔ بہت اچھی۔" زارا نے آنکھیں مٹکائیں اور دوسرے راؤنڈ کے لیے مڑ گئی۔ شہروز نے اس کا ساتھ دیا۔ ان کے ہاتھ میں موجود آئس کریم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ عمران سے ذرا پیچھے ہو کر چل رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ بہت رغبت سے آئس کریم کھا رہا تھا۔ زارا نے شہروز کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ شہروز نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جان بوجھ کر موضوع سے ہٹ گئے تھے۔

شہروز کے کسی دوست کی بھانجی کسی پیچیدہ مرض میں مبتلا تھی۔ جس کا علاج کافی مہنگا تھا۔ سو وہ زارا سے اس متعلق پوچھنے لگا۔ وہ آج کل اسی سلسلے میں اپنی فیملی اور دوست احباب سے مدد اکٹھی کرتا پھر رہا تھا۔ بات کرتے کرتے وہ دونوں کن اکھیوں سے عمر کی جانب بھی دیکھ لیتے تھے جو آئس کریم ختم کر چکا تھا اور اب راہ میں آنے والے پتھروں کو ٹھوکر مار کر نجانے کیا سوچتا ان کے پیچھے چلا آرہا تھا۔

"زارا۔۔۔ یار! بات سنو۔۔۔ وہ واقعی تمہاری دوست ہے؟" عمر نے عقب سے اسے پکارا۔ گھر کا گیٹ قریب آچکا تھا۔ عمر نے گاڑی گیٹ سے ذرا ہٹ کر پارک کی ہوئی تھی۔ وہ گیٹ کی طرف جانے کے بجائے گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ زارا نے شہروز کی جانب دیکھا، پھر وہ مسکرائے تھے۔ عمر گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔ انہیں مسکراتا دیکھ کر اس نے ٹھاہ کرکے دروازہ بند کیا اور بڑے بڑے قدم بھرتا ان کے قریب آگیا۔

"زیادہ خباثت دکھانے کی ضرورت نہیں۔" عمر نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

"تم دونوں جو آنکھوں آنکھوں میں اشارے کر رہے ہو نا، میں کب سے نوٹس کر رہا ہوں۔" پھر اس کے چہرے کے غصیلے تاثرات یکدم بدلے تھے۔ وہ مسکرایا، اپنے بائیں ہاتھ سے اپنا دایاں کان کھجاتے ہوئے بولا۔

"کیا یاد کرو گے تم لوگ بھی۔۔۔ چلو مان لیا۔" مسکراہٹ دھیرے سے چمکی اور صبح کی روشنی کی طرح دور تک پھیل گئی۔ اس نے شہروز کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اچھی لگتی ہے وہ مجھے۔۔۔ پتا نہیں کیوں؟" اس نے اعتراف کرلیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"افغانستان بے شک ایک اسلامی ملک ہے، لیکن اس نے کبھی ہمسائے ہونے کا حق ادا ہی نہیں کیا۔"

اسفند خان اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔ شہروز نے خاموشی سے ان کی بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ چند لمحے قبل عمر کے ہمراہ سر آفاق کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔ اس لیے اسے صحیح اندازہ نہیں تھا کہ گفتگو کا موضوع کیا ہے، مگر وہ پروفیسر اسفند خان کو اچھی طرح جانتا تھا جو سیاسیات کے پروفیسر تھے اور سر آفاق کے اچھے دوست میں سے تھے۔

"ایک مسلمان ملک دوسرے مسلمان ملک کی جس طرح مدد کرسکتا ہے، افغانستان نے کبھی پاکستان کی اس طرح مدد نہیں کی۔ افغانستان نے کبھی پاکستان کو کوئی ایسا حق نہیں دیا جس کی بنا پر دونوں ممالک کے درمیان برابری کی بنیاد پر تعلقات استوار ہوسکیں۔"

ان کا بات کرنے کا ایک بڑا مخصوص سا انداز تھا۔ وہ بحث بھی ایسے کرتے تھے جیسے کلاس روم میں لیکچر دے رہے ہوں۔ ہر نکتے کو بیان کردینے کے بعد وہ مقابل کا چہرہ تکنے لگتے تھے۔ اسی لیے شہروز بے حد چوکنا ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہی اس کے بے حد قابل عزت اساتذہ تھے۔

"یہ وہ ہمسایہ ملک ہے، جس کے لیے پاکستان کو ہمیشہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر کڑی آزمائش میں اس ہمسائے کا ساتھ دینے کے باوجود ہمیں کیا ملا۔ اقتصادی پابندیاں، دنیا میں ایک نیگیٹو امیج۔۔۔ اسلحہ اور ہیروئن کلچر کا فروغ جو ناسور کی طرح ہماری رگوں میں بس چکا ہے اور معاشی بوجھ ان سب کے علاوہ ایک علیحدہ بڑا مسئلہ ہے۔"

ان کی بات کو توجہ سے سنتے ہوئے شہروز نے عمر کو کندھے سے ٹھوکا دیا۔ وہ لاتعلق سا بیٹھا منہ کھولے سامنے والی دیوار پر لگی تصویر کو گھور رہا تھا۔ پروفیسر اسفند کی پاکستانی خارجہ پالیسی پر بڑی گہری نظر تھی اور وہ اسے ناکام قرار دیتے ہوئے اکثر جذباتی ہوجایا کرتے تھے۔ سر آفاق ان کی جذباتیت سے خائف رہتے تھے۔ اب بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیلی ہوئی تھی۔

"خان صاحب! میں آپ کی بات سے انکار نہیں کررہا۔" انہوں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ خان صاحب نے ان کی بات کاٹ دی۔

"آپ ہمیشہ میری بات سے انکار نہیں کرتے، مگر کبھی اتفاق بھی تو نہیں کرتے جناب۔" یہ ان کا پرانا شکوہ تھا۔

"یہ وہ واحد ملک ہے، جس نے یو این او میں پاکستان کی ممبرشپ کی مخالفت کی، پاکستانی علاقوں پر اپنا حصہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ پاکستان کے مقابلے میں ہمیشہ ہندوستان کا ساتھ دیا۔ کیا افغانستان اسلامی ملک نہیں ہے؟ کیا یہ پاکستان کا حق نہیں تھا کہ افغانستان اسلامی ملک ہونے کے ناتے ہر معاملے میں ڈنکے کی چوٹ پر پاکستان کا ساتھ دیتا، جبکہ پاکستان تو ہر معاملے میں اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ کیا پاکستان کے اپنے مسائل کم ہیں یا وسائل بہت زیادہ ہیں جو ہم کبھی مفاہمت اور مصالحت کی پالیسی نظرانداز نہیں کرتے۔ ضرورت کے وقت خوراک کی امداد دیتے ہیں، چاہے ہمارے بچے خوراک کی کمی کا شکار ہوکر بیماریوں میں مبتلا ہورہے ہوں اور حال ہی میں جو گرم پانیوں تک تجارت کے غرض سے رسائی دی گئی۔ کیا اس سے ہماری معیشت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ آپ کو پتا ہے افغانی تاجر انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیے گئے ہیں۔ وہ انکم ٹیکس سے بھی بچ رہے ہیں اور اپنا مال ہماری سرحدوں پر بیچ کر ڈبل منافع کما رہے ہیں۔"

شہروز کو ان کی گفتگو میں بے حد دلچسپی محسوس ہوئی۔ ماس کمیونیکیشن میں اس کی فیلڈ پرنٹ میڈیا تھی۔ وہ اخبارات اور سیاسی پروگرامز وغیرہ دیکھتا تھا، مگر خان صاحب جو باتیں بتا رہے تھے۔ وہ اس کے لیے

ایک ایسے کالم یا ٹی وی پروگرام کی طرح تھیں جو ابھی شائع یا ٹیلی کاسٹ نہ ہوا ہو۔ اس کے لیے یہ سب فرسٹ ہینڈ نالج تھی۔ وہ بھول ہی گیا کہ عمر بھی اس کے ہمراہ ہے اور اب مصنوعی جمائیاں لے کر اور منہ کے زاویے بگاڑ بگاڑ کر اسے اپنی بوریت کا احساس دلانا چاہ رہا تھا۔

"ہم نے تیس لاکھ افغان مہاجرین کو پناہ دے رکھی تھی۔ کیا یہ ہماری نازک و ناتواں معیشت کے لیے بوجھ نہیں ہے۔ وہاں بنگلہ دیش میں بیٹھے بہاری کب سے واویلا مچا رہے ہیں کہ ہمیں بلاؤ اور ہم اپنی معیشت بچانے کے لیے اس مسئلے پر آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ افغانی ہمیں بہاریوں سے زیادہ عزیز کیوں ہیں؟"

پروفیسر اسفند توقف کرکے پانی پینے لگے تھے۔ عمر نے ایک اطمینان بھری مصنوعی ٹھنڈی سانس بھری۔ شہروز نے سٹپٹا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے، بازو صوفے کی پشت پر پھیلائے ایسے بیٹھا تھا جیسے دوستوں کے درمیان بیٹھا ہو۔ شہروز نے گھور کر منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر اسے گھرکنے کی کوشش کی، جواباً وہ اسے یہاں سے اٹھنے کے اشارے کرنے لگا، تب ہی سر آفاق نے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"خان صاحب! یہ بچے یہاں بیٹھے ہیں۔۔۔ ان سے پوچھتے ہیں کہ ان کی اس مسئلے پر کیا رائے ہے؟" انہوں نے یک دم ہی انہیں بھی گفتگو میں گھسیٹ لیا۔ شہروز کو پتا تھا عمر کچھ نہیں بولے گا۔ اس لیے اس نے خود ہی اپنی رائے دینی شروع کردی۔

"میں خان صاحب سے متفق ہوں۔" وہ بولا۔ حالانکہ اس نے اس موضوع پر جو سنا تھا۔ ابھی سنا تھا، لیکن حالات حاضرہ پر نظر رکھنے کی وجہ سے وہ کچھ نہ کچھ تو بہرحال جانتا تھا۔

"سر! دراصل ہماری جنریشن کا سب سے بڑا مسئلہ بیروزگاری اور روزگار میں ایک جیسے مواقع کی عدم دستیابی ہے۔"

عمر نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس نے جو بھی کہا تھا۔ عمر کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا، جبکہ شہروز مودب و تمکن کہہ رہا تھا۔

"ہر گزرتا دن بیروزگاری کی شرح میں اضافہ کررہا ہے۔ کتنے پڑھے لکھے نوجوان مناسب نوکری نہ ملنے کے باعث ایسے کام کرنے پر مجبور ہیں، جس سے ان کا وہ ہنر ضائع ہورہا ہے، جس کی انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اچھی نوکری یا نوکری سرے سے نہ ہونے کے باعث والدین جوان اولاد سے شکوہ کناں نظر آتے ہیں۔ والدین کی امیدیں پوری نہ کرنے کا احساس گناہ ہماری نسل کو جرائم کی طرف لے جارہا ہے۔ ہمارے ملک میں روزگار نہ ملنے کے باعث کی جانے والی خودکشی کا ریٹ بڑھ گیا ہے۔ سر! ایسی صورت حال میں واقعی تیس لاکھ مہاجرین کی آبادکاری معیشت کے لیے بوجھ اور یوتھ کے لیے ڈپریشن کا باعث بن رہا ہے۔ کل ہی ایک دوست بتا رہا تھا کہ اس نے جرمنی کے لیے ویزا اپلائی کیا ہے اور پیپرز میں اس نے خود کو بحالت مجبوری ایک غیر مسلم ظاہر کیا ہے، کیونکہ اس غیر مسلم جماعت کو جرمنی میں ویزا جلدی مل جاتا ہے۔ میں اسے گناہ کہتا ہوں، مگر میرا دوست، بھوکے پیٹ کو بھرنے کے لیے اس گناہ کو مجبوری کہتا ہے۔ میرے کئی دوست اس طرح فرانس، امریکہ اور کینیڈا وغیرہ جارہے ہیں۔"

اس نے لمحہ بھر کا توقف کرکے دونوں قابل احترام اساتذہ کی جانب دیکھا۔

"میں موضوع سے ہٹ نہیں رہا۔۔۔ دراصل میں یہی بتانے کی کوشش کررہا ہوں کہ جب ہم بحیثیت قوم اتنے مسائل کا شکار ہیں تو پہلے ہمیں ان مسائل کو حل کرنا چاہیے، پھر کسی اور کی طرف توجہ دینی چاہیے۔"

پروفیسر صاحب سر آفاق کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو شہروز بیٹا! مگر جغرافیائی حدود کو نظرانداز کرکے کوئی ملک کیسے ترقی کرسکتا ہے۔ اگر ہم مسائل کو حل کرنے میں ان کی مدد نہ کرتے تو کون کرتا، بہرحال وہ ایک اسلامی ملک ہے۔ ہمارا دین ہمیں ان کی مدد کرنے کا درس دیتا ہے۔ مجھے حیرانی ہے کہ

خان صاحب پٹھان ہو کر پٹھان کا ساتھ دینے پر اعتراض کر رہے ہیں۔" سر آفاق نے چند لفظوں میں اپنا موقف بیان کر دیا تھا۔

"بات ساتھ دینے نہ دینے کی نہیں ہے آفاق صاحب! بات یہ ہے کہ کیا آپ ساتھ دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ افغانستان سے طالبان کو نکال دیا گیا ہے۔ وہ کہاں ہیں؟ وہ ہمارے یہاں ہیں۔ جب امریکہ سرکار افغانستان سے طالبان کو نکالنے کے لیے بمباری کر سکتی ہے تو پاکستانی سرحدیں اس کی پہنچ سے دور نہیں ہیں۔ وانا اور وزیرستان کی صورت حال دیکھ کر آپ کو اندازہ نہیں ہو رہا ہے کہ اصل میں کیا ہو رہا ہے۔ کس چیز کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ سارے حقائق ثابت کرتے ہیں کہ آنے والا وقت ہمارے لیے مسائل و مصائب کا انبار لائے گا۔ اللہ کرے کہ میں غلط ثابت ہو جاؤں تو یقین کریں مجھے اس کی خوشی ہو گی۔ میں کسی قوم، کسی ذات، کسی صوبے یا قبیلے کے خلاف نہیں ہوں آفاق صاحب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں محب وطن پاکستانی ہوں۔ مجھے اس سرزمین سے عشق ہے۔ یہ سوچ کر میری جان نکل جاتی ہے کہ میرے ملک کی سالمیت سے کسی کو خطرہ ہے اور جس جس چیز سے جس جس شخص سے میرے ملک کی سالمیت کو خطرہ ہو، میں اس کی حمایت کیسے کر سکتا ہوں۔"

پروفیسر صاحب کا انداز جذباتی، مگر دو ٹوک تھا۔ سر نے تحمل سے اس کی بات کو سنا۔

"خان صاحب! یہ بہت حساس موضوع ہے۔ ہم کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ بہت سے محب وطن اہل دل پاکستانی اس کی حمایت نہیں کریں گے۔"

"آفاق صاحب! بڑی دل کھانے والی بات کر دی آپ نے۔ کیا میں اہل دل پاکستانی نہیں ہوں؟" خان صاحب تڑپ کر بولے تھے۔ سر آفاق مسکرائے۔

"آپ میری بات نہیں سمجھے۔ میرا مطلب تھا۔ اس موضوع پر اتفاق رائے نہیں ہے، اس لیے

۔۔۔ ارے بھئی، آپ خفا مت ہوں۔۔۔ میں معذرت خواہ ہوں، اگر میری بات سے آپ کو تکلیف پہنچی ہو۔"

انہوں نے پروفیسر اسفند کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔ پروفیسر صاحب نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"شرمندہ مت کرو یار۔" وہ ہنسنے لگے تھے۔

"خان صاحب! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک بات کہوں؟" شہروز نے اجازت طلب کی تھی۔ وہ عمر کو اور اس کے اشاروں کو نظر انداز کرتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ سر آفاق کئی مرتبہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی یہ اشارہ بازی محسوس کر چکے ہیں۔

"بیٹا! میں ابھی تم سے اتنا بڑا نہیں ہوں کہ تم مجھ سے اجازت طلب کرو۔ تم کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرو۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شہروز بھی مسکرا دیا اور عمر کی جانب دیکھا۔ وہ بہت اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔

"آپ کی بات ٹھیک ہے، ہمیں افغان مہاجرین کو پناہ نہیں دینی چاہیے تھی، لیکن ہمیں امریکہ کو بھی اپنی زمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا جو کالم نگار، اسمبلیاں کہتی ہیں کہ یہ سب آخری آپشن کے طور پر کیا گیا۔ ہم امریکہ کو "نو" کیوں نہیں کہہ سکتے تھے۔ بہت سے ممالک اپنی سیاسی و معاشی کمزوریوں کے باوجود ایسا کر رہے ہیں۔ ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے جو اپنا اصولی موقف منوانے کے لیے امریکہ کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑا ہے۔ اسی بنا پر مغرب کی مخالفت کے باوجود دنیا بھر میں ایران کا نام بلند ہوا ہے۔ لبنان نے اسرائیل کو شکست دے کر امت مسلمہ کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے اور ہم پہلی اسلامی ایٹمی قوت ہو کر بھی گیدڑ کی سو سالہ زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ دراصل ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا ایمان خود پر اور اللہ پر سے اٹھ گیا ہے۔ اور جنہیں اللہ کی طاقت پر بھروسا نہ ہو ان کے لیے ایٹمی قوت بھی کچھ نہیں کر سکتی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر

بول رہا تھا۔ کمرے میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ جسے پروفیسر اسفند خان صاحب کی خاموشی نے توڑا۔

"بچے! بات تو تم نے بالکل ٹھیک کی ہے، واقعی ہمیں اللہ کی طاقت پر بھروسا نہیں رہا۔"

"یہ اب اس ٹاپک پر بولنا شروع ہو جائیں گے۔ خدا کے لیے شہروز! یہاں سے چلو۔ میں بور ہو کر بھی تھک چکا۔"

اپنے حساب سے عمر نے بہت دھیمی آواز میں شہروز سے کہا تھا۔ مگر اس کی آواز اتنی ضرور تھی کہ سر آفاق ان کی جانب دیکھنے لگے۔ شہروز ان کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔

"یہ بچہ کون ہے؟" سر آفاق نے ایک دم شہروز سے پوچھ ڈالا۔

"یہ عمر ہے سر! احسان چاچو کا بیٹا۔" اس نے مختصر سا تعارف کروایا۔ عمر ابھی بھی سابقہ لاتعلق سے انداز میں بیٹھا تھا۔ سر آفاق کے احسان چاچو سے بھی مراسم تھے۔ اس لیے شہروز نے یہی حوالہ دیا۔ سر آفاق نے بھی عمر کا انداز اور تاثرات دیکھ کر اسے زیادہ مخاطب نہیں کیا، بلکہ وہ شہروز سے اس کے ڈیڈی اور بھائیوں کا حال احوال پوچھنے لگے تھے۔ انہوں نے جس طرح عمر کو نظر انداز کیا تھا۔ اس سے شہروز کے دل میں یہ مستحکم ہو گیا تھا کہ وہ اس کی بات سن چکے ہیں۔ اس لیے اس نے چند منٹوں بعد ہی ان سے اجازت چاہی تھی۔ اسے عمر پر بے پناہ غصہ آ رہا تھا تب ہی گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ عمر پر برس پڑا۔

"انتہائی فضول انسان ہو تم۔۔۔ تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ کسی بڑے سے کیسے بات کرتے ہیں۔"

"میں جیسا ہوں، مجھے ویسا ہی رہنے دو۔۔۔ مجھے کسی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔" عمر کو اکتاہٹ پہلے ہی ہو رہی تھی۔ شہروز کی خفگی نے مزید غصہ دلا دیا۔

"او کے۔۔۔ ایز یو وش۔" شہروز چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر سرد لہجے میں بولا۔ کافی دیر تک ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شہروز اسے نظر انداز کیے ڈرائیونگ کی طرف متوجہ رہا، جبکہ عمر اسٹریٹ لائٹس کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ شہروز کے چہرے پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔

"مجھے یہ اچھے نہیں لگے۔"

گاڑی میں پھیلی خاموشی کو عمر نے ہی توڑا۔ اس کا اشارہ سر آفاق کی جانب تھا۔ شہروز کو اس کے اعتراض پر حیرانی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ تم بھی انہیں اچھے نہیں لگے ہو گے۔" اس نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"مجھے پروا نہیں ہے۔" عمر نے پاکٹ سے ببل گم نکالتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"ہونا چاہیے احمق آدمی۔۔۔ تم ان کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔" شہروز کا انداز پہلے جیسا تھا۔ اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر ایسے جمے تھے جیسے عمر کی گردن پر رکھے ہوں۔

"اسی لیے نہیں ہے کہ ان کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ ان سے نہیں۔"

شہروز نے اس کے لاپروا انداز کو مزید ناپسندیدگی سے دیکھا۔

"میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔۔۔ میں وہاں بیٹھ کر کیا کرتا۔۔۔ میرے مطلب کی وہاں کوئی بات نہیں تھی۔ تم تینوں مل کر مجھے بور کر رہے تھے اور پھر اپنے سر کا انداز دیکھا تھا تم نے۔ میری طرف ایسے دیکھ رہے تھے۔ وہ جیسے میں چوہا ہوں۔۔۔ مجھ سے کتنا روڈلی بیہو کیا انہوں نے۔"

وہ ناک چڑھا کر بول رہا تھا۔ شہروز کے دل میں اس کے ببل گم چباتے منہ پر ایک مکا رسید کرنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔

"میں نے ایسا کیا کیا تھا کہ میں شرمندہ ہوتا پھروں اور پلیز تم بھی بلاوجہ غصہ مت کرو۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا۔۔۔ میرا پرپوزل ریجیکٹ کر دیں گے وہ۔ اچھی بات ہے۔۔۔ کر دیں۔۔۔ ان کا نقصان زیادہ ہو گا۔ ان کی سڑیل بیٹی کو مجھ سے زیادہ اچھا لڑکا نہیں ملے گا۔"

وہ قطعیت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ عمر کا یہی

مسئلہ تھا۔ وہ بولتا پہلے تھا، سوچتا بعد میں تھا۔ شہوز کچھ کہنے کے بجائے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"عمر بہت بدتمیز ہے۔"

شہوز نے ناک چڑھا کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ زارا نے بیزاری سے اس کی بات کو سنا تھا۔ وہ کچھ اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"اسے تمیز نہیں ہے کہ کسی بڑے سے کیسے بات کرتے ہیں اور کسی سے ملنے کے کیا مینرز ہوتے ہیں۔"

پارکنگ تلاش کرنے میں ناکام ہونے کے بعد گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ پارکنگ ایریا میں گاڑیوں کی لمبی قطار تھی اور جس انداز میں شہوز پارکنگ کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اگر اس انداز میں مزید ایک، دو گھنٹہ بھی کوشش کرتا تو اسے جگہ نہیں ملنی تھی۔ اسی لیے زارا بیزاری کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اسپتال سے اسے پک کرنے کے بعد اب تک وہ عمر کے متعلق بات کیے جارہا تھا۔ جبکہ اسپتال میں ایک بے پناہ مصروف دن گزارنے کے بعد زارا نہ صرف تھکی ہوئی تھی بلکہ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس لیے وہ شہوز کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دے رہی تھی۔ وہ صرف یہ چاہ رہی تھی کہ شہوز اسے ڈنر کروا دے یا پھر اسے گھر ڈراپ کردے۔ شہوز نے جب اسے فون کرکے ڈنر کی آفر کی تب بھی وہ اسے انکار کرنا چاہتی تھی، کیونکہ وہ بہت تھکی ہوئی تھی، مگر پھر بھی جانے کیوں وہ اس سے کہہ نہیں پائی۔ اسے خدشہ تھا کہ شہوز اس کے انکار کا برا مانے گا، مگر اب اس کی منہ سے مسلسل اس کے اور عمر کے درمیان اختلافات کا ذکر سن سن کر وہ نہایت بور ہوچکی تھی اور پھر جس طرح شہوز پارکنگ نہ ملنے کا بہانا کرکے ایک ریسٹورنٹ سے دوسرے ریسٹورنٹ تک چکر لگا رہا تھا، اس نے بھی زارا کو اکتاہٹ کا شکار کردیا تھا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے زارا! میں اب اس کے کسی معاملے میں نہیں بولوں گا۔ ان فیکٹ میں اب اس سے بات ہی نہیں کرنے والا۔۔۔ وہ پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ ہاں وہ ہینڈسم ہے، اس کے پاس پاؤنڈز ہوتے ہیں۔ وہ اپنے پیرنٹس کا بہت لاڈلا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جس کی چاہے جب چاہے انسلٹ کردے۔ ہم بھی کسی سے گئے گزرے نہیں۔ لاکھوں سے بہتر ہیں، 'ارے بابا نواب ہوگا' وہ اپنے لندن کا، چاچو، چاچی کے ساتھ کیا کرے اس طرح کی بدتمیزیاں، ہم پر اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔۔۔ تم مجھ سے لکھوا لو یار! یہ ڈبوئے گا چاچو کا نام۔۔۔ کہاں وہ اتنے خوش اخلاق اور رویل مینرڈ اور کہاں یہ ڈفر۔۔۔ میں تو اس سے بات نہیں کروں گا اب، بے شک تم آج کی تاریخ میں یہ بات نوٹ کرلو۔"

شہوز اس سے کافی ناراض لگ رہا تھا۔ زارا نے اس کے بیان کو عدم توجہی سنا۔ اسے فی الحال وہ بورڈز اور ہورڈنگز زیادہ دلچسپ اور قابل توجہ لگ رہے تھے جن پر کھانے سے متعلق کچھ نہ کچھ نمایاں تھا۔

"غلطی ایکچوئلی اس کی نہیں میری ہے۔ میں نے اسے زیادہ سر چڑھالیا ہے۔ کزنز اور فرینڈز میں ہمیشہ اس کو ترجیح دے دے کر اس کا دماغ خراب کردیا ہے۔ اسے تو اب میں سیدھا کروں گا۔ تم دیکھنا۔"

اس کی تقریر کے جواب میں زارا مسلسل چپ تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر شہوز نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"تم کیوں خاموش ہو؟"

"احتراماً۔" زارا نے اس کی جانب دیکھے بغیر سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ لہجے کی سادگی، چہرہ کی بیزاری سے بالکل میچ نہیں کررہی تھی۔

"احتراماً؟" شہوز نے استفہامیہ انداز میں اس کے لفظ کو دہرایا۔ اب کی بار زارا نے اس کی جانب دیکھا، پھر چبا چبا کر بولی۔

"پیٹ میں کچھ چوہے اودھم مچارہے تھے۔ ان میں سے آدھے بھوک کے باعث وفات پاگئے ہیں۔ ان کی

تدفین کے احترام میں خاموش ہوں۔"

شہوز کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی، پھر وہ خجالت بھری ہنسی ہنس دیا۔

"بھوک لگ رہی ہے؟"

"نہیں۔۔۔ مذاق کررہی ہوں۔" زارا کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

"شکر ہے میں سمجھا تم سیریس ہو۔" شہوز اسے مزید چڑانا چاہتا تھا، مگر پھر اس کے چہرے پر پھیلی اکتاہٹ دیکھ کر ارادہ ترک کردیا۔

"آئی ایم سوری یار۔۔۔ میں اپنی باتوں میں بھول گیا۔۔۔ دراصل یہ عمر۔۔۔" وہ ایک بار پھر عمر کے متعلق کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ مگر پھر ارادہ ترک کرکے خاموش ہوگیا۔ اسے کوئی موزوں ریسٹورنٹ بھی نہیں ملا تھا۔ عمر کی شکایتیں کرتے وہ اتنا جذباتی ہوگیا تھا کہ اس نے گاڑی بھی رہائشی علاقے کی طرف موڑلی تھی، جہاں کوئی اچھا ریسٹورنٹ موجود نہیں تھا۔ جو تھے وہاں کا ماحول کچھ زیادہ آزاد تھا یا شہوز کے بجٹ کی حدود میں نہیں آتے تھے۔

"لنچ میں کیا کھایا تھا تم نے؟" اسے زارا کی خاموشی سے شرمندگی بھی ہورہی تھی، مگر اس پر ظاہر کیے بنا وہ عام سے لہجے میں پوچھنے لگا۔ زارا نے منہ پھلا کر گہرا سانس بھرا، پھر اس کی جانب دیکھ کر اسی کے انداز میں بولی۔

"لنچ نہیں کیا میں نے۔"

شہوز کے دل کو واقعی کچھ ہوا۔ ساڑھے آٹھ ہورہے تھے۔ وہ جانتا تھا۔ زارا ناشتا کرنے کی عادی نہیں ہے۔ اگر اس نے لنچ نہیں کیا تھا تو واقعی وہ چوہوں کی تدفین کے احترام میں خاموش تھی۔ شہوز کا ارادہ تھا وہ گھوم پھر کر نو بجے کے قریب ڈنر کے لیے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں چلے جائیں گے، پھر کسی آئس کریم پارلر سے اسے آئس کریم کھلوا کر وہ اسے گھر ڈراپ کردے گا۔ تب ہی اس نے زیادہ پروا نہیں کی تھی۔ زارا کے ایک، دو بار ٹوکنے پر وہ ریسٹورنٹ کے سامنے رکا ضرور تھا، مگر پارکنگ کے پرابلم کا بہانا بنا کر آگے نکل آیا۔ وہ عمر کے متعلق اپنی ساری بھڑاس نکالنا چاہتا تھا جو ڈرائیونگ کے دوران ہی ممکن تھا۔

شرمندگی کی وجہ سے وہ کچھ لمحے خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

"میرا خیال ہے مجھے اعتراف کرلینا چاہیے کہ میں شرمندہ ہوں۔" وہ زارا کی بیزاری و خفگی کا لیول کم کرنے کے لیے بولا۔ اس نے شہوز کی بات پر سر ہلایا، پھر جبڑے باچھوں تک چیر کر مصنوعی انداز میں مسکرائی اور دوبارہ لمحہ بھر بعد ہی ہونٹوں کو سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا دیا۔

"میرا یقین کرو یار! میں نے آج تک یہ بات کسی لڑکی کے سامنے نہیں کی۔"

زارا نے منہ بنا کر اس کی جانب دیکھا۔

"مشکل ہے، مگر کرلیتی ہوں یقین۔۔۔ خوش؟ اب پلیز، مجھے کسی ٹھیک اڈے سے کچھ کھانے کو لے دو، چاہے ایک سینڈوچ اور ایک کولڈ ڈرنک۔۔۔ میں بھوک سے نہیں مرنا چاہتی شہوز۔"

زارا کے لہجے میں اب بے بسی تھی۔ وہ زچ ہوچکی تھی۔ شہوز نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔ یہ وہی زارا تھی جسے وہ اتنا ستایا کرتا تھا کہ وہ رونے والی ہوجاتی تھی اور اب جب سے ان دونوں کے درمیان رشتے کی نوعیت بدلی تھی تو اس کو ستا کر بھی دل کو کچھ ہوتا تھا۔ اس کی جانب دیکھتے ہوئے شہوز نے ذرا سا رخ موڑ کر جینز کی پاکٹ سے ایک فل سائز چاکلیٹ نکال کر اسے تھما دی۔

"عبیرہ کے لیے لی تھی۔۔۔ گزارہ کرو جب تک میں ڈھونڈتا ہوں کوئی اچھی جگہ۔" وہ محبت سے بولا۔ زارا نے پھر فوراً چاکلیٹ پکڑلی۔ ایک جانب سے ریپر پھاڑ کر اس نے پہلے شہوز کی جانب بڑھائی۔ شہوز نے مسکراتے ہوئے ایک بائٹ لے لیا تھا۔ اس کے بعد وہ خود کھانے لگی۔ اس کی بھوک ختم نہیں ہوئی تھی۔ مگر بیزاری ختم ہوگئی تھی۔ شہوز کو اتنا کیئرنگ دیکھ کر اس کی اکتاہٹ بالکل ختم ہوگئی تھی۔

"تھینک یو۔" چاکلیٹ ختم کرکے وہ مسکراتے

ہوئے بولی۔

"ہو آر آل ویز ویلکم۔" شہوز نے سر جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

"اب فٹافٹ عمر کے متعلق جو کہنا ہے 'فوراً' کہہ ڈالو۔ ڈنر کے دوران مجھے بور مت کرنا۔"

زارا چاہتی تھی کہ وہ اپنی بات گاڑی میں ہی مکمل کرلے۔ وہ پہلے بھی شہوز اور عمر کے جھگڑوں میں ثالث کا کردار کرتی آئی تھی۔

"مجھے اب اس کے متعلق مزید کچھ نہیں کہنا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس سے بات ہی نہیں کرنی اب۔۔۔ وی آر نو مور ناؤ۔"

اس کا انداز حتمی تھا۔ زارا کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہر جھگڑے کے بعد شہوز ایسا بیان ضرور جاری کرتا تھا۔

"شہوز! یہ بات تم نے پہلے بھی کہی تھی۔۔۔ یاد ہے؟ جب عمر نے اور تم نے ماموں کی گاڑی کا حشر خراب کردیا تھا اور عمر نے ماموں کے سامنے تمہارا نام لیتے ہوئے یہ ماننے سے انکار کردیا تھا کہ جب گاڑی ٹکرائی تو وہ بھی تمہارے ساتھ تھا اور ہاں تب جب اس نے تمہارے کلاس فیلو کو گھر ڈنر پر انوائیٹ کرلیا تھا اور تمہیں اپنی پوری پاکٹ منی مائی جی کو دینی پڑی تھی' تاکہ وہ تمہاری شکایت ماموں سے نہ کریں۔" اس کے جتاتے ہوئے انداز نے شہوز کو مسکرانے پر مجبور کردیا۔

"واقعی یار۔۔۔ شکر ہے تم نے مجھے یہ سب یاد دلا دیا۔ یہ عمر شروع سے ہی خبیث ہے۔" وہ ڈھیٹ بنا کہہ رہا تھا۔

"اب بتا بھی چکو عمر نے کیا کردیا ہے۔" وہ زچ ہو کر بولی۔

"پوچھ تو ایسے رہی ہو جیسے حکیم لقمان کی شاگرد ہو۔۔۔ ساری بات سن کر فوراً مسئلہ حل کردو گی۔۔۔ ہو تو اس کی کزن۔۔۔ اسی کی طرح ڈفر۔ ساری بات سن کر اسی کی حمایت کرو گی۔"

وہ بے وجہ اس پر برس پڑا۔ زارا نے حیرانی سے اسے دیکھا' پھر بجھے دل سے باہر دیکھنے لگی۔ "ڈفر" تو اس کا نک نیم تھا جیسے۔

"اچھا اب رونا نہ شروع کردینا۔ سنو اپنے عمر کے کارنامے۔ پتا ہے کیا ہوا۔" زارا کی پروا کیے بغیر اس نے بتانا شروع کیا تھا۔ وہ پہلے تو منہ بگاڑ کر بیٹھی رہی' پھر اس نے آہستہ آہستہ دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ عمر کی یہ حرکت اس کی پرانی بدتمیزیوں اور شرارتوں کے مقابلے میں صفر تھی' مگر چونکہ یہ معاملہ سنجیدہ نوعیت کا تھا' اسی لیے شہوز زیادہ ہی ری ایکٹ کررہا تھا۔

"میری طرف سے بھاڑ میں جائے پرنس عمر۔" سب کچھ کہہ لینے کے بعد شہوز نے اپنا فیصلہ بھی سنادیا تھا۔

"تم اسے لے کر سر آفاق کے گھر گئے ہی کیوں تھے؟" زارا کو سب سے پہلا اعتراض اس بات پر ہوا تھا۔

"سر کے گھر سر سے ملوانے کے لیے گیا تھا اس کو۔" شہوز اکتا کر بولا۔

"مگر کیوں؟" زارا نے پوچھا' شہوز مزید چڑ گیا۔

"اوہ! میری ٹیوب لائٹ' تم واقعی ٹیوب لائٹ ہو۔ جس طرح ٹیوب لائٹ آن ہونے سے پہلے کچھ سیکنڈ بلنک کرتی ہے' اسی طرح تم بھی پہلے بلنک کرتی ہو' پھر بات سمجھتی ہو۔"

اپنی بات مکمل کرکے اس نے زارا کی طرف دیکھا' پھر لہجہ نرم کرکے بولا۔

"سر سے ملوانے لے کر گیا تھا' تاکہ عمر اور امائمہ کے رشتے کی بات چلائی جاسکے۔"

زارا کچھ نہیں بولی۔ اس نے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا۔ شہوز کچھ لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا' پھر اس کے کندھے پر دستک دینے والے انداز میں انگلی بجا کر بولا۔

"رو رہی ہو؟"

"جی نہیں۔۔۔ میں برسات ہوں کیا جو بلاوجہ برستی رہوں۔" وہ تنک کر بولی۔ شہوز نے قہقہہ لگایا۔

"اوئے ساشے پیک۔۔۔ بڑے مزے کی مثال دی ہے۔ ذہین ہوتی جارہی ہو' چلو اب میں تمہیں ٹیوب لائٹ کہنا چھوڑ دوں گا۔" زارا خاموشی سے باہر دیکھتی رہی۔

"زارا۔۔۔ یار۔۔۔ اوکے۔ آئی ایم سوری۔" وہ شرمندہ نہیں تھا' مگر اس کی خاموشی سے اکتا رہا تھا۔

"مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم عمر کے اس پرسنل معاملے میں خود کو کیوں انوالو کررہے ہو۔ ابھی تو یہ بھی کنفرم نہیں ہے کہ وہ سیریس بھی ہے یا نہیں۔ تم جانتے ہو' وہ بہت بار اپنی اسٹیٹمنٹ سے مکر بھی جاتا ہے۔ میرا مشورہ ہے شہوز اس معاملے کو ویسے ہی ہینڈل کرو جیسے کہ کرنا چاہیے۔" زارا اسے سمجھا رہی تھی۔

"اس کی بھی وضاحت کردو کہ یہ معاملہ کس طرح ہینڈل کرنا چاہیے۔"

شہوز کا انداز کسی قدر طنزیہ تھا۔

"تمہارا کنسرن یہاں تک تھا کہ وہ امائمہ میں انٹرسٹڈ ہے یا نہیں۔۔۔ اس کے بعد یہ اس کا اور اس کے پیرنٹس کا معاملہ ہے۔ اسے چاہیے' وہ اپنی پسندیدگی اپنے پیرنٹس کو بتائے' تاکہ بزرگ انوالو ہوں اور بات آگے بڑھے۔ تم عمر سے کہو کہ وہ احسان ماموں کو یہ سب بتائے۔ اس کے بعد ہماں۔۔۔"

"میں اسے کچھ بھی مشورہ نہیں دینے والا۔ وہ اپنے مسائل خود حل کرتا پھرے۔"

شہوز نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اوکے۔۔۔ یہ مشورہ میں اسے دے دوں گی اور پلیز تم اس ٹاپک کو یہیں ختم کردو۔ میں بہت بور ہوگئی ہوں۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ شہوز کچھ نہیں بولا' مگر وہ کچھ سوچ ضرور رہا تھا۔

"ٹیوب لائٹ" نے بات تو کرکی بتائی تھی۔ یہ مسئلہ واقعی بڑوں کا حل کرنے والا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے اس نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے باہر روک لی تھی۔

☼ ☼ ☼
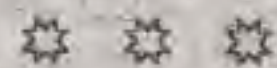
"شہوز۔۔۔"

کچن میں داخل ہوتے ہی ممی نے اسے کچھ اس انداز میں پکارا کہ وہ پریشان سا ہوگیا۔ فریج کی جانب پانی کی بوتل نکالنے کے لیے بڑھایا گیا ہاتھ بھی دروازے کے ہینڈل پر جم سا گیا۔ ممی ہفتہ بھر کی سبزیاں ٹیبل پر سجائے انہیں فریج میں محفوظ کرنے کے لیے چھوٹی ٹوکریوں اور تھیلیوں میں منتقل کررہی تھیں۔ مٹر کے دانے نکال کر ایک ایئر ٹائٹ باکس میں رکھے ہوئے تھے۔ لہسن کے چھلے ہوئے جوئے ایک الگ پیکٹ میں پڑے تھے۔ ادرک' ہری مرچ وغیرہ چھوٹی ٹوکری میں سالم و ثابت پڑے تھے۔ شہوز نے کن اکھیوں سے سب دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ اتوار کو وہ ممی سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ آج بھی ناشتے کے بعد سے وہ انٹرنیٹ پر مصروف تھا۔ عمر اور اس کے درمیان سرد جنگ چل رہی تھی۔ عمر رات سے اپنی ممی کی کزن یعنی اپنی خالہ کے گھر گیا ہوا تھا اور شہوز کی معلومات کے مطابق وہ تاحال واپس نہیں آیا تھا۔

"یس ممی۔۔۔" لاڈ سے انہیں پکارتے ہوئے وہ دوبارہ فریج سے پانی نکالنے لگا۔

"ادھر آؤ ذرا۔۔۔ وہیں جم کر کھڑے ہوگئے ہو۔" وہ گھور کر بولیں۔ شہوز کچھ سوچتے ہوئے ان کی جانب آگیا۔ ممی کچھ ناراض لگ رہی تھیں۔

ہفتہ بھر کی تازہ رنگ برنگی سبزیاں ٹیبل پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ہفتہ بھر کی سبزیاں لاکر اسی طرح فریج میں محفوظ کرلیا کرتی تھیں اور اتوار کے روز مارکیٹ جانے کے لیے انہیں شہوز سے بہتر ڈرائیور کوئی نہیں لگتا تھا۔ شہوز کو ڈرائیور بننے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ڈیڈی اور بھائی لوگوں کو ہفتہ بھر مصروف رہنے کے بعد اتوار کا دن ہی آرام کرنے کے لیے میسر ہوتا تھا' سو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے وہ ممی کا ڈرائیور بخوشی بن جاتا تھا' لیکن اتوار بازار سبزی لینے جانے کے لیے علی الصبح اٹھنا اسے سخت ناپسند تھا۔ جبکہ ممی کا کہنا تھا کہ وہاں سے سبزی تازہ اور سستی ملتی ہے۔ سو ہر پندرہ بیس دن بعد اس ایک معاملے میں ممی اس کی کلاس لیا کرتی تھیں۔ وہ خاندان بھر میں اپنی اسی سلیقہ شعاری

کی وجہ سے پہچانی جاتی تھیں۔ بہوؤں کی موجودگی اور ملازم کی سہولت کے باوجود وہ اپنے کچن کے بیشتر کام خود کرتی تھیں یا اپنی نگرانی میں کروانا پسند کرتی تھیں۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا' لیکن شہروز کو تب زیادہ چڑ ہوتی جب ممی اسے لہسن چھیلنے' مٹر کے دانے نکالنے اور ٹماٹر دھونے جیسے کاموں پر لگا دیا کرتی تھیں۔ کچن کے اوپر کے کاموں کے لیے ایک کل وقتی ملازم تھا' جب کبھی وہ چھٹی پر چلا جاتا تو ممی کو شہروز سے بہتر ہیلپر کوئی نہیں لگتا تھا۔ انہیں خود کو اور دوسروں کو مصروف رکھنے کا خبط تھا اور شہروز چونکہ ابھی آفس نہیں جاتا تھا' سو وہ انہیں سب سے زیادہ فارغ اور نکما نظر آتا تھا۔

"ارے آپ نے یہ سب خود ہی کرلیا۔ مجھے آواز دے لیتیں آپ۔ میں فارغ ہی تھا۔" وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"ہاں' مجھے پتا ہے' تم میرے کتنے فرماں بردار بیٹے ہو۔ صبح سے کمرے میں گھسے بیٹھے ہو' اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ آکر یہی پوچھ لو گوشت وغیرہ تو نہیں لانا۔ یہ یاد رہتا ہے کہ اتوار ہے بریانی ہی کھانی ہے۔ یہ کبھی یاد نہیں رہتا کہ گوشت بھی لاکر دینا ہے۔ چکن کا ریٹ پھر بڑھ گیا ہے۔"

وہ اسے ڈانٹنے کے ساتھ جتا بھی رہی تھیں۔

"میرے ذہن سے نکل گیا ممی۔ اچھا پرامس' نیکسٹ سنڈے میں جلدی اٹھوں گا اور آپ کی ساری شکایتیں دور کردوں گا۔ کیسا؟"

ٹوکری میں پڑا ٹماٹر اٹھا کر اپنے ٹراؤزر سے رگڑتے ہوئے وہ انہیں مسکہ لگا رہا تھا۔

"رہنے دو۔ کوئی ضرورت نہیں اس مہربانی کی۔ کہہ دیا ہے میں نے تمہارے ڈیڈی سے گھر کے لیے ایک ڈرائیور رکھ دیں۔ بہت پریشانی ہوتی ہے' ہمیں۔ مارکیٹ جانا ہے تو شہروز صاحب کی منت کرو' کسی کے گھر تعزیت کے لیے جانا ہے یا مبارک سلامت کرنی ہے تو پہلے شہروز صاحب کو عرضی دو۔ وہ "ہاں" کہیں گے تو ہم جا پائیں گے' ورنہ۔ ارے اتنے نخرے تو میں نے کبھی تمہارے ڈیڈی کے نہیں سہے' مہروز' بہروز بھی تو ہیں' کیسے میرے دل کی بات جان لیتے ہیں۔"

شہروز خجالت بھری ہنسی ہنسا۔ ممی سچ کہہ رہی تھیں۔

"اتنا غصہ کیوں آرہا ہے آپ کو۔ ڈیڈی سے جھگڑا تو نہیں ہوگیا۔ ان کا غصہ مجھ پر کیوں اتار رہی ہیں؟" ان کے کندھے کو اپنے کندھے سے ٹہوکا دیتے ہوئے وہ لاڈ سے بولا۔

"وہ بے چارے کہاں جھگڑتے ہیں کسی سے۔ ان کے مزاج کی نرمی نے ہی تو بگاڑا ہوا ہے تمہیں۔" وہ واقعی آج کچھ زیادہ خفا تھیں۔

"سبحان اللہ' سبحان اللہ۔ ڈیڈی اور نرم مزاج۔ آپ نے شاید تب انہیں نہیں دیکھا جب وہ مجھے ڈانٹ رہے ہوتے ہیں۔ آپ تو خیر ان کی فیور ہی کریں گی ممی۔ آپ کے مجازی خدا ہیں بھئی۔"

ٹماٹر کترتے ہوئے وہ سابقہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"زیادہ بک بک مت کرو۔ ذرا سنجیدہ ہوجاؤ۔ شام تک وہ کلاس لینے والے ہیں تمہاری۔" انہوں نے اسے ٹوکا تھا۔

"کون؟ ڈیڈی؟" وہ چونکا۔ اس کے ارد گرد الارم بجنے لگے تھے۔ ممی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیوں ممی۔ میں نے کیا' کیا ہے؟" وہ پریشان ہوکر پوچھنے لگا۔ ممی اور بھائیوں کی بازپرس سے ڈر نہیں لگتا تھا' لیکن ڈیڈی کی ذرا سی جواب طلبی اسے ڈرا دیتی تھی۔ وہ ڈانٹتے زیادہ نہیں تھے' لیکن سزائیں ایسی دیتے تھے کہ کئی دن وہ جلتا کلستا رہتا تھا۔ کبھی پاکٹ منی بند' کبھی حکم صادر کردیتے کہ گاڑی کو چھونا بھی مت۔

"بتائیں نا ممی۔ میں نے کیا' کیا ہے۔ بہروز بھائی نے شکایت لگائی ہے؟ یا۔ آپ نے کہا ہوگا ان سے کچھ۔"

وہ ان کے ہاتھ کو پکڑ کر لجاجت سے بولا تھا۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے سوچ رہا تھا کہ گزشتہ دنوں اس نے کون سی حرکت کی ہے' جو ڈیڈی کے نوٹس میں آگئی ہے۔

"مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ خود سوچو۔ یقیناً کوئی شرارت کی ہوگی تم نے جو تمہارے ڈیڈی خفا ہیں تم سے۔"

اس کے پریشان ہوجانے پر ممی کچھ مطمئن سی لگنے لگی تھیں۔ دل ہی دل میں انہیں خوشی ہوئی تھی کہ جوان بیٹا' باپ کا فرماں بردار ہے۔

"لیں مجھے کیا پتا' وہ کیوں خفا ہیں۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ نے یا بھائی نے کی ہوگی شکایت۔" وہ منہ بسور کر حتمی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ چہرہ لٹک سا گیا تھا۔ ممی کو ہنسی آگئی۔

"یہ عمر اور امائمہ کا کیا سلسلہ ہے؟" انہوں نے ہنسی دبا کر ہلکی آواز' مگر سخت لہجے میں پوچھا۔ شہروز کو جھٹکا سا لگا۔

"ت۔ ڈیڈی نے یہ پوچھا ہے۔ انہیں کیسے پتا چلا؟" وہ یکدم مزید پریشان ہوگیا۔ بات ہی ایسی تھی۔

"عمر نے خود بتایا ہے۔" ممی کے لہجے میں واضح اطمینان تھا۔ شہروز ان کی آنکھوں میں چھپی شرارت پڑھ نہیں پایا تھا۔

"کس کو۔ ڈیڈی کو؟" شہروز کی پریشانی اب خفگی میں ڈھل رہی تھی۔

بہت ہی بدتمیز انسان ہے عمر۔ اسے سبق سکھانا ہی پڑے گا۔" ممی کو خاموش پاکر وہ خود ہی اپنا غصہ نکالنے لگا۔

"اسے تم بعد میں سبق سکھانا۔ پہلے مجھے بتاؤ اصل معاملہ کیا ہے۔ یاد رکھنا! اگر کچھ بھی جھوٹ بولا تو میں ڈیڈی کو سب کچھ بتادوں گی۔"

اس کا کان مروڑتے ہوئے وہ گھرک رہی تھیں۔ شہروز مشکوک ہوا۔

"اس کا مطلب ہے ابھی ڈیڈی کو نہیں پتا۔ ہے نا۔ آپ ڈرا رہی ہیں مجھے۔" وہ ناراض ہوا تھا اور عمر پر بے پناہ غصہ بھی آرہا تھا۔

"میں تمہیں ڈرا' یا دھمکا نہیں رہی بلکہ کچھ پوچھ رہی ہوں اور اگر تم نے مجھے سب سچ سچ نہ بتایا تو میں تمہیں جوتے بھی لگاؤں گی۔" امی کا سارا دھیان سبزیوں سے ہٹ کر اس کی جانب منتقل ہوچکا تھا۔

"تم سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ تمہاری کلاس فیلو ہے۔ تم نے کوئی اچھائی' کوئی خوبی تو دیکھی ہوگی جو عمر کے لیے اس کا نام لیا ہے۔"

وہ خود ہی سوال کررہی تھیں اور خود ہی جواب دیتی جارہی تھیں۔ ان کے ہاتھ تو اچھی مصروفیت لگنے والی تھی جبکہ شہروز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عمر کی مرمت کردے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح سارا مدعا شہروز پر ڈال دیا تھا۔

"عمر واپس کب آئے گا؟" اس کے لہجے میں ابھی بھی خفگی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ عمر اس طرح سب کچھ اس کی ممی یعنی اپنی تائی جان کو بتا سکتا ہے۔

"وہ تو کب سے ڈرائنگ روم کا اے سی آن کرکے سویا ہوا ہے۔ میں نے کہا بھی کہ اس موسم میں بھلا اے سی کی کیا ضرورت۔ بولا لندن کی یاد تازہ کرنی ہے۔"

انہوں نے تسلی سے جواب دیا۔ شہروز کھولتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ڈرائنگ روم کے انتہائی خنک ماحول میں کھڑا عمر کو کشنز سے پیٹ رہا تھا۔

"سوری یار۔ آئی ایم سوری۔ کہہ تو رہا ہوں سوری۔"

عمر ایک ہی گردان کیے جارہا تھا۔ شہروز نے جی بھر کر اپنی بھڑاس نکالی تھی اس پر۔ اور پندرہ بیس منٹ بعد وہ دونوں کارپٹ پر آڑے ترچھے لیٹے قہقہے لگا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یہ تو اس صدی کا معجزہ ہوگیا۔ ناقابل یقین اور حیران کن۔" شہروز نے آڑو میں دانت گاڑتے ہوئے با آواز بلند تبصرہ کیا تھا تاکہ عمر جو اس کے عقب میں صوفے پر چت لیٹا آنکھوں کو کشن سے ڈھکے' دونوں

پاؤں کے انگوٹھوں کو دائیں بائیں ہلانے میں مصروف تھا' بخوبی سن سکے۔

"تم نے منہ کے بجائے ناک سے کھانا شروع کر دیا ہے۔" عمر کے بجائے زارا نے جواب دیا جو سامنے سنگل کاؤچ پر دونوں ٹانگیں اوپر چڑھائے گود میں آڑو والی باسکٹ رکھے کب سے اپنی پسند کا آڑو تلاش کر رہی تھی۔

"یہ پہلے بھی منہ سے نہیں کھاتا۔ اچھا۔" عمر نے آنکھوں پر سے لمحہ بھر کے لیے کشن ہٹا کر زارا کو جتایا تھا۔ زارا نے حیرانی سے کشن کو دیکھا' جس کے نیچے عمر تھا۔

"تو پھر؟" وہ پوچھے بنا رہ نہ سکی۔

"آف کورس... دانتوں سے کھاتا ہے۔" یہ جواب سر سے کشن ہٹائے بغیر دیا گیا تھا۔

"تو نہہ۔ بے کار جوک۔" زارا کو اپنی پسند کا آڑو مل گیا تھا۔

"ہوتا پھر ٹیوب لائٹ۔" شہروز نے اسے چڑانا چاہا۔

"مجھے اپنی خوبیوں پر فخر ہے۔" زارا نے کندھے اچکائے تھے۔ وہ کوشش کرتی تھی' ان کی باتوں سے خار نہ کھائے۔

"اچھا آ آ آ۔" عمر یکدم حیران ہوتے ہوئے اٹھ بیٹھا' پھر زمین پر بیٹھے شہروز کا کندھا پکڑ کر کہنے لگا۔

"یہ تو واقعی معجزہ ہو گیا۔ ناقابل یقین اور حیران کن... زارا بی بی کو اب فخر ہونے لگا ہے اپنی خوبیوں پر... واہ بھئی واہ۔ سن کر خوشی ہو رہی ہے۔"

"دھیان سے بھائی... اس خوشی میں میرا کندھا نہ توڑ دینا۔" شہروز نے اسے پیچھے دھکیلا۔

"نہیں ٹوٹتا تیرا کندھا... اور بالفرض ٹوٹ گیا تو ڈاکٹر صاحبہ بیٹھی ہیں نا... ان کا ہنر آزمائیں گے تیرے کندھے پر۔"

"سوچ لو ٹوٹے کندھے کے ساتھ تمہاری منگنی پر بھنگڑا ڈالتا کیسا لگوں گا۔" شہروز تیسرا آڑو ختم کرتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"ارے ہاں... یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا... چلو معاف کیا۔" وہ سیدھا ہو گیا۔

"شہروز! کہیں تم امائمہ اور عمر کی انگیجمنٹ کو تو اس صدی کا معجزہ قرار نہیں دے رہے؟"

زارا نے یکدم پوچھا جیسے ساری بات اب سمجھ میں آئی ہو۔ شہروز اور عمر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' پھر وہ زور سے ہنسے تھے۔

"زارا! وہ کیا ہے؟" عمر نے لاؤنج میں روشن ٹیوب لائٹ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹیوب لائٹ۔" وہ ترنت بولی' پھر پچھتائی۔

"وہی تو میں کہہ رہا تھا۔ ٹیوب لائٹ۔" وہ دونوں پھر ایک بار ہنسنے لگے۔ زارا نے ناک چڑھائی۔

"میری فکر چھوڑو اور اپنے بارے میں سوچو۔ میں تو ابھی تک شاک میں ہوں کہ سر آفاق نے ہاں کیسے کہہ دی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ آنٹی جو مرضی کہیں' مگر سر آفاق تمہیں کبھی امائمہ کے لیے پسند نہیں کریں گے۔" وہ ساتھ ساتھ آڑو بھی کتر رہی تھی۔

"کیوں جی... امائمہ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جو مجھے ناپسند کرتے۔ ان فیکٹ' وہ تو شکر ادا کر رہے ہوں گے کہ اتنا اچھا داماد مل رہا ہے انہیں۔" عمر نے فخر سے گردن اکڑائی۔

"اچھا تو داماد صاحب! ذرا ڈرائنگ روم میں جا کر چیک کریں کہ بزرگوں کی میٹنگ ختم ہوئی کہ نہیں۔ کوئی مٹھائی شٹھائی کھلانے کا پلان ہے کہ نہیں۔"

شہروز بلاوجہ کی بحث سے سب سے پہلے اکتایا تھا۔ وہ سب لوگ اپنی مصروفیت چھوڑ کر اکٹھے ہی اس لیے ہوئے تھے۔ امائمہ کی امی نے شہروز کی ممی کو فون پر بتایا تھا کہ انہیں یہ رشتہ قبول ہے۔

"میں نہیں جا رہا... ابو کا فون آیا ہوا ہے... وہ فون بند کریں گے تو میں جاؤں گا۔"

عمر دوبارہ لیٹ گیا۔ اس کے والدین کو پہلے ہی خوشخبری دی جا چکی تھی۔ اب وہ بھی فون کے ذریعے شامل تھے۔

"تمہیں شرم آ رہی ہے عمر؟" زارا نے حیرانی سے پوچھا تھا۔ عمر نے پہلے تو اسے کھا جانے والی نظروں

سے گھورا پھر دوبارہ چپ چاپ ٹیوب لائٹ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بے چاری چپ ہو گئی۔

"چاچو سے بات نہیں کرنا چاہتے تم؟" شہروز پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" عمر کے انداز میں اکتاہٹ نمایاں تھی۔

"کیوں؟" شہروز نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ عمر گہری سانس بھر کے کچھ کہنے لگا مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔ وہ غائب دماغی کی سی کیفیت میں تھا۔

☆ ☆ ☆

"ایلی فینٹ۔"

اس بچے کے سامنے ایک بار پھر دہرایا گیا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی پنسل کو انگلیوں کے درمیان ذرا سا گھمایا، پھر رائٹنگ پیڈ پر جھک گیا۔ اس سے پہلے وہ چھ لفظ لکھ چکا تھا۔ ساتواں لفظ ایلی فینٹ تھا، جس پر وہ اٹک گیا تھا۔ اسے یاد تھا وہ یہ لفظ پڑھ چکا ہے۔ وہ کچھ لمحے اسی طرح رائٹنگ پیڈ کی طرف دیکھتا رہا، پھر اس نے میز کے دوسری جانب بیٹھے شخص کی طرف دیکھا تھا جو اسے یہ الفاظ لکھوا رہا تھا۔ وہ شخص بھی اس بچے کی جانب متوجہ تھا۔ اس کی نگاہوں میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ کنفیوز ہو کر دوبارہ رائٹنگ پیڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی لکھائی بے حد واضح اور خوب صورت تھی۔ وہ اس شخص کا کہا ہوا ہر نیا لفظ لکھتے وقت پہلے نمبر لکھتا تھا، پھر اس کے آگے لفظ لکھتا تھا۔ ساتواں ہندسہ لکھنے کے لیے اس نے سات کا ہندسہ پہلے ہی لکھ لیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ سامنے بیٹھا شخص منتظر نگاہوں سے اسے بغور دیکھ رہا ہے۔ اس کی نظروں سے خائف ہو کر اس نے ڈھیلے ہاتھوں سے رائٹنگ پیڈ پر سات کے ہندسے کے آگے لیٹر "ای" لکھ دیا تھا، مگر اس کے بعد وہ ایک بار پھر پنسل کو انگلیوں میں گھمانے لگا۔ وہ اگلا لیٹر لکھنے کے متعلق قطعاً "پر یقین" نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا اور پہلے کی طرح خائف ہو کر نظریں جھکا لیں۔ اب کی بار اسے شرمندگی بھی ہوئی تھی۔ اسی شرمندگی کی وجہ سے اس نے ای کے بعد پی لکھ دیا تھا۔ سامنے بیٹھے شخص کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے اپنے اندازوں کے مصدق ہو جانے کی خوشی ہوئی تھی۔ وہ ابھی پوری طرح سے مسکرا بھی نہ پایا تھا کہ اسے بچے نے پنسل کے دوسرے حصے کو اس حرف پر رگڑنا شروع کر دیا۔ وہ لیٹر پی کو مٹا رہا تھا۔

"سوری... مجھے یہ یاد نہیں آرہا۔" پی کو مٹا دینے کے بعد اس نے رائٹنگ پیڈ سے نظریں اٹھائے بغیر گلوگیر لہجے میں کہا۔ وہ شخص اب کھل کر مسکرایا۔

"نو پرابلم... ایک ورڈ کے نہ آنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔" اس شخص نے مسکراہٹ چھپا کر تسلی دی۔ اس بچے کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"آپ نیکسٹ ورڈ لکھو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ون کلاس کی انگلش کی کتاب کے صفحوں کو الٹ پلٹ کیا۔ اس بچے نے نظریں اٹھائی تھیں نہ ہاتھ میں پکڑی پنسل۔ وہ اگلا لفظ لکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس بچے کے چہرے کے تاثرات نے اس شخص کو مزید مسکانے پر مجبور کیا، اس نے اتنے چھوٹے بچے کو کبھی اتنا شرمندہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ذرا جھک کر بچے کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ وہ پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ چند لمحوں بعد اس نے اسی پانی کو بہتے دیکھا۔ اس نے متعجب ہو کر ہاتھ میں پکڑی کتاب کو بند کر کے میز پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ کو کیا چیز پریشان کر رہی ہے؟" اس نے بے حد نرم لہجے میں سوال کیا۔ بچہ کچھ بھی نہیں بولا۔

"آپ مجھے نہیں بتاؤ گے کہ آپ کیوں رو رہے ہو تو مجھے کیسے پتا چلے گا؟" اس نے پھر پوچھا۔ بچہ اب کی بار خاموش نہیں رہا تھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے؟" بچے نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا، پھر بولا۔

"نہیں... آپ تو اچھے لگے ہیں مجھے۔" وہ شخص

پھر مسکرایا۔

"واقعی... ؟ مجھ میں کیا اچھا لگا آپ کو؟" اس کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ بچے کو حوصلہ دے رہی تھی۔ وہ اب رو نہیں رہا تھا۔

"آپ ڈانٹنے والے نہیں ہیں... اس لیے اچھے لگے مجھے۔"

"جب کوئی غلط کام کرے تو ڈانٹنے والا بھی بن جاتا ہوں... اتنا اچھا نہیں ہوں میں۔"

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بات کر رہا تھا جیسے اس وقت اس بچے سے بات کرنا ہی اس کے لیے سب سے ضروری کام ہو۔

"مجھے نہیں ڈانٹا آپ نے۔" اس نے جتایا۔

"ویل... آپ نے کوئی غلط کام بھی تو نہیں کیا۔"

"کیا ہے... میں نے ایلی فینٹ کی اسپیلنگز نہیں لکھی۔" اس بچے کی آواز ایک بار پھر دھیمی ہوئی۔ اس شخص نے قہقہہ لگانے میں تحمل سے کام نہیں لیا تھا۔

"یہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ آپ نے سکس ورڈز کے اسپیلنگز بالکل ٹھیک لکھے ہیں۔ میں اس کی بھی توقع نہیں کر رہا تھا۔ میں جب آپ جتنا تھا تو میں ایک ورڈ بھی صحیح نہیں لکھ پاتا تھا۔"

اس کی بات پر بچے نے حیرانی سے اسے دیکھا، پھر حیرانی کی جگہ تاسف نے لے لی۔

"آپ کے ابو آپ کو بہت ڈانٹتے ہوں گے نا؟" وہ بہت معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"بالکل بھی نہیں۔" اس شخص نے فوراً کہا۔ پھر مزید بولا۔

"وہ خود بھی میرے جیسے تھے۔ ہم سب بڑے جب چھوٹے ہوتے ہیں تو ہمیں اسپیلنگز لکھنے میں دشواری ہوتی ہے جیسے آپ کو ہوئی ہے، لیکن پھر جب ہم دل لگا کر پڑھتے ہیں تو ہر دشواری... دور ہو جاتی ہے۔ اگر آپ اس لیے پریشان ہو کہ آپ کو اسپیلنگز نہیں آتی تو آپ بے فکر ہو جاؤ۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ تو اتنے ذہین ہو کہ آپ نے ایک لفظ کی اسپیلنگز نہیں لکھی، مگر باقی چھ فوراً لکھ لی تھیں... ہے نا؟"

وہ سمجھانے کے ساتھ ساتھ استفسار بھی کر رہا تھا۔

"غلطی، غلطی ہوتی ہے۔ ابو کہتے ہیں ایک غلطی معاف کر دو تو بچے بار بار غلطیاں کرتے ہیں۔ ابو کو بار بار غلطیاں کرنے والے بچے اچھے نہیں لگتے۔ میرے ابو کو کبھی اسپیلنگز نہیں بھولتی۔ وہ مجھے ڈکٹیشن کرواتے وقت آپ کی طرح بک سے ورڈز نہیں دیکھتے، انہیں سب ورڈز زبانی یاد ہیں۔"

وہ اس کو جھٹلا کر بولا تھا۔ وہ شخص متاثر ہو کر مسکرا دیا تھا۔ اس کا واسطہ ہر روز بہت سے بچوں سے پڑتا تھا، لیکن اتنی ذہانت سے بھرپور باتیں کرنے والے بچے اس نے کم ہی دیکھے تھے۔ وہ فقط تین سال کا تھا، لیکن اس کی باتیں پانچ سال کے بچے جیسی تھیں۔

"ابو کہتے ہیں غلطی کی کوئی معافی نہیں ہوتی۔ غلطیاں کرنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اگر میں غلطیاں کروں گا تو میں پیچھے رہ جاؤں گا، پھر میں ڈاکٹر نہیں بن پاؤں گا۔"

"آپ ڈاکٹر بننا چاہتے ہو؟" وہ شخص صرف یہی سوال کر سکا۔

"جی..." اس بچے نے گردن بھی ہلائی تھی۔

"آپ کو ڈاکٹرز اچھے لگتے ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔

"مجھے ابو اچھے لگتے ہیں۔" وہ سادگی سے بولا تھا۔ پھر اپنے رائٹنگ پیڈ کی طرف دیکھ کر مزید کہنے لگا۔

"لیکن میں انہیں اچھا نہیں لگتا۔ مجھ سے غلطی ہو جاتی ہے نا... مجھے ایلی فینٹ کی اسپیلنگز بھول گئی۔"

وہ شخص ایک بار پھر بہت غور سے اس بچے کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بچے کو سمجھائے، لیکن وہ خاموش رہا۔ اس بچے کے ذہن میں موجود غلطی کا تصور اس شخص کے لفظوں سے زیادہ جامع تھا۔

"غلطی کی کوئی معافی نہیں ہوتی۔" اس کے گھر میں

یہ فقرہ اکثر دہرایا جاتا تھا۔ وہ غلطیاں کرنے کا عادی نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس کے ابو اسے یاد دلانا ضروری سمجھتے تھے۔

وہ اپنے ماں، باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور بچہ نہ تھا۔ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ تب ہی کھیل پاتا تھا۔ جب وہ گوجرانوالہ اپنے نانا ابو کے گھر جاتا تھا۔ اس کے گھر کے قرب و جوار میں جو گھر واقع تھے وہاں بھی بچے موجود تھے، لیکن اس کے ابو کو یہ قطعاً پسند نہیں تھا کہ وہ کھیل کود کے لیے باہر گلی محلے میں نکلے۔ اس لیے اس کی امی اسے باہر نہیں جانے دیتی تھیں۔ وہ گلی محلے میں کھیل کود کا شوقین بھی نہیں تھا، لیکن اسے یہ شوق ضرور تھا کہ اسے اپنے اردگرد اپنے علاوہ اور بچے بھی نظر آئیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اسکول جانے کے تصور سے ہی بہت خوش تھا۔

اس کو پڑھانے لکھانے کی ذمہ داری اس کے ابو کی تھی۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ فقط تین سال کی عمر میں اسے چھ کلمے، چھوٹی چھوٹی کئی سورتیں اور دعائیں یاد تھیں۔ وہ ابتدائی کلاس کی کتابیں بھی رٹ چکا تھا۔ پڑھائی کے دوران وہ اسے کوئی رعایت نہیں دیتے تھے۔ وہ پڑھائی سے گھبراتا نہیں تھا، لیکن کبھی کبھار بہت تھک جاتا تھا۔ تب بھی وہ کوشش کرتا تھا کہ ابو کو ناراض ہونے کا موقع نہ دے، لیکن تھکن میں اس سے غلطیاں ہو جایا کرتی تھیں۔ تب اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کتابیں اور کاپیاں ایک سائیڈ میں رکھ دے اور ابو کی گود میں لیٹ کر ان سے باتیں کرے، بالکل اس طرح جیسے وہ اپنی امی کی گود میں لیٹ کر ان سے باتیں کرتا تھا۔ اس کی امی اسے بالکل بھی نہیں ڈانٹتی تھیں، لیکن پھر بھی اسے ابو زیادہ اچھے لگتے تھے۔ اس نے سیکھ رکھا تھا کہ "غلطی کی کوئی معافی نہیں ہوتی" مگر اسکول میں پہلے ہی دن اس نے کیا سیکھا تھا۔

"غلطی درگزر بھی کی جاسکتی ہے۔"

اس کا ننھا سا ذہن یہ بات اتنی جلدی ہضم نہیں کرسکتا تھا۔ وہ یہ بات گھر پہنچنے تک بھول بھی گیا تھا۔ کیونکہ ابو کے ساتھ اسکول آفس سے نکلنے سے لے کر گھر پہنچنے تک اس کے ابو نے اسے اپلی فینٹ کی اسپیلنگز بھول جانے پر اتنی بار سرزنش کی تھی کہ اس کے ذہن سے نکل گیا تھا کہ۔۔۔ "غلطی درگزر بھی کی جاسکتی ہے۔"

"ایسا مت کریں پلیز۔"

اس نے آفس میں داخل ہوتے ہوئے سر شعیب کو کہتے سنا تھا۔ سر شعیب وہی شخص تھے جنہوں نے پہلے دن اس کا انٹرویو کیا تھا۔ اسے اسکول آتے ہوئے تقریباً "دو ہفتے ہو چلے تھے اور اس عرصے میں وہ نا صرف ٹیچرز کا بلکہ سب کلاس فیلوز کا پسندیدہ بچہ بن چکا تھا، مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ ابو کسی چیز سے مطمئن نہیں ہو رہے تھے۔ انہیں اس کی کتابیں پسند آئی تھیں نہ اس کے ٹیچرز کے پڑھانے کا طریقہ، اس کا ننھا ذہن سمجھ نہیں پایا تھا کہ اسکول میں ایسی کیا چیز ہے، جو ابو کے لیے غیر تسلی بخش ہے۔ انہوں نے امی کو بتایا تھا کہ وہ دو، تین بار اسکول فون کرکے بھی اس متعلق بات کرچکے ہیں۔ جہاں تک اس کی بات تھی وہ خود بے حد مطمئن تھا۔ اس کی کتابیں بہت آسان تھیں۔ وہ ہر روز سب سے پہلے سبق یاد کرکے سنا دیتا تھا۔ نوٹ بک پر لکھنے کے لیے جو کام دیا جاتا تھا، وہ بھی سب سے پہلے وہی مکمل کرکے ٹیچرز کو چیک کرواتا تھا، پھر ایسا کیا تھا کہ ابو مطمئن نہیں ہو پا رہے تھے۔ اسے جب آفس میں بلوایا گیا تو وہ بچوں کو نظمیں یاد کروا رہا تھا۔ آفس میں داخل ہونے کے بعد سر شعیب کو گڈ مارننگ کہنے تک اس کی نظر دوسری طرف پڑی کرسی پر نہیں پڑی تھی۔ وہ جب کمرے کے بالکل وسط میں پہنچا تھا تو اس نے ابو کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اسے انہیں وہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ ان کے پاس آ کھڑا ہو گیا تھا۔ تب ہی اس نے سر شعیب کو دوبارہ کہتے سنا۔

"ایسا مت کریں۔۔۔ پلیز۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر مزید بولے۔

"آپ جو کہہ رہے ہیں میں اسے جھٹلا نہیں رہا۔ بلاشبہ آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میں نے ہی آپ کے بچے کا ٹیسٹ لیا تھا۔ اس کا اسکور بہت شاندار تھا۔ میں جانتا ہوں آپ نے بچے پر محنت کی ہے، ظاہر ہوتا ہے اور یہ سب آپ کی محنت کی وجہ سے ہی ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ کی محنت بالکل ضائع نہ ہو۔ ہم تین سال کے بچوں کو نرسری میں ایڈمیشن دیتے ہیں۔ میرے پاس کچھ ایسے بچے بھی ہیں جو تین سال سے زیادہ عمر کے ہیں، مگر ان کے پیرنٹس انہیں پری اسکول کی کلاس میں ہی رکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ بنیاد بہت اہم ہوتی ہے، اگر بچے کی بنیاد ٹھیک ہو تو وہ پڑھائی میں کبھی مار نہیں کھاتا۔ اس لیے میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دے رہا ہوں کہ ایسا مت کریں۔"

سر شعیب بہت تحمل سے بات کر رہے تھے۔ اس نے ان کی بات سنی تھی مگر سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس کی دلچسپی بس اتنی تھی کہ ابو بات مکمل کریں تو وہ انہیں لے کر اپنے کلاس روم میں جائے اور اپنے کلاس فیلوز کو ابو سے ملوائے۔ اسے ابھی ابو کے ارادوں کی خبر نہیں تھی۔

"آپ درست کہہ رہے ہیں شعیب صاحب! میں بھی آپ کی بات سے متفق ہوں، لیکن آپ کا مشورہ ماننے کا مطلب ہے میری اور میرے بچے کی اتنے دن کی محنت بے کار چلی جائے۔ میں پلے گروپ یا نرسری کلاس جیسی کسی چیز کو نہیں مانتا۔ میں جانتا ہوں میرا بچہ جب ایک کام کرسکتا ہے تو میں اس چیز پر اصرار کیوں نہ کروں؟ یہ سب کتابیں جو آپ ان کلاسز کو پڑھا رہے ہیں، میں اپنے بیٹے کو گزشتہ سال پڑھا چکا ہوں۔ آپ بے شک اس کا ٹیسٹ لے لیں۔ آپ مایوس نہیں ہوں گے۔" ابو کا انداز بھی سر شعیب کی طرح بے حد دھیما تھا۔

"یہ دونوں کیا کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے سوچا تھا۔

"بچہ واقعی بہت ذہین ہے ماشاء اللہ۔ مجھے اس امر سے انکار نہیں ہے۔ میں ایک بار نہیں دو بار اس کو چیک کرچکا ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے اسے نرسری یا پریپ کے بجائے ون کلاس میں بٹھایا ہے۔ ون کلاس کا کریکولم، بچے کے لیول بر کے حساب سے پرفیکٹ ہے۔ وہ نا صرف پڑھ سکے گا بلکہ دوسری صلاحیتوں کو بھی نکھار سکے گا۔ ہم جب بھی کسی بچے کو ایڈمٹ کرتے ہیں تو نہ صرف میں بلکہ پرنسپل بھی ٹیچرز کے ساتھ مکمل رابطے میں رہتے ہیں۔ میں آپ کے بچے کو مسلسل واچ کر رہا ہوں۔ وہ اسکول کو انجوائے کر رہا ہے۔ اسے یہ کرنے دیں۔ آپ کے کہنے پر میں بچے کو ٹو کلاس میں پروموٹ کر دیتا ہوں، لیکن بچہ پڑھائی کا اتنا بوجھ برداشت نہیں کرسکے گا اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ بچہ پڑھائی کو وبال جان سمجھنا شروع کر دے گا۔" سر شعیب نے پھر ابو کو سمجھایا۔

"ہو ہی نہیں سکتا۔ میں اپنے بیٹے کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ میرا بیٹا پڑھائی کو بوجھ سمجھ ہی نہیں سکتا اور پھر میں بھی تو ہوں۔ میں ایسا باپ نہیں ہوں کہ بچے کو ٹیچرز کی ذمہ داری سمجھ کر اپنی ذمہ داری سے جان چھڑوا لوں۔ میں خود اسے پڑھاؤں گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اس کے رزلٹ ہمیشہ شاندار پائیں گے۔ آپ براہ مہربانی اسے ٹو کلاس میں پروموٹ کر دیجیے۔"

ابو نے حتمی انداز میں کہا۔ سر شعیب نے گہری سانس بھری تھی۔

"او کے۔۔۔ ایز یو وش۔۔۔ میں تو فقط درخواست ہی کرسکتا ہوں کہ بچے کو اس کی عمر کے مطابق پھلنے پھولنے دیں۔" وہ ابھی بھی متامل تھے۔ ابو نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"میں اپنے بیٹے کو کسی سے پیچھے نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگلے دس سالوں میں زمانہ بہت آگے چلا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں میرا بیٹا زمانے کا مقابلہ فاتحین کی طرح کرے۔ وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ اسی لیے۔۔۔"

وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ سر شعیب بھی انہی کی طرف متوجہ تھے۔ لیکن نجانے کیوں اسے عجیب سا محسوس ہوا۔ سر شعیب ابو کی بات سن ضرور رہے تھے۔ لیکن ان کے انداز میں رضامندی نہیں تھی۔ اسے اب ان دونوں کی گفتگو سے الجھن سی ہو

چلی تھی۔ سر شعیب نے ابو سے بات کر لینے کے بعد پیون کو اس کا بیگ لانے کے لیے کہا تھا۔

اس کا بیگ جونیئر سیکشن کے سب سے آخری کلاس روم میں رکھ دیا گیا۔ اس کی ساری کتابیں اور نوٹ بکس واپس لے لی گئیں۔

"کل آپ کو نئی بکس اور نوٹ بکس مل جائیں گی۔" اس کی نئی ٹیچر نے کہا۔

ابو جو اسے نئی کلاس روم میں بٹھا کر وہیں کھڑے تھے ٹیچر کی بات سن کر مطمئن ہو کر واپس چلے گئے تھے۔ اس نے تحیر اور خوف کے ملے جلے جذبات میں گھر کر کلاس روم میں بیٹھے بچوں کو دیکھا۔ وہ سب اسے خود سے بڑے لگے تھے۔ اسے عجیب طرح کی اداسی نے گھیر لیا۔ اسے اپنی آنکھوں کے کنارے نم محسوس ہوئے۔

"اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نیا کلاس روم، نئے کلاس فیلوز اور نئے ٹیچرز سب اسے الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ وہ چپ چاپ اس ڈیسک پر بیٹھ گیا جس پر ٹیچر نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔

"Cobbler cobbler mend my shoe"

اس کے کانوں میں وہی نظم گونجنے لگی جو وہ پرانی کلاس میں بچوں کو یاد کروا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وہاں کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔"

اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی منہ بسور کر امی سے کہا تھا۔ ون کلاس میں وہ ایک ہی دن میں ایڈجسٹ کر گیا تھا۔ جبکہ ٹو کلاس میں وہ ایک ہفتے میں بھی ایسا نہیں کر پایا تھا۔ اسے واقعی یہاں کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے اگلے ہی دن نیا کورس فراہم کر دیا گیا۔ اسے وہاں کسی بچے کا رویہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ون کلاس میں بھی کچھ بچے ایسے تھے جو اس سے بڑے تھے لیکن ٹو کلاس میں سارے ہی بچے اس سے بڑے تھے۔ ان کے انداز بھی بڑوں والے تھے۔ وہ دھونس جما کر بات کرتے تھے۔ ٹیچرز اس سے پیار کرتی تھیں۔ انہوں نے اسے کلاس کے سب سے ذہین بچے کے ساتھ بٹھایا تھا۔ لیکن وہ بچہ اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ اس پر رعب جماتا تھا۔ اس کی نوٹ بکس میں غلطیاں ڈھونڈتا رہتا تھا۔ اس کا مذاق اڑاتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس نے باقی کلاس فیلوز کو اس کے ساتھ دوستی کرنے اور کھیلنے سے روک دیا تھا۔ یہ سب چیزیں اسے اداس کرتی تھیں اور وہ ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں پاتا تھا۔ اسی لیے اس نے امی کے سامنے کھلم کھلا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔ اسے پتا نہیں چلا تھا کہ عقب میں ابو بھی اس کی باتیں سن رہے ہیں۔ یہ بات اسے تب پتا چلی تھی جب وہ شام کو پڑھنے کے لیے ان کے پاس بیٹھا تھا۔

"سائنس کے ٹیسٹ میں اتنی خراب ہینڈ رائٹنگ۔ وجہ؟" انہوں نے نوٹ بک اس کے سامنے کی تھی۔ اس ٹیسٹ میں اس نے پورے نمبر لیے تھے، لیکن لکھائی عجلت میں لکھنے کے باعث واقعی اچھی نہیں تھی۔

"میں ایسی باتوں پر کوئی کمپرومائز نہیں کروں گا۔ خبردار! یہ غلطی آئندہ دہرائی تو۔" انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں وارننگ دی تھی۔ پڑھائی کے وقت وہ بے حد سنجیدہ ہو جاتے تھے۔

"سوری ابو۔" اس نے معذرت کی۔

"دیکھو بیٹا! سوری کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ اگر دل لگا کر نہیں پڑھو گے تو ڈاکٹر کیسے بنو گے؟ اس کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ آپ تو ابھی سے گھبرا گئے ہو تو بڑی کلاس میں جا کر کیا کرو گے۔" وہ اسے سمجھانے لگے تھے۔

"ابو! مجھے وہاں کچھ اچھا نہیں لگتا۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ امی سے کہتے وقت اس کا انداز اور طرح کا تھا، لیکن ابو سے کہتے وقت وہ تھوڑا سا ڈر بھی رہا تھا۔

"آپ کو اپنی بکس پسند نہیں آئیں؟" انہوں نے سوال کیا۔

"نہیں۔ بکس تو اچھی ہیں۔" اس نے سابقہ انداز میں جواب دیا تھا۔

"تو پھر۔؟" انہوں نے مزید استفسار کیا۔

"وہاں کوئی میرا دوست نہیں ہے۔ کوئی میرے ساتھ نہیں کھیلتا۔ وہ سب آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ وہ مجھے اچھا نہیں سمجھتے ابو!"

اس نے ابو کو اپنا مسئلہ بتا دیا تھا۔ وہ انہیں اس لڑکے کے متعلق بتانے لگا تھا جو کلاس میں فرسٹ آتا تھا۔ لیکن وہ بہت لڑاکا تھا۔ ابو نے اس کی ساری بات تفصیل سے سنی تھی اور سننے کے بعد وہ اطمینان سے بولے۔

"یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ نہیں کھیلتا۔" جب وہ اسے اس انداز میں سمجھاتے تھے تو ان کے لہجے سے سارا لاڈ پیار ختم ہو جاتا تھا۔

"یہ اسکول کوئی کھیلنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ جوائے لینڈ نہیں ہے کہ جہاں تمہارے ماموں تمہیں جھولا دلوانے لے جائیں گے۔ وہاں تم پڑھنے جاتے ہو اس لیے تمہیں وہاں پڑھنا ہی ہے۔ اگر کوئی بچہ تمہارے ساتھ نہیں کھیلتا یا کسی اور کے ساتھ کھیلتا ہے تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنا کام کرو انہیں اپنا کام کرنے دو اور میں تمہیں بتا چکا ہوں تمہارا کام کیا ہے۔ پڑھائی اور بس پڑھائی۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کلاس میں تمہارے کتنے دوست ہیں لیکن اس بات سے بہت فرق پڑتا ہے کہ کلاس ٹیسٹ میں تمہارے کتنے مارکس ہیں۔ کم دوست ہیں تو خیر ہے، لیکن کم مارکس ہیں تو تمہاری خیر نہیں۔ تمہیں سب کلاس فیلوز کو پڑھائی میں بیٹ کرنا ہے کھیل کود میں نہیں۔ اس لیے ایسی کسی بات کی پروا مت کرو۔ آئندہ میں تمہیں کسی ایسی فضول یا احمقانہ بات کے لیے پریشان نہ دیکھوں۔"

وہ اسے ایک بار پھر وارن کر رہے تھے۔ اسے سب باتیں سمجھ میں آئی تھیں مگر ہمیشہ کی طرح کچھ باتوں کے لیے اس کا ذہن عجیب الجھن کا شکار ہوا تھا مگر چونکہ ابو کہہ چکے تھے کہ یہ فضول اور احمقانہ بات ہے، اس لیے اس نے اس بات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم ففتھ کلاس میں ہو؟" عذیر نے ازحد حیرانی میں گھر کر اس کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ ایک جھینپی ہوئی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اسے عجیب سی خجالت محسوس ہوئی۔ اگرچہ حیرانی کے یہ تاثرات اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ وہ لوگ جو اس سے پہلی مرتبہ ملتے تھے۔ اس طرح حیرانی کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی نجانے کیوں عذیر کے سامنے اس امر کا اقرار کرتے ہوئے اسے شرمندگی ہوئی۔

"تمہاری ایج کیا ہے؟" عذیر نے ایک اور سوال کیا تھا۔ اس کا جواب سن کر وہ پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوا۔ اس نے اس کے کزن بلال کی طرف دیکھا تھا۔

"میں بھی سات سال کا ہی ہوں، مگر میں تو ابھی تھرڈ کلاس میں آیا ہوں۔ سات سال کے سب بچے تھرڈ کلاس میں پڑھتے ہیں۔ میری کلاس میں سب بچے میرے جتنے ہیں، پھر تم ففتھ کلاس میں کیسے آ گئے؟"

عذیر کے تفتیشی انداز نے اسے مزید شرمندہ کیا۔ اسکول میں بھی اسے ایسے تبصرے سننے کو ملتے تھے مگر وہ جس اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ وہاں سب اس کو جانتے تھے۔ سب ٹیچرز کو بھی اس کا پتا تھا۔ اس نے پڑھائی میں ہمیشہ کار کردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک ذہین و فطین بچے کے طور پر ہمیشہ اس کو سراہا گیا تھا لیکن دوستوں کے معاملے میں وہ زیادہ خوش قسمت نہیں تھا۔ اس کی ساری دلچسپی کتابوں کے بعد گھر اور گھر میں موجود پالتو جانوروں اور پرندوں میں تھی، پہلے کی طرح کلاس فیلوز اسے پریشان نہیں کرتے تھے، لیکن وہ اس سے کتراتے ضرور تھے۔ وہ اس کے پاس زیادہ وقت تب ہی گزارنا پسند کرتے تھے جب ان میں سے کسی کو

پڑھائی کے سلسلے میں کسی قسم کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ میتھس، انگلش یا سائنس وہ کسی مضمون میں نکما نہیں تھا۔ ہر مضمون میں وہ ہر سال سو فیصد نمبر لیتا تھا۔ اسکول کے علاوہ ننھیال و ددھیال میں بھی اسے دل کھول کر سراہا جاتا تھا۔ کزنز بھی اسے پسند کرتے تھے۔ لیکن عذیر اس کا کزن تھا نہ کلاس فیلو' وہ اس کے ماموں کے پڑوس میں رہتا تھا۔ ماموں کے دونوں بیٹوں کی اس سے اچھی خاصی سلام دعا تھی۔ اسی دوستی کی وجہ سے اس کی اور عذیر کی ملاقات ہوئی تھی۔ پڑھائی کے سخت شیڈول کی وجہ سے ننھیال جانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا' مگر آج کل تو اس کو خوب مزا آرہا تھا' کیونکہ وہ اور امی پندرہ دن کے لیے یہاں آئے تھے۔

پہلے ہی دن اسے عذیر سے ملنا اچھا لگا تھا۔ وہ تقریباً" اس کے ہی جتنا تھا' لیکن اب یہ عقدہ کھل چکا تھا کہ وہ عذیر کی کلاس میں نہیں بلکہ اس کے بڑے بھائی کی کلاس میں ہے۔ (اسکول اگرچہ مختلف تھے' مگر کلاس ایک ہی تھی۔)

"میں بھی سات سال کا ہوں۔ یہ دیکھو میرا ایک دانت بھی ٹوٹا ہوا ہے۔" شرمندگی کی حالت میں ہی اس نے منہ کھول کر اسے یقین دلانا چاہا اس کے پاس ٹوٹے دانت کے علاوہ خود کو سات سالہ ثابت کرنے کا کوئی اور ثبوت نہیں تھا۔ عذیر نے بغور اس کے دانتوں کا جائزہ لیا۔ سامنے والے دانتوں میں واقعی ایک دانت جتنا خلا تھا۔ عذیر بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اسے ایک عجیب طرح کا احساس کمتری محسوس ہوا تھا۔ ایک بچہ جو دیکھنے میں اس کے ہی جتنا تھا' مگر اسکول میں کلاس کے حساب سے اس کے بڑے بھائی کے برابر تھا۔ وہ دوستی جو چند گھنٹے قبل شروع ہوئی تھی' وہ کس طرح برقرار رہ سکتی تھی۔

"رباب آپی! یہ کہتا ہے یہ سات سال کا ہے اور ففتھ کلاس میں پڑھتا ہے۔"

عذیر نے اس کے بڑے ماموں کی سب سے بڑی بیٹی کو جنہیں سب بچے رباب آپی کہتے تھے' شکایت لگانے والے انداز میں کہا۔ گویا اسے یقین تھا کہ اس سے جھوٹ بولا گیا تھا۔

"وہ سچ کہہ رہا ہے۔" رباب آپی نے مسکرا کر تائید کی۔ وہ لان میں بیٹھی کوئی جرنل مکمل کررہی تھی۔

"تم سب نکموں کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ تم دونوں کے برابر ہے یہ بھی' لیکن تم دونوں سے زیادہ ذہین ہے۔ ہر کلاس میں فرسٹ آتا ہے۔"

وہ ہمیشہ اسے اسی انداز میں سراہتی تھی۔ عذیر کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی شرمندہ کرنا چاہا۔

"میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔ اس لیے مجھے بہت زیادہ پڑھنا پڑتا ہے۔ میرے ابو کہتے ہیں کہ ڈاکٹر بننے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔"

رباب آپی نے اس کی تعریف میں مزید کچھ الفاظ کہے اسے یہ تعریف اچھی نہیں لگی تھی کیونکہ اس سے عذیر کی آنکھوں میں اجنبیت بڑھنے لگی تھی۔ بلال تو یہ باتیں سنتا ہی رہتا تھا۔ اس کے لیے یہ باتیں تو بچے کے خرناٹے کی طرح لازمی تھیں' جبکہ عذیر کو اتنی تعریف ہضم نہیں ہورہی تھی مگر پھر بھی ان تینوں نے دوبارہ کھیلنا شروع کردیا تھا۔

"میں بھی بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا' مگر میں اپنی کلاس چھوڑ کر ففتھ کلاس میں نہیں جاسکتا۔"

عذیر نے کھیل شروع ہونے سے پہلے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ بلال نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ "میں بھی نہیں۔"

عذیر اور بلال ہنسنے لگے تھے' جبکہ وہ شرمندہ ہونے لگا۔ لیکن یہ شرمندگی زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔ اس کے ماموں اور خالائیں اسے اتنا سراہتے تھے کہ وہ چند دن بعد اس شرمندگی کو بھول گیا تھا' مگر اتنا ضرور ہوا تھا کہ عذیر کے ساتھ پہلے دن والی بے تکلفی قائم نہیں رہی تھی۔ اپنے گھر واپس آجانے کے بعد وہ عذیر کو بھی بھول گیا تھا۔

"تمہیں بہت محنت کی ضرورت ہے۔" اسے جماہیاں لیتا دیکھ کر ابو نے کھردرے لہجے میں کہا۔ اسے نیند آرہی تھی' وہ سونا چاہ رہا تھا لیکن ابو کی بات سن کر

دوبارہ کتاب کی جانب دیکھنے لگا۔

اس کا دل اب پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا' کیونکہ اس کے پورے وجود پر تھکن غالب آچکی تھی۔ اس کا ہوم ورک مکمل ہوچکا تھا۔ کل کلاس میں ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری بھی وہ کرچکا تھا لیکن ابو کے ٹوکنے پر وہ دوبارہ انگلش کی کتاب پر نظریں دوڑانے لگا۔ اس کی پڑھائی کا دورانیہ بڑھ گیا تھا۔ ابو بارہ بجے تک لیکچر کی تیاری کرتے اور تب تک اسے بھی اپنے ساتھ بٹھائے رکھتے۔ اکثر وہ اس روٹین سے بہت اکتا جاتا تھا' لیکن ابو کے ڈر کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ پاتا۔ وہ اب ساتویں جماعت میں آچکا تھا۔

چند سال پہلے اس کے گھر میں جس ننھی بہن کا اضافہ ہوا تھا' وہ اب بڑی ہوچکی تھی۔ اس سال سے اس کی بہن بھی اسکول جانے لگی تھی۔ ابو نے اسے بھی نرسری یا پریپ کے بجائے ون کلاس میں داخل کروایا تھا۔ اسے اپنی بہن سے بہت پیار تھا۔ اب اگر اسکول میں کوئی بچہ اس کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا تو وہ پروا نہیں کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہی بچہ جو بے حد صحت مند اور گول مٹول سا ہوا کرتا تھا' اب ایک لمبے' مگر دبلے پتلے وجود کا مالک بن چکا تھا۔ اس کے ابو جہاں اس کی پڑھائی کے لیے ہلکان رہا کرتے' وہیں اس کی امی کو اس کی صحت اور خوراک کے معاملات پریشان رکھتے تھے۔ ان کی بھرپور کوشش ہوتی کہ وہ وقت پر کھائے اور پیٹ بھر کر کھائے' مگر اسے کھانے پینے سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی' جبکہ اس کی بہن اس معاملے میں اس سے بہت بہتر تھی۔ بھوک لگنے پر وہ پیٹ بھر کر کھاتی اور اکثر اوقات جب وہ اپنے حصے کی چیز چھوڑ دیتا تو وہ بھی کھالیا کرتی تھی۔ ماموں اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان سے باہر سیٹ ہوچکے تھے۔ زندگی میں اس کی دلچسپیاں بے حد محدود تھیں۔ کھیل کود کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ اسکول میں بریک کے دوران بھی وہ کلاس روم میں بیٹھا

رہتا۔ جس طرح کے کھیل اس کی کلاس کے زیادہ تر بچے کھیلتے تھے اسے جلدی تھکا دیتے تھے اور جیسے کھیل وہ کھیل سکتا تھا اس کے کلاس فیلو ان میں کم دلچسپی رکھتے تھے۔ ہنگ مین' اسکریبل اور جگسا پزل ان بچوں کے لیے کرکٹ' ہاکی اور بھاگ دوڑ والے کھیلوں کی طرح دلچسپ نہیں تھے۔ اگرچہ اس کا دل بہت چاہتا تھا کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح بھاگے دوڑے' شرارتیں کرے' لیکن ابو پڑھائی کو اس کے سر پر اس طرح سوار رکھتے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ان چیزوں کے لیے وقت نہیں نکال پاتا تھا۔ اس کی جسمانی صحت اس لیے کمزور تھی۔ وہ باقی کلاس فیلوز سے عمر میں چھوٹا تو تھا ہی مگر دبلا پتلا ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی چھوٹا اور کمزور لگتا۔

ٹیچر' پیرنٹس میٹنگز میں جب اس کے ٹیچرز اس کی کارکردگی کی تعریف کرتے ہوئے اسے کمزور قرار دے کر ایکٹو ہو جانے یا غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی تلقین کرتے تو اس کی امی خاموش رہ جاتیں' جبکہ ابو واضح الفاظ میں کہتے۔

"بڑھتی ہوئی عمر میں بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ اس کے ہم عمر بچوں یا اس کے کلاس فیلوز کی طرف نظر بھی نہیں ڈالتے تھے۔ وہ باقی بچوں سے اس کا تقابل صرف پڑھائی میں کیا کرتے تھے اور اس معاملے میں وہ کسی بھول چوک کو معاف نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ اس کا نام کلاس کے ہی نہیں اسکول کے بھی ذہین ترین بچوں میں پہلے نمبر پر آتا تھا۔ ہر کلاس میں' ہر ٹرم میں فرسٹ پوزیشن لینے والا اور ہر سال اسی بنا پر اسکالر شپ لینے والا وہ واحد بچہ تھا۔ اس کے ریکارڈ اب تک کوئی نہ توڑ سکا تھا لیکن اس کے باوجود یہ امر حیران کن تھا کہ اس کے کلاس فیلوز اور ٹیچرز کے علاوہ باقی اسکول فیلوز کے لیے اس کا چہرہ انجان تھا۔ سب اس کے نام سے واقف تھے' مگر اس کے چہرے سے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ اس کی واحد اور سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ کتابوں کے علاوہ کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ وہ اسکول کے کسی فنکشن میں نہیں آتا تھا۔ وہ ایسی باتوں کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ یہ صورت حال اب اسے تکلیف نہیں دیتی تھی۔ تب ہی اس کی کلاس میں ایک نئے بچے کا اضافہ ہوا۔ یہ بچہ سلیمان حیدر تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم واپس جانا نہیں چاہتے؟" شہروز نے گود میں پڑی آڑوؤں کی سب گٹھلیاں ٹیبل پر رکھ کر ٹشو پیپر کے کیس سے ٹشو پیپر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جانا تو پڑے گا نا۔" اس نے کشن ایک بار پھر آنکھوں پر رکھ لیا۔ شہروز کو یکدم احساس ہوا' وہ بہت ست لگ رہا ہے۔ شہروز چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ٹیبل پر پڑا میگزین اٹھا لیا۔ عمر اور اس کے درمیان سنجیدہ نوعیت کی گفتگو کبھی کسی تیسرے کی موجودگی میں نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں اگر ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں بانٹتے تھے تو دکھ کہنے کے لیے بھی انہیں ایک دوسرے سے بہتر رازدان میسر نہیں تھا اور یہی ان دونوں کی مضبوط دوستی کی بنیاد تھی۔

"نیکسٹ سنڈے کو انوائیٹ کیا ہے انکل آفاق نے۔" ارم بھابھی سب سے پہلے خبر لائی تھیں۔

"مبارک ہو بھئی۔" بہروز' مہروز بھائی اور پھر پھپھو' تایا جان' تائی امی ایک کے بعد ایک لاؤنج میں چلے آئے تھے۔

"شہروز نے عمر کی دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ماشاء اللہ بہت اچھی جوڑی ہے۔" پھپھو نے سب کو ایک ساتھ سراہا تھا۔ ماحول یکدم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ سب ہی اگلے اتوار کو ہونے والے فنکشن کو لے کر بہت خوش تھے۔ پھپھو اور تائی امی یعنی زارا اور شہروز کی ماؤں کا تو یہ پسندیدہ کام تھا۔ وہ خاندان اور خاندان سے باہر بچے' بچیوں کے رشتے جوڑنے میں ماہر سمجھی جاتی تھیں۔

"ایک ہفتہ بھی نہیں ہے درمیان میں۔ بہت کام ہیں کرنے والے۔" دونوں بھابھیوں کو شاپنگ کا جنون تھا۔

"آفاق صاحب نے زیادہ بڑا فنکشن نہیں رکھا۔ بس ایک طرح کا ڈنر سمجھ لیں اور صرف ہم گھر والوں کو انوائیٹ کیا ہے۔ انہوں نے رنگ وغیرہ لانے سے بھی منع کیا ہے۔"

شہوز کی ممی نے بطور خاص منور صاحب کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ کیونکہ انہیں یہ ساری باتیں امائمہ کی والدہ نے بتائی تھیں۔

"مجھے بھی آنے کی اجازت ملی ہے یا نہیں۔" عمر نے چڑ کر کہا' لیکن آواز مدھم تھی۔ شہوز اور مہوز بھائی ہی سن پائے تھے اس کا واویلا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ڈیڈی! عمر تو جائے گا نا ہمارے ساتھ" وہ عمر کا سوال اب باآواز بلند پوچھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ سب مسکرا رہے تھے۔

"آف کورس جائے گا۔ ہم اپنی خوشی اپنے طریقے سے سلیبریٹ کریں گے۔ عمر بھی جائے گا اور رنگ بھی لے جائیں گے ہم بلکہ جو بھی ضروری لوازمات ہیں گفٹس وغیرہ وغیرہ سب خرید لیں آپ لوگ۔ آفاق صاحب کو ہم خود سمجھا لیں گے۔ پریشان نہیں ہونا عمر!"

منور صاحب کے کہنے پر عمر جھینپ کر ہنس دیا۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھ کسی انجانے خوف سے کھلی تھی؟ لمحہ بھر کے لیے وہ سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا چیز تھی؟ جس نے اسے نیند سے بیدار کیا ہے۔ پھر محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے دروازے پر دستک دی ہے۔ اس نے کروٹ بدل کر اس دستک کو نظر انداز کرنا چاہا' مگر انتہائی کوشش کے باوجود وہ ایسا کر نہیں پایا۔ پہلی دفعہ اسے اپنے جسم کی لاچاری سے خوف آیا تھا۔ وہ حرکت کیوں نہیں کر پا رہا تھا' ایسا کیا ہوا تھا اس کے جسم کے ساتھ کہ وہ ہاتھ ہلانے سے بھی قاصر تھا۔ یہ سب اس کے ساتھ کیوں ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اسی دوران دستک زیادہ تیزی سے ہونے لگی تھی۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ جو بھی آیا ہے خود بخود واپس چلا جائے گا وہ اٹھ کر دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔ ایک لمحے بعد دستک رک گئی۔ اس نے گہری سانس بھری اور تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ ٹھیک سے سانس بھی نہیں لے پا رہا ہے۔ اسے مزید خوف آیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کیا اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی کیا اسے معالج کی ضرورت تھی؟

دستک ایک بار پھر ہونے لگی تھی۔ اب کی بار اس نے اپنے خوف پہ قابو پانے کی کوشش کی۔ اسے اٹھ کر دروازہ کھولنا چاہیے۔ یہ ضروری ہے' ورنہ کیسے پتا چلتا کہ کون اس سے ملنا چاہتا۔ اس نے ہمت مجتمع کر کے پھر اٹھنے کی کوشش کی' مگر پھر بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ اٹھ نہیں پا رہا تھا۔

دستک دینے والے نے ناکام ہو کر دروازہ خود کھول دیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس کے لیے بالکل انجان تھا۔

"میرا بچہ کہاں ہے؟ مجھے میرا بچہ چاہیے۔ مجھے میرا بچہ واپس کر دو۔"

تب اسے احساس ہوا کہ کمرے کے اندر آنے والا کوئی مرد نہیں بلکہ ایک عورت تھی۔ اس نے پھر اٹھنا چاہا۔ یہ بڑی معیوب بات تھی کہ وہ ایک عورت کی موجودگی کے باوجود اسی حالت میں لیٹا رہتا' مگر اس کا وجود جیسے اس کے کہنے میں نہیں رہا تھا۔ اسے خوف کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی' اس نے پہلے کبھی ایسی جہالت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو بہت تمیزدار شخص کے طور پر جانا جاتا تھا۔

"تمہیں یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرے بچے نے بھروسا کیا تھا تم پر' اس کا تم نے یہ صلہ دیا۔ تم نے ایک بار نہیں سوچا کہ تم غلط کر رہے ہو بلکہ گناہ کر رہے ہو۔ کسی کے بھروسے کو توڑتے ہوئے تمہیں ذرا احساس نہیں ہوا کہ کسی کے معصوم وجود سے کھیلنا گناہ ہے۔"

اس نے بولنا چاہا۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ یہ سب سچ نہیں ہے مگر لفظ پھر جیسے کہیں اندر دبے رہ گئے اس نے اپنے آپ کو بے انتہا بے بس محسوس کیا۔ وہ بول

نہیں پا رہا تھا۔ وہ بولتا تو اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگتی تھیں۔ وہ عورت جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' اس کی خاموشی سے اکتا کر مزید آگے بڑھ آئی تھی۔

"میں اپنا بچہ لے جانے آئی ہوں اور میں اسے لے کر ہی جاؤں گی۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم اسے واپس کر دو۔"

"مجھے نہیں پتا تم کیا کہہ رہی ہو' میں تمہارے بچے کو نہیں جانتا۔ میں تو تمہیں بھی نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ تم کیوں مجھے پریشان کر رہی ہو۔ میری طبیعت پہلے ہی خراب ہے۔"

اس نے یہ سب بڑی ہمت سے کہا تھا۔ اس کا ہر عضو جیسے فالج زدہ ہو چکا تھا۔ اس عورت نے شاید کچھ بھی نہیں سنا تھا۔

"میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اس طرح خاموش مت رہو' میں بہت امید لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ میرا بچہ مجھے واپس کر دو۔"

وہ عورت یکدم رونے لگی تھی۔ اسے دکھ کی لہر نے اپنے حصار میں لیا۔ وہ کس قدر مجبور تھا کہ کچھ بول بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس کے منہ سے جو آوازیں نکل رہی تھیں' وہ کھانسی سے مشابہ تھیں' جو خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں تو وہ بھلا اس عورت سے کیا توقع کرتا کہ وہ انہیں سمجھ سکے گی۔ اس نے لمبا گہرا سانس بھرنے کی ایک ناکام کوشش کی۔ اسے پہلے کبھی اس قسم کا کوئی عارضہ لاحق نہیں رہا تھا۔ اتنا لاغر اس نے پہلے کبھی اپنے آپ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ ایسا کیوں تھا۔ اسی اثناء میں وہ عورت اس کے قریب ہوئی تھی اس عورت نے اس کے گریبان کو ہاتھ میں پکڑ لیا۔ حیرانی والی بات یہ تھی کہ اتنا قریب ہو کر بھی اس عورت کے چہرے کے خدوخال واضح نہیں ہو رہے تھے۔

"گناہ گار ہو تم۔ گناہ گار اور میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی' کبھی بھی نہیں۔"

وہ عورت چلا چلا کر بولنے لگی تھی اور تب اسے سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیوں بول نہیں پا رہا تھا۔ اس نے آیت الکرسی کی تلاوت شروع کر دی۔ اس عارضہ کا یہی ایک واحد حل تھا کہ وہ نیند سے بیدار ہو جاتا۔ اس بار اسے اتنی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ آیت الکرسی کے بعد اس نے معوذتین کی تلاوت شروع کر دی۔ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔

پہلے اس کی آنکھیں کھلیں' پھر اس کا سانس بحال ہونے لگا۔ پھر حواس بحال ہوئے تو اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ سب خواب تھا۔ آنکھ کھلتے ہی اسے اپنے کمرے کے مانوس ماحول نے حرارت بخشی تھی۔ اس کا خوف کم ہو رہا تھا اور طبیعت بحال ہو رہی تھی' مگر اس کے سینے پر کچھ نادیدہ بوجھ سا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے مسلنا چاہا۔ تب ہی اس کا ہاتھ کسی چیز سے مس ہوا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس چیز کو تھام لیا۔ یہ تھی وہ چیز جو حقیقت میں اس کے سینے کا بوجھ تھی۔ اس پر واضح لفظوں میں لکھا تھا۔

"عہد الست"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا نا کہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اسے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

—۲۴—

چوبیسویں قسط

صبح سے سرما کی پہلی بارش کی کن من جاری تھی' خدیجہ نے آتش دان میں نصب گیس ہیٹر کی ناب گھما کر اپنی سماعت اس میں سے اٹھنے والی آواز کی طرف لگائی' ہیٹر سے گیس نکلنے کی سرسراتی آواز آرہی تھی۔

"شکر ہے' ابھی گیس بند نہیں ہوئی۔"

انہوں نے ہیٹر کی ناب گھما کر بند کی اور دیا سلائی جلا کر دوبارہ گیس آن کرکے ہیٹر جلا دیا۔ آہستہ آہستہ حدت بند دروازوں والے اس کمرے میں پھیلنے لگی۔ وہ ہیٹر کے قریب سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ کھڑکی کا پردہ برابر کرتے ہوئے انہوں نے کھڑکی سے پار باہر کے منظر پر نظر ڈالی تھی۔ گرد و غبار میں اٹے پیڑ پودے دھل اور نکھر گئے تھے۔ پردہ برابر کرکے واپس ہیٹر کے قریب صوفے پر آبیٹھیں۔

"فاطمہ ابھی تک بستر میں دبکی بیٹھی ہے' اسے تو بچپن سے ہی سردی ہم سب سے زیادہ لگا کرتی ہے' بستر میں گھسی کتابیں پڑھ رہی ہوگی' نجانے اپنے کمرے کا ہیٹر بھی جلایا اس نے کہ نہیں' کہاں جلایا ہوگا' سستی کے مارے اٹھ کر چیک کرنے کی بھی کوشش نہیں کی ہوگی کہ گیس آئی یا نہیں۔" خشک میووں سے بھری ٹرے سے پستے اور کاجو نکال کر کھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں۔

سرما کی پہلی بارش۔۔۔ اب اس میں وہ مزا کہاں جو کبھی ہوا کرتا تھا' کئی کئی راتیں اور کئی دن مسلسل قطرہ قطرہ برستی رہتی تھی' چپ چاپ' بغیر آواز کے' بغیر بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک کے۔

خدیجہ نوسٹلجیا میں مبتلا ہوگئیں۔

"اب تو یہی ایک دو گھنٹہ برسے گی اور بس ختم۔۔۔ اب تو موسموں کے بدلنے سے یہ احساس شدت پکڑنے لگتا ہے کہ گرمی بڑھے گی تو بجلی کی لوڈشیڈنگ بڑھ جائے گی اور سردی بڑھے گی تو گیس کی لوڈشیڈنگ ہیٹر اور چولہے ٹھنڈے کردے گی' رہنے کو بستیاں بڑھیں' بستیوں میں بسنے والے انسان بڑھے' انسانوں کی سہولت کے لیے نت نئی ایجادات بڑھیں اور پھر انسانوں کی گنتی کے دباؤ کے نیچے سب کچھ کم ہونے لگا' برقی آلات میں زندگی دوڑانے والی بجلی کی پیداوار کم ہوگئی' استعمال کے لیے انسان بڑھنے لگے' سوئی کے مقام سے گیس برآمد ہوئی تو دعوا کیا گیا' یہ ذخائر ہزاروں برس کے لیے کافی ہیں۔ کوئلہ' لکڑی' اپلے استعمال کرنے والے انسان نے اپنے چولہوں کا ماڈ بدل لیا' گھر گھر سوئی سے چلتی پائپوں سے گزرتی گیس چولہے روشن کرنے لگی' لیکن پھر نجانے کیا ہوا' وہ گیس استعمال کرنے والے انسان بڑھے یا اس کو فراہم کرنے والے انسانوں کے پیٹ بڑھ گئے جو بھی ہوا سوئی سے چلنے والی گیس کے پائپ تنگ پڑ گئے اور پھر کم پڑنے لگے' نتیجہ انسان پھر انہی کوئلوں' لکڑیوں اور اپلوں کے پاس واپس ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا چلو میرے پیارو چل کر میرا چولہا روشن کردو' ورنہ میں تو خالی پیٹ سونے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

سوچتے سوچتے خدیجہ اپنی ہی سوچی بات پر بے اختیار مسکرا دیں۔ پھر بیل بجنے کی آواز پر چونک گئیں۔

"ہائیں! اس بارش میں اس وقت کون آگیا۔" انہوں نے حیران ہوتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا اور کھڑکی کے قریب جا کر پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ بند گیٹ کے نچلے حصے سے باہر کھڑے کسی شخص کے جوتے نظر آرہے تھے۔ گیٹ کے اوپری حصے سے باہر فضا میں اڑتا ہلکا سا دھواں بھی نظر آرہا تھا جیسے کسی ایسی کھڑی گاڑی سے نکل رہا ہو۔ جس کا انجن بند نہ کیا گیا ہو۔ اطلاعی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بجی۔

"انٹرکام بھی کئی دن سے بے کار پڑا ہے' ورنہ اندر سے ہی پوچھ لیتی کون آیا ہے' اب اس برستی بارش میں بھیگتے ہوئے گیٹ تک تو جانا ہی پڑے گا۔" انہوں نے چھاتا اتارا اور گیٹ وے پر جا کر اسے کھول کر خود پر تانا۔ کال بیل مسلسل بج رہی تھی۔ "صبر بھئی صبر' آرہی ہوں۔" انہوں نے بلند آواز میں پکار کر کہا اور گیٹ کے قریب پہنچ کر اسی بلند آواز میں پوچھنے لگیں۔ "کون ہے بھئی؟"

"گیٹ تو کھولو کوئی' کیا یہیں کھڑی کھڑی بہہ جاؤں' ہوں تو مٹی سے ہی بنی ہوئی نا۔" باہر سے ایک نسوانی آواز

آئی۔ خدیجہ نے گیٹ کھول دیا۔ لمبے رین کوٹ میں ملفوف' سر پر تنے چھاتے کے اندر سے جھانکتی وہ شکل یقیناً مانوس سی تھی لیکن خدیجہ کو فوری طور پر نہ نام یاد آیا نہ ہی حوالہ۔

"یوں تو میرے پیچھے جاسوس بھیجے تھے تم دونوں نے اور اب میں سامنے کھڑی ہوں تو مجھے پہچان ہی نہیں پا رہیں۔" آنے والی نے کہا اور گردن موڑ کر اپنے عقب میں کھڑی گاڑی کے ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔

"تم اب جاؤ ایک گھنٹے بعد آجانا۔" گاڑی آگے بڑھ گئی۔ آنے والی نے گردن موڑ کر واپس خدیجہ کی طرف دیکھا۔

"آیا یاد یا نہیں؟ فلزا ہوں میں' فلزا ظہور۔" آنے والی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کھاری اپنی زندگی کے سب سے مشکل موڑ پر آکھڑا ہوا تھا۔ وہ سعدیہ اور آپا رابعہ کو یقین دلانے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا کہ اپنے باپ اور بھائی کے سلسلے میں جو دعوا وہ کر رہا تھا وہ سو فیصد وہی تھا جو اس نے سنا تھا۔ اسے زندگی کے مشکل ترین موڑ پر لا کھڑا کرنے والی وہ عورت جو اسے کسی "بچھل پائی" جیسی بدشکل اور استانی حمیدہ جیسی کرخت لگی تھی۔ اچانک کہیں غائب ہوگئی تھی' ڈرامائی طور پر اس بچھل پائی کی بات کی تائید کرنے والے چوہدری صاحب اپنے کاروباری دوستوں کے ساتھ دریائی مچھلی کے شکار پر نکل چکے تھے۔ اب اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے کھاری اپنے گواہ کے طور پر کسے سامنے لاتا۔ مایوس اور بے بس کھاری کے پاس اس وقت خاموش ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنے دل و دماغ کی کیفیت کسی کے سامنے بیان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جن حقائق سے آگہی' اسے پاؤں سے اکھیڑ ڈالنے کے مترادف تھی' وہ زبردستی اس کے کانوں میں انڈیل دی گئی تھی' وہ نہ خود میں رہ پا رہا تھا نہ خود سے جدا ہو پا رہا تھا۔ اسے اپنی ذات' پہلے سے بھی زیادہ ہلکی' بے وقعت اور ادھوری لگنے لگی تھی' اگر وہ سب سچ تھا جو چوہدری سردار کی مہمان کہہ رہی تھی تو وہ لڑکا جس کا نام سعد سلطان تھا' آسمان پر کیوں نظر آتا تھا اور خود وہ آسمان سے بہت دور' بہت ہی نیچے زمین پر کیوں کھڑا تھا۔ حالات کی گرد میں سر تا پا اٹا ہوا چیونٹی کی طرح حقیر' وہ کیوں سعد سلطان کی طرح آسمان پر چاند بن کر نہیں چمک سکا تھا۔ اگر وہ اور سعد سلطان ایک ہی باپ کی اولاد تھے تو باپ نے ایک کو آنکھوں کا نور اور دوسرے کو پاؤں کی دھول کیوں بنایا تھا۔

کھاری سوچنا نہیں چاہتا تھا' مگر سوچیں اس کے دماغ میں اٹھتی تھیں اور اس کے پیٹ میں گرہیں ڈالتی جاتی تھیں اس پر المیہ یہ تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کی بات سننے کے موڈ میں نظر آتا تھا نہ ہی سمجھنے کے' اسے اس وقت دنیا میں اپنے آپ سے زیادہ تنہا کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ کھاری کو زندگی میں پہلی بار اپنے ہونے پر دکھ محسوس ہونے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

نادیہ نے پاؤں سے جوتے اتارتے ہوئے سامنے دیکھا' کھڑکی کے شیشوں سے پردے ہٹے ہوئے تھے اور باہر آسمان سے گرتی ہلکی برف کے روئی کے سے چھوٹے چھوٹے گالے زمین پر اتر کر جم جاتے تھے۔ کہر آلود لندن' سرما کی مخصوص برف باری کی زد میں تھا۔ منجمد کردینے والا درجہ حرارت زندگی کو مفلوج کردینے کی کوشش میں مصروف تھا' مگر زندگی رواں تھی۔ نادیہ نے چہار طرف پھیلی برف کی سپیدی کو دیکھا اور کچھ یاد کرتے ہوئے مسکرا دی۔

فن لینڈ کے برف کے قبرستان جیسے اندھیرے اور یخ بستہ موسموں کی سختی سے نبرد آزما ہوتے ہوئے زندگی اس پر مہربان ہوئی اور پہلے اس نے ہیلسنکی ہی میں اس کے لیے سکون کے سانس لینے کا کیسا موقع فراہم کیا تھا۔ اسے

ہیلسنکی کے یوتھ ہوسٹل کی سخت زندگی سے — ایک آرام دہ اور فرنشڈ کمرے کی طرف سفر کا منظر یاد آیا اور پھر اس آرام دہ، پرسکون زندگی کی دین کا خیال آیا جس نے اسے ایک دن دیکھی طاقت سے ذہنی، جذباتی، جسمانی اور نظریاتی طور پر منسلک ہونے کی راہ پر ڈال دیا تھا۔

"کیسا انقلابی فرق ہے، میرے کل اور میرے آج میں۔ بے وجودی کے احساس سے لے کر وجود کو پالینے تک کا فرق۔ اور یہ سب کبھی ممکن نہ ہوپاتا اگر زندگی میں اچانک کہیں سے تم نہ آجاتے۔"

اس نے کھڑکی کے قریب رکھی گول میز پر سجے فوٹو فریم میں جڑی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تم انسان ہو یا انسان کے روپ میں مہربان فرشتے۔" اس نے سوچا اور اس تصویر سے مخاطب ہوئی۔

"کیا تم خود بھی جانتے ہو کہ تمہارا وجود کتنی بڑی خوشی ہے، اتنی بڑی خوشی کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کتنا عرصہ ہوگیا، تم سے رابطہ نہیں ہوا، مگر وہ دل اور روح کا تعلق ہے جو ہر دم مجھے تمہارے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے جو ہمیشہ مجھے یقین دلاتا رہتا ہے کہ تم جہاں بھی ہو، مجھ سے دور نہیں ہو، جو ہر دم میرے لبوں کو اور میرے ہاتھوں کو تمہارے لیے دست دعا بنائے رکھتا ہے، تم جہاں بھی ہو، جو بھی کررہے ہو۔ سلامت رہو، آباد رہو، تم خوشی ہو، ہمیشہ خوشی کا احساس بنے رہو۔"

تصویر سے باتیں کرتے اس کی نظر اپنے فون پر پڑی جس کی اسکرین روشن ہورہی تھی۔ اس نے اپنے قریب رکھا فون اٹھایا، فون پر ایک انجان نمبر کی طرف سے اس کے لیے پیغام موجود تھا۔

"تم فوراً "ڈار لنگٹن میموریل اسپتال" پہنچ جاؤ جو کہ تین ہزار نو برن ایونیو پر واقع ہے۔" پیغام اسے ہدایت کررہا تھا۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے اس نامعلوم نمبر پر کال کی، کچھ دیر تک بیل بجتے رہنے کے بعد نمبر مصروف کردیا گیا، وہ نمبر کس کا ہوسکتا تھا اور وہ پیغام اسے کیوں بھیجا گیا تھا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں ہورہا تھا۔ موبائل کی میسج ٹون ایک بار پھر بجی اور اس کی اسکرین روشن ہوئی۔

"سوچنے میں وقت ضائع کیے بغیر فوراً" اس اسپتال پہنچ جاؤ، یہاں تمہارے لیے ایک ایمرجنسی جیسی صورت حال ہے۔"

پیغام کہہ رہا تھا اس نے مزید کچھ سوچے بغیر اپنے فون پر نقشوں کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بتائے گئے پتے کی تصویر لی اور اسے محفوظ کرنے کے بعد تیزی سے دوبارہ جوتے پہننے لگی۔

☼ ☼ ☼
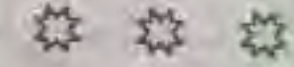
"تم نے وہ سب دیکھ لیا جو تمہارے لیے اس لفافے میں محفوظ تھا؟"

بلال سلطان نے ڈنر کے دوران ماہ نور سے پوچھا۔ انہیں اس لڑکی کے مرجھائے ہوئے چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں سے اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے۔

"نہیں، میں اسے پوری طرح نہیں دیکھ پائی، شاید مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" اس نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی کہنی کے سہارے اپنا ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ کر اپنے تئیں اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت کسی سے بات کرنا چاہ رہی تھی نہ کسی کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں پارہی تھی۔

"ہوں!" بلال سلطان اس کا جواب سننے کے بعد چند ثانیے اسے غور سے دیکھتے رہے پھر گہرا سانس لیتے ہوئے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "مجھے تم سے معذرت کرنا تھی کہ تم سے پہلے میں وہ سب کچھ دیکھ چکا تھا۔" انہوں نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ ہنوز اسی انداز میں بیٹھی تقریباً "خالی پلیٹ میں کانٹا گھمارہی تھی۔

"اسی لیے میں اس وقت بھی جانتا تھا کہ میرے بیٹے کی کوئین آف ہارٹ تم ہی ہو، جب میں نے پہلی بار تم سے وہ سوال پوچھا تھا۔"

ماہ نور نے چونکتے ہوئے ایک لحظے کے لیے ہاتھ روک کر ان کی طرف دیکھا۔

"تمہارے انکار پر میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس کی طرح میں بھی تمہیں نہیں بتاؤں گا کہ وہ لڑکی تم ہو۔" وہ دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔ "شاید میں نے یہ اندازہ کرنے کے لیے ہی تم سے پہلی ملاقات میں وہ سوال کیا تھا کہ تم اس کے دل کی کیفیات سے کس حد تک واقف ہو جبکہ میں جانتا تھا، تم ماہ نور تھیں اور تم ہی اس کے لیے اتنی پریشان اور سرگرداں ہوسکتی تھیں جیسی پہلی ملاقات میں تم نظر آئیں۔"

ماہ نور کی آنکھیں بھر آئیں اس نے اپنے چہرے کو چھپانے کے لیے اپنے ہاتھ کو چہرے پر مزید پھیلالیا۔

"کچھ حقیقتوں کا انکشاف اگر موزوں ماحول اور موزوں وقت پر ہو تو انسان کو اپنی زندگی میں ہر طرف پھول ہی پھول کھلتے نظر آتے ہیں، لیکن وہی خوشگوار حقیقتیں ببول اگادیتی ہیں جب وہ ایسے وقت اور ایسے ماحول میں منکشف ہوتی ہیں جب دل کی بستی بنجر، ویران اور خشک ہورہی ہوتی ہے۔ میرا دل تمہاری لاعلمی اور غلط فہمی کو دیکھ کر جلنے لگا کہ تمہیں محبت بلکہ سعد کے الفاظ کے مطابق عشق کے اس اظہار نے، بجالوں جو تمہارے دل میں پھول کھلانے کے بجائے ببول اگادے۔ تم سے دوسری ملاقات حیرت انگیز تھی۔ تمہارے انداز، اعتماد اور تمہارے لہجے کی Surity نے مجھے حیران کردیا۔ چھتیس گھنٹے پہلے تم ایک ہاری ہوئی، دل شکستہ لڑکی نظر آرہی تھیں اس انکشاف نے صرف چھتیس گھنٹوں کے اندر تمہیں سرتاپا بدل کررکھ دیا۔ یہ انکشاف تم پر اچانک کیسے وارد ہوا میں بے خبر ہوں، مگر میں اس جذبے کی طاقت کا پہلے بھی قائل تھا، تمہاری کیفیت دیکھ کر میرا یقین اور بھی پختہ ہوگیا۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"اور اب!" ماہ نور نے اپنے ہونٹوں سے ہاتھ ذرا سا ہٹاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ "اب میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، میں انکشاف کی طاقت کی تصویر نظر آتی ہوں یا نارسائی کے کرب کی۔"

"دونوں کی درمیانی کیفیت کی۔۔۔" وہ نرمی سے بولے۔

"آپ۔" ماہ نور نے بے چینی اور وحشت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ "آپ کے لیے سب کچھ ممکن ہے؟" اس کی آواز بھرا رہی تھی، "یہ پوری دنیا آپ کی رسائی کے لیے محض ایک چھوٹا سا گاؤں ہے پھر آپ کیوں پتا نہیں کرتے، آپ کیوں اس کے پیچھے جاکر اسے ڈھونڈ نہیں لاتے، اپنے لیے نہ سہی، میرے لیے ہی ایسا کردیں، پلیز۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ میرے لیے اسے ڈھونڈ لائیے، میں کمزور ہوں اور میری رسائی بہت محدود ہے۔ پلیز آپ کچھ کیجیے، خدا کے واسطے اسے ٹریس کرلیجیے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور اس نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلال نے اس کی آنکھوں سے بہتے ان آنسوؤں کو دیکھا۔ اس کے منتشر بالوں اور گلابی ناک پر نظر ڈالی اور سامنے دیکھنے لگے۔

"سائمن اختر تم نے کہا تھا کہ یہ لڑکی سعد کی وجہ سے آزمائش میں پڑے گی۔" انہوں نے سوچا۔ "اور اس کم عقل سعد کو دیکھو جس آزمائش سے اسے بچانے کے لیے اظہار سے گریز کرتا رہا خود اپنے ہاتھوں اسے اسی آزمائش سے دوچار کرگیا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ میرے کہنے پر واپس آجائے گا؟"

انہوں نے گلاس سے پانی کا گھونٹ پینے کے بعد کہا۔

"نہیں وہ جو سوچ کر گیا ہے، اسے اس سوچ کے تجربے کرلینے دو، اسے معلوم ہولینے دو کہ اس بھری دنیا میں

انسان تنہا ہو جائے تو دل کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اسے پتا چل جانے دو کہ اس اتنی بڑی دنیا میں جھوٹا سچا ہی سہی ایک رشتہ بھی کافی ہوتا ہے اسے رشتوں ناتوں اور تعلق کی قدر ہو لینے دو' ایک Priviliged "(پر یوی لیجڈ) زندگی سے نکل کر Unpriviliged زندگی کا تجربہ کر لینے دو' بھرے پیٹ کھانے کا برتن توڑ دینا شاید بہت بڑی فینسٹی ہوتی ہے بھوک لگنے پر اس برتن کا نہ ملنا ہی اس کی یاد بھی دلاتا ہے اور قدر بھی کراتا ہے۔"

"یہ آپ کی سوچ ہے نا!" ماہ نور نے تڑپ کر کہا۔ "آپ اسے خود سے بغاوت کرنے کا سبق سکھانے پر تل گئے ہیں' جبکہ آپ بھی جانتے ہیں کہ اس نے یہ بغاوت بے سبب نہیں کی' اسے اور آپ کو اطمینان سے بیٹھ کر آپس میں ایک طویل ڈائیلاگ کی سخت ضرورت ہے' ایک ایسا ڈائیلاگ جس میں انا' بدگمانی اور شک انوالو نہ ہو۔ جس میں اتنے قریبی تعلق کے باوجود ایک انجانا سا فاصلہ انوالو نہ ہو' آپ کیوں نہیں سمجھتے کہ ایسا نہ کر کے آپ اس کا اور اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

اس نے بے بسی سے بلال سلطان کی طرف دیکھا وہ اس کی بات غور سے سن ضرور رہے تھے' مگر ان کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

"وقت!" ان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری' ایک تمسخر اور طنز بھری مسکراہٹ۔ "میں وقت ہی کی چوٹ تو کھایا ہوا ہوں' وقت کی مار۔" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "جس کے دیے زخموں کا کوئی علاج نہیں' جس کی دی چوٹوں کے درد سے کوئی مسیحا نجات نہیں دلا سکتا۔ کیونکہ وقت زخم دے کر آگے بڑھ چکا ہوتا ہے اور انسان کچھ نہیں کر پاتا۔ وقت کا ذکر مت کرو لڑکی' وقت بڑی ہی ظالم شے ہے۔"

"یعنی آپ سعد کو بھی یہ ہی سبق سکھانا چاہتے ہیں کہ وقت کی مار بڑی ظالم شے ہے۔" ماہ نور ان کی بات بالکل بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔

"نہیں۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "میں اسے کوئی سبق نہیں سکھانا چاہتا' میں تو عمر بھر اسے ایسے اسباق سے بچانے ہی کی کوشش کرتا رہا۔ یہ اس کی اپنی ضد ہے کہ اسے سبق سیکھنا ہے۔ میں تو اس سلسلے میں بڑا ہی بے بس ہوں' کیوں کہ اپنی زندگی میں' میں نے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو اتنا ضرور سیکھا ہے کہ جو کچھ لکھا جا چکا ہے' اسے پیش آنا ہی آنا ہے' کوئی تدبیر' کوئی کوشش آنے والے اچھے یا برے وقت کو ٹال نہیں سکتی اور اسی چیز کو شاید تقدیر کہا جاتا ہے۔"

ماہ نور نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ وہ بہت گہری بات کر گئے تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر کچھ سوچ کر منہ بند کر لیا۔

"تمہارے لیے بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ صبر کرو اور وقت کا انتظار کرو' دیکھو' وہ تمہارے لیے کیا Unfold کرتا ہے۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ تم میرے لیے سعد کا دیا وہ سرپرائز ہو جس کی میں بالکل بھی توقع نہیں کر رہا تھا۔"

"وہ کیسے؟" ماہ نور نے بے اختیار پوچھا۔

"سعد ان لوگوں میں سے ہے' جو جب کچھ کر لینے کی ٹھان لیتے ہیں تو نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر بس کر گزرتے ہیں' جو کچھ وہ کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ اس میں وہ کسی دوسرے کا مشورہ مانتے ہیں' نہ تجویز' نہ ہی وارننگ' حیرت ہے تم سے اسے عشق ہو گیا اور اختر کی ایک وارننگ نے اسے اس کے اظہار سے روک دیا۔"

ماہ نور نے سر جھکا لیا۔

"وہ بہت سمجھ دار' بہت Composed لڑکا ہے' بہت آرگنائزڈ اور ٹھہرا ہوا' لیکن اس کے اندر کی کیفیات اس ٹھہراؤ اور سمجھ داری کے بالکل متضاد ہوتی ہیں۔ اس کے عمل میں بظاہر وہ بے چینی اور بے قراری نظر نہیں

آتی جو اس کی روح کو بے قرار کیے رکھتی ہے۔ اس لیے کہ وہ زندگی کو آرگنائزڈ طریقے سے گزارنا جانتا ہے' ہر جو بات اس کے ذہن میں ایک بار سما جائے۔ اس پر عمل اس نے ہر حال میں کرنا ہوتا ہے۔ یہاں عمل کرنے کے لیے وہ اپنے دماغ میں دو تین طرح کے پلان ترتیب دیتا ہے۔ جہاں پلان اے چلنے کا امکان کم نظر آتا ہے وہاں فوراً "پلان بی" اختیار کر لیتا ہے' وہ نہیں تو پھر اس سے اگلا یا پھر اس سے بھی اگلا پلان' اپنی سوچ کو عملی جامہ کسی نہ کسی طریقے سے پہنا کر چھوڑتا ہے' مگر تمہارے سلسلے میں اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے تمہارے لیے اپنے جذبے کو محبت کے بجائے عشق کا نام دیا ہے تو میں سمجھ سکتا ہوں وہ عشق' کس درجے کا ہو گا۔ لیکن وہ اس احساس' اس جذبے کے ساتھ تم سے ملتا رہا اور پھر بھی اظہار سے گریز کرتے ہوئے تمہیں خود سے اور خود کو تم سے بچاتا رہا محض اختر کے وارن کرنے پر۔۔۔ اس کا مطلب ہے۔" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "وہ دنیا کے ہر تعلق سے زیادہ تم سے تعلق کو ویلیو کرتا ہے' کیونکہ تمہیں آزمائش میں ڈالنا اسے کسی طرح بھی منظور نہیں تھا۔"

"محض اختر کی وارننگ۔۔۔" ماہ نور نے کہا۔ "اسے اس کے کہے لفظوں پر پورا یقین تھا اس لیے اس نے۔۔۔"

"ہوں!" بلال سلطان ماہ نور کی بات کاٹتے ہوئے ہلکا سا مسکرائے۔ "تمہیں شاید علم نہیں کہ اختر نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ پوری دنیا میں ایک دل ایسا ہے جو اسے بہت چاہتا ہے' اسے اس دل کی قدر کرنی چاہیے' اس دل کو توڑنے سے بچنا چاہیے' سعد بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دل کس کا تھا' مگر اس نے اس دل سے ہی بدگمانی سے گریز نہیں کیا' ایک بار اس کے دل نے کہہ دیا کہ وہ شخص جس کا دل توڑنے سے اختر اسے منع کرتا ہے' محبت کے نہیں نفرت کیے جانے کے قابل ہے تو دیکھ لو' وہ کسی وارننگ کے' کسی تجویز کے' کسی اشارے کے بھرے میں نہیں آیا اور اس نے وہی کیا جو خود ایک بار سوچ لیا۔ اب بتاؤ' اختر کے کشف و کرامات پر یقین کیا ہوا جبکہ وہ تو آخری ملاقات تک اسے منع کرتا رہا۔"

ماہ نور کے دل نے ایک دھڑکن مس کر دی۔

"میں تمہارے اضطراب کو' بے قراری اور بے چینی کو خوب سمجھتا ہوں۔" بلال نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ اضطراب' بے قراری اور بے چینی کسی کام نہ آئے گی جب تک تمہارا اور اس کا وقت نہیں آ جاتا' اگر وہ تمہاری تقدیر میں لکھا ہے تو اس کے اور تمہاری وقت کو آنے سے کوئی روک نہیں سکتا' لیکن اگر وہ تمہارے تقدیر میں نہیں ہے تو لاکھ ہاتھ پاؤں مار لو' تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا۔" وہ یوں بولے جیسے ماہ نور کی کیفیت سے بالکل بے نیاز ہوں۔

"کوشش۔" ماہ نور کو ان کی بے نیازی پر طیش آ گیا۔ "کوشش کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"ہاں وہ کر لو' ضرور کرو۔" انہوں نے اسی بے نیازی سے کہا۔ "تمہارا دل لگا رہے گا۔"

"بہت شکریہ!" ماہ نور نے نیپکن سے اپنے ہونٹ صاف کیے اور اسے میز پر پٹخ دیا۔ "میں بھی یہیں ہوں اور آپ بھی یہیں ہیں۔ میں آپ کو دکھا کر رہوں گی کہ کوشش پیہم کیا رنگ لایا کرتی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"شیور!" وہ اس کا چیلنج قبول کرتے ہوئے جیسے محظوظ ہو رہے تھے۔

"میں اب جا رہی ہوں۔" ماہ نور نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

"وہ سب جو وہ میرے لیے چھوڑ گیا تھا' میں لے جا رہی ہوں کیونکہ وہ میرا ہے۔" اس کے لہجے میں استحقاق کا رنگ نمایاں تھا۔

"ضرور' ضرور۔" انہوں نے جواب دیا۔ "میں تمہیں بھجوانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

"شکریہ۔" ماہ نور نے سخت لہجے میں کہا۔ "میرے پاس گاڑی ہے۔"

"اچھا چلو' میں تمہیں باہر تک رخصت کرنے چلتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"زحمت مت کیجیے، کیوں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" ماہ نور نے دانت پیسے۔

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔" وہ واپس ڈائننگ چیئر پر بیٹھ گئے۔ ماہ نور انہیں خدا حافظ کہے بغیر دروازے کی طرف چل دی۔

"سنو!" بلال نے پیچھے سے آواز دی۔ ماہ نور نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

"یہ کبھی مت بھولنا کہ تم مجھے بے حد عزیز ہو، اس لیے کہ میرا بیٹا تم سے صرف محبت نہیں کمال درجے کا عشق کرتا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں دیکھتی ہوں تو دل پر قابو نہیں رہتا، دل بے اختیار بھر آتا ہے، تم کہتی ہو۔ صبر کرو، کہو کیسے صبر کروں؟"

"صبر کرو، کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں۔"

"ہائے اب اسے کیسے بتاؤں کہ جب یہ بولتی ہے تو آواز گلے سے ایسے نکلتی ہے جیسے کسی تنگ سرنگ سے کوئی پھنس پھنس کے نکلے، مجھ میں تو اسے بتانے کا حوصلہ کبھی آئے گا بھی کہ نہیں۔"

"سراج کہاں ہے، اسے کہا تھا، ماسٹرنی صدیقہ سے پیسے پوچھ آئے، دو سال ہو چکے، اسے ہم سے قرض لیے ہوئے، کیا اب بھی واپس نہ کرے گی۔"

"مانو آواز تو گھٹ ہی گئی ہے، ہائے کیا میٹھی آواز تھی تمہاری میری بہن! سُر کے ساتھ سفر کرتی تھی تو لگتا تھا مدھر جھرنا بہہ رہا ہو، ہائے ہائے طیفا تیرا بیڑا غرق ہو جائے، کسی کی آئی تجھے آجائے، دشمنی اور ایسی دشمنی پالی تو نے میری اس معصوم بہن سے کہ اس کی شکل صورت اور آواز ہی لے ڈوبا۔ نہ جیتوں میں لگتی ہے نہ مرتوں میں۔ زخم ٹھیک ہو گئے، مگر اپنے پیچھے کیسے بھیانک نشان چھوڑ گئے، خیال بھی نہیں آتا۔ یہ وہی سندر شکل ہے جسے دیکھ کر انسان کی بھوک مٹ جاتی تھی، ہائے اسی شکل کی دیوانگی نے ہی تو طیفا تجھ سے یہ وار کرایا، اس کرموں والی کا کیا قصور تھا جو اس کو اللہ نے وہ حسین شکل اور میٹھی آواز بخش دی تھی، دونوں ہی اس کا تو امتحان بن کے رہ گئیں۔"

"میں سراج کا پوچھ رہی ہوں رابعہ!"

"ہوں، ہاں... کس کا پوچھ رہی ہو...؟"

"سراج کا... کس سوچ میں گم ہو تم؟"

"کسی بھی سوچ میں نہیں، ہاں سراج باہر نکلا ہے ذرا۔"

"ماسٹرنی صدیقہ سے پیسے نہیں پوچھے اس نے؟"

"پوچھے تھے، ابھی تو اس نے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں دیا۔"

"سراج سے کہنا پھر جائے اس کے پاس تقاضا کرنے، بینک کی کاپیاں بھی نکال کر دینا مجھے، دیکھوں کتنا روپیہ پڑا ہے بینک میں۔"

"اچانک تمہیں روپے پیسے کی کیوں فکر پڑ گئی، تمہارا علاج کروا تو رہا ہے دولہا بھائی گھر کا سارا خرچا بھی اٹھا لیا اب تو اس نے۔ چاہے چور کو ٹھگ کر چاہے یار کو ٹھگ کر لاتا ہے، لاتا ہے نا، دیتا ہے نا، تم روپے پیسے کی فکر میں کیوں پڑ گئیں۔"

"مجھے علاج کے لیے پیسے چاہئیں نہ گھر کے خرچے کے لیے، مجھے تو اپنی جمع پونجی دیکھنی ہے، اتنی ہے کیا کہ میں قصد کروں؟"

"کہاں کا قصد کرنا ہے تمہیں؟"

"بتاؤں گی، پہلے جمع پونجی کی خبر لوں۔"

"اللہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہے من میں، دن بھر پڑے پڑے۔ بے چاری کی دنیا ہی الٹ گئی یک دم، اپنا یہ حال ہو گیا، دولہا بھائی بچے کو اپنے ساتھ لے گیا، کیا تو اس نے ٹھیک ہی، ماں کی یہ بھیانک شکل دیکھ دیکھ کر بچہ روتا اور ہولتا رہتا۔ ماں سامنے ہو تو اسے کیسے بچے کو گود لینے اور پیار کرنے سے روکا جائے۔ اب طفل تسلیاں تو بہت ہیں۔ دولہا بھائی کہتا ہے ذرا اس کے پاؤں زمین پکڑ لیں، وہ اس کا بہترین سے بہترین علاج کرائے گا، شکل و صورت تک کو بدلوا دے گا، لیکن کون جانے یہ کب ہو گا اور کیسے ہو گا، ٹھیک کہتے ہیں سیانے۔ مصیبت اکیلی نہیں آتی، اپنے ساتھ چاروں طرف سے منحوس خبریں لے کر چلتی ہے۔ بے چاری نے اس آفت کے ٹوٹ پڑنے پر جو واپس اپنے گھر والوں کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کی کہ دکھیا ماں باپ سے معافی مانگ لے تو پتا چلا۔ پیچھے تو جھاڑو ہی پھر چکی ہے۔ اماں، باوا اللہ کو پیارے ہو چکے اور بہن سارا پیسہ، جائیداد سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے باہر کے ملک سے پیغام بھیجا۔ "جب میرے ماں باپ نے اپنی زندگی میں تمہاری شکل تک نہ دیکھنے کا اعلان کیا تھا تو میں بھی ان ہی کی بیٹی ہوں، میں تو تمہاری طرف دیکھ کر تھوکوں گی بھی نہیں۔" یا میرے مولا! کیا کیا تیرے رنگ ہیں۔ انسانوں کی ایک ذرا سی غلطی انہیں کہاں پہنچا دیتی ہے۔ ہائے میری چاند صورت بہن، جس کی چاند صورت دیکھنے اور گلے کا سُر سننے کہاں کہاں سے لوگ اس گھر کے صحن میں اکٹھے ہوا کرتے تھے، اب نئی شکل اور گھٹی آواز لے کر سارا سارا دن کھٹیا پر پڑی آسمان کو تکا کرتی ہے۔ گلے میں آواز اٹکتی ہے، جو نکلیں تو صرف نوحے نکلیں یا مرثیے۔ یا میرے مولا، میری زندگی بھی اسے لگا دے، جو میرے حصے میں کچھ خوشیاں، کچھ نعمتیں تو نے لکھ رکھی ہیں وہ بھی اسے عطا کر دے۔ میری جھولی تو ہمیشہ سے خالی تھی، میرے جیسے تو دوسروں کے چہروں کو مسکراہٹیں دے کر خوش ہو جاتے ہیں، مجھے فرق نہ پڑے گا کہ میرے پاس کچھ ہے یا نہیں، مگر اسے بہت پڑتا ہے، بہت فرق پڑتا ہے، میرے مولا! تو اس پر رحم کر۔ ہائے وے طیفا اٹھ مرنیا، تیرا بیڑا غرق ہو جائے، کسی کی آئی تجھے آجائے وے ظالما۔"

☼ ☼ ☼
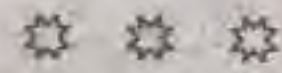
"مجھے ذرا سا بھی گمان نہیں تھا کہ تم مجھے نہیں پہچانو گی خدیجہ!" فلزا ظہور نے خدیجہ کے لاؤنج میں گیس ہیٹر کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنے سرد ہاتھ آپس میں رگڑ کر ہیٹر سے اٹھتی حدت کے قریب کر دیے۔

"تم نے شاید کبھی آئینہ نہیں دیکھا۔" خدیجہ سیدھی بات کرنے کی عادی تھیں، انہیں تلخ بات چینی کی پڑیا میں لپیٹ کر کرنا نہیں آتی تھی۔ "آج تم جیسی مجھے نظر آرہی ہو وہ اس فلزا ظہور کا بگڑا ہوا بھوت تو کہلایا جا سکتا ہے جس کو میں نے عرصہ پہلے دیکھ رکھا ہے، فلزا ظہور نہیں کہلائی جا سکتی۔"

"کیا میں اتنی بدل چکی ہوں، ایسی بدشکل ہو گئی ہوں؟" فلزا نے بے اختیار اپنے ہاتھ چہرے پر رکھتے ہوئے خدیجہ کی طرف دیکھا۔

"میں نہیں جانتی اتنے برس جو درمیان میں گزرے، تم پر کیسے گزرے لیکن اتنا اندازہ ضرور کر سکتی ہوں کہ ان برسوں کی تلخیوں نے تمہارے چہرے کے نقوش پر خاصے خوفناک اثرات چھوڑے ہیں۔" خدیجہ اسی صاف گوئی سے بولیں۔ "تمہارے چہرے کے ہر نقش پر تلخی، اکھڑ پن، بے زاری اور بد مزاجی کا رنگ نمایاں ہے۔"

فلزا کا وجود خدیجہ کی یہ بات سنتے ہوئے جیسے تناؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کے کندھے اوپر کو اٹھ گئے اور چہرہ ایک ہی جگہ ساکت سا ہو گیا۔ اس کی نظریں ایک ٹک کسی سمت دیکھے چلی جا رہی تھیں۔ جیسے خدیجہ کی بات سن کر گزرے ماہ و سال کے نفع نقصان کے اعداد و شمار کا حساب کر رہی ہوں۔

"ہوں!" چند منٹ بعد اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے خدیجہ کو دیکھا۔ "شاید تم ٹھیک کہتی ہو، میں نے

برسوں سے آئینہ نہیں دیکھا' اس خوف سے نہیں کہ میری شکل کیسی بگڑ چکی ہے بلکہ اس خوف سے کہ آئینے میں جھانکنے کی صورت میں کہیں مجھے اپنے کیے کی جھلک بھی نہ دکھائی دینے لگے۔ میں نے حقیقتوں کی بدشکلی اور بدہیتی سے فرار حاصل کرنے کے لیے برسوں سے کبھی آئینے میں نہیں جھانکا۔"

"اس سے کیا ہوا ہوگا بھلا؟" خدیجہ نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔ "حقیقتیں تو اسی طرح سر اٹھا کر اپنی جگہ پر قائم دائم رہتی ہیں جیسے اول دن تھیں۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ اتنے برس آئینہ نہ دیکھ کر تم نے خود اپنا ہی نقصان کیا' کیونکہ آج تمہیں دیکھ کر مجھے اس کے علاوہ کوئی دوسرا خیال نہیں آرہا کہ تم کوئی نہایت ہی بدمزاج' غصیلی اور مردم بے زار خاتون ہو' جس سے بات کرنا خود پر قہر برسوانے کے ہی مترادف ہوگا' شاید تم بھول گئیں کہ چہرے انسانوں کے اندرونی حالات کے سب سے بڑے غماز ہوتے ہیں۔"

"جب ہی لوگ اکثر چہروں سے ہی دھوکا کھا جاتے ہیں۔" فلزا نے کہا۔

"دھوکا دینے والے چہروں کے مالکوں کو بھی شاید یہ نہیں پتا ہوتا کہ چہروں کے پیچھے چھپے چور دوسرے چوروں کی نسبت جلدی پکڑے جاتے ہیں۔" خدیجہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"خیر اب میرا یہ چہرہ دھوکا دیتا ہے یا سچ کہتا ہے' یہ جیسا ہے ویسا ہی ہے۔" فلزا نے بات کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

"اچھا ہی ہوا جو اتنے برس میں نے اسے دیکھا نہیں' ورنہ خود سے ہی ڈر جاتی۔"

"لیکن میں تمہیں دیکھ کر ڈری تو نہیں۔" خدیجہ ہلکا سا مسکرائیں۔ "میں تو تمہارے اس چہرے کے اندر اب بھی اس فلزا ظہور کے چہرے کو کھوجنے میں مصروف ہوں' جس سے میں واقف تھی۔ اوہ" پھر انہیں خیال آیا۔

"دیکھو تو میں بھی کیسی بری میزبان ثابت ہو رہی ہوں' اتنی سردی میں تم یہاں ہم تک آئی ہو اور میں نے چائے کافی سے تمہارے مدارات کرنے کے بجائے تمہیں چہرے کے غم میں مبتلا کرنا شروع کردیا۔ تم بیٹھ کر آگ تاپو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"فاطمہ کہاں ہے میں اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوں؟"

"مجھے یاد ہے۔" خدیجہ مسکرائیں۔ "مجھ سے زیادہ تمہاری دوستی فاطمہ سے تھی۔ میں اسے تمہاری آمد کا بتاتی ہوں' وہ ایسے موسم میں اب بھی پہلے کی طرح اپنے بستر میں دبکی رہتی ہے۔"

"یہاں آنے سے پہلے میں راستہ بھر یہی سوچتی آئی تھی' مجھے بالکل اندازہ تھا کہ فاطمہ بستر میں دبکی ہوگی اور میرے لیے دروازہ تم یا تمہارا کوئی ملازم ہی کھولے گا۔"

فلزا ذرا سا پر سکون ہو کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کر بولی۔

"میں چائے نہیں' کافی پیوں گی خدیجہ! تمہارے گھر میں کافی ہے یا نہیں' اگر نہیں ہے تو مجھ سے لے لو۔ میرے بیگ میں کافی کا ڈبہ موجود ہے' کافی بینز ہیں یہ' تمہیں انہیں گرائنڈ کرنا پڑے گا۔" اس نے بے تکلفی سے فرمائش کی۔

"تلخی یا شاید تلخیوں کا ایک اور ثبوت۔" خدیجہ نے زیر لب کہا اور سر ہلاتے ہوئے فلزا کی طرف دیکھا۔

"میں کافی ہی بناتی ہوں' میرے پاس کافی پاؤڈر موجود ہے۔"

فلزا نے سر ہلایا اور خدیجہ کے کمرے سے جانے کے بعد کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے اس کا جائزہ لینے لگی۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری ممی نے کال کرکے مجھے اتنا ڈانٹا جتنا دراصل تمہیں ڈانٹنا چاہیے تھا۔" وہ فرقان ماموں تھے جو اس

روز ماہ نور کے گھر واپس آنے پر اسے اپنے منتظر ملے تھے۔

"کیوں کیا ہوا؟" اگرچہ وہ اس روز کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی' لیکن اسے فرقان ماموں کو جواب دینا ہی تھا۔

"انہوں نے تمہیں آج کتنی بار فون کیا' معلوم ہے تمہیں؟" فرقان ماموں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے اپنے بیگ میں رکھا فون ٹٹولتے ہوئے جواب دیا۔

"بیس مرتبہ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔" وہ جتانے کے سے انداز میں بولے۔

"ہو سکتا ہے۔" بالآخر فون اس کے ہاتھ میں آگیا' اس نے اس پر مسڈ کالز چیک کیں۔ "ہاں ان کی کافی مسڈ کالز ہیں۔"

"مجھے پتا نہیں چلا' میرا فون سائیلنٹ پر تھا۔"

"اسی لیے انہوں نے مجھے کال کرکے بے نقط سنائیں' ان کا خیال ہے کہ میں تمہاری طرف توجہ نہیں دے رہا' نہ ہی تمہاری ایکٹیوٹیز پر نظر رکھ رہا ہوں' الٹا میں تمہیں بے جا سہولتیں دے کر پہلے سے زیادہ بگاڑ رہا ہوں۔"

"میں بگڑ چکی ہوں کیا؟" ماہ نور نے رک کر فرقان ماموں کی طرف دیکھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟"

"خیر میں تو یہ اسٹیٹمنٹ تمہارے بارے میں نہیں دے سکتا' کیوں کہ میرے نزدیک تمہاری ایکٹیوٹیز خاصی ہومیوپیتھک قسم کی ہیں' لیکن تم اپنی ممی کو جانتی ہو نا!" انہوں نے عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اسے دیکھا۔

"تمہیں پتا ہے اسے کیسی منظم زندگی پسند ہے' میں' میری بیوی' میرے بچے' میرے بچوں کی تربیت اسے سب غلط لگتے ہیں۔ لہٰذا وہ اگر تمہیں بگڑی ہوئی سمجھتی ہے تو اس کے لحاظ سے درست ہی ہوگا۔"

"پھر۔" ماہ نور نے کہا۔ "کیا حکم ہے آپ کے اور میرے لیے؟"

"تم جانتی ہی ہو۔" فرقان ماموں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری فوراً' واپسی کا حکم ہے۔"

ماہ نور نے ان کی بات سن کر آنکھیں بند کرلیں' کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول کر فرقان ماموں کی طرف دیکھا۔

"لیکن میں تو ابھی واپس نہیں جا رہی ماموں! کیا آپ مجھے مزید اپنے گھر رہنے دے سکتے ہیں؟"

"ارے شیور!" وہ اس کے سوال پر گڑبڑا سے گئے۔ "تم جب تک چاہو' یہاں رہ سکتی ہو۔"

"اگر یہ چاہنا عمر بھر کا ہو تب بھی؟" ماہ نور نے ان سے یہ سوال یوں کیا جیسے یقین دہانی چاہتی ہو۔

"میرا خیال ہے' تمہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاکر مسکراتے ہوئے بولے۔ "میں نے صرف تمہیں تمہاری ممی کا پیغام دیا تھا۔"

"میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ان کا پیغام دے دیا۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔ "لیکن میں واقعی ابھی نہیں جا رہی ماموں! میں یہاں جو کام کرنے آئی تھی وہ ابھی ادھورا ہے اور میں نہیں جانتی کہ اسے مکمل کرنے میں کتنا وقت لگے۔"

"میں نے کہا نا' مجھے بتانے یا پوچھنے کی ضرورت نہیں' ہاں اپنی ممی کو بتانا' پوچھنا اور سمجھانا تمہارا کام ہے' میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا۔" فرقان ماموں نے کہا۔

ماہ نور نے ماموں کی طرف ممنونیت سے دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر کچھ دیر وہ دروازے کے قریب کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ اس وقت اسے اپنا ذہن ماؤف ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

"نہیں ماہ نور' یوں نہیں۔" پھر جیسے اس نے خود کو مخاطب کرتے ہوئے سر ہلایا۔

ڈپریشن' انگزائٹی' غم کے دورے' رونے کی شدت' دکھ کا بوجھ اٹھانے کی اذیت نہیں۔ جس صورت حال میں تم پھنس چکی ہو' اس میں یہ سب نہیں چلے گا۔" وہ دو تین قدم چل کر آگے بڑھی اور دیوار پر لگے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"تم بلال سلطان جیسے بڑے پلاٹر کو چیلنج کر کے آئی ہو' تم نے کوشش پیہم کا دعوا کیا ہے' اب اپنے دعوے سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنا تمہاری توہین ہے۔" اس نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو خم ٹھونکنے کا حوصلہ دیا۔ "کوشش پیہم کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹیں یہ ہی تو ہیں' ڈپریشن' انگزائٹی' غم کے دورے' رونے کی شدت' دکھ کا بوجھ اٹھانے کی اذیت۔

"نہیں ماہ نور! یہ سب نہیں چلے گا' تمہیں اپنا چیلنج پورا کرنا ہی ہو گا' چاہے کیسی ہی مشکل راستے میں کیوں نہ آئے۔" اس نے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کرتے ہوئے اپنی حوصلہ افزائی کی اور ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھا۔

"تمہارے شانوں پر پڑے بال' تمہاری اپنی کسی بھی کوشش کے بغیر اتنے سجے ہوئے اور شان دار لگتے ہیں کہ انہیں کسی بھی ہیئر ڈریسر کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اس کی نظر اپنے بالوں پر پڑی۔

"تمہاری آنکھوں کی چمک ستاروں کی چمک ماند کر دیتی ہے۔ خدا کرے تمہاری آنکھوں کی یہ چمک ہمیشہ اسی طرح قائم رہے۔" اس نے اپنی آنکھوں کو دیکھا۔

"تم مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو' خدا کرے تم ہمیشہ یوں ہی مسکراتی رہو۔" اس کے آپس میں سختی سے جڑے ہونٹ اسے نظر آ رہے تھے۔

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر آئینے کے بالکل قریب آ گئی۔ "کیونکہ لڑکی! تمہیں خدا نے جیسا بنایا ہے' تمہارا ویسا ہونا ہی دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔"

اس نے آنکھوں میں بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو چھنگلی کی جنبش سے اڑا دیا۔

"ماہ نور! میں تم سے شدید محبت میں گرفتار ہوں' شدید ترین محبت میں گرفتار۔" کسی نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"وہ پہلی نظر کی محبت نہیں' پہلی نظر کا عشق تھا۔" کوئی کہہ رہا تھا۔ ماہ نور کا دل معمول سے زیادہ تیز رفتار سے دھڑکنے لگا تھا۔ اسے لگا اس کے جسم کا خون اکٹھا ہو کر اس کے چہرے کی رگوں میں جمع ہو گیا تھا اور آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

"نہیں ماہ نور!" اس نے ایک بار پھر خود کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ "جذباتی ہونے سے کام نہیں چلے گا' راستہ مشکل اور منزل کہیں دھند کے اس پار ہے' اگر وہ تم سے عشق کرتا ہے تو عشق کے تقاضے پورے کرنے بھی لازم ہیں' وہ اظہار کر گیا' تقاضے پورے کی کٹھن ذمہ داری تمہارے حصے میں آ گئی۔ اب جذبات سے نہیں ہوش سے کام لینے سے ہی بلال سلطان کے دیے چیلنج کو سرانجام دینا ممکن ہے۔"

اپنے جذبات کو قابو کرنے میں اسے مزید پندرہ منٹ لگے' اگلے پندرہ منٹ اپنے جسم کے تناؤ اور ایب نارمل ردعمل کو قابو کرنے میں صرف ہوئے۔ ٹھیک تیس منٹ کے اندر اس کے چہرے کی رگوں میں جمع ہوا خون واپس اپنے راستوں پر دوڑنے لگا' جسم میں چلتی چیونٹیاں غائب ہوئیں اور آنکھیں بھی خشک ہو گئیں۔

اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھا۔ اسے اپنے چہرے اور آنکھوں میں اس چیز کا عکس نظر آیا' جو وہ دیکھنا چاہتی تھی۔ آئینے کے قریب سے ہٹ کر وہ اپنی شل ہوتی ٹانگوں کو آرام دینے کے لیے نیچے فلور کشنز پر بیٹھ گئی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اس نے اپنے بیگ سے اپنا فون نکالا۔ وہ اپنے بابا کا نمبر ملا رہی تھی۔

"آئی ایم سوری بابا! ایک بار پھر میں آپ کو لیٹ ڈاؤن کر رہی ہوں۔ لیکن اس بار میں سب سچ سنا کر آپ سے ایک اجازت مانگنا چاہتی ہوں۔" کچھ ثانیوں کے بعد کمرے کے خاموش ماحول میں اس کی آواز ابھری تھی۔

"اس کا نام سعد سلطان ہے بابا۔ آپ اس سے مل چکے ہیں۔ میں اسی کی خاطر اسلام آباد آئی تھی اور اسی کی خاطر یہاں رکنا چاہتی ہوں۔ بابا! آئی ایم سوری۔ پہلے میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن اب میں آپ سے سچ کہنے جا رہی ہوں۔"

وہ بول رہی تھی اور شاید زندگی میں پہلی مرتبہ بہت سوچ سمجھ کر بول رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری بدقسمت کزن شہناز۔" خدیجہ اور فاطمہ کے سامنے فلزا ظہور نے گویا سینٹر آف اسٹیج پر بیٹھے ہوئے گریک ٹریجڈی کے ایک کردار کو متعارف کرتے ہوئے کہا۔ "میری بدقسمتی میں اس کے شوہر کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔"

خدیجہ اور فاطمہ نے ایک ٹک فلزا ظہور کو دیکھتے دیکھتے رک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر توجہ فلزا کی طرف مبذول کر لی۔

"لیکن جب میں اس کی محبت میں گرفتار ہوئی' میں نہیں جانتی تھی کہ وہ شہناز کا شوہر تھا اور پہلے سے ایک بچے کا باپ بھی تھا۔"

"بچہ۔" بیک وقت خدیجہ اور فاطمہ نے اپنے اپنے دل میں کہا۔

"وہ سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ آرٹ اور لٹریچر کا دلدادہ۔ جب میرا اور اس کا پہلی بار آمنا سامنا ہوا۔ اس وقت وہ اپنے بزنس میں ترقی کی سیڑھیاں' قدم جما۔۔۔ جما کر چڑھ رہا تھا۔ وہ وہاں اسلام آباد میں تنہا رہتا تھا۔ ہماری پہلی ملاقات ایک آرٹ ایگزیبیشن میں ہوئی۔ اس نے پہلی بار میری پینٹنگز دیکھیں اور وہیں مجھ سے ملنے آ گیا۔ ہم نے دیر تک آرٹ کی ہسٹری پر گفتگو کی۔ اس کا علم باکمال اور میرا فن بے عیب تھا۔ اس ملاقات میں ایک دوسرے سے رخصت ہونے کے وقت تک ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے اور مزید ملاقاتوں کے خواہش مند بھی تھے۔ پہلی ملاقات آئندہ ہونے والی کئی ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا تحمل' ایک عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی' مگر وہ اتنا کمپوزڈ اور آرگنائزڈ تھا کہ اس کے منہ سے کبھی کوئی غیر ضروری بات نہیں نکلی تھی۔ ہم گھنٹوں اپنے اپنے پسندیدہ مصوروں' اسکول آف تھاٹس' پیریڈز آف آرٹ' مصنفین' کتابوں' شاعروں اور شاعری پر بات کرتے اور اس گفتگو کے دوران بھی کبھی اس نے کوئی فالتو بات نہیں کی تھی اور میں شاید اس کی اسی خصوصیت پر مرمٹی تھی۔ جتنا وہ فالتو بات کرنے سے گریز کرتا اتنا ہی میرا دل اس کی طرف مائل ہوتا۔ ان دنوں میں اسلام آباد میں ہی ایک اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔ اکثر شام کے وقت وہ میرے ہاں آ جاتا۔ میری ادھوری' مکمل پینٹنگز دیکھتا۔ ان پر رائے دیتا اور کبھی کوئی ایسا نکتہ بھی بتا دیتا جس کو سن کر مجھے اپنے کام میں بہتری لانے میں آسانی رہتی۔ اس کی اپنے ہاں آمد میرے اندر ایک نیا جوش اور شوق پیدا کر دیتی۔ شاید اس سے ملاقات کے بعد وجود میں آنے والا میرا سارا آرٹ اس کو خوش کرنے کے لیے ہی تھا۔ وہ میرے کسی فن پارے کو سراہتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے پوری دنیا فتح کر لی ہو۔"

فلزا نے رک کر خدیجہ اور فاطمہ کی طرف دیکھا' جو عمر کے اس حصے میں تھیں جہاں بہت سی باتیں چونکا دینے اور حیرت میں مبتلا کر دینے والی نہیں لگتیں۔ ان دونوں کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کہہ رہی ہوں' یہ تو ہو گیا۔ بی بی! آگے بتاؤ کیا ہوا۔

"وہ میرے کام کو سراہتا' میری مہارت پر حیران رہ جانے کی بات کرتا' لیکن ایک سال' دو مہینے کی ملاقاتوں میں مجھے کبھی یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ خود میرے بارے میں اس کی کیا رائے تھی' نہ اس کی آنکھوں نے کبھی یہ تاثر دیا' نہ ہی الفاظ نے کہ وہ بھی مجھ پر اسی طرح فدا تھا جیسے میں اس پر۔"

"تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا آگا پیچھا کیا تھا۔ اس کے گھر والے' ماں' باپ' بہن' بھائی۔" خدیجہ نے سوال کیا۔ "اگر تمہیں یہ لگا کہ وہ شادی شدہ نہیں ہے تو تم نے شادی کرنے کے بارے میں اس کا خیال نہیں پوچھا کبھی؟"

"میں سچ کہوں۔ وہ ایسا تھا کہ اسے دیکھتے ہوئے' اس کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے ذہن سے اس کے سوا دوسرا ہر خیال مٹ جاتا تھا۔ میرے ذہن میں صرف اس کا' اس کے میرے ساتھ موجود ہونے کا خیال باقی رہ جاتا تھا یا پھر یہ کہ یہ کتنی دیر کے لیے میرے سامنے' میرے ساتھ موجود ہے۔ چند گھنٹے جن کا ایک ایک لمحہ یوں بھاگا چلا جا رہا ہے۔ میری مٹھی میں بند چند گھنٹوں کی رفاقت کا ذرہ ذرہ ایک کے بعد ایک کرکے گرتا جاتا اور جب اس کی رخصت کا وقت آجاتا تو جیسے کسی طلسم میں بند میرا سحر ٹوٹنے لگتا۔ خیال اور سوال ذہن میں امڈنے کا وقت آنے لگتا۔ لیکن وہ رخصت ہو چکا ہوتا۔"

"یہ کتنے برس پہلے کا واقعہ ہے؟ کیا اس وقت تمہاری عمر اس طوفانی محبت کی تھی۔" خدیجہ نے حسب عادت لگی لپٹی کے بغیر سوال کیا۔

"شاید نہیں۔" فلزا نے سر ہلایا۔ "لیکن طوفانی محبت ہو جانے کے لیے عمر کی تو کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ وہ تو ہونے پر آئے تو تمہیں بھی اس عمر میں بھی ہو سکتی ہے۔"

"لاحول ولا..." خدیجہ نے بے اختیار کہا اور مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر فاطمہ کی کہنی اپنی پسلی میں چبھتی محسوس کرنے پر خاموش ہو گئیں۔

"وہ بتاتا تھا' وہ سیلف میڈ انسان تھا۔ اس کا باپ کسی گورنمنٹ کالج میں لیکچرار تھا۔ مگر بہت کم عمری میں اس کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد ماں کے گھر والوں نے اس کی دوسری شادی کر دی اور وہ اپنے چچاؤں اور دادی کے پاس رہ گیا۔ باپ نے جائیداد' گھر' روپیہ پیسہ جیسی کوئی ایسی چیز ترکے میں نہیں چھوڑی تھی جو اس کے کام آتی۔ چچاؤں' ان کی بیویوں اور دادی کی جھڑکیاں' گھرکیاں سنتے۔ اس نے گریجویشن کر لیا۔ ماں جو دوسری جگہ بیاہی گئی تھی۔ ٹی بی کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ چچاؤں نے مزید پڑھانے سے انکار کر دیا۔ تو وہ اپنی قسمت خود بنانے نکل کھڑا ہوا۔"

"تو شہناز سے کہاں ٹکرا گیا۔ اس بد قسمت کا کیا ہوا۔ یہ تو بتاؤ' جو اصل بات ہے' وہ بتا نہیں رہیں۔ ادھر ادھر کی سنائے جا رہی ہو۔" خدیجہ نے کہا۔ اس بار فاطمہ کی کہنی بھی انہیں کہنے سے نہیں روک سکی تھی۔

"ابھی شہناز اس قصے میں آئی کہاں ہے' جو بتا دوں۔" فلزا نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"تو شروع تو شہناز سے ہی ہوئی تھیں نا کہ وہ بد قسمت تھی۔" خدیجہ کو داستان گوئی کے اس انداز پر غصہ آنے لگا۔

"وہ جملہ میں نے اس شخص کے تعارف کے لیے بولا تھا۔ جو اس کا شوہر تھا۔"

"اور بد قسمتی سے جس سے تمہیں محبت ہو گئی۔" فاطمہ نے اس بار بولنے کا فریضہ خود انجام دے لیا۔ وہ فلزا کی داستان اسی ترتیب سے سننا چاہ رہی تھیں۔ جس ترتیب سے فلزا سنا رہی تھی۔

"ہاں..." فلزا نے سر ہلایا۔ "جن دنوں میری ملاقات اس سے ہوئی وہ آگے بڑھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ چھوٹے موٹے کام کرکے اس نے تھوڑا سرمایہ جمع کر رکھا تھا اور پھر وہ سرمایہ کسی کے ساتھ بزنس میں انویسٹ

کردیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنی انویسٹمنٹ کے ثمر کا منتظر تھا۔ پنڈی میں ایک عام سے علاقے میں کرائے کے کمرے میں رہتا تھا۔"

"اور سج سنور کر تمہارے پاس تمہارے فن پر گفتگو کرنے آیا کرتا ہوگا۔" خدیجہ نے کہا۔ "فراڈیا کہیں کا یوں ہی کسی طرح شہناز بے چاری کو بھی پھانس لیا ہوگا اس نے۔"

"نہیں' وہ سج سنور کر نہیں آتا تھا۔" فلزا نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ تھا ہی ایسا کہ جو پہنتا تھا' وہ اس پر سج جاتا تھا۔"

"کیا تمہیں اس سے پہلے کوئی مرد ایسا نہیں ملا تھا جو تمہارے دل کو بھا جاتا۔" فاطمہ نے پہلا سوال کیا۔

"فاطمہ! تم تو مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔" فلزا نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "تمہیں یاد ہے نا کہ میں کیسی ہوا کرتی تھی' خود میں گم' اپنے مشغلے میں مگن' میں نے کسی بھی مرد کے بارے میں کبھی سوچا کہاں تھا اور تم میری کم رولی سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ اگر کوئی میرے دل کو بھا بھی جاتا تو ایسے مرد نے مجھے گھاس ہی کہاں ڈالنی تھی۔"

"تو یہ بے چاری تو خاصی خود آگاہ ہے' میں نے ناحق ہی دل توڑنے والی باتیں کیں اس سے۔" خدیجہ نے دل میں سوچا۔

"پھر اس شخص نے تمہیں کیسے گھاس ڈالی۔" وہ پھر بھی اپنی عادت سے مجبور ہو کر پوچھنے لگیں۔

"اس کے ساتھ میری کیمسٹری مل گئی تھی۔ اسے میرے آرٹ نے اپنی طرف متوجہ کیا اور مجھے خود اس نے۔"

"آگے سناؤ۔" فاطمہ نے خدیجہ کا منہ کھلتے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر انہیں کہنی مارتے ہوئے کہا۔

"ایک عرصے تک بات صرف ملاقاتوں اور فن و ادب پر باتوں تک محدود رہی۔ اس دوران وہ ترقی کا زینہ ایک ایک اسٹیپ اوپر چڑھتے ہوئے طے کر رہا تھا۔ اس سفر کے دوران ہی میں نے دیکھا۔ اس کے لباس کا رنگ ڈھنگ بدلا' پرانی پتلون اور ملگجی قمیص اتری اور ان کی جگہ شہر کے بہترین ٹیلرنگ ہاؤس سے سلوائی ہوئی قمیص اور پتلونیں لینے لگیں۔ سگریٹ کا برانڈ بدلا' کبھی کبھار سگار بھی انگلیوں میں رہنے لگا۔ بالوں کو برش کرنے کا انداز بدلا' جوتے کا لیدر مہنگا ہونے لگا۔ وہ ایک جدوجہد کرتے انسان کا کامیابی کی طرف بڑھنے کا سفر تھا۔ میں اس کی کامیابی کے نشان دیکھ کر اور عنوان بڑھ کر خوش ہوتی رہی۔ مجھے اس بات سے سروکار نہیں تھا کہ وہ rags سے Riches کا سفر طے کر رہا تھا۔ مجھے اس سفر کے پڑاؤ اور منزلیں دیکھنے میں لطف آتا تھا۔ وہ کما رہا تھا۔ کتنا اور کیسے؟ یہ میری دلچسپی کا محور نہیں تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ ایک عام سے علاقے کے کرائے کے کمرے سے اٹھ کر پہلے کرائے کے ایک انڈیپینڈنٹ مکان میں منتقل ہوا اور پھر اس مکان سے ولیسٹر ریج کے ایک بنگلے میں۔ اس ایک بنگلے کے بعد نجانے کتنے اور کہاں کہاں بنگلے' پینٹ ہاؤسز' اپارٹمنٹس' اور محل اس کے مقدر نے اسے عطا کیے۔ میں نہیں جانتی۔ میرا اور اس کا ساتھ ولیسٹر ریج کے بنگلے تک ہی رہا۔

ان دنوں میں ہی پہلی بار اس نے مجھے میرے مستقبل کے بارے میں سہانے خواب دکھانے شروع کیے۔ وہ میرے لیے ایک نیسٹ ٹو آرٹ اسٹوڈیو بنانے کی بات کرنے لگا۔ ملک کے سب بڑے شہروں میں میری سولو ایگزیبشنز فنانس کرنے کا ذکر کرنے لگا۔ وہ مجھے دنیائے مصوری میں ایک ہونہار اور ابھرتی ہوئی مصنفہ کے طور پر متعارف کروانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اسی مقصد کے لیے اس نے مجھ سے میرا پورٹ فولیو بنوایا۔ اس وقت اس کا بزنس اتنا سیٹل ہو چکا تھا کہ وہ یہاں تک بھی کہنے لگا تھا کہ وہ ملک سے باہر بھی میرا کام انٹروڈیوس کروائے گا۔ میں اس کی برسوں سے جو پوجا اپنے دل میں کر رہی تھی' میرے نزدیک اس کے رنگ لانے کے دن آ رہے تھے۔ میں نے ان سالوں میں جتنے پورٹریٹس' چارکول اسکیچز اور بسٹ اس کے بنائے' پوری زندگی میں کسی دوسرے

شخص کے نہیں بنائے۔ بلکہ شاید کسی کے بنائے ہی نہیں۔ بنائے بھی تو اولین کاوشوں کے دوران جن کا کوئی ریکارڈ میرے پاس نہیں۔ وہ اپنے لیے میرے جنون کو جانتا تھا' سمجھتا تھا' لیکن اس کے متعلق اس نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان میرا اور اس کا موضوع کبھی آیا ہی نہیں۔"

فلزا سانس لینے کے لیے رکی۔ خدیجہ اور فاطمہ کے ذہن میں بہت سے سوال سر اٹھا رہے تھے۔ لیکن اب وہ پہلے سب سن لینا چاہتی تھیں۔

"پھر ایک رات اچانک اس نے مجھے فون کیا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا اس رات کے وقت میں اس کے ساتھ لاہور تک کا سفر کر سکتی ہوں۔"

خدیجہ کے حلق تک سوال اٹھا۔ جسے انہوں نے بڑی دقت سے واپس دھکیلا۔

"میرے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا اور اس سوال کے آگے معمول سے کہیں بڑا سوالیہ نشان بھی موجود تھا۔ وہ مجھ سے ایسا کیوں کہہ رہا تھا۔ وہ مجھے لاہور کیوں لے جانا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں اٹھتے ان سوالوں کا جواب میرے بغیر پوچھے خود اسی نے دے دیا۔ اس نے بتایا کہ لاہور میں اس کے ایک نامور مصور دوست کے گھر ڈنر پر کچھ اور نامور آرٹسٹ بھی اکٹھے ہو رہے تھے۔ وہ میرا کام مجھ سمیت وہاں لے جانا چاہتا تھا۔ "تمہارا کام اس لیے کہ اب اس کی پروموشن کی طاقت مجھ میں ہے۔ طاقت سے میری مراد سرمایہ ہے۔" اس نے کہا تھا "اور تم اس لیے کہ رات کے وقت اس سفر کو تنہا طے کرنے کے بجائے تم جیسی رفیق کے ساتھ کرنا یقیناً" میرے لیے ایک حسین تجربہ ہوگا۔" اس کی اس بات کو سن کر میری روح تک خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی نئی نئی خریدی زیرو میٹر گاڑی میں لاہور تک کا سفر میرے لیے جنت تک کے سفر کے برابر تھا۔"

خدیجہ نے بے چینی سے پہلو بدلا' مگر خاموش رہیں۔

"آج تک مجھے وہ سفر کسی خواب کی مانند لگتا ہے۔ راستوں پر پھیلی روشنی' راستوں پر چھایا اندھیرا' کہیں راستوں پر چھائی سنسانی' کہیں راستوں پر نظر آتی آبادی' نئی گاڑی کی ہموار' ایک سی بے آواز رفتار' اس زمانے کا سریلا میوزک اور اس کا ساتھ' اس کی آواز' اس کی گفتگو' مجھے لگا رات کا وہ نصف حصہ میں کسی جنت میں گزار رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا وہ سفر کبھی ختم نہ ہو' مگر سفر تھا کہ گام گام طے ہوا چلا جا رہا تھا۔ رات کے اس نصف حصے میں پہلی بار وہ اپنے بارے میں مجھ پر کھلا تھا۔ وہ سب کچھ دسترس میں ہوتے ہوئے بھی تنہا تھا۔ وہ زندگی بھر کے لیے کسی ساتھی کو اپنی زندگی میں خوش آمدید کہنے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے کئی بار گلہ کیا کہ وہ وقت جیسی ظالم چیز کے ہاتھوں بلیک میل ہوتا چلا آیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اس پوزیشن میں آ چکا تھا کہ وقت کو شکست دے سکے۔ اس کی گفتگو کے مفہوم کو سمجھتی میں جنت میں چار طرف قلانچیں بھرنے لگی تھی۔ اس نے کہا کہ بس ایک دو دن کی بات ہے۔ متوقع خوشیاں جو اس کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ ان کے لیے وہ اپنے دروازے کھول دے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میرے جیسی خوب صورت دل رکھنے والی خاتون کے لیے اس کے دل میں بے پناہ قدر ہے اور بے شمار جگہ بھی۔ اس نے کہا' اس کی شخصیت میں بے شمار کجیاں تھیں۔ ان کجیوں کے باوجود کیا میں اپنے دل میں اسے جگہ دے پاؤں گی۔ میں خوشی سے اچھلتے دل پر قابو پانے میں اس قدر مشغول تھی کہ اس کی بات کا جواب دینے کے لیے ڈھنگ کے الفاظ بھی مجھے سوجھ نہیں پا رہے تھے۔"

فلزا کی نظریں سامنے ٹکی تھیں۔ جیسے ماضی کے پردے پر کوئی خوش گوار منظر دیکھ رہی ہوں۔

"بہت زیادہ تفصیل میں پڑ گئیں تم فلزا! یہ بتاؤ آگے کیا ہوا؟" خدیجہ اپنی بے چینی کب تک چھپاتیں' یقیناً" اس عمر میں انہیں فلزا کا اپنے رومانس کا یوں ذکر کرنا انہیں پسند نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں' شاید میں زیادہ تفصیل میں پڑ گئی۔" فلزا نے چونک کر سر ہلایا۔ اس کے لہجے میں درد سا اتر آیا۔ "شاید

مجھے خیال نہیں آرہا کہ وہ رات جو میری زندگی کا حاصل تھی' اس کے قصے میں کسی دوسرے کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

"اچھا نا۔ تم اسی طرح سناؤ جیسے سنا رہی تھیں تمہاری باتیں میری سمجھ میں آرہی ہیں اور دلچسپ بھی لگ رہی ہیں۔" فاطمہ نے خدیجہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد وہ رات ختم ہو گئی۔ اس کا وہ نصف پہر شاید منٹوں میں گزر گیا۔ صبح کی روشنی پھیلی اور ہم لاہور پہنچ گئے۔ لاہور جو میری جائے پیدائش تھا۔ اس کے بعد شاید مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔" فلزا کے چہرے پر تلخی پھیلی۔

"وہ مجھے اس مصور دوست کے گھر لے گیا جس کے ہاں ناشتے پر بہت سے ایسے لوگ مدعو تھے جن کو وہ میرا کام دکھانا چاہتا تھا۔ میری پینٹنگز' اسکیچز اور مجسموں پر اس نے اتنی تفصیل سے گفتگو کی کہ میں خود بھی حیران رہ گئی۔ وہ ان کے تکنیکی پہلوؤں سے اتنا واقف ہو گا۔ میں بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کی گفتگو اور میرے کام کو حوصلہ افزا رسپانس ملا۔ اس نے مجھے کئی ایسے لوگوں سے ملوایا جو آئندہ میری رہنمائی کر سکتے تھے اور جن کے اسکولز آف تھاٹ پر مجھے غور و خوض کرنے کی ضرورت تھی۔ صبح کا ناشتا تقریباً" دوپہر کو ختم ہوا۔ پھر وہ مجھے لے کر ایسی دکانوں پر پھرتا رہا جہاں میرے کام سے متعلق سامان کھلی مارکیٹ کی نسبت خاصا سستا مل جاتا تھا۔ اس نے جو سامان ان دکانوں سے خرید کر مجھے دیا۔ وہ دو سالوں کے کام کے لیے کافی تھا۔ اپنے لیے اس کی یہ توجہ مجھے ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔"

"تمہیں ملک کی صف اول کی مصورہ بنا دیکھنا میرا خواب ہے فلزا اور اس خواب کو تعبیر میں ڈھالنے کے لیے مجھے جو بھی کرنا پڑا مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکا۔ میں کروں گا۔"

اس شام ایک کافی شاپ پر بیٹھے اس نے مجھ سے کہا تھا۔

"خود کو اس آئسولیشن سے باہر نکالو' چیزوں کو ایکسپلور (دریافت) کرنا سیکھو۔ تمہیں اللہ نے بڑے ہنر سے نوازا ہے۔ آگے بڑھنے کا حوصلہ کر لو' میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ نرم لہجے میں بات کرتا میرا حوصلہ بڑھا رہا تھا اور ہوائیں مجھے اوپر' اوپر بہت اوپر اڑانے لگی تھیں۔ پھر وہ مجھ سے پبلک کال بوتھ سے کسی کو فون کرنے کی اجازت لے کر کافی شاپ سے باہر گیا اور جب وہ واپس آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"مجھے ابھی' اسی وقت کہیں پہنچنا ہے فلزا۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر۔ تمہیں کسی دوست کے ہاں ڈراپ کر دوں یا۔۔۔" اس کی آواز کسی انجانے خوف کے تحت کپکپا رہی تھی۔

"میرا تو ایسا کوئی دوست' کوئی رشتہ دار یہاں نہیں رہتا۔" اس کی گھبراہٹ نے مجھے بھی ایک یکدم سب کچھ بھلا دیا تھا۔

"میرے لیے تو ایک ایک لمحہ بہت بھاری ثابت ہونے لگا ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔

وہ اضطراب کی حالت میں تیزی سے مڑ کر دوبارہ باہر کی طرف چل دیا۔ میں بنا سوچے سمجھے اس کے پیچھے چل دی اور گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ انتہائی خطرناک اسپیڈ پر گاڑی چلاتا اندرون شہر پہنچا اور گاڑی ایک کھلے احاطے میں چھوڑ کر اس علاقے کی تنگ و تاریک پر پیچ گلیوں کی طرف بھاگا۔ میں اسی طرح بنا سوچے سمجھے اس کے تیز چلتے قدموں کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔ وہ راستہ طویل اور بھول بھلیوں ایسا تھا۔ چلتے چلتے میرا سانس پھولنے لگا۔ کمزور روشنی کی اسٹریٹ لائٹس جو کہیں کہیں جل رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھانے کے لیے بھی ناکافی تھیں کہ ہم کس سمت جا رہے تھے۔ یوں ہی چلتے چلتے ہم ایک تنگ و تاریک مکان تک پہنچے جس کی نیم روشن ڈیوڑھی کی دہلیز پر ٹھوکر کھا کر میں بمشکل گرتے گرتے بچی' چھوٹے سے صحن سے گزر کر وہ ایک کمرے میں گھس گیا۔ میں وہیں صحن میں کھڑی تھی۔ اس کمرے کے اندر سے تکلیف سے کراہتی ایک نسوانی آواز صحن تک سنائی دے رہی تھی۔

"میں آگیا ہوں میری جان! ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔" میں نے سنا' وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ میرے کان کھڑے ہوئے اور میں ان الفاظ کے جھٹکے کا شکار ہوتی کمرے کے اندر پہنچ گئی۔ میرے سامنے کھری چارپائی پر پڑا وہ نسوانی وجود' میرے حلق سے چیخیں نکلنے کا باعث ثابت ہوا۔ تم جانتی ہو فاطمہ! وہ وجود کس کا تھا؟" فلزا نے رک کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔ فاطمہ کے چہرے پر تجسس اپنی انتہا تک ابھرا۔

"وہ وجود شہناز کا تھا۔" فلزا نے گریک ٹریجڈی کے کردار کو متعارف کروانے کے سے انداز میں کہا۔ "وہ چہرہ مندمل ہو چکے عجیب سے زخموں کے نشانوں سے بھرا ہوا تھا۔ سرخی مائل سفید رنگت سیاہ پڑ چکی تھی۔ ہوش اڑا دینے والی سیاہ چمک دار آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں۔ مگر میں نے پھر بھی ایک نظر میں اسے پہچان لیا تھا۔

"شہناز تم!" میں بے قراری سے آگے بڑھی۔ میرے ان الفاظ نے اس کو بھی بری طرح چونکا دیا جو میرا محبوب تھا اور دردزہ میں مبتلا شہناز کو بھی' شہناز کی نظریں لحہ بھر کے لیے مجھ پر ٹکیں' پھر درد کی ایک لہر نے اسے دہرا کر دیا۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی' سر پٹخ رہی تھی اور میرا رفیق خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے وہ کرنے میں مصروف تھا جو کسی دایہ کے کرنے کا کام تھا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"یہ شہناز ہے۔ تم نے پہچان تو لیا۔" وہ اپنے کام میں مصروف بولا۔

"یہ تمہاری کون ہے اور یہ اتنی تنہا کیوں ہے کہ تم اس کے لیے یہ کام کر رہے ہو۔"

"یہ میری بیوی ہے۔ میرا بچہ پیدا کر رہی ہے اور اسے اس علاقے میں ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی میں نے شفٹ کیا ہے۔ ابھی میں یہاں کسی سے بھی واقف نہیں ہوں اور اس کی یہ حالت ہے کہ اسے تنہا چھوڑ کر نہ اس وقت کہیں جا کر میں کسی دایہ' کسی نرس یا ڈاکٹر کو بلا لانے کی پوزیشن میں ہوں' نہ ہی خود مجھے اس کام کا تجربہ ہے۔" اس کا اپنا چہرہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ "تم میری مدد کر سکتی ہو کیا؟"

اس نے پرامید نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ مگر میں اس بمباری کی زد میں تھی جو اس کے الفاظ کی شکل میں مجھ پر برسی تھی۔ میں بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے موجود منظر کو دیکھ رہی تھی۔ بھل بھل بہتا سرخ سرخ خون' ناتجربہ کار ہاتھوں کی لرزش' دل چیر دینے والی درد سے بھری چیخیں' میں اس منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور پوری کائنات پر تاریکی چھا چکی تھی۔ پھر ایک دلدوز چیخ کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی بچے کے رونے کی آواز۔۔۔ میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"پلیز فلزا پلیز۔۔۔ میری مدد کرو۔"

اپنے عقب میں مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ اس کے ہاتھوں میں کپڑے میں لپٹا وہ کمزور ننھا سا وجود تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور بے اختیار ہاتھ بڑھا کر گوشت پوست کا وہ جان دار لوتھڑا پکڑ لیا۔ اسی دم کمرے میں کسی چیز کے گرنے کی زوردار آواز آئی۔ وہ الٹے قدموں کمرے کی طرف بھاگا۔ میں بچہ ہاتھوں میں پکڑے کچھ سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اسی دم' اس گھر کا دروازہ کھلا اور ایک باریش شخص گھر میں داخل ہوا۔

"میں فضل حسین' میرا صاحب کدھر ہے؟" اس شخص نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے گردن موڑ کر کمرے کی طرف دیکھا۔ جہاں سے اب ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے بکرے کی گردن پر چھری پھرنے کے بعد اس کے

نرخرے کی خرخراہٹ سنائی دیتی ہے۔ ساتھ ہی دو مردانہ آوازیں گرنے اٹھنے اور چیزیں گرنے کی آوازیں' کسنے والا باریش شخص کمرے کی طرف بھاگا۔

"یہ کیا صاحب؟" مجھے اس شخص کی آواز آئی۔

"وہ ادھر کو۔" میرے محبوب کی آواز آئی۔ "میرا سب کچھ تباہ ہو گیا۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ میں روتے بچے کو ہاتھوں میں اٹھائے کمرے کی طرف بھاگی۔ میری نظروں کے سامنے ایک دل دوز منظر تھا۔ شہناز نیم برہنہ چارپائی پر پڑی تھی اور اس کی گردن کٹی ہوئی تھی۔ اس کا وجود خون میں ڈوب رہا تھا اور میرے محبوب' اس کے شوہر کے ہاتھ میں خون آلود چھری تھی۔ اس کے اپنے کپڑوں پر جابجا خون اور گرد کے داغ تھے۔

میرے حلق سے نکلنے والی چیخیں شاید کبھی تھم نہ پاتیں' جو وہ میرے قریب آکر با آواز بلند مجھے آواز نہ دیتا۔

"خاموش ہو جاؤ قلزا! یہ قیامت کا وقت ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "تمہیں اس محبت کی قسم دے کر کہہ رہا ہوں جو تمہیں مجھ سے ہے' میرے اس بچے کو لے کر یہاں سے فوری طور پر نکل جاؤ۔ اپنے ساتھ اسے بھی کسی محفوظ مقام پر پہنچا دو' تم جہاں بھی ہو گی' میں تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔"

"مگر یہ۔" میں خون میں ڈوبے شہناز کے بے جان وجود کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

"جاؤ قلزا! پلیز۔۔۔ نکل جاؤ۔" اس نے مجھے ہلکا سا دھکا دیا تھا۔ "فضل حسین اس کو باہر کھلے تک پہنچا کر واپس آجاؤ۔"

اس نے باریش شخص سے کہا' اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور تقریباً" گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ اس کے ساتھ یوں ہی گھسٹتی' ٹھوکریں کھاتی' گرتے گرتے پچتی میں نجانے کیسے کھلی سڑک تک پہنچی تھی۔ بچہ بھوک سے بلبلا کر رو رہا تھا یا اپنے وجود میں آجانے کے غم میں' جو بھی تھا' اس کے رونے کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس باریش شخص نے مجھے قریب آکر رکی ایک بس میں سوار کر دیا۔ میری ٹمز نائٹ ان ہیون ختم ہونے والی تھی اور A Dawn in hell کا سفر شروع ہو رہا تھا۔" قلزا کی آواز بھاری ہونے لگی۔

"او میرے خدا!" محویت سے سنتی خدیجہ اور فاطمہ کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ گویا جو کچھ شہناز کے بارے میں سنا تھا' سچ تھا۔ دونوں کے چہرے سفید پڑ رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اپنی فرسٹ کزن کی بھیانک موت کا قصہ سن کر دونوں کے چہروں پر ایسا تاثر تھا جیسے برسوں بعد اس کی نعش وصول کر رہی ہوں۔

"اس کے شوہر نے اسے کیوں قتل کر دیا۔ تمہارے لیے نا؟" خدیجہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور آنکھوں سے اتارا چشمہ دوبارہ آنکھوں پر جما کر قلزا کی طرف دیکھنے لگیں۔

"مجھے کچھ علم نہیں۔ کمرے میں اس وقت کیا ہوا' جب میں صحن میں کھڑی تھی' لیکن اس کے ہاتھ میں پکڑی خون آلود چھری' شہناز کی گردن کٹی نعش اور کمرے میں جابجا بہتے خون کا وہ منظر میری نظروں کے سامنے سے کبھی گیا نہیں۔ اس پر اس نے مجھے کچھ پوچھنے' کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر بچہ پکڑا کر چلتا کر دیا۔" قلزا کی نظریں ابھی بھی اپنے سامنے خلا میں ماضی کی فلم پر وہ بھیانک منظر دیکھتی دکھائی دے رہی تھیں۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟" فاطمہ نے شدت غم سے گلابی پڑتی ناک کو سوں سوں کرتے ہوئے رومال سے پونچھا۔

"اس کے بعد۔۔۔" قلزا نے فاطمہ کی طرف یوں دیکھا' جیسے اسے فاطمہ کا سوال سمجھ میں نہ آیا ہو۔ "اس کے بعد میں اس ٹوٹی پھوٹی' کھڑکھڑاتی بس میں بیٹھی کسی انجانی منزل کا سفر طے کرنے لگی۔ نصف رات بیت چکی تھی۔ اس بس میں مسافر کم تھے۔ دو خواتین اور چار یا شاید پانچ مرد' میرے سینے سے لگا وہ گوشت کا لوتھڑا رو رو کر تھک چکا تھا یا مر چکا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی' مگر وہ خاموش ہو گیا تھا اور میں اس خوف سے اسے سینے سے الگ نہیں کر رہی

تھی کہ ان چند مسافروں کی نظروں میں مشکوک نہ ہو جاؤں۔ میں نے اپنی چادر سے اسے ڈھانپ لیا اور اپنی خوف زدہ تھکی ہوئی آنکھیں موند لیں۔ جو کچھ دیر پہلے دیکھا تھا' وہ منظر خواب تھا یا حقیقت میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بس شہر کے مختلف راستوں سے گزر کر شہر سے باہر نکل گئی تھی۔ بس کے کنڈیکٹر نے مجھ سے ٹکٹ کے پیسے مانگے تو مجھے اپنے شانے پر لٹکے بیگ کا خیال آیا۔ میں نے چادر میں لپٹے بچے کو گود میں لٹایا اور بیگ سے پیسے نکال کر کنڈیکٹر کو دیتے ہوئے نیچی آواز میں پوچھا۔

"بس کہاں جا رہی ہے؟"

"بی بی! تم یہ دیکھے بغیر ہی بس میں سوار ہو گئیں کہ بس کہاں جا رہی ہے؟" کنڈیکٹر بلند آواز میں بولا اور زور سے ہنس دیا۔

"فیصل آباد جا رہی ہے بس' تم نے کدھر جانا ہے؟" پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"میں نے بھی وہیں جانا ہے۔" مجھے عجیب سی خجالت نے آن گھیرا۔

اسی دم ان پانچ' سات انسانوں کے درمیان عجیب سی کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ میں جانتی تھی' اب وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کسی کی طرف نہ دیکھنے کا فیصلہ کر لیا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔

بس تیز رفتاری سے بھاگتی چلی جا رہی تھی' کسی اسٹاپ پر رکتی' نئے مسافر بس میں سوار ہوتے۔ اکا دکا پہلے سے بیٹھا مسافر اتر جاتا' صبح کی سفیدی نمودار ہوئی' میں مجرم سی بنی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جب میری گود میں لیٹے بچے نے چیخ مار کر ایک بار پھر رونا شروع کیا۔ وہ زندہ تھا اور نیند سے جاگا تھا۔

"بچے کو دودھ پلاؤ بہن!" ایک مسافر عورت مشورہ دے رہی تھی۔

"ہائے یہ ہے کتنے دن کا اور تمہیں کس مصیبت نے آن گھیرا جو تازہ زچگی سے اٹھ کر اسے لے کر بس میں سوار ہو گئیں۔" کسی اور نے کہا۔ پھر مجھے لگا سب طرح طرح کی باتیں بنانے لگے تھے۔ میں بت بنی بیٹھی تھی۔ بچہ ایک پل خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بس ایک اسٹاپ پر رک کر دوبارہ چلی' اس میں چند نئے مسافر سوار ہوئے۔

"توبہ۔۔۔ توبہ۔" کسی کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "ریڈیو پر خبر سنی ہے ابھی ابھی' گزشتہ رات اندرون لاہور میں ایک عورت قتل ہو گئی۔ اس کے شوہر نے مبینہ طور پر اس کے گلے پر چھری پھیر کر اسے قتل کر دیا۔ قاتل رنگے ہاتھوں آلۂ قتل سمیت پکڑا بھی گیا۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ قاتل تھا۔ وہی قاتل تھا' جب ہی تو بچہ میرے حوالے کر کے مجھے بھگا دیا۔ بدگمانی کا دھواں میرے دل پر چھانے لگا۔ کیسی چال چلی اس نے' مجھے بچہ پکڑا کر چلتا کیا' تاکہ بچے سمیت میں پکڑی جاؤں اور خود۔۔۔ خود بھی کہاں بچ پایا؟

سوچتے سوچتے مجھے خیال آیا اور ایک مرتبہ پھر وہی بھیانک منظر میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ پہلی بار اس شخص کے لیے میرے دل میں نفرت کی ایک لہر اٹھی۔ راسکل' ہمروک' دھوکے باز' کمینہ' میں نے دانت پیستے ہوئے سوچا' دل چاہا' وہ چیختا چلاتا بچہ چلتی گاڑی سے اچھال کر کہیں باہر پھینک دوں۔

"لیکن میں کیوں قاتلہ بنوں؟" دماغ نے مارے غصے کے کام کرنا شروع کر دیا۔ بس ایک چھوٹے سے قصبے کے اسٹاپ پر رکی اور میں بچے کو اٹھا کر بس سے اتر گئی۔

اپنے پیچھے نجانے میں نے کتنے لوگوں کو اپنے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے چھوڑا تھا۔ وہ جگہ اجنبی تھی مجھے اس اسٹاپ کا نام بھی معلوم نہ تھا۔ میں بچے کو اٹھائے بس اسٹاپ پر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ بچے کی چیخیں دم توڑنے لگیں۔ شاید اس کے حلق نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میرے دل میں یکایک اس سے نجات حاصل کرنے کا

خیال آیا۔ اس کے قاتل باپ کے بارے میں تفتیش کرتے ہوئے جو پولیس مجھ تک آن پہنچی؟ میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ عمر زیادہ نہیں تھی۔ تجربہ کم تھا۔ آنکھوں کے سامنے کئی منظر گھومنے لگے۔ خود کو ہتھکڑی لگے دیکھا' بچے اغوا کرنے والے گروہ کی صف میں کھڑے دیکھا۔ اپنے خاندان' بہن' بھائیوں کے حیرت زدہ چہرے اور ملامت کرتی نظریں دیکھیں۔ جس شخص کے سحر میں گرفتار میں کسی کو بتائے بغیر اس کے ساتھ گھر سے چل دی تھی۔ وہ مجھے کس انجام کو پہنچانے کا باعث بننے جا رہا تھا۔

بس سیکنڈوں میں فیصلہ ہو گیا۔ میں نے دائیں بائیں' آگے پیچھے دیکھتے ہوئے ایک مناسب اوٹ تلاش کی اور بچہ وہاں رکھ کر خود تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے میں اس بس اسٹاپ کی حدود سے باہر نکل گئی۔ بس اسٹاپ سے ذرا فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ وہاں سے میں نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اسلام آباد واپس پہنچ گئی۔ سارا راستہ میں خوف سے لرزتی رہی۔ اب پکڑی گئی کہ تب پکڑی گئی۔ لیکن خدا کا شکر اپنے گھر واپس آنے تک اور اس کے بعد بھی کوئی میرے پیچھے نہیں آیا۔"

"تو پھر اس بچے اور اس کے باپ کا کیا ہوا؟ شہناز بے چاری کا کیا بنا؟" خدیجہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ!" اسی وقت کال بیل کسی اور کسی گاڑی کا ہارن بیک وقت بجنے لگے۔

"مجھے اس وقت ایک جگہ' بہت ضروری پہنچنا ہے۔" فلزا یکدم اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں نے ڈرائیور کو ٹھیک ایک گھنٹے میں یہاں پہنچنے کو کہا تھا۔ یقیناً" وہی آیا ہے۔ میں چلتی ہوں۔" وہ فاطمہ کا ہاتھ دبا کر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"لیکن تم نے ابھی پورا قصہ تو سنایا ہی نہیں۔" خدیجہ نے کہا۔

"باقی پھر کبھی سنادوں گی' اگر ملاقات ہوئی تو۔" وہ ہاتھ ہلاتی تیزی سے باہر نکل گئی۔

"فلزا سنو تو۔ تمہارا فون نمبر' تم ٹھہری کہاں ہو؟" فاطمہ اس کے پیچھے لپکیں' لیکن وہ ان کے کسی سوال کا جواب دیے بغیر تیزی سے گیٹ کھول کر گھر سے باہر جا چکی تھی۔

"بہت عجیب ہے یہ۔" خدیجہ نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ "ہمارے دلوں میں دکھ کی آگ لگا کر ادھوری بات سنا کر چلتی بنی۔"

"ہوں۔" فاطمہ کی نظریں کسی شے پر ٹکی تھیں' ان کا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
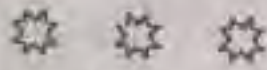
"میرے دل دا حال کوئی بھی نہیں جاندا' بھائی رضوان الحق! سب سمجھتے نیں کہ میں کملا ہو گیا ہوں۔ ایس لئی آپ نوں فون کر بیٹھا ہوں۔ شاید میری بات آپ دی سمجھ وچ آجائے۔"

"میں تمہاری بات تو سمجھ رہا ہوں بھائی افتخار' مگر میری سمجھ میں اور کئی باتیں نہیں آرہیں۔ تم ان سعد صاحب کے بھائی ہو تو کیا انہیں پتا نہیں تھا ان کا کوئی ایسا بھائی بھی ہے جو گم ہو گیا ہے۔ تمہاری بہن جی جو قصہ تمہیں سعد صاحب کے والد اور والدہ کا سناتی ہیں' اس میں بھی سعد صاحب کے کسی بھائی کا ذکر نہیں' پھر تم ان کے بھائی کیسے ہوئے؟"

"میں نئیں جاندا بھائی رضوان الحق' پر میرا ساہ پھلدا اے (میرا سانس پھول جاتا ہے) میرے قدم بھاری ہو جاندے ہیں' ٹروے ٹروے (چلتے چلتے) میں بے دم ہو جاندا ہوں۔ رب داناں ہے بھائی رضوان الحق! میرے حق اندر دعا کرو' خدا کا واسطہ ہے میرے لیے دعا کرو۔"

کھاری کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کسی سے بھی کس قسم کی اپیل کرے جو کوئی اس کے لیے آسانی پیدا

کروے۔ آپا رابعہ اپنا وقت ضائع کرنے پر اسے ڈانٹ کر واپس اپنے گھر جا چکی تھیں۔ سعدیہ کبھی اس کی حالت پر اس کا مذاق اڑاتی اور کبھی تشویش ظاہر کرنے لگ جاتی۔ اسے محسوس ہوتا کھاری پر کسی جناتی شے کا سایہ تھا۔ وہ اسے مولوی سراج سرفراز سے دم کروانے بھیج دیتی۔ مولوی سراج سرفراز دم کرنے کے بعد اسے اپنا ذہن دین کی باتوں میں لگانے کی تلقین کرنے لگتے۔ ان کا خیال تھا کھاری گاؤں کے بگڑے ہوئے لڑکوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگ گیا تھا اور اس کے خیالات بے راہ روی کا شکار ہو رہے تھے۔ دن اور رات کھاری کے لیے مشکل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ چوہدری سردار شکار سے فارغ ہو کر وہیں سے کراچی جا چکے تھے۔ کراچی سے انہیں تھائی لینڈ چلے جانا تھا اور پندرہ بیس دن سے پہلے ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسے زندگی کی نئی حکایت سنانے والی بے چیل پائی بھی اسے اس کے پیروں سے اکھیڑ کر کہیں غائب ہو چکی تھی۔

"خدا کسی نوں میرے ورگا نہ پیدا کرے' نہ پیچھے دا پتا ہے نا آگے دا' تے جے پتا لگنے لگے تو سرنا وے توں بغیر چٹھی دے وچ لکھیا ہووے۔

وہ اکثر سوچنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے اس روز جو بات تم سے کہی تھی ماہ نور! مجھے اس کا صرف شک نہیں تھا' مجھے یقین تھا کہ سعد کی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھنے والی لڑکی تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔"

سارہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ ماہ نور نے دیکھا۔ سارہ کی مسکراہٹ میں اداسی تھی۔ جسے چھپانے میں وہ ناکام ہو رہی تھی۔

"تم نے میری بات پوری سنی نہیں شاید سارہ!" ماہ نور نے کہا۔ "مجھے اس کی محبت کا اعتراف اس وقت ملا جب اپنی محبت کا احساس دلانے کے لیے وہ خود میرے سامنے موجود نہیں۔ شاید تمہیں اندازہ نہ ہو سکے کہ یہ کیسی بے بسی کی کیفیت ہے۔"

"سعد جیسے شخص کی محبت کے اعتراف کا مل جانا ہی اتنا بڑا احساس ہے ماہ نور! کہ اس کے بعد کسی دوسری سوچ کا ذہن میں آنا ممکن ہی نہیں۔" سارہ نے کہا۔ "وہ سامنے موجود نہیں' مگر وہ ہے' اسی دنیا میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اگر وہ میرے جیسی لڑکی کو جس سے اس کا فقط ہمدردی کا تعلق ہے یہ یقین دلا سکتا ہے۔ وہ میرے لیے ہر وقت کہیں بھی موجود ہے تو تم تو اس کے دل کا سب سے مقدس جذبہ ہو' سوچو وہ جہاں بھی ہے' تمہارے لیے کیا اور کیسا محسوس کرتا ہو گا۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟" ماہ نور نے بے بسی سے کہا۔ "وہ جن سے بھاگا ہے' انہیں تو اس کے بھاگنے کی پرواہ بھی نہیں۔ جسے پرواہ ہے' جو اس کے لیے دن کے چوبیس گھنٹے بے قرار ہے۔ اسے ایک بے نشاں راستے کی مسافر بنا گیا۔ بتاؤ میں اسے کہاں تلاش کروں؟"

"انتظار کرو ماہ نور! اسے ایک نہ ایک دن لوٹ کر آنا ہی ہو گا۔" سارہ نے یقین کے ساتھ کہا۔

"انتظار۔۔۔ صبر' تلاش!" ماہ نور روہانسی ہو گئی۔ "جس آزمائش سے مجھے بچانے کے لیے سعد نے کبھی میرے سامنے اعتراف نہیں کیا' اس آزمائش میں خود ہی مجھے ڈال گیا۔"

"انتظار!" سارہ نے دہراتے ہوئے کہا۔ "تلاش۔۔۔ صبر۔" وہ بڑبڑائی۔ "ہم میں سے ہر کوئی اس آزمائش میں پڑتا ہے۔ اس سے گزرتا ہے۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور اکثر کی تو تلاش' انتظار' صبر سب بے سود ہی رہتا ہے' ناکامی کا شکار۔" وہ اٹھی اور مختلف چیزوں کا سہارا لیتے ہوئے چلتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"اب یہ اکیلی بیٹھی رہے گی۔ کڑھتی اور روتی رہے گی۔" سیمی آنٹی نے کشیدہ کاری کے فریم سے نظریں ہٹا کر سارہ کو جاتے ہوئے دیکھنے کے بعد ماہ نور سے کہا۔

"کیوں؟" ماہ نور نے بے دھیانی سے سوال کیا۔ اس کی نظریں سامنے موجود بلند پہاڑوں پر جمی تھیں اور ذہن سعد سلطان کے خیالوں میں کھویا تھا۔

"میں اس سے کہتی تھی کہ سعد کے بارے میں زیادہ نہ سوچا کرے۔" سیمی آنٹی نے کہا۔ "سعد کو اس سے ہمدردی تو ہو سکتی ہے' خلوص کے ساتھ مدد کرنے کا احساس تو ہو سکتا ہے' مگر جس محبت کا خیال اس کے دل میں ہے' وہ سعد سلطان اس سے نہیں کر سکتا اور اب جبکہ اسے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ جو سوچتی تھی' وہ غلط تھا تو اسے شدت سے احساس ہونے لگتا ہے کہ جس کے جذبات اور محبت کو اس نے نظر انداز کیا۔ اس کے رویے پر اس کا کیا حال ہوتا ہو گا۔"

"ہیں!" ماہ نور اپنے خیالات سے چونک کر باہر نکلی۔ "ایسا کون تھا۔ ایسا بھی کوئی تھا؟" بے ترتیب جملے اس کے منہ سے نکلے تھے۔

"ہاں۔۔۔" سیمی آنٹی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ رکو تھا' بلیو ہیون سرکس کا ہر دل عزیز مسخرہ' جسے ہم وقت کی دھول کے بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

سیمی آنٹی کہہ رہی تھیں اور ماہ نور سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتاؤ ابراہیم' جس کے گھر کے باہر سے آخری مرتبہ تم نے سعد کو پکڑا تھا' وہ لڑکی جو معذور ہے اور بے آسرا بھی۔"

"آئی ایم سوری انکل! میں شاید آپ کو نہ بتا سکوں' وہ سعد کا ایسا معاملہ تھی جس کے بارے میں اس کی سختی سے ہدایت تھی کہ اس کے بارے میں آپ کو علم نہیں ہونا چاہیے۔" ابراہیم نے سر ہلاتے ہوئے بلال سلطان کو جواب دیا تھا۔

"گدھے ہو تم!" وہ ڈپٹ کر بولے تھے۔ "اس کے ایسے سارے معاملات' اس وقت تک میرے علم میں نہیں آنے چاہیے تھے جب تک وہ یہاں تھا اور تم اچھی طرح واقف ہو' اس وقت میں نے اس کے کسی ایسے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی تھی' لیکن ابھی وہ یہاں نہیں ہے اور اس کے جانے کے بعد اگر اس کے ایسے تمام معاملات رک گئے تو جانتے ہو کیا اور کس کا نقصان ہو گا۔۔۔"

"جج۔۔۔ جی۔۔۔ انکل!" ابراہیم ان کے لہجے کے سامنے گھگھیا کر رہ گیا۔

"اس کے ایسے تمام معاملات کی ایک فہرست بنا کر مجھے دو' جہاں اس کے اکاؤنٹس سے ہر ماہ رقم منتقل ہوا کرتی تھی اور اس لسٹ میں ٹاپ آف دی لسٹ اس معذور لڑکی کا ذکر اور تفصیل ہونی چاہیے۔"

"معاملات رک جائیں تو کیا ہوتا ہے انکل!" ابراہیم نے احمقوں کی طرح سوال کیا۔ "ان لوگوں کا کچھ اور بندوبست ہو جائے گا' اللہ ہے نا!"

"احمق لڑکے! معاملات رک جائیں تو مسائل کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں' کبھی جا کر ان لوگوں کی خبر بھی لی ہے جن کے معاملات اس کے چلے جانے کی وجہ سے رک گئے ہیں۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ درشت لہجے میں بولے "اور ہاں یہ ہی تو تمہیں بتا رہا ہوں کہ ان لوگوں کا کچھ اور بندوبست کرنا ہے' واقعی اللہ ہے نا!" آخری جملہ انہوں نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ انکل!" ابراہیم کو اگرچہ ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی، لیکن اس نے ان کی تائید میں سر ہلا دیا تھا۔

"بے چارے انکل!" بعد میں اس نے سوچا تھا۔ "سعد کے یوں چلے جانے نے ان کا دماغ بالکل ہی بے ٹھکانا کر کے رکھ دیا ہے۔"

☼ ☼ ☼
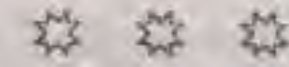
"وہ سارہ کو چاہتا تھا۔ بہت زیادہ چاہتا تھا، اس کی ہر الٹی سیدھی فرمائش پوری کرنا اپنا فرض سمجھ لیتا تھا۔ چھوٹی آنکھوں، گول ناک اور راؤنڈ چہرے والا رکو نجانے کب اور کیسے اچانک کہیں سے آ کر بلیو ہیون سرکس کا حصہ بن گیا تھا۔ بے چارہ اپنی ماں سے دور، باپ سے ذہنی فاصلوں پر کھڑا، گھر والوں کی بے نیازیوں کا شکار، گھر سے بھاگ آیا تھا اور بلیو ہیون سرکس کا حصہ بن کر ہم سب میں گھل مل سا گیا تھا۔ وہ ہم سب سے ہنسی مذاق کرتا، سرکس کے تماشائیوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرتا، کسی مہربان فرشتے کی طرح ہمہ وقت ہر کسی کی مدد کے لیے تیار رہتا، مگر سارہ کے لیے اس کے جذبات بالکل مختلف تھے۔ خاص اور جان دار!"

یمی آنٹی بتا رہی تھیں اور ماہ نور خاموشی سے سن رہی تھی۔

"وہ اس کو پریا رانی کہہ کر بلاتا تھا۔ سارہ کو پالنے والا ماسٹر خان اس کو پری یا پریا رانی کہہ کر بلاتا تھا، اس کے علاوہ رکو تھا جو اسے پریا رانی کہا کرتا تھا۔ اس کے ہر عمل سے سارہ کے لیے پیار جھلکتا تھا، مگر سارہ نے کبھی اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا جب یہ چھ انچی بار پر کرتب دکھاتی نیچے گری، وہ رکو ہی تھا جو سرکس کے پردے کے پیچھے بیٹھے سب فنکاروں کو وہیں چھوڑ کر پنڈال میں داخل ہوا اور تماشائیوں کو دھکیلتا، اس جگہ جا پہنچا جہاں سارہ گری تھی۔ سارہ کو اٹھا کر چھولداری میں لانے اور فرسٹ ایڈ دینے کے دوران وہ وہیں موجود رہا، میں بھی وہیں موجود تھی پھر سرکس کے مالک ماسٹر کا فو نے رکو کو اپنے پاس بلوایا۔ اس کے بعد میں نے رکو کو نہیں دیکھا، نہ سرکس رنگ میں، نہ ہی کرتبوں کی پریکٹس کرنے والے میدان میں، نہ ہی سارہ کی چھولداری میں، چند دن کے وقفے کے بعد جب سارہ کے زخم خراب ہونے لگے تو کسی فرشتے کی طرح سعد سلطان آ گیا اور سارہ کو وہاں سے اٹھا لایا، میں سارہ کی حالت دیکھ کر اسے اکیلے جاتے نہ دیکھ پائی اور ساتھ ہو لی، بلیو ہیون سرکس اور وہ جاپانی گڈا رکو پیچھے رہ گئے اور ہم آگے نکل آئے اس کے بعد مجھے علم نہیں بلیو ہیون کا کیا ہوا، رکو کہاں غائب ہوا تھا، وہ واپس بلیو ہیون آیا یا نہیں۔

ہاں، شروع شروع میں بلکہ اس کے بہت بعد تک سارہ کو بلیو ہیون والوں میں اگر کوئی یاد آتا تھا تو وہ رکو ہی تھا۔ اکثر نیند میں یہ چیختے چلاتے ہوئے اسے آوازیں دیتی، اسے پکارتی اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی، میں نے اسے سمجھایا، رکو کو یاد کرنا چھوڑ دے، وہ اپنی دنیا میں مگن ہو گا، اسے اس کی فکر ہوتی تو اسے ڈھونڈ لیتا، میں ایسا دانستہ کیا کرتی تھی تاکہ یہ اسے بھول جائے کیونکہ اس کو یاد کرنے میں اسے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب اتنے عرصے کے بعد سعد سلطان کا احساس ہاتھ سے چھٹ جانے پر اسے پھر سے رکو یاد آنے لگا ہے۔ اب اس کا خیال ہے، جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، وہ رکو کا دل توڑنے کا نتیجہ ہے۔ اب پچھتاوے اس کو گھیرنے لگے ہیں محبت کے، خیال کے ایک گہرے احساس سے اچانک بے دخل ہو جانے پر اسے محبت اور خیال کا وہ گہرا احساس یاد آنے لگا ہے، جو دلانے والا دلا تارہ گیا، مگر یہ دامن جھٹک دیتی تھی۔"

یمی آنٹی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہوتا ہے، کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے، چیزوں کے ہاتھ سے نکل جانے پر، چیزوں کی قدر آتی ہے۔"

وہ کہہ رہی تھیں، مگر ماہ نور ان کی نہیں سن رہی تھی۔ اس کے ذہن میں چند الفاظ گردش کر رہے تھے۔ چھوٹی

آنکھیں، گول ناک، راؤنڈ چہرہ، سرکس کا مسخرہ جاپانی گڈا۔" اس کے پردۂ ذہن پر ایک چہرہ یاد بن کر ابھرنے لگا تھا۔

"کھاری!" وہ دل میں اس چہرے کے مالک کا نام یاد کرتے ہوئے اٹھی اور کمرے میں رکھے اپنے فون کی طرف لپکی۔

☼ ☼ ☼
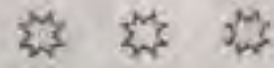
ہولی ہرسٹ روڈ ڈارلنگٹن پر واقع ڈارلنگٹن میموریل اسپتال پہنچنے تک نادیہ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ وہاں کس کے بلاوے پر اور کس لیے جا رہی تھی، اسپتال کے مرکزی گیٹ پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر پیغام بھیجنے والے کے نمبر پر کال کی۔ دو، تین بار بیل بجنے کے بعد کال وصول کر لی گئی۔

"میں نادیہ بلال۔" نادیہ نے کہا۔ "میں ڈارلنگٹن پہنچ چکی ہوں اور اس وقت میموریل اسپتال کے مرکزی گیٹ پر کھڑی ہوں۔"

"میرا خیال ہے، تم وہیں رہو، میں تمہاری رہنمائی کے لیے وہیں آتا ہوں۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔ نادیہ شش و پنج میں وہیں کھڑی تھی کچھ دیر بعد اس کے فون کی گھنٹی بجی، اس نے ہاتھ میں پکڑا فون آن کرنے کے لیے نظروں کے سامنے کیا۔

"رہنے دو۔" سامنے سے آئے ایک اجنبی شخص نے اسے قریب آ کر مخاطب کیا۔ "میں صرف تم تک پہنچنے کے لیے کال کر رہا تھا۔" وہ بولا۔ نادیہ نے استفہامیہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔

"میں وودن زادے ہوں۔" اس شخص نے کہا۔ "وودن زادے فرام امریکا۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک بری خبر ہے اور وہ خبر تمہارے بھائی سعد سلطان کے متعلق ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم حوصلے کے ساتھ یہ خبر سنو گی۔"

وہ کہہ رہا تھا اور زمین نادیہ کو اپنے قدموں تلے سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔ (باقی ان شاءاللہ آئندہ شمارے میں)

صدف آصف

ناولٹ

"تمہاری بھابھی جان کی تو مت ہی پوچھو، اگر ان کا بس چلے تو گھر کے چھ افراد کے لیے گن کر پانچ بوٹیاں پکا میں، شاید کوئی نہ کھائے، بقول ان کے فضول خرچی سے پرہیز کرنا چاہیے۔" انیقہ نے چبا چبا کر کہا، جوش میں جو تقریری انداز اپنایا تو اس کی گلابی مائل سفید رنگت، سرخ گلاب ہو گئی، اس کا غصے سے کچھ ایسا حال ہوا کہ حلق سے نیچے کچھ اتارا ہی نہیں گیا، حالانکہ مصباح کی حلوہ پوری اور حرا کے قیمے بھرے پراٹھے بہت مزے کے تھے، مگر جب دل ہی خوش نہ ہو تو بھلا زبان کو ذائقوں کی کیا قدر؟ اس پر یہ احساس بھی سوا کہ پارٹی کی خرابی کا فرد جرم بھی ان پر عائد ہوا۔

"کیا مطلب سچ سچ بتاؤ۔ تمہاری بھابھی ایسا کرتی ہیں؟"

حرا نے رنگ برنگ کے ریسٹ بینڈ کو کلائی کے گرد لپیٹا، بیگ پر لگے چھوٹے سے چوکور آئینے میں جھانکا، اپنا آپ جانچا، ایک بار پھر بالوں کو انگلیوں سے سنوارا، عام سی شکل و صورت والی حرا کی جب سے بات طے پائی، اس کے منگیتر کی محبت نے اسے ایک دم خاص بنا دیا۔ اس کا دماغ خراب ہوا تو ہوا، اس نے ان سب کا دماغ خراب کرنا شروع کر دیا۔ خود کو کالج کو مین کے خطاب سے کیا نوازا، پورا گروپ مل کر اس کے پیچھے ہی پڑ گیا۔ سب کی ہزار کوششیں بھی اسے ہوش کی دنیا میں واپس نہ لا سکیں، کبھی کبھی خوش فہمیاں بھی جینے کا بہانہ بن جاتی ہیں۔

"بات تو سچ ہے، مگر بات ہے رسوائی کی، وہ ایسی ہی ہیں اور تو اور ان کے کفایت شعاری کے سارے اصول صرف گھر والوں پر ہی لاگو ہوتے ہیں، اگر کوئی مانگنے والا آجائے پھر ان کی پھرتیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، پرس کا منہ فوراً ہی کھل جائے گا، اتفاق سے پاس پیسے موجود نہ ہوں تو وہ کھلا پلا کر ہی اسے رخصت کرتی ہیں، جانے والا بھی ان کے دریا دلی کے قصیدے پڑھتا جاتا، شاید انہیں بھی اور لوگوں کی طرح واہ واہی سے تسکین حاصل ہوتی ہوگی۔" انیقہ نے سر ہلا کر منفی انداز میں سوچا اور چڑ کر بولی۔ مصباح کو ان کا

اس طرح سر محفل یہ باتیں کرنا بھایا نہیں۔ اس نے دونوں بہنوں کو گھورا' دانت کچکچائے' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں' ان کی لن ترانیاں جاری رہیں۔

"ہائے... او ربا... تیری بھابھی... بھی... چل کوئی گل نئی... بھابھیاں تو ایس طرح دی ہوندی اے۔"

سحرش نے جا گرز کو کچی زمین پر مار کر مٹی جھاڑی' وہ نام بوائے ٹائپ لڑکی تھی' بجنے سنور نے سے الرجک' انیقہ کے کاندھے پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ رکھ کر تسلی دینے کی کوشش کی' غم مشترک نے اپنائیت کے احساس کو بڑھاوا دیا۔ اتفاق سے اس کا واسطہ بھی انتہا درجے کی مزاج داز زبان دراز بھابھی سے پڑا' جو سب سے زیادہ اس کے بے وقت کے ٹونکنے پر نظر رکھتی' سحرش کے چڑ کر جواب دینے پر وہ طعنے دیتی کہ سحرش اور ان کے گاؤں میں موجود بھوری مج میں زیادہ فرق نہیں رہتا۔

"بس یار... بھابھی کٹوتی نے تو امی کے جانے کے بعد ہم پر جیسے دنیا تنگ ہی کر دی۔"

بہن کی حالت پر اریبہ کا لہجہ بھی دکھوں سے چور چور ہو گیا' ماں کی یاد کیا آئی' آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر سا الڈ آیا۔ گھاس پر بیٹھی مصباح کا دل بھی دکھی ہو گیا۔ آج کالج میں ان سب کا ون ڈش بریک فاسٹ کرنے کا ارادہ تھا' مگر انیقہ اور اریبہ کی بھابھی نے ایک بار پھر رنگ میں بھنگ ڈال دیا' اب دونوں بہنیں دوستوں کے گروپ میں بیٹھی' جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی ہوئی منہ بسور رہی تھیں۔

"وہ... انیقہ ناراض نہ ہو تو... ایک بات پوچھنی تھی؟ یہ کا... ٹو... تی... نام کچھ عجیب سا نہیں' میں نے پہلی دفعہ سنا ہے۔" حرا نے ناک پر دھرا چشمہ انگلی سے پیچھے کرتے ہوئے اپنی نوٹنکی شروع کی۔ ماحول میں در آئی اداسی دور کرنے کی کوشش کامیاب رہی' اس کے انداز پر سب کی ہنسی نکل گئی۔

"ارے بابا... یہ بھابھی کا نام نہیں' وہ تو ان کی ہر وقت کی کنجوسی کی عادت کے باعث اریبہ انہیں اس نام سے پکارتی ہے' مگر پیٹھ پیچھے' ورنہ بھیا ہم دونوں کی ایسی کلاس لگائیں گے کہ مت پوچھو۔"

انیقہ نے اپنی چھوٹی سی ناک سکوڑ کر زبردستی مسکراتے ہوئے صفائی دی' تو سب نے ایک ساتھ کورس میں گردن ہلائی اور ہنسی کی پھلجھڑی سی چھوٹ گئی' طالب علمی کا زمانہ اتنا سہانا' نہ کسی بات کی فکر' نہ ہی کوئی پریشانی' کبھی بات بے بات ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑے تو کبھی منہ سے آواز نہ نکلے' یوں ہی دوستوں سے روٹھے رہنے کا دل چاہے۔ بیکار چیزیں دل کو بھا جائیں' تو کبھی بہترین اشیا بھی نگاہوں میں نہ سمائیں' وہ لوگ تھوڑی ہی دیر بعد سب بھول بھال بدلتے موسم کے ساتھ مارکیٹ میں آئے ڈیزائنر کپڑوں کی نئی کھیپ کی خریداری پر تبادلہ خیال کرنے لگیں' دونوں بہنیں ایسی چیزوں سے جلد متاثر ہونے والی "فوراً" ہی بہل گئیں۔ چھٹی کا وقت ہوا تو سارا گروپ منتشر ہو گیا۔

"ایک بات کہوں اریبہ اور انیقہ... تم لوگوں کو سب کے سامنے اپنی بھابھی کا یوں مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔" مصباح کو جو بات بری لگی اس نے دونوں بہنوں کے ساتھ کیفے ٹیریا سے باہر نکلتے ہی جھٹ سے بول دی۔

"ہاں... یار کہہ تو تم صحیح رہی ہو... مگر یہ اریبہ بھی نا... "فوراً" ہی جذباتی ہو جاتی ہے۔"

انیقہ کو بھی افسوس ہونے لگا کہ گھر کی باتیں یوں نشر کرنا اچھا نہیں لگتا' "فوراً" ہی اپنی بہن پر بات ڈال کر کندھے اچکا دیے' ویسے بھی بھابھی کے معاملے میں اس کی نفسیات کچھ عجیب سی ہو چلی تھی۔ دل کا ایک حصہ اگر بھابھی کو ناپسند کرتا تو دوسرا حصہ "فوراً" ہی ان کی حمایت پر لڑنے کھڑا ہو جاتا' ثمین جیسی بھی سہی' مگر ساس کے انتقال کے بعد سے اس نے نہ صرف گھر کو سمیٹا' بلکہ دونوں بہنوں کی ذمہ داری بھی اٹھائی' ورنہ سب تنکا تنکا ہو کر بکھر جاتا۔

یہ ہی وجہ ہوئی کہ ان کی زندگیوں میں کبھی خوشی' کبھی غم' نند' بھاوج کا تعلق روایتی سا نہیں رہا' بلکہ منفرد بن گیا۔ زندگی کا فلسفہ اس وقت سمجھ سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ جب کسی کے لیے دل میں بیک وقت پسند

اور ناپسندیدگی کے جذبات ایک ساتھ ہی پروان چڑھنا شروع ہو جائیں۔ کم از کم انیقہ اور بھابھی کٹوتی کا معاملہ تو کچھ ایسا ہی کھٹا میٹھا سا تھا۔

"کیوں... تم کون سی کم ہو؟ بڑی آئیں کہیں سے سید ھی بننے والی' خود ہی نے تو سب کے سامنے بوٹیوں والی بات نکالی' اب سارا دوش میرا ہو گیا۔" اریبہ کے تو پیروں لگی سر تک جا بجھی۔ "فوراً" ہی چڑ گئی' لگی آستین چڑھا کر بہن سے لڑنے' انیقہ بھی بہن سے الجھ کر منہ کا مزا بدلنے میں جت گئی۔

"اچھا... بس سیز فائر' تم دونوں میں سے اب کوئی نہیں بولے گا۔" مصباح نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی اور جھلا کر بولی۔

"انیقہ کو تو کچھ بولتی نہیں' میرے پیچھے پڑی رہتی ہو۔" اریبہ نے منہ بنایا' اس کے گالوں میں جیسے ہوا سی بھر گئی' غباروں کی طرح پھول گئے۔

"بابا... میں تم دونوں کو کہہ رہی ہوں... آئندہ اس بات کا خیال رکھنا کہ... اس زمانے میں لوگ رو کر سنتے اور ہنس کر اڑاتے ہیں۔"

مصباح نے ایک اور نصیحت کی گرہ ان دونوں کے دامن پر کس کر لگائی اور اپنا اسکارف اچھی طرح سے سر کے گرد لپیٹا' وہ ایک سلجھی ہوئی' حساس لڑکی' چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی دھیان رکھتی' اسے جانے کیوں ان بھولی بھالی سی جڑواں بہنوں پر ٹوٹ کر پیار آتا' شاید اس کی کوئی بہن جو نہ تھی' وہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن' دوسراہٹ ڈھونڈتی' دونوں نوجوانی کی منزلیں طے کرنے کے باوجود ابھی تک بچوں کی طرح لڑتیں' مصباح کو ان کی سنگت بہت بھائی' اب تو یہ حال ہو گیا کہ ایک دوسرے کے بغیر گزارا بھی مشکل' مصباح بہت کچھ سوچتی اور مسکرا دیتی۔

انیقہ اور اریبہ کو زندگی کی چھوٹی موٹی باتیں بھی پہاڑ جیسی لگتیں اور ان کا واویلا شروع ہو جاتا' شاید والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے باعث ان کے اندر چھپا حساس بچہ کرلاتا پھرتا' لوگوں میں محبتیں تلاشتا' یوں ان تینوں کا ساتھ دن بدن مضبوط ہو چلا۔

"اللہ جی... تو بڑا رحیم ہے... ان کو زندگی کے بڑے بڑے غموں سے نا آشنا ہی رکھنا۔" مصباح نے ان کو چونچیں لڑاتے دیکھا تو پیار سے دعا دی اور ان کے بیچ بچ بچاؤ کروا دی۔

"چلو آئندہ خیال رکھنا' دنیا روتے ہوئے کا ساتھ نہیں دیتی۔" مصباح نے مسکرا کر انہیں متوجہ کیا۔

"ہاں... میں یہ بات سمجھتی ہوں۔ مگر بھابھی بھی نا... قسم سے صبح صبح موڈ آف کر دیا۔ ہم نے تو ان کی نظروں سے بچا کر دس شامی کباب فرائنگ پین میں تلنے کے لیے رکھے' وہ خوشبو سونگھتی کچن میں پہنچ گئیں' "فوراً" ہی دو اٹھا لیے کہ تم پانچ دوستوں کے لیے یہ بھی بہت ہیں' یہ میں شہوار کے لنچ میں رکھ دوں گی' ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔ کم تو ہم بھی نہیں' غصے میں لنچ باکس کچن میں ہی چھوڑ آئے' اب جائیں گے تو شام کو بھیا کا ایک لمبا لیکچر تیار ملے گا' بھلا بتاؤ ایسے رویے پر غصہ آنا چاہیے کہ نہیں؟" صبح کا واقعہ کیا یاد آیا؟ انیقہ' مصباح سے پل بھر پہلے کیے گئے وعدے وعید بھول بھال' جوش خروش سے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگی۔

"اچھا... حیرت ہے' تم لوگوں کے ساتھ ایسا رویہ' اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے بچوں کو من مانی کی کھلی چھوٹ دیتی ہوں گی؟" تینوں خراماں خراماں اسٹاپ کی طرف بڑھنے لگیں' شکر ہے کہ ان کے روٹ کی چنگ چی نزدیک ہی مل جاتی' ورنہ دور جانا دشوار لگتا۔ جب سے چنگ چی کا رواج عام ہوا لوگوں کو لدی پھندی بسوں میں بیٹھنا گوارا نہ رہا' اس لیے وہ بھی اس سواری کے مزے لوٹتیں۔

"ارے کہاں... وہ ہمارے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو بھی نہیں چھوڑتیں' سب پر برابری سے شیر کی نگاہ رکھتی ہیں۔" اریبہ مسکرائی تو اس کی سنہری آنکھیں بھی مسکرا دیں' کافی دیر بعد اس کا موڈ بہتر ہوا تو مصباح نے سکھ کا سانس لیا۔

"اچھا... تو ٹھیک ہے... اہل خانہ کے ساتھ یکساں سلوک ہی کرتی ہیں نا۔"

مصباح پر سکون نظر آنے لگی' اس نے بغور اریبہ کو دیکھ کر ان کی رائے جاننا چاہی' ورنہ اس سے قبل تو وہ یہ ہی سوچتی کہ اس کی دوستوں کی کہانی بھی روایتی سی ہوگی' جہاں ظالم بھابھی نے دہرا معیار اپناتے ہوئے یتیم نندوں کے ساتھ زیادتی روا رکھی ہو اور اپنے بچوں کے بے جا ناز نخرے بھی اٹھائے جاتے ہو' لیکن کہانی میں تو ایسا کوئی ٹوئسٹ ہی نہیں آیا۔

"ربا۔ مصباح کو شہوار والا واقعہ تو سناؤ۔" انیقہ کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ ابھر آئی' اس نے کچھ یاد کر کے چٹخارا بھرا۔

"ہاں۔ مصباح میں تمہیں اپنے بھتیجے کے عقیقے کا واقعہ سناتی ہوں' زوار بھائی نے طویل عرصے بعد گھر میں ایک بڑی تقریب منعقد کی' شہوار کے عقیقے پر پورے خاندان کو بلاوا دیا گیا۔ ہمارے گھر بڑے دنوں بعد پھوپھیاں اور خالائیں ٹھہریں' بھابھی کے نہ نہ کرنے کے باوجود بھائی نے اتنا کھانا پکوالیا کہ بکرے کے قورمے کی ایک دیگ بچ گئی' بھابھی پریشان کہ اب کیا کریں' سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔" اریبہ نے چپس کا پیکٹ ٹٹولا اور ہنستے ہوئے پھر کچھ چپس چبانے لگی۔

"ارے تو اس میں پریشانی کیسی؟ تمہارے گھر میں موجود ڈھیر سارے مہمانوں کو دوسرے دن کھلا دیتیں۔" مصباح نے آسان حل پیش کیا۔

"وہ ہی تو۔ ہمارے یہاں اگر خاندان والوں کے آگے باسی کھانا رکھ دیا جائے تو ناک کٹنے کے مترادف ہوتا ہے' کھانا جتنا بھی بچ جائے' مگر باسی کھلانا اچھا نہیں سمجھا جاتا اگر کسی نے ایسی کوشش کی بھی تو خاندان والوں نے باتیں سنا سنا کر بے چاروں کا ناطقہ بند کر دیا۔" انیقہ نے بڑے فخر سے بتایا' مصباح نے حیرت سے گھورا۔

"خیر۔ یہ کوئی بہت فخر کرنے کی بات تو نہیں' بلکہ میرے حساب سے یہ لغو رسم رزق کی بے حرمتی کے زمرے میں آتی ہے۔" مصباح نے منہ بنا کر کہا کہ اسے حقیقتاً "یہ بات جان کر دکھ پہنچا۔

"جو بھی کہو۔ بس رواج ہے تو ہے' خیر اس وقت بھابھی کی اتری صورت مت پوچھو' ہم دونوں بہنیں الگ حیران و پریشان' بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ منتظر کہ کیا ہونے والا ہے؟ کیونکہ اب آیا تھا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔"

"اس دفعہ نکلے گی بھابھی کی ساری کنجوسی۔" ان کو پریشانی سے اندر باہر آتے دیکھ کر انیقہ نے کہا "بھابھی کنوتی اس دفعہ تو پھنس ہی گئیں۔"

"اچھا۔ پھر کیا ہوا؟" مصباح نے دلچسپی سے پوچھا اور اریبہ کا ہاتھ تھام کر کھڑا کیا۔ وہ تھک کر فٹ پاتھ پر بیٹھنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"ہماری امی جان نے بھابھی کے ارادے جانے تو خوب گرم ہوئیں' بھائی کے ذریعے بھابھی کنوتی کو سختی سے رات کا بچا ہوا کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنے سے منع کروایا' بھابھی بولتی رہ گئیں' مگر امی نے ان کی ایک نہ سنی۔" اریبہ نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر بڑی دقت سے ایک ببل گم ڈھونڈ نکالی' تو بشاشت سے بولی۔

"چھ۔ اچھا۔ پھر تمہاری بھابھی نے اس بات کو کیسے حل کیا؟ سب کے لیے ڈھیر سارا کھانا دوبارہ پکایا ہوگا۔" مصباح نے تجسس سے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ بھابھی بھی اپنے نام کی ایک ہیں۔ انہوں نے وہی کھانا مہمانوں کو پیش کیا۔ مگر مجال ہے جو کسی کے منہ سے آواز نکلی ہو' ان فیکٹ سب نے واہ۔ واہ کر کے دکھایا۔" ربا نے ہنستے ہوئے کہا اور ببل گم کا غبارہ بنا کر پٹاخ سے پھاڑا' مصباح نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ کی' وہ راہ چلتے ایسی حرکتیں بالکل برداشت نہ کرتی۔

"کیوں انہوں نے ایسا کون سا منتر پڑھ دیا؟" مصباح نے جلدی سے پوچھا' ان لوگوں کا اسٹاپ قریب تر تھا۔ وہاں سے انہیں علیحدہ ہو کر اپنے اپنے روٹ کی طرف جانا پڑتا' اسی لیے اسے پورا واقعہ سننے کی جلدی ہوئی۔

"بھابھی جی کی ہوشیاری دیکھو۔ جب ساری خواتین بڑے کمرے میں آرام فرمانے اور باتیں بگھارنے گئیں۔ انہوں نے جلدی جلدی بچے ہوئے قورمے میں سے آدھا سالن بڑے پتیلے میں نکالا' اس میں ٹماٹر کا تازہ پیسٹ بنا کر ملایا' پھر آلو الگ سے فرائی کر کے سالن میں ملانے کے بعد' باسمتی چاول ابال کر تازہ ہرا دھنیا اور پودینے کو قورمے میں ملا کر مزے دار تہ والی بریانی پکالی' اوپر سے پیاز لال کر کے تازہ بگھار بھی لگا دیا' انہوں نے ایک اور یہ غضب بھی ڈھایا کہ مجھ سے لوکی کا تازہ رائتا بھی بنوالیا اور میرے ہاتھ کے رائتے کا زمانہ دیوانہ۔۔۔ پھر تو مت پوچھو کہ سب نے کیسے مزے لے لے کر اس دھمال بریانی کی دعوت اڑائی۔"

انیقہ نے اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہوئے کہا۔ اریبہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ مصباح نے اس کا ہاتھ دبا کر احساس دلایا کہ وہ لوگ سڑک پر ہیں' وہ دنیا کی رنگینی میں کھونے کی شائق لڑکی' ان معاملات میں اس کا کوراپن عروج پر ہوتا۔

"یہ تو انہوں نے بڑی سلیقہ مندی کا کام کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خاصی معقول خاتون ہیں۔" مصباح متاثر ہو کر مسکرائی تو بھابھی کی تعریف پر اریبہ نے اسے ہونٹ لٹکا کر' منہ پھلا کر دکھایا۔

"کاہے کی سلیقہ مندی' یہ بولو نا' کنجوسی۔۔۔ خیر ہم دونوں بہنوں نے خالہ اور تائی سے خصوصی طور پر بریانی کے بارے میں جا کر پوچھ گچھ کی۔ ان لوگوں کی عقابی نگاہوں سے اندرون خانہ باتوں کا پوشیدہ رہنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ مگر اللہ جھوٹ نہ بلوائے تیسری دفعہ بریانی نکالنے کے ساتھ ساتھ وہ بھابھی کنوتی کے ہاتھ کے ذائقے کی تعریفوں میں لگی رہیں۔" انیقہ نے جل کر کہا۔ اریبہ نے گردن ہلا کر اس کی بات کی تائید کی۔

"اچھا۔ انہوں باقی بچے ہوئے آدھے سالن کا کیا کیا؟" مصباح نے پوچھا۔ اس کی بھابھی کنوتی کی شخصیت میں دلچسپی بڑھنے لگی۔

"کچھ نہیں۔ تندور سے روٹیاں منگوائیں' بچے ہوئے سالن کا پتیلا گاڑی میں لادا اور ہمارے گھر کے نزدیک واقع بستی میں جہاں مزدور پیشہ اور کم آمدنی والے لوگ رہتے ہیں' بانٹ آئیں۔" اریبہ نے بے نیازی سے بتایا' جیسے اس کے نزدیک اس اچھے فعل کی کوئی وقعت نہ ہو۔

"بھابھی کنوتی سے ملنے کے لیے ان لوگوں کے گھر جانا ہی پڑے گا۔" مصباح نے ہاتھ ہلا کر دونوں سے اجازت لی اور سوچتی ہوئی اپنے راستے ہولی۔

☼ ☼ ☼

"تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ اتنی جلدی شادی ممکن ہی نہیں' امی' بابا زندہ ہوتے تو اور بات تھی۔ مگر اب۔۔۔" انیقہ نے دور بہت دور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے' کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور پھر افسردگی سے گردن جھکالی' وہ آنکھوں میں آئے آنسو سامنے بیٹھے شان دار مرد سے چھپانا چاہتی تھی' سالار نے بس ایک دفعہ اسے روتا دیکھ کر اپنے سینے پر دل کے مقام پر انگلی چھو کر اذیت سے کہا۔

"اگر اس کو تکلیف دینا چاہتی ہو تو خوب آنسو بہایا کرو' مگر یہ بات یاد رکھنا۔ اب یہ دل میرا نہیں رہا' تمہارا ہو چکا ہے' شاید اپنی چیز کی قدر تو سب ہی کرتے ہیں نا۔"

اس نے آنسو پونچھ کر فوراً" اثبات میں سر ہلا دیا۔ سالار کے جذبوں کے احترام میں انیقہ نے اس کے سامنے نیر بہانا چھوڑ دیا۔ یہ اور بات ہے کہ تنہائی میں اکثر اس کا تکیہ بھیگ بھیگ جاتا' سالار کھنکھنارا اور اس کے سامنے اپنا چوڑا مردانہ ہاتھ لہرایا' وہ چونک کر واپس اپنے حواسوں میں آئی۔

"میں اتنی جلدی شادی کے لیے تیار نہیں ہوں' مجھے ابھی اپنے اور اریبہ کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔" وہ چیخ کر بولی۔

"پلیز بچہ' یہ باتیں چھوڑ دو' ابھی شادی کرنے میں کوئی قباحت نہیں' ورنہ سوچ لو' پھر میں دو سال کے لیے لاہور چلا جاؤں گا' تم یہاں اکیلی بیٹھی چین کی بانسری بجاتی رہنا۔" وہ بھی بھڑکا۔ دونوں کی لڑائی شروع' پہلے انیقہ نے اسے منہ چڑایا۔ پھر سالار نے اس کے سر پر چپت لگادی۔ وہ ناراض ہونے لگی تو

سالار کو خیال آیا کہ وہ اتنی سردی میں بہت اہم بات کرنے یہاں آیا ہوا ہے۔ جلدی سے اصل بات کی طرف لوٹا۔

"تمہیں پتا ہے نا... نئی نئی جاب لگی ہے' دو سال کا کنٹریکٹ کیا ہے' اب فیصلہ واپس نہیں لے سکتا۔ اگر اتنی اچھی آفر نہ ملی ہوتی تو تمہیں چھوڑ کر دوسرے شہر جانے کا سوچتا بھی نہیں' مگر اب مجبوری ہے۔ میں سوچ سوچ کر پاگل ہوتا رہا' تو یہ ہی بہتر حل نظر آیا کہ تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں' اب تم کیا کہتی ہو؟"

سالار نے ماتھے پر ہاتھ مارا' کوڑھ مغز کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہیں کہ اس کے لیے انیقہ کے بغیر دو سال گزارنا سوہان روح ہوگا۔ سالار کے بغیر مشکل میں تو وہ بھی پڑ جاتی' مگر کیسے منہ کھول کر کہہ دیتی' اپنے جذبات کا بے محابا اعلان کرنے کے بیچ اس کی شرم و حیا حائل ہونے لگی۔

"ایسا چیونٹیوں بھرا کباب کھانے کو کس نے کہا تھا؟ ٹھکرا دیتے یہ آفر۔" اس کا لہجہ زچ کرتا ہوا سا تھا' سالار کا دماغ گھوم گیا' مگر اس کی طرف دیکھا تو خاموش ہوگیا۔ بھولی سی صورت پر ناراضی کے بادل چھائے ہوئے اس کی دل ربائی میں کمی ہی نہ ہوتی' پھر سالار دل کو کیوں قصوروار ٹھہراتا۔

"چل بیٹا... اسے منالے' ورنہ زندگی کے سارے رنگ پھیکے پڑنے والے ہیں۔" وہ ہونٹ لٹکائے گھاس نوچتی من موہنی سی لگی' دل کو کچھ ہوا' صبر کے گھونٹ پیتے ہوئے سالار نے ٹھنڈی سانس بھری اور اس کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہوا۔

"میری جانو... آپ کا کہا بجا... بالکل ایسا ہی کرتا... اگر یہ کوئی اونی پونی جاب ہوتی۔" سالار نے گھاس کا تنکا توڑا اور اسے چبھو دیا۔

"سالار! تمہارا سدھرنا... مشکل ہے' بڑا مشکل ہے۔" وہ بری طریقے سے تپ گئی۔

"ارے... کہاں؟ میں اتنا معصوم ہوں' جانے کیوں' دونوں بہنوں کو برا لگتا ہوں۔" سالار نے بکا منہ بنا کر کہا۔

"بس... بس رہنے دو' مجھے کچھ نہیں سننا' تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔" دھلی دھلی سی گھاس بہت بھلی لگ رہی تھی' مگر انیقہ کو نہیں' وہ اٹھ کر منہ پھلا کر اندر کی طرف جانے لگی تو سالار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

"یار! تم سمجھ ہی نہیں رہی ہو' میرا ان لوگوں سے منسلک ہونے میں کتنا فائدہ ہے۔ مارکیٹ میں ربانی بلڈرز کا بہت بڑا نام ہے۔ انہوں نے مجھے لاہور میں اپنے نئے پروجیکٹ کے لیے اتنے سارے لڑکوں میں سے چنا ہے۔ وہ بھی بغیر کسی سفارش کے' صرف میری اہلیت کی بنا پر اور میں اسے اپنی اور تمہاری خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ تم حال سے پریشان ہو' مگر میری نظریں مستقبل پر ہیں' ہمارے آنے والے کل کو اچھا بنانے کے لیے تھوڑی قربانیاں تو دینی پڑیں گی نا' میری شریک زندگی بننے جا رہی ہو تو تمہیں میرے مسائل کو بھی سمجھنا پڑے گا۔ تم کو اندازہ نہیں کہ اس کمپنی سے منسلک ہو کر مجھے فیلڈ میں کام کرنے کا کتنا تجربہ حاصل ہوگا۔ خیر یہ باتیں تمہاری چھوٹی اور پیاری سی عقل شریف میں فٹ نہیں ہونے والی' تم بس ایک کام کرو کہ شرافت سے میری بیوی بن کر ساتھ چلی چلو۔"

سالار نے پیار لٹاتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور کی چین اس کے سر پر مارتے ہوئے قریب آکر سرگوشی کی۔ اس کے انداز پر انیقہ شرم سے لال لال ہونے لگی۔ اس کا نظریں اٹھانا محال ہوگیا۔ جس کا فائدہ سالار نے اٹھایا' وہ اپنی فارم میں واپس آگیا۔

"ویسے... تم سوچ لو کوئی جلدی نہیں' مجھ جیسے ہینڈسم بندے کو تو لاہور کی کوئی پیار کرنے والی گوری چٹی لڑکی مل ہی جائے گی' مگر اپنا سوچو' تمہیں تو کوئی کالا بھی نہیں پوچھے گا۔"

سالار نے اپنی منگیتر کی شرماہٹ کو بھرپور انداز میں انجوائے کیا اور لگا چھیڑنے' وہ اس کے سانولے سلونے روپ کا شیدائی ہونے کے باوجود اس کا ریکارڈ لگانے سے باز نہیں آتا ______ انیقہ نے بھی چڑنا چھوڑ دیا' ورنہ وہ اور پیچھا لے لیتا۔

"نہیں جی... ایک ہی بہت ہے... دوسرا کسے چاہیے؟" انیقہ نے دل ہی دل میں کہا' مگر منہ سے ایک لفظ نہ نکالا' یوں کھلم کھلا اظہار محبت' اسے کھجور کے درخت پر چڑھانے کے مترادف تھا۔ ویسے ہی وہ اپنی تعریفیں کرنے کا بہت شوقین تھا۔

"اف... لوگوں کو اپنے بارے میں کتنی خوش فہمیاں ہوتی ہیں نا۔" اس نے ادا سے نگاہیں اٹھائیں اور بولی' مگر زیادہ دیر تک اس دشمن جاں سے نگاہیں نہ ملا سکی' سو جھکا لیں۔ سالار کی گھنی پلکوں والی براؤن آنکھوں سے انیقہ کے لیے محبت کا ایسا دریا بہتا کہ وہ لہروں سنگ بہتی چلی جاتی۔

سالار صرف اس کا منگیتر ہی نہیں بلکہ فصیحہ پھوپھو کی بڑی اولاد' ماموں کی آنکھ کا تارا' ان سے لاڈ اٹھوانے یہاں چلا آتا۔ بچپن سے ہی وہ ان دونوں بہنوں کا دوست' ہم دم' ساتھی بن گیا' زوار ان سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے ذرا دور' دور ہی رہتا۔ بچوں کی محبت نے بڑوں کے گرد بھی یگانگت کا جال بن دیا۔ دونوں گھرانوں میں ہر وقت کا آنا جانا لگا رہتا۔ اس عمر میں جبکہ انہیں محبت کے مفہوم سے آشنائی بھی حاصل نہ تھی۔ سالار انیقہ کا سایہ بنا رہتا' اپنے سارے دکھ سکھ اس سے کہتا' سنتا' وہ بھی مدبرنی اس کی الٹی سیدھی باتوں پر سر ہلاتی رہتی۔

پہلے ابو اور پھر امی کے انتقال کے بعد دونوں کو اپنا ہوش ہی نہ رہا' غم بھی ایسا جس کا کوئی مداوا نہیں' جانے والوں کا دنیا میں کوئی بدل نہیں' وقت لگتا ہے زخموں پر کھرنڈ آنے میں' پھر کیسے اتنی جلدی سب بھول بھال دنیا کے جھمیلوں میں لوٹ آتیں۔ زوار کے ساتھ ساتھ فصیحہ اور سالار کی محبت ان کے زخموں پر مرہم بنی' ورنہ وہ دونوں بہنیں غموں کے طوفان میں ہی پھنسی رہتیں' نکلنا ناممکن ہو جاتا۔ اس کے لاہور جانے کا سنتے ہی انیقہ کو سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ سالار کی شخصیت کا چارم اس کے سونے جیسے دل کی وجہ سے بڑھ جاتا۔ وہ پرخلوص' با محبت اور سب کا خیال رکھنے والا' اس کے بغیر تو پورا شہر ہی ویران ہو جاتا۔ مگر فوراً" ہی شادی کی پیش کش... وہ تذبذب کا شکار ہوگئی'

"میں نے شادی کے حوالے سے بڑے رنگ رنگیلے خواب دیکھ رکھے ہیں۔ ان کی تکمیل کے لیے میں پہلے اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں گی۔ جاب کروں گی' اس کے بعد شادی کا سوچوں گی۔" انیقہ نے نظریں چراتے ہوئے سالار کے اصرار پر کچھ بے وقوفانہ سا فلسفہ بیان کیا۔

"تم کیوں فضول بہانے بنا کر معاملے کو طول دینا چاہتی ہو۔"

سالار نے سنجیدگی سے پوچھا۔ اسے لگا اصل بات کچھ اور ہے' کیونکہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی' ان باتوں میں اتنا دم نہیں۔ اسے اپنے دل سے زیادہ انیقہ کے دل کی خبر تھی' وہ سالار سے بات کیے بغیر ایک دن بھی نہ گزارتی' اگر وہ پورا ہفتہ کہیں مصروف ہو جاتا تو اس کا بی پی ڈاؤن ہونے لگتا ہے۔ اب جبکہ سالار نے بڑی مشکلوں سے مما کو راضی کیا تو اس کے نخرے شروع' سالار کو یقین ہو چلا کہ کچھ تو دال میں کالا ہے۔

شادی کا ذکر چھیڑتے ہی فصیحہ نے بیٹے کو وارننگ دی کہ وہ پہلے لاہور جا کر سیٹل ہونے کی کوشش کرے۔ پھر شادی کر کے انیقہ کو لے جائے' تاکہ ان کی لاڈلی بھتیجی کو دوسرے شہر میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہ ہو' مگر سالار نے دوسرے شہر میں اپنے مسئلے مسائل کا ایسا بھیانک نقشہ کھینچا کہ ان کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ فوراً" شادی کی تاریخ لینے کی رضامندی دے دی' سالار نے یہ ہی خوش خبری تو اسے سنائی' مگر وہ... پتا نہیں کن جھمیلوں میں پڑ گئی۔

سالار صرف اپنے لیے نہیں بلکہ انیقہ کے لیے ہی اس سے سر کھپا رہا تھا۔ انیقہ جیسی پاگل لڑکی کو یہاں چھوڑ کر جانے کا مطلب تنہائی کے ساتھ ساتھ اندیشوں میں مبتلا کرنا' اس کا کچھ بھروسا بھی نہیں کہ سوچ سوچ کر بیمار ہی پڑ جائے۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ یہ بات سن کر انیقہ اچھل پڑے گی۔ اسی لیے اتنی سردی میں بھی صبح صبح شادی کی خوش خبری سنانے دوڑا بھاگا ماموں کے گھر چلا آیا۔ مگر اس کی توقع کے برخلاف جس کے

لیے اس نے ماں کے سامنے جھوٹ سچ کیا' وہ تو گم صم سی لاتعلق بیٹھی پودوں کی اقسام کو گھورنے میں مشغول تھی۔

"پتا نہیں... مگر اتنی جلدی... بھابھی اور بھائی راضی بھی ہوں گے کہ نہیں؟ ویسے بھی شادی کوئی دو پیسے کا کھیل نہیں۔" انیقہ نے فلسفیوں کی طرح سوچتے ہوئے سوکھا منہ بنایا۔ سالار کا قہقہہ نکل گیا۔ انیقہ نے اسے گھورا تو اس کے دانت اندر چلے گئے۔

"اچھا تو یہ مسئلہ ہے... شادی کے خرچوں کی فکر سوار ہے... چلو جانم... ہم یہ مسئلہ بھی حل کیے دیتے ہیں۔" لان کی نم گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سالار اس کی طرف دیکھ بھی رہا تھا اور نہیں بھی کیونکہ ذہن کہیں اور تانے بانے بننے میں مصروف ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ زوار پر سارے گھر کا بوجھ ہے' شاید اسے اپنے بھائی پر اکیلے شادی کا بوجھ ڈالنا گوارا نہیں۔

موسم بڑا رومان پرور ہونے لگا۔ سردیاں کیا شروع ہوئیں' فضاؤں پر دھند سی چھا گئی۔ ایسے جان لیوا موسم میں وہ بہار و خزاں کا امتزاج بنی دل کو لبھانے کا سبب بنی' سالار کا امتحان لینے لگی' اترے چہرے کی اداسی دور کرنا ضروری ہو گیا۔ لان میں رات بھر گرنے والی شبنم نے ہر شے کو نمی بخش دی۔ سالار کی آنکھوں میں ہیرے سے چمک اٹھے' شرارت جو سوجھی تو اس نے اپنے بھاری مردانہ ہاتھوں سے اوس کی نمی چرائی اور اچانک پیچھے سے آکر انیقہ کے نرم گرم گالوں کو ڈھانپ دیا۔ ٹھنڈک کی ایک لہر کرنٹ کی طرح اس کے اندر دوڑ گئی۔ سالار کو گرم سی نرمی بہت بھلی لگی۔ مگر انیقہ جو سوچ میں کھوئی ہوئی تھی ایک دم چیخ اٹھی' سردی اس کے اندر سرایت کر گئی۔ اس نے دھکیل کر سالار کو پرے کیا' وہ دیر تک ہنستے ہوئے اس البیلی نار کے غصے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

"کیا کرتے ہو؟ تمہیں پتا ہے نا۔ مجھے کتنی سردی لگتی ہے' اوپر سے اتنی صبح آکر میری نیند خراب کر دی۔ ان باتوں کے لیے یہ ہی وقت ملا تھا؟ بعد میں آجاتے۔"

انیقہ جو بہت دیر سے مروت میں یہاں بیٹھی کچھ بول نہیں سکی' اب دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع اس کے ہاتھ آگیا۔ سبز سوئٹر کے اوپر بھورے رنگ کی شال لپیٹے ہونے کے باوجود سردی سے اس کا برا حال اور وہ فان رنگ کی شرٹ اور بلو جینز میں فریش فریش سا موسم کو انجوائے کرنے والا۔ ویسے بھی سردیاں اسے ہمیشہ سے بھاتیں۔

اس جھلی کو نرم و گرم بستر سے نکل کر ایسے ٹھنڈے موسم میں سالار کا اظہار محبت سننا بھی گوارا نہ تھا۔ اس پر سے اس کے ٹھنڈے ہاتھوں کا لمس' انیقہ کو کپکپی سی لگ گئی مزید سالار کی شوخیاں وہ جل ہی اٹھی۔

"صبح صبح... میڈم نو بج رہے ہیں' شکر کرو یہاں برف باری نہیں ہوئی' ورنہ تمہارا چہرہ فریز ہو جاتا۔" وہ ایک آنکھ بند کر کے مزے سے بولا اور اس کے سامنے اپنے ہاتھ پر بندھی چوڑے پٹے والی سلور گھڑی لہرائی۔

"مانو بلی کہاں ہے؟" بڑی دیر بعد اسے اریبہ کا خیال آیا تو پوچھ بیٹھا۔

"سو رہی ہو گی... ویسے بھی آج چھٹی کا دن ہے آرام کا۔ اب پلیز تم اسے مت تنگ کرنے پہنچ جانا۔"

انیقہ نے اس کے ارادے بھانپ لیے۔ کچھ جتا کر اسے منع کرنے لگی۔ اس کی رگ رگ سے واقفیت کا دعویٰ رکھنے والی' سمجھ گئی کہ وہ اندر جا کر اس سردی میں بھی اریبہ پر پانی کا چھڑکاؤ کرے گا۔ اریبہ پورے گھر میں اس کو مارنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے دوڑے گی اور تمکین ان دونوں کی ایسی شرارتوں پر ایک لمبا لیکچر دے گی۔ ایسے سین اس گھر کی در و دیوار کو بھی ازبر تھے۔

"کیا یار... اتوار ہے تو کیا تم لوگ پوستیوں کی طرح سوتے رہو گے؟ اسے بھی اٹھاتا ہوں۔" اس نے شرارتی انداز میں انیقہ کی بات رد کی اور اریبہ کو جگانے اندر کی طرف بڑھ گیا۔

انیقہ وہیں شال میں اپنا منہ چھپائے بیٹھی رہ گئی۔

کوریڈور میں کھڑی تمکین نے دونوں کو بغور گھورا اور کچھ سوچتے ہوئے انہیں ناشتے کے لیے آوازیں دینے لگی۔

☼ ☼ ☼

"خیر تو ہے' اداس لگ رہی ہو؟" انیقہ تیزی سے کلاس سے باہر نکلی اور نگاہیں اٹھا کر گوشہ تنہائی ڈھونڈنے لگی' جہاں بیٹھ کر دل کے زخموں کو کریدا جا سکے۔ مصباح نے پیچھا کرتے ہوئے اسے کوریڈور میں ہی جا پکڑا۔ وہ صبح سے محسوس کر رہی تھی کہ انیقہ کچھ چپ چپ سی ہے۔ اریبہ فلو کی وجہ سے کالج نہیں آئی' اسی لیے ——— کورم پورا نہیں ہو پایا۔

"کچھ نہیں یار... بس ایسے ہی سر میں درد ہے۔"

اس کی جرح پر انیقہ نے صاف ٹالا۔ مصباح نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے ساتھ گھسیٹنے لگی۔ کیفے ٹیریا میں معمول کے مقابلہ میں کم رش دیکھ کر مصباح خوش ہو گئی۔ ورنہ یہاں کے شور شرابے سے اس کی جان جاتی تھی۔

"اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟" چائے کا کپ انیقہ کے سامنے رکھتے ہوئے مصباح نے پوچھا۔

"وہ... یار سالار فوراً شادی کا کہہ رہا ہے۔" انیقہ کو بھی ایک ہمدرد کاندھے کی ضرورت محسوس ہوئی' جس پر سر رکھ کر وہ آنسو بہا سکے۔ اپنا غم ہلکا کر سکے' ہمیشہ تو اسے سالار کا کاندھا میسر آجاتا' مگر اس کی بات اسی سے کرنا کچھ زیب نہیں دیتا۔

"ہوں... مبارک ہو' یہ تو اچھی بات ہے' مگر تم بلاوجہ نوکری کی بیچ کیوں لگا رہی ہو؟" گرم گرم چائے سردی میں مزا لائے گی۔ اس نے ایک گھونٹ بھر کر پوچھا۔

"اس کی دو وجوہات ہیں' ایک تو اریبہ... میری شادی کے بعد تنہا رہ جائے گی' اسے میرے بغیر رہنے کی عادت ہی نہیں' یہ سوچ سوچ کر میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ شادی کے بعد مجھے دوسرے شہر جانا ہے۔" انیقہ نے افسردگی سے کہا۔

"اچھا... دوسری وجہ بتاؤ۔" مصباح کے چہرے پر سوچوں کے بادل چھا گئے۔

"بھابھی کنٹونی... امی کے بعد انہوں نے ہمیں جیسا ترسایا' مجھے امید نہیں کہ وہ ہماری شادی پر اس طرح سے خرچا کر پائیں گی۔ ویسے بھی زوار بھائی نے کب سے ہمارا بوجھ اٹھایا ہوا ہے' میں چاہتی ہوں جاب کر کے کچھ ان کا ہاتھ بٹاؤں' اریبہ کی شادی کے لیے کچھ اسباب جمع کروں' اس کے بعد ہی اپنی شادی کا سوچوں۔" انیقہ کی آنکھیں بھیگ اٹھیں۔ مصباح کو ایک دم اس پر پیار آگیا۔

"اچھا... تو یہ مسئلہ ہے۔ ایک بات کہوں مجھے نہیں لگتا کہ جیسا تم سوچتی ہو تمکین بھابھی ویسا کریں گی۔ میں ان سے ملی ہوں۔ مجھے تو کافی اچھی لگیں۔ جہاں تک میں تمہارے گھرانے کو سمجھی ہوں' تمہیں زوار بھائی کبھی بھی جاب کی اجازت نہیں دیں گے۔" مصباح کی پرسوچ نگاہیں اس پر گڑ گئیں۔ انیقہ بھی سوچنے لگی۔

"امید تو مجھے بھی یہ ہی ہے کہ بھائی کو میرا جاب کرنا پسند نہیں آئے گا۔ مگر میں ان سے اس سلسلہ میں بات تو کروں نا؟" انیقہ نے سر ہلا کر اتفاق کیا' پھر مشورہ مانگا۔

"میری بات مانو تو اتنی دور تک مت سوچو۔ سارے کام انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے' سب کچھ اوپر والے پر چھوڑ دو۔ مستقبل کی فکر میں اپنا حال خراب مت کرو' اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس پر یقین قائم رکھو' سارے مسئلے چٹکی بجاتے ہی حل ہو جائیں گے۔ تم بس ایک کام کرو' شادی کرو اور پیا کے دیس سدھارو۔" مصباح کے نرم اور ناصحانہ انداز نے جیسے اس کے دل کی ساری پریشانیوں کو ختم کر ڈالا۔ وہ ہلکی پھلکی ہو کر مسکرا اٹھی۔

"رہی اریبہ کی بات' یہ فکر اب تم مجھ پر چھوڑ دو' دیکھنا کیسا شاندار حل نکالتی ہوں۔" مصباح کی

مسکراہٹ دلنشین ہوگئی۔

"کیا مطلب' میں سمجھی نہیں؟" انیقہ نے اسے الجھ کر دیکھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ سالار بھائی صحیح کہتے ہیں' تم اپنی عقل شریف پر زیادہ زور نہ ڈالا کرو۔" مصباح نے کھلکھلا کر بات ٹالی' ان کی کلاس کا ٹائم ہو گیا تو انہیں اٹھنا پڑا' انیقہ اس کی بات میں الجھی اس کے پیچھے چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

"یہ سوٹ بھی اچھا لگ رہا ہے۔ پلیز پہن لونا' مصباح کی دوبار کال آچکی ہے' اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر آدھے گھنٹے میں ہم وہاں نہیں پہنچیں تو وہ خود یہاں پہنچ جائے گی اور تمہیں پتا ہے کہ وہ جو کہتی ہے وہ کرتی ہے۔" انیقہ نے لمبے سنہری لچھوں کو سلجھا کر چوٹی کی شکل دی اور بینڈ لگایا۔ وہ جیولری باکس میں اپنے سوٹ کی میچنگ کے ٹاپس ڈھونڈتے ہوئے مسلسل بہن کو منانے میں لگی رہی' مگر دونوں کام مشکل بن گئے۔ نہ ڈھنگ کے ایئررنگ ملے' نہ ہی اریبہ ٹس سے مس ہوئی' تکیے میں منہ چھپائے پڑی رہی۔

مصباح نے اپنی امی کے حج کرنے کی خوشی میں قرآن خوانی اور درس کا انتظام کیا تھا۔ جس کا بلاوا ان دونوں کے علاوہ ثمین بھابھی کو بھی دیا گیا۔ مصباح نے کئی بار ان کے گھر کا چکر لگایا۔ مگر ان دونوں کا ابھی تک اس کے یہاں جانا نہیں ہو سکا۔ زوار نے کالج کے پہلے ہی دن بہنوں پر یہ بات واضح کردی تھی کہ دوستیاں وہیں تک محدود رہیں تو بہتر ہے۔ بغیر وجہ کہ دوستوں کے گھر منہ اٹھا کے چل پڑنا انہیں قطعی پسند نہیں۔

تاہم مصباح کے کئی بار ان کے یہاں آنے جانے سے ثمین بھابھی بھی اس کی اچھی عادتوں کی شیدائی ہو گئیں۔ انہوں نے خصوصی طور پر میاں جی سے نندوں کے لیے سفارش کی۔ جانا تو ثمین بھی چاہتی تھی۔ مگر طبیعت کی ناسازی کے باعث جانے کا پروگرام کینسل کرنا پڑا' شہر بھر میں پھیلے نزلہ و بخار کے وائرس کا شکار ہو کر وہ بستر پر پڑ گئی۔

"ربا ڈارلنگ۔۔۔ اٹھتی ہو کہ نہیں۔۔۔ یا میں اکیلے ہی چلی جاؤں۔" انیقہ نے اریبہ کے چہرے سے تکیہ ہٹایا تو وہاں تو بادوباراں کا سماں دیکھا' دل دکھ گیا' بہن کے ماتھے سے بال ہٹا کر پیشانی کو چوما۔

"کیا تھا' جو بھابھی مجھے وہ ڈیزائنر کا سوٹ خریدنے دیتیں' میں نے ان سے تو پیسے نہیں مانگے تھے نا۔ اپنی جیب خرچ جمع کر کے خرید رہی تھی۔ ساری لڑکیاں آج کل مہنگے سے مہنگے برانڈ کی چیزیں استعمال کرتی ہیں۔ مگر ساری پابندیاں ہمارے لیے ہیں۔" اریبہ کا پھول سا چہرہ رو رو کر سرخ گلاب میں ڈھل گیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اچھا بات سنو۔ یہ جو بھابھی نے درزی سے سوٹ خود ڈیزائن کروائے ہیں نا' ناٹ بیڈ' تم پہن کر تو دیکھو' اچھی لگو گی' ڈیزائننگ منفرد سی ہے۔ یہ دیکھو میں نے بھی پہنا ہے۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے نا۔" انیقہ نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی بہن کو سمجھانے لگی۔ اس نے ہینگر میں لٹکی ہوئی کیمل کلر کی شرٹ' جس پر رنگ برنگ کے بٹنوں کا کام کیا گیا تھا اور فیروزی پرنٹڈ پلازو کی طرف تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بھرہ کیا۔ انیقہ نے خود بھابھی کا سلوایا ہوا بلیک شیفون کا انارکلی اور میرون چوڑی دار پائجامہ پہنا' انارکلی کے گلے پر میرون کٹ ورک کا کام بہت بھلا لگ رہا تھا۔ "تمہارے کہنے پر پہن رہی ہوں۔" اریبہ نے بغور سوٹ کو دیکھا تو من کو بھایا' مگر احسان بہن پر دھر دیا۔ انیقہ کے سمجھانے بجھانے پر آخر اریبہ تیار ہونے چل دی۔ "واؤ۔۔۔ ایک بات تو ماننی پڑے گی' بھابھی کٹوتی نے جب بھی ہم لوگوں کے لیے کپڑے ڈیزائن کیے ہیں' منفرد ہوتے ہیں۔" اریبہ تیار ہو کر آئی تو بہت پیاری لگ رہی تھی۔ انیقہ نے ایک دم آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ "ہاں۔۔۔ ہاں آج کل تمہیں تو ویسے بھی سب کچھ اچھا ہی لگ رہا ہے' تمہاری شادی

کی تاریخ جو طے ہو گئی ہے۔ وہ تم سے کچن میں کھڑے ہو کر ڈھیروں کھانے پکواتی ہیں۔ مگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ مجھے پتا ہے تم اب بدل گئی ہو' تمہیں میری فکر ہی نہیں۔" اریبہ نے بہن کی تعریف پر جل کر کہا' تو انیقہ کا قہقہہ نکل گیا۔ واقعی یہ بات توجہ ہے کہ آج کل وہ بہت خوش اور مگن دکھائی دیتی' سالار اور مصباح نے مل کر اس کے سر سے فکر کا ٹوکرا ہی اتار پھینکا۔ سالار نے اس کے جاب کرنے کا سن کر نہ صرف اس کی سوچ کا مذاق اڑایا' بلکہ اس کے منصوبے کو انتہائی احمقانہ خیال قرار دیا۔ سالار نے زوار کی پریشانی کو کم کرنے کے لیے اپنی ماں کو پہلے ہی سمجھا بجھا لیا' جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کے لیے مرے ہوئے بھائی کی محبتیں بھی یاد دلائیں۔ فصیحہ بھائی کو یاد کرتی آنسو پونچھتی ہوئی شادی کی تاریخ لینے پہنچ گئیں اور پہلی بات جہیز کی بابت کی' ایسے لین دین پر سختی سے اعتراض جڑتے ہوئے کچھ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ "تم لوگوں کا دماغ تو ٹھیک ہے' یہ میرے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے۔ میں جہیز و بہیز کے چکر میں پڑ کر اپنے بھائی کی روح کو تکلیف دوں' کبھی نہیں' ویسے بھی ان لوگوں کو دوسرے شہر چلے جانا ہے' جہاں کمپنی کی طرف سے سالار کو فلیٹ مل رہا ہے۔ دونوں جہیز کا سامان ڈھوتے کہاں لدو بیل بنے رہیں گے۔" گو کہ ثمین اور زوار نے آنا کانی بھی کی۔ مگر فصیحہ خاتون نے ایک نہ سنی' بلکہ دھمکی دے دی کہ اگر وہ ان چکروں میں پڑیں گے تو کل ہی نکاح پڑھوا کر اپنی امانت ایسے ہی دو کپڑوں میں گھر لے جائیں گی۔

مزے لوٹ رہی تھی۔ "جانو کیوں روتی ہو۔۔۔ میں ہوں نا' بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟" زوار نے پہلے اریبہ کے منہ پر ٹیپ چپکایا' ہاتھ جوڑ کر اسے ایک طرف بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر انیقہ کا نرم و ملائم ہاتھ پیار سے تھام کر اسے دلاسا دیا۔ انیقہ نے موقع دیکھ کر خواہشات کی لمبی فہرست اسے تھما دی۔ سالار نے بے ساختہ امڈ آنے والے قہقہے کے طوفان پر جبرا" بند باندھا' ورنہ وہ تو لڑنے بیٹھ جاتی۔ پیار سے پاگل سی اس لڑکی کو دیکھا' جو اب مطمئن ہو کر ٹشو سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے سالار کے جواب کی منتظر تھی۔

"اوکے پکا۔۔۔ میں لاہور جا کے سارے ڈیزائنر سوٹ اور برانڈڈ پرس و جوتے وغیرہ کی شاپنگ کراؤں گا اور بھی وہ سب کچھ جو تمہیں پسند ہو گا' مگر پلیز ابھی خاموشی سے ان بڑوں کو اپنی مرضی کرنے دو' اسی میں ہماری بھلائی ہے۔" سالار کے جڑے ہاتھ دیکھ کر وہ شرمندہ ہو گئی' مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے بھی شاپنگ کروانی ہے گی۔۔۔ بالکل انیقہ جیسی۔۔۔ ورنہ چھوڑوں گی نہیں۔" اریبہ نے فٹ سے ٹیپ نکالا اور ان کے بیچ کباب میں ہڈی بننے لگی۔

"اپنا منہ دھو رکھو بلی' مجھے نچانے کے لیے گھر والی کم ہے کیا کہ آدھی گھر والی بھی اٹھ کھڑی ہوئی؟" سالار نے اسے چھیڑا۔ ان دونوں کے بیچ لڑائی کا نیا راؤنڈ جاری ہو گیا۔ انیقہ نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔

"مجھے بھابھی کٹوتی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر۔۔۔ تم کھو جاؤ رنگین سپنوں میں۔۔۔ بی بنو خوشی خوشی لاہور سدھار جاؤ گی' ہم دیوانے بنے ان کی یاد میں آنسو بہائیں گے۔" اریبہ نے ہونٹ لٹکا کر آنکھوں میں آنسو بھر کہا' اسے ابھی سے تنہائی کی آہٹ محسوس ہونے لگی۔ انیقہ نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ بہن کو اداس دیکھ کر وہ بے چین ہو اٹھی۔ ان دونوں بہنوں کا تعلق بہنوں سے زیادہ دوستوں والا رہا۔ اب ایک کو تنہا رہنا بھاری پڑ رہا تھا۔ اریبہ کو اس کی شادی کا سوچ کر ہی جھرجھری آنے لگی۔

"میری جانو۔۔۔ مجھے پتا ہے' تم اکیلی نہیں رہو گی' میرے ساتھ ساتھ تمہارا ابھی کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے' ایک شہزادہ پیاری ربا کو اپنا بنانے دور سے چلا آرہا ہے۔"

انیقہ نے پیار سے بہن کو منانے کے لیے ایک بات کہہ دی۔ اریبہ بہن کے بہلاووں پر افسردگی سے

مسکرادی' دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر کی طرف چل پڑیں' یہ جانے بغیر کہ کل کیا ہونے والا ہے؟ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ہر وقت منہ سے اچھی بات نکالنی چاہیے کہ جانے کب قبولیت کی گھڑی ہو تو انیقہ کے لبوں سے نکلنے والی دعا کو بھی "فوراً" ہی مقبولیت حاصل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"آؤ مجھے تم دونوں کو کچھ دکھانا ہے۔" ثمین نرمی سے ہاتھ تھام کر انہیں اس کمرے سے باہر لے آئی جہاں مایوں بٹھانے کے بعد سے آج تک دونوں کو محصور کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے دوپٹا ٹھیک کیا جو سر کر کاندھے پر آ گیا تھا۔ دوپٹے کے کناری پر ٹکی ماتھا پٹی یوں جھلملا اٹھی مانو دن میں تاروں کی بارات اتر آئی ہو۔

جانے کیوں۔۔۔ شادی کے دن جیسے جیسے قریب آ رہے تھے' اس گھر کے ذرے ذرے کے لیے ان کا پیار اُمڈ کر باہر آ رہا تھا۔ بابل کا گھر چھوڑنا اتنا سہل بھی نہ لگا' بچپن کی سہانی یادیں' وہ باتیں جو کبھی بہت بری لگتیں' آج قابل برداشت ہو گئیں' دل در و بام کو چومنے کو بے تاب ہوا جاتا کہ اب ساجن کے گھر جانا ہے۔

دنیا کی یہ ریت بھی کچھ عجب ہے کہ جہاں لڑکی سالوں گزارتی ہے' اپنا آپ پہچانتی ہے' وہ اپنا گھر شادی کے بعد پرایا کہلاتا ہے۔ ثمین نے باری باری دونوں کی پیشانی پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیے۔ اب جانے کی گھڑی کیا آئی' ان کی آنکھیں بھر آئیں' کچھ مصباح اور کچھ اپنے دل کے سمجھانے پر دونوں نے سارے گلے شکوے اسی دہلیز پر چھوڑ جانے کا عہد کیا۔

آنسو تو ثمین کی آنکھوں سے بھی بہہ نکلے' مگر خوشی کے اور آخر اس کی سالوں سے جاری ریاضت ضائع ہونے سے بچ گئی۔ اس نے دل پر پتھر رکھا' کٹھن ریاضت کی۔ ساس سے کیا گیا وعدہ نبھاتے خود کو متنازعہ بھی بنا ڈالا۔ تاہم اپنی نندوں کی تربیت میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ دونوں تجربے کی بھٹی میں پک کر کندن بن گئیں' تو ان کی شادی کرنے چلی' تاکہ جنت مکانی ساس کے سامنے سرخرو ہو پائے۔

انیقہ اور اریبہ کو تو اس بات کا ادراک بھی نہ ہو سکا کہ بھابھی کی سختیوں نے ان کو اندر سے کتنا مضبوط بنا ڈالا ہے۔ ثمین مطمئن ہو گئی کہ اب وہ دونوں اس قابل ہیں کہ سسرال کی نرمی گرمی برداشت کرتے ہوئے اچھے برے ہر طرح کے ماحول میں سبھاؤ سے گزارا کر سکیں۔

ثمین نے جب سسرال میں قدم رکھا تو ڈھنگ ہی نرالے دیکھے' جتنی رزق کی ناقدری اس نے یہاں پائی' اس کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے' میکے میں اس کی امی کا مقولہ تھا کہ پاس تین نوالے ہوں تو کیوں نہ دو کھا کر تیسرے سے کسی پریشان حال یا لاچار کی بھوک مٹا دی جائے اور یہاں کا نظام عجیب' جو بھی ہو اس سے بس اپنا پیٹ بھر لیا جائے۔ ثمین کے اندر ماں کی نصیحتیں سرایت کر چکی تھیں۔

اسے میکے کی باتیں یاد آتیں' وہ رزق کی بہت قدر کرتی' خود باسی کھا لیتیں' مگر کھانا ضائع نہ کرتیں۔

ان کی بابرکت ہانڈی سے روزانہ محلے کے اس گھر میں کھانا جاتا' جہاں ایک بیوہ عورت قرآن پاک کی تعلیم دے کر بڑی مشکلوں سے زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی۔ ثمین میکے جاتی تو ماں سے سسرال کی باتیں بہت محتاط انداز میں شیئر کرتی' انہوں نے ساری بیٹیوں پر از خود پابندی عائد کر دی تھی کہ یہ تمہارے باپ کا گھر ہے' جم جم آؤ' لیکن یہاں بیٹھ کر اس گھر کو برا نہ کہو جو اب تمہارا گھر ہے۔

"یا تو ان کی جیسی بن جاؤ' یا آہستہ آہستہ انہیں اپنے جیسا بنا ڈالو۔" اس کی ماں نے اپنی پیاری بیٹی کی پیشانی چوم کر کہا۔ تو ثمین نے یہ بات گرہ سے باندھ لی۔

ثمین کے سسر دعوتوں کے شوقین' ان کو تازہ پکا کھانا مرغوب' صبح' شام کئی طرح کے کھانے پکتے' باقی بچ جانے والے فریج میں پڑے اپنی ناقدری پر روتے یا باسی ہو کر سڑ کر کوڑے کے ڈھیر پر چلے جاتے' فاروق صاحب بیوی کی نہ سنتے' ایک عمر گزارنے کے بعد وہ بھی آخر ان کے ہی رنگ میں رنگ گئیں۔ فاروق صاحب نے اپنی کمائی کا زیادہ حصہ کھانے پینے میں اڑا دیا۔ آخر دل کا روگ لگا بیٹھے' بائی پاس کروایا گیا۔ ساری عمر بہت اچھی کمائی کی' مگر سب اللوں تللوں کی نظر ہو گئی۔ مکان پرانا ہو چکا۔ کب سے دیکھ بھال مانگ رہا تھا' مگر بچت کے نام پر ٹکا پاس نہیں۔

سارا گھر بے فکری کی روٹی توڑتا' انیقہ' اریبہ بھی گھر کے حالات سے بے خبر بس آسائشوں کی عادی ہو چلیں' ان حالات کو سنبھالا دینا' ثمین کے لیے ایک چیلنج بن گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ گھر کا چارج سنبھالا تو ہاتھ روک کر طریقے سے کچن چلاتی' سسر کو پرہیزی کھانوں پر لے آئی' شروع میں تو سوائے زوار کے سب نے خوب شور مچایا' مگر اس نے بھی ثابت قدمی سے چلتے ہوئے اپنی حکومت قائم کر ہی لی۔ وہ مثبت تھی' اس کا ضمیر مطمئن تھا' پھر کاہے کا ڈر۔ اس کی سلیقہ مندی کو کنجوسی کا نام دیا گیا۔ مگر جب مہینے کے بجٹ میں سے پیسے بچا کر اس نے کمیٹیاں ڈال کر نہ صرف گھر کی مرمت کروائی بلکہ اوپری منزل کے اسٹور روم کو صاف کروایا۔ دو کمروں میں تازہ چونا پھروایا' چھوٹا سا کچن اور واش روم بنوا کر کرائے پر چڑھا دیا۔ یوں سسر کی ریٹائرمنٹ سے آمدنی کا جو ایک خلا پیدا ہوا وہ مکمل طور پر نہ سہی' تھوڑا بہت بھر ہی گیا۔

آخری وقت میں تو فاروق صاحب بھی بہو کے کہنے پر چلنے لگے۔ صحت کی خرابی نے ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیے' مگر دیر ہو چکی تھی' بدپرہیزیوں کا انجام برا' اک دن ایسا سوئے کہ پھر نہ اٹھ سکے۔ سسر کے اچانک چلے جانے کا صدمہ ساس سے برداشت نہیں ہو پایا۔ وہ بھی مسلسل بیمار رہنے لگیں۔

"بہو۔۔۔ تم بہت اچھی ہو۔۔۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم میری بیٹیوں کو بھی اپنے جیسا بنا لو۔ انہیں بھی دوسرے گھر جانا ہے۔ میری خواہش ہے کہ وہ تمہاری طرح گھر جوڑنے والی بن جائیں۔"

ثمین ان کو چمچے سے سوپ پلا رہی تھیں۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر حسرت سے کہا۔ تو اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اسے اپنی قربانیوں کا صلہ ساس کے منہ سے نکلنے والے تعریفی الفاظ کی صورت میں مل گیا' ساری کلفتیں جاتی رہیں۔

"میں ان کی تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑوں گی۔ شاید اریبہ اور انیقہ کو میری سختی بری لگے' ہو سکتا ہے وہ مجھ سے بدگمان بھی ہو جائیں۔" ثمین کے لہجے میں اندیشے بول اٹھے۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ زخم کے علاج کے لیے چیرے کا درد تو سہنا ہی پڑے گا' جب وہ رشتوں کو برتیں گی' تمہاری باتیں انہیں شہد کی طرح میٹھی لگیں گی۔ ایک نہ ایک دن انہیں احساس ہو ہی جائے گا کہ تم نے ان کو کیسا باشعور بنا دیا ہے۔" وہ آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"بھابھی۔۔۔ کہاں جانا ہے؟" اریبہ کی آواز نے ثمین کو ماضی کی وادیوں سے کھینچ نکالا۔ اس نے نظریں اٹھا کر نندوں کو دیکھا۔ زرد اور سبز امتزاج کے غرارے سوٹ جس کی قمیص کے گلے آستین اور گوٹ پر چوڑی چوڑی سنہری بیل لگائی گئی تھی۔ زیب تن کیے وہ دونوں مغلیہ دور کی شہزادی لگ رہی تھی۔

گھر میں کئی دنوں سے شادی کی رونقیں جاری تھیں۔ دونوں کی مشترکہ سہیلیاں حرا اور سحرش آ کر خوب دھمال ڈالتیں' مصباح البتہ وعدے کے باوجود ایک دن بھی نہ آ پائی۔ اس کے اپنے گھر میں ہلا گلا لگا ہوا تھا۔ آخر اس کے اکلوتے بھائی کی شادی تھی۔ اپنی ہر دلعزیز دوست اریبہ کو بھابھی بنانے کے لیے جان توڑ کوششیں بار آور ہو گئیں۔ ورنہ اس کی امی تو اپنی بھانجی نرجس کو بہو بنا کر لانے کے لیے پر تول رہی

تھیں۔ اریبہ کی معصومیت نے پہلی ملاقات میں ہی مصباح کے دل میں جگہ پیدا کردی۔ اسے ڈر لگتا کہ یہ کانچ کی گڑیا کسی بے درد ہاتھوں میں جاکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوجائے۔ وہ ان دونوں کو اتنا ڈانٹتی ڈپٹتی مگر وہ ہمیشہ اس کی پرخلوص محبت کا احترام کرتیں۔ یہ ان کے اچھے خاندان سے تعلق رکھنے کی نشانی تھی۔ انیقہ کی پریشانی نے اس کے ارادے کو تقویت دی۔

وہ کیا کہتے ہیں کہ ”نیت ثابت تو منزل آسان“ ان لوگوں کے معاملے میں بھی یہ ہی ہوا' مصباح نے ان لوگوں کو دعوت میں بلوا کر خصوصی طور پر اپنی اماں اور بھائی سے ملوایا۔

”پلیز بہنا۔۔۔ جلدی سے اپنی دوست کو بھابھی بنا کر گھر لانے کا انتظام کرو' میں نرجس کو اپنی بہن تصور کرتا ہوں' یہ نہ ہو کہ تمہارا بھائی امی کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مارا جائے۔“ دعوت کے اختتام پر' رمیض تو مصباح کے گوڈوں میں جا بیٹھا' لگا اسے مسکہ لگانے' بھائی کی رضامندی نے جیسے اس کے پر لگا دیے' کمر کس کر میدان عمل میں کود پڑی' امی کو منا کر ہی دم لیا۔

زوار کو بھی اچھی پوسٹ پر فائز ہینڈسم سا رمیض اپنی لاڈلی اور چھوٹی بہن کے لیے مناسب لگا۔ ویسے بھی جب ملن آسمانوں پر طے ہوجائے تو زمین پر ملنے کے راستے خود بخود بنتے جاتے ہیں۔ بغیر کسی رکاوٹ اور بغیر کسی پریشانی کے سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے پاتے چلے گئے۔ یوں دونوں بہنوں کی شادی ایک ہی دن کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ آج ان کی مہندی کی رسم ادا ہونی تھی۔

دونوں گنگ سی بغیر سوال جواب کیے بھابھی کے پیچھے چل دیں۔ ثمین انہیں بڑے کمرے کی طرف لے آئی۔ جس کا دروازہ بند تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو دونوں بہنوں کی آنکھیں چکاچوند ہوگئیں۔ بے شمار ڈیزائنرز کے جدید انداز میں سلے ہوئے دل کش سوٹ' برانڈڈ جوتے اور مہنگے ہینڈ بیگز' ان کی پسند کی گئی ہر وہ چیز ان کے جہیز کے سامان میں رکھی گئی تھی۔ جن کی فرمائش کبھی انہوں نے بھابھی سے کی تھی۔

”مجھے پتا ہے کہ تم لوگ دل ہی دل میں مجھے برا سمجھتی رہی ہو۔ مگر میں نے امی جان کی مرضی سے تم لوگوں میں زندگی کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کی' سوچو کیا یہ بری بات ہے کہ اگر ہم تھوڑا کھا کر کسی نادار کا پیٹ بھر دیں' اپنی خواہشات کو محدود کر کے بھی خوش رہا جاسکتا ہے نا۔“ ثمین کے آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ انیقہ اور اریبہ نے بڑھ کر ایک ساتھ اسے گلے لگا لیا۔ کچھ بولنا چاہا' مگر گلا رندھ گیا' بول ہی نہ پائیں۔

”جہاں تک ان قیمتی کپڑوں اور باقی اشیا کی بات ہے' ان کو استعمال کرنے میں کوئی برائی نہیں' مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ زندگی کا آخر نہیں' زندگی ان برانڈز کے بغیر بھی سہل طریقے سے گزر سکتی ہے نا۔۔۔ خیر میں نہیں چاہتی کہ اس گھر سے جاتے ہوئے تمہارا دل برا ہو' اسی لیے تم دونوں کی پسند کے حساب سے شاپنگ کی ہے۔“ ثمین کے چہرے پر ایک چمکیلی مسکراہٹ عود آئی۔

”نہیں بھابھی۔۔۔ آپ تو بہت اچھی ہیں' پلیز ہمیں معاف کردیں۔“ دونوں ثمین سے لپٹ کر بلکنے لگیں۔ بدگمانی کے بادل کیا چھٹے' سارے منظر صاف صاف دکھائی دینے لگے۔

”ویسے کوئی برائی نہیں' کبھی ضرورت پڑے' زندگیاں سدھارنے کا معاملہ ہو تو تم دونوں بھی بھابھی کٹوتی کا روپ دھار لینا۔“ ثمین نے شرارتی انداز اپنایا تو وہ دونوں جھینپ گئیں۔ ان کا دل اپنی بھابھی کی عظمت کو سلام پیش کرنے لگا۔

جھنجھلاتے ہیں، لجاتے ہیں' پھر مسکراتے ہیں
اس اہتمام سے انہیں، ہم یاد آتے ہیں

اب جاکے آہ کرنے کے آداب آئے ہیں
دنیا سمجھ رہی ہے کہ، ہم مسکراتے ہیں

گزرے ہیں مے کدے سے جو توبہ کے بعد ہم
کچھ دور عادتاً بھی قدم لڑکھڑاتے ہیں

اب جوئے گریہ! دیکھ' نہ کرنا خجل مجھے
آنکھیں تیری ضرور ہیں' آنسو پرائے ہیں

اے موت، اے بہشتِ سکوں خوش آمدید!
ہم زندگی میں پہلے پہل مسکراتے ہیں

انسان جیتے جی کریں توبہ خطاؤں سے
مجبوریوں نے کتنے فرشتے بنائے ہیں

خمار بارہ بنکوی

اس کے بعد'

پرانے گھر میں کوئی رہے کیا
ہر اک شے سے تمہاری بانہیں لپٹ رہی ہیں
فضا میں اب تک
تمہارے ملبوس اور بدن کی نشیلی خوشبو
رچی ہوئی ہے
ہر اک گوشے میں
ہلکی ہلکی تمہاری آواز تیرتی ہے
خموش ویران آئینے میں تمہاری آنکھیں
ہر آنے والے کو روکتی ہیں
اداس گھر میں جو کوئی آئے
تمہاری سانسوں کا شور پا کے
تمہاری دھڑکن کا گیت سن کے
وہیں دبے پاؤں لوٹ جائے

سلیم الرحمٰن

کیا کہیں کشف و کرامات میں رکھا ہوا ہے
یا ترا عشق مناجات میں رکھا ہوا ہے

مجتہدا عشق کی تفسیر جو ممکن ہی نہیں
کس لیے پھر اسے آیات میں رکھا ہوا ہے

عین ممکن تھا ترے ہاتھ سے جاتا رہتا
تُو نے اچھا کیا اوقات میں رکھا ہوا ہے

کیا تماشہ ہے کوئی عشق تھا کر صاحب
روز اک ہجر مری گھات میں رکھا ہوا ہے

میں تو دریا کے سفر کے لیے موزوں بھی نہیں
تُو نے صحرا بھی مرے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے

ڈر سا رہتا ہے کہیں ٹوٹ نہ جائے میثم
یہ جو اک حبس مری ذات میں رکھا ہوا ہے

میثم علی آغا

وہ درد کو آنکھوں سے گزرنے نہیں دیتا
سیلاب تو دے دیتا ہے، جھرنے نہیں دیتا

رہتا تو ہے آنکھوں میں وہ آئینہ برابر
جب مجھ کو سنورنا ہو، سنورنے نہیں دیتا

خود ٹوٹ کے بکھروں تو بکھر جاؤں بلا سے
میں درد کی دولت تو بکھرنے نہیں دیتا

پھر مجھ کو اٹھا دیتا ہے دامن کی ہوا سے
مرنے کا ارادہ ہو تو مرنے نہیں دیتا

میں اُس کے دلِ سخت میں گھر کیسے کروں گا
وہ اپنی گلی سے بھی گزرنے نہیں دیتا

میں مائل انکار تو ہو جاتا ہوں دُنیا
دل مجھ کو محبت سے مکرنے نہیں دیتا

شہزاد نیئر

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت اسماءؓ بنت یزید سے روایت ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔
"کیا میں تمہیں بہترین افراد کی نشان دہی نہ کروں؟"
صحابہ نے عرض کیا۔ "کیوں نہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تمہارے بہترین افراد وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ کی یاد آئے۔"

تصنیف،

میں جب مقامِ فاطمہؓ کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے حیاتِ اقبال کا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جب شاعرِ مشرق نے اپنے استاد میر حسن کا نام شمس العلماء کے خطاب کے لیے پیش کیا۔ کمیٹی کے ارکان نے پوچھا۔ "ان کی تصنیف کیا ہے؟" علامہ اقبال نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"میں ہوں ان کی تصنیف۔"
آپ اس واقعے کی روشنی میں مقامِ فاطمہؓ کی جستجو کریں تو آپ کو کربلا کے میدان میں کھڑے حضرت حسینؓ حضرت فاطمہؓ کے مقام کا تعین کرتے نظر آئیں گے۔ جن کے دس دن آج تک چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں۔
"ہاں میں ہوں فاطمہ کی تصنیف۔"
(زیرو پوائنٹ۔ جاوید چوہدری)
عائشہ خان۔ ٹنڈو محمد خان

بے ادبی کی سزا،

ابراہیم بن ادہم نے مکے میں دیکھا کہ ایک مشہور دولت مند گھوڑے پر سوار ہے۔ اور طواف کر رہا ہے۔ ابراہیم ادھم کو بہت ناگوار گزرا۔ جب وہ اور دوسرے حاجی مکے سے نوٹے تو راستے میں وہی شخص ملا۔ اس حال میں کہ اس کا گھوڑا اور اونٹ بدوؤں نے لوٹ لیے تھے۔ اور اس کے بدن کے کپڑے تک اُتروا لیے تھے۔ پاپیادہ اور برہنہ پا سفر کر رہا تھا۔
اس کی یہ حالت دیکھ کر ابراہیم ادھم اس کے پاس پہنچے اور بولے۔
"جو شخص پیدل چلنے کے مقام پر سوار ہوتا ہے اس کی سزا یہی ہے کہ سواری کے مقام پر پیدل چلے۔"

تازہ انڈہ،

ایک صاحب نے ریسٹورنٹ میں ویٹر کو تازہ اُبلے انڈے کا آرڈر دیا اور تازہ انڈے پر زور دیا۔ ویٹر نے انہیں اطمینان دلایا کہ ان کے ہاں بالکل تازہ انڈے ہی ہوتے ہیں۔
انڈا آیا تو اس پہ باریک الفاظ میں ایک پیغام درج تھا۔
"میری عمر بائیس سال ہے۔ میں دنیا میں اکیلی ہوں خوبصورت، زندہ دل اور خوش حال ہوں۔ شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ میری ذات میں دلچسپی محسوس کریں تو مندرجہ ذیل پوسٹ بکس کی معرفت خط لکھیں۔"
ان صاحب نے بصد اشتیاق پوسٹ بکس نمبر نوٹ

کیا، انڈا کھایا اور گھر آ کر اس نامعلوم لڑکی کے نام ایک نہایت طویل اور رومینٹک خط لکھا۔ کافی دن بعد جواب آیا۔

"آپ نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے ان کا شکریہ لیکن میری شادی ہوئے تو ڈیڑھ سال گزر چکا ہے۔"

اقصیٰ اکبر۔ حیدر آباد

بلامعاوضہ،

ایک دن جنرل منیجر صاحب جلدی دفتر آ گئے تو انہوں نے دیکھا کہ کلرک ایک کونے میں لیڈی ٹائپسٹ کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف ہے۔ انہوں نے کلرک کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں اس کام کی تنخواہ دی جاتی ہے؟"

کلرک نے جواباً مودبانہ عرض کی۔ "نہیں جناب! یہ کام تو میں بلامعاوضہ انجام دیتا ہوں۔"

ارم کمال۔ فیصل آباد

کوزے،

- بات تمیز سے اور اعتراض دلیل سے کرو کیونکہ زبان تو حیوانوں کے منہ میں بھی ہوتی ہے مگر وہ علم اور سلیقے سے محروم ہوتے ہیں۔
- مجھے بہت سے ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے جو میرے مرنے پر رونے کو تیار ہوں مجھے صرف ایک شخص کی ضرورت ہے جو میرے رونے پر مرنے کو تیار ہو۔
- دنیا میں رہنے کے لیے دو جگہ سب سے زیادہ بہترین ہیں۔ کسی کے دل میں، یا کسی کی دعاؤں میں۔
- اپنوں کو ہمیشہ اپنے ہونے کا احساس دلاؤ ورنہ وقت آپ کے اپنوں کو آپ کے بنا جینا سکھا دے گا۔
- ہر انسان کی خوشی کی وجہ بنو۔ خوشی کا حصہ نہیں۔ اور ہر انسان کے دکھ کا حصہ بنو۔ دکھ کی وجہ نہیں۔
- انسان کی مرضی اور اللہ کی مرضی کے فرق کا نام غم ہے۔ جتنا فرق کم ہوگا، اتنے ہی غم کم ہوں گے۔
- کبھی دوسروں کے لیے دل سے دعا مانگ کر دیکھو تمہیں اپنے لیے مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔
- تو نے محبت کیا چیز بنائی ہے یا رب! تیرے ہی آگے تیرے بندے کسی اور کے لیے روتے ہیں۔
- جب تمہیں یقین ہو کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کون کون تمہارے خلاف ہے۔
- جب رب راضی ہونے لگتا ہے تو بندے کو اپنے عیبوں کا پتا چلنا شروع ہو جاتا ہے اور یہ اس کی رحمت کی پہلی نشانی ہے۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

شکایت،

ایک صاحب نے رات کو ایک ہوٹل میں قیام کیا اور صبح منیجر کو بلا کر شکایت کی۔

"یہ آپ کا ہوٹل ہے۔ میرے ساتھ والے کمرے میں رات بھر حیا سوز حرکتیں ہوتی رہی ہیں۔"

"لیکن جناب! آپ کو کیسے علم ہوا؟ درمیان میں کوئی دروازہ بھی نہیں۔ کمروں کے دروازے اندر سے بند رہتے ہیں۔" منیجر نے استفسار کیا۔

"ذرا میز پر کرسی رکھیے اور روشن دان سے جھانکیے تو آپ کو پتا چلے گا۔" موصوف نے غصے سے کہا۔

نمرہ، اقراء۔ کراچی

دنیادار،

حضرت علیؓ سے کسی نے سوال کیا۔

"امیرالمومنین! دنیادار کی آپ کیا تعریف فرمائیں گے؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا۔

"دنیادار بھونکنے والے کتوں کی طرح ہوتا ہے جو ایک دوسرے پر غراتے رہتے ہیں۔ یہ سب درندوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں سے طاقت ور اپنے سے کمزور کو کھا جاتا ہے اور بڑے چھوٹوں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔"

شبنم شمشاد۔ بزمان

تخیل،

"میں سیاح ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک جگہ رہنے سے میرے پاؤں زمین میں دھنس جائیں اور میں ہمیشہ کے لیے ساکت رہ جاؤں۔"

"ایک جگہ رہنے سے ہی۔ ساکت ہونے سے ہی شاخیں پھوٹتی ہیں پھر ان پر پھول لگتے ہیں۔"

سنان نے حیرت سے چینی کی طرف دیکھا۔

"اتنا خوبصورت تخیل!"

(مستنصر حسین تارڑ۔ پیار کا پہلا شہر)

عاقل بالغ،

سکندر اعظم سے کسی نے پوچھا۔

"اتنی چھوٹی سی زندگی۔ اتنی بڑی دنیا کو کیسے فتح کیا؟"

جواب دیا۔ "دو کاموں سے۔ پہلا دشمنوں کو اتنا مجبور کیا کہ وہ دوست بن گئے... دوسرا دوستوں کو کبھی نہیں چھوڑا کہ وہ دشمن بن جائیں۔"

تین اصول،

زندگی کے تین سنہرے اصول ہمیشہ یاد رکھو۔

1. اس سے ضرور معافی مانگو جسے تم چاہتے ہو۔
2. اسے مت چھوڑو جو تمہیں چاہتا ہے۔
3. اس سے کچھ بھی نہ چھپاؤ جو تم پر اعتبار کرے۔

مدیحہ یوسف۔ فیصل آباد

مداخلت،

موٹر وے پر ایک پولیس افسر نے تعاقب کر کے ایک کار کو روکا۔

"جی جناب! فرمائیے، کیوں روکا ہے آپ نے؟" کار سوار نے پوچھا۔

"آپ اسی کی رفتار سے جا رہے ہیں جبکہ یہاں رفتار کی حد ساٹھ ہے۔" افسر نے کہا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو پچاس پر گاڑی چلا رہا ہوں۔" سوار نے جواب دیا۔

"نہیں ڈارلنگ! تم پورے سو کی رفتار پر گاڑی اڑا رہے تھے۔" سوار کی بیوی نے یکدم مداخلت کی۔

"تمہاری گاڑی کی عقبی لائٹ بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔ جو حادثے کا باعث بن سکتی ہے۔" افسر نے کہا۔

"اوہ! مجھے علم نہیں ہو سکا اس کے ٹوٹنے کا۔" مرد سوار نے پریشان ہو کر کہا۔

"رہنے دو۔ میں پچھلے تین ہفتوں سے تمہیں یاد کروا رہی ہوں مگر تمہارے پاس ٹائم ہی نہیں ہوتا۔" سوار کی بیوی بولی۔

"تم نے سیٹ بیلٹ بھی نہیں باندھی ہوئی۔" افسر نے تیز نظروں سے سوار کو گھورا۔

"وہ تو میں آپ کو دیکھ کر اترنے لگا تھا تو بیلٹ کھولی۔" سوار نے بوکھلا کر وضاحت کی۔

"نہیں ڈارلنگ! تم بیلٹ کہاں باندھتے ہو کبھی۔" سوار کی بیوی چپ نہ رہ سکی۔

"بکواس بند کرو۔ ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔" سوار پلٹ کر بیوی پر غرایا۔

"کیا آپ کے شوہر آپ سے اسی طرح بات کرتے ہیں؟" افسر نے بیوی سے سوال کیا۔

"نہیں نہیں۔" بیوی سہم کر بولی۔ "بس جب نشے میں ہوتے ہیں، تب تھوڑا غصہ دکھانے لگتے ہیں۔"

سیماب منصور۔ اسلام آباد

یاسمین حنفی ـــــــــ کراچی

احوالِ غمِ ذات سنانے سے رہا میں
اب خود کو تماشا بنانے سے رہا میں
ہر بار میں تذلیلِ انا کر نہیں سکتا
ہر بار اسے جا کے منانے سے رہا میں

آمنہ اُجالا ـــــــــ ڈہرکی

کوئی ایسا حرف نہیں لکھا کہ ہو شرمسار قلم میرا
کوئی ایسا جرم نہیں کیا کہ وضاحتیں بھی ساتھ ہوں
یہ نہیں کہ راہ میں جو ملے اسے ہی ہمسفر بناؤں میں
جو تمام عمر نبھا سکیں وہ رفاقتیں مرے ساتھ ہوں

شفق راجپوت ـــــــــ گوجرہ

بجھا سکیں نہ آندھیاں جسے زمانے کی
تیری آرزو میں ایسے چراغ جلتے ہیں

نمرہ، اقرا ـــــــــ کراچی

ممکن ہے کسی روز یہ کندن ہی بنا دے
اس دل میں لگی آگ بجھانے سے رہا میں
جو زخم رفیقوں کے رویوں سے لگے ہیں
وہ زخم کسی کو بھی دکھانے سے رہا میں

رضوانہ شکیل راؤ ـــــــــ لودھراں

گردشِ لمحات کے اندھے و تیرے دیکھے
ہم جو بیٹھے زیرِ سایہ چل پڑتی دیوار بھی

کائنات اصغر بوزدار ـــــــــ ڈہرکی

یاد آئیں جو کبھی ڈھونڈنا ویرانوں میں
ہم نہ مل پائیں گے شاید کوئی ہم سا ہو گا
روٹھے گی صبح ہمیں، شام مضطر ہو گی
کچھ بھٹکتی راتوں کو بھی غم سا ہو گا

سیما ممتاز عباسی ـــــــــ لاڑکانہ

اندر سے سراپا آگ ہوں میں
باہر سے مگر جمی ہوئی برف

شفاعت بتول مین تارا ـــــــــ جام پور

یہ کیا خبر تھی کہ اک چہرے سے کتنے چہرے کشید ہوں گے
میں تھک گیا ہوں تمہارے چہروں کو آئینے میں سجا سجا کے
عجب تناسب سے ذہن و دل میں خیال تقسیم ہو رہے ہیں
مگر محبت ہی ہو گئی ہے تمہیں محبت سکھا سکھا کے

فائزہ بلال، اقرا آفرین ـــــــــ جام پور

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

رخسانہ ـــــــــ کوٹ ادو

وہ جو مجھ سے سر آئینہ پس آئینہ بھی تو دیکھتے
کبھی روشنی میں وہ تیرگی کو چھپا ہوا بھی تو دیکھتے
سرِ آب جو رہا تشنہ لب تو یہ ضبطِ غم کی ہے انتہا
میرے حال پہ تھے جو نکتہ چیں میرا حوصلہ بھی تو دیکھتے

نخبہ اکرم ـــــــــ گاؤں کوٹیکی

وہ اتر گئے تھے جو پار خود، مجھے بیچ بھنور میں چھوڑ کر
تھا جوان میں اتنا حوصلہ مجھے ڈوبتا بھی تو دیکھتے
جنہیں مجھ سے ہے یہ گلہ کہ میں رہا بے نیازِ خلوص و ربط
میرے گرد رسم و رواج کا کبھی دائرہ بھی تو دیکھتے

حرا قریشی ـــــــــ ملتان

اقرار کر گیا، کبھی انکار کر گیا
ہر بار اک عذاب سے دوچار کر گیا
رستہ بدل بدل کے بھی دیکھا مگر وہ شخص
دل میں اتر کے ساری حدیں پار کر گیا

ایمان فاطمہ ـــــــــ نامعلوم شہر

مجھے آرزوئے سحر رہی یوں ہی رات بھر بڑی دیر تک
نہ بکھر سکا نہ سمٹ سکا یوں ہی رات بھر بڑی دیر تک
ہے بہت عذاب اور اکیلے ہم، شبِ غم بھی میری طویل تر
رہی زندگی بھی سراب اور رہی آنکھ بھی تر بڑی دیر تک

روبی ـــــــــ آزاد کشمیر

یہاں ہر طرف ہے عجب سماں سب ہی خود پسند، سب ہی خود نما
دلِ بے سکوں کو نہ مل سکا کوئی چارہ گر بڑی دیر تک
مجھے زندگی ہے عزیز تر اسی واسطے میرے ہم سفر
مجھے قطرہ قطرہ پلا زہر، جو کرے اثر بڑی دیر تک

اقصیٰ، عذرا ـــــــــ کراچی

یہ پھیلی ہوئی رات ڈھلے یا نہ ڈھلے
یہ یورشِ حالات ٹلے یا نہ ٹلے
روشن کر چراغِ دہر و کعبہ
پھر شمع خرابات جلے یا نہ جلے

صفیہ عباس ـــــــــ کروڑ لعل عیسن

آئینے میں غبار اُتر آیا
عکس ٹکرا رہے ہیں پتھر سے
میں تھکن اور دکھ سے کدھر جاؤں
آسمان ہٹ گیا ہے میرے سر سے

دردہ بٹ ـــــــــ ڈسکہ

نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

حرا قریشی ـــــــــ ملتان

ان انتہاؤں میں تھوڑا سا اعتدال بھی تھا
وہ دشمنوں میں تھا اُس کو میرا خیال بھی تھا
عجیب کیا ہے جو اُس کا جرم چھپ گیا ہے
وہ یاد سوخ بھی تھا اُس کے پاس مال بھی تھا

صفیہ عباس ـــــــــ لیہ

میں تیرے ساتھ جنت ہو جاؤں
دُعا مانگی ہے طاق راتوں میں

نور سحر ـــــــــ چونیاں

اُجڑی کلائیوں کی طرح شاخ شاخ تھی
بیوہ رُتوں کا نوحہ اثر مانگتا رہا
اخبار لے کے آتا رہا روز اک لیے
میں روز کوئی اچھی خبر مانگتا رہا

ام احمد ـــــــــ لالہ

آہٹ ہی ہوئی تھی نہ کوئی برگ ہلا تھا
میں خود ہی سرِ منزلِ شب چیخ پڑا تھا
دیکھا نہ کسی نے بھی مری سمت پلٹ کر
محسن میں بکھرتے ہوئے شیشوں کی صدا تھا

سارہ نور دین ـــــــــ ملتان

عمر رائیگاں کر دی تب یہ بات مانی ہے
موت اور محبت کی ایک ہی کہانی ہے
کھیل جو بھی تھا جاناں اب حساب کیا کرنا
جیت تو کسی کی ہو، ہم نے ہار مانی ہے

امۃ الصبور

خواتین کی ڈائری

نمرہ افرا کی ڈائری سے

عبدالحمید عدم کی یہ غزل اپنے مفہوم اور الفاظ دونوں لحاظ سے ہی ایک مکمل تخلیق ہے۔ عرفان کی یہ منزل جب انسان اپنے اندر کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔

پھول دامن میں چند رکھ لیجے
راستے میں فقیر ہوتے ہیں

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

دیکھنے والا ایک نہیں ملتا
آنکھ والے کثیر ہوتے ہیں

جن کو دولت حقیر لگتی ہے
اُف! وہ کتنے امیر ہوتے ہیں

بے خوشی بھی عجیب شے ہے
غم بڑے دل پذیر ہوتے ہیں

سعدیہ ریاض کی ڈائری سے

مجید نظامی کی یہ نظم میں نے راحت جبیں کے ناول میں پڑھی تھی اور تب سے یہ میرے دل پر نقش ہو چکی ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔

یہ تمہیں بتا دوں میں، چاہتوں کے رشتے میں پھر گرہ نہیں لگتی۔
لگ بھی جائے تو اس میں وہ کشش نہیں رہتی
ایک پھیکا پھیکا سا، رابطہ تو ہوتا ہے، تازگی نہیں رہتی
روح کے تعلق میں روشنی نہیں ملتی
بات وہ نہیں رہتی، دوستی نہیں رہتی
لاکھ بار مل کر بھی دل نہیں ملتے
ذہن کے جھروکوں میں، یاد کے دریچوں میں
تتلیوں کے رنگوں میں پھول نہیں کھلتے
اس لیے میں کہتا ہوں، اس طرح کی باتوں میں احتیاط کرتے ہیں
اس طرح کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں

طیبہ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ایک خوب صورت نظم، جو کہ مجھے بہت پسند ہے لیکن افسوس کہ میں یہ نہیں جانتی یہ کس شاعر نے لکھی ہے۔ اگر کسی قاری بہن کو علم ہو تو وہ ضرور بتائے۔

بے خواب لمحوں کا پرستار کون تھا
اتنی اُداس رات میں بیدار کون تھا
کس کو یہ فکر تھی کہ محبت میں کیا ہوا
ہم اس پہ اڑ رہے تھے کہ وفادار کون تھا
سو کشتیاں جلا کے چلے ساحلوں سے ہم
اب تم کو کیا بتائیں کہ اس پار کون تھا
یہ فیصلہ تو شاید وقت بھی نہ کر سکے
سچ کون بولتا تھا، اداکار کون تھا
زمانے گزر گئے ہیں یہ سوچتے ہوئے
میں کس کو کہوں اپنا، میرا غم خوار کون تھا

حرا قریشی کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی ایک خوب صورت نظم "ہوا ضدی بہت ہے" سب قارئین کے لیے۔

ہوا ضدی بہت ہے
شاخ پر اک پھول تک رہنے نہیں دیتی
روش پر خاک اڑاتی ہے... تو اس کی دھول تک رہنے نہیں دیتی
ہوا کی ضد پر... شاخیں کب تک خوشبو سنبھالیں گی
کہ پھول کی مہکتی پتیوں کی... نرم و نازک سی رگیں
ہوا کے کھردرے ہاتھوں سے جھل جائیں
تو موسم سرد پڑ جائے
ہوا ضد پر جو اڑ جائے
تو پیڑوں کی جڑیں مٹی کی تہہ میں... ٹوٹ جاتی ہیں
سنبھالو سانس کا ریشم... کہ آوارہ ہوا کے تند خو جھونکے سے چھو جائیں
تو آپس میں جڑی سانسیں بھی اکثر ٹوٹ جاتی ہیں
سنبھالو اپنے سائے کو
کہ آپس میں بچھڑنے کی یہی رُت ہے
ہوا ضدی بہت ہے

سارہ چوہدری کی ڈائری سے

دل کے اپنے قاعدے، قانون ہوتے ہیں۔ وہاں دوسرا کوئی نظام نہیں چلتا۔ سعد اللہ شاہ کی یہ غزل آپ کی نذر۔

اپنا مزاج کار بدلنے نہیں دیا
دل نے کوئی نظام بھی چلنے نہیں دیا

اے ماہتاب حسن ہمارا کمال دیکھ
تجھ کو کسی بھی رنگ میں ڈھلنے نہیں دیا

نظروں سے اپنی آپ ہی گرتے گئے ہم
اے عشق تو نے ہم کو سنبھلنے نہیں دیا

تھوڑی سی وضع داری تو اس دل کے واسطے
تو نے تو اس دل میں وہم بھی پلنے نہیں دیا

تہذیب اپنی کی ہے محبت نے سعدیوں
اس دل کو ہم نے حد سے نکلنے نہیں دیا

ظل ہما کی ڈائری سے

آج کل جو ہمارے پیارے پاکستان کے حالات ہیں ہر طرف شور بپا ہے مگر کوئی کسی کی بات نہیں سنتا۔ سب لفظ بے اثر نظر آتے ہیں۔ سب لمحے جھوٹے لگتے ہیں۔ وحشت ہے، دکھ ہے، ماتم ہے، محسن نقوی کی نظم انہی حالات کے نام جو کہ ان کے مجموعۂ کلام خیمۂ جاناں سے ہے۔

ابھی لکھیں تو کیا لکھیں

ہر اک جانب اداسی ہے
ابھی سوچیں تو کیا سوچیں؟
ہر اک سو، ہُو کا عالم ہے
ابھی بولیں تو کیا بولیں؟
ہر اک انسان پتھر ہے
ابھی دھڑکیں تو کیا دھڑکیں؟
فضا پر نیند طاری ہے
ابھی جاگیں تو کیا جاگیں؟
ہر اک مقتل کی شہ رگ سے
لہو کی لہر جاری ہے
ابھی دیکھیں تو کیا دیکھیں
ہر اک انسان کا سایہ
ابھی مٹی پہ بھاری ہے
ابھی لکھیں تو کیا لکھیں؟

جویریہ اجمل سے ملاقات

شاہین رشید

چھوٹی سی معصوم اور دلکش خدوخال والی جویریہ اجمل کو آپ آج کل متعدد ڈراموں میں دیکھ رہے ہیں۔ اگرچہ انہیں اس فیلڈ میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے مگر اس کے باوجود انہوں نے اس فیلڈ میں اپنی پہچان بنالی ہے۔

"کیا حال ہے۔ اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"جی اللہ کا شکر ہے اور آج کل بہت کام ہو رہا ہے۔ ایک سوپ کر رہی ہوں۔ ایک سیریل عنقریب شروع ہونے والا ہے مطلب ریکارڈنگز شروع ہونے والی ہے اور ایک میوزک کی ویڈیو لائن اپ میں ہے اور جو آن ایر ہیں ان میں سیریل "باندی" ہے جو نشر مکرر ہو رہا ہے۔ "کیوں ہے تو" آن ایر ہے "محبت صبح کا ستارہ" بھی چل رہا ہے۔ چبھن حال ہی میں ختم ہوا ہے اور دو تین کمرشلز بھی لائن اپ ہیں۔"

"کتنا عرصہ ہو گیا ہے اس فیلڈ میں اور کیسے آئیں، یہ بعد میں پوچھیں گے۔ اس سے پہلے تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ؟"

"جی میرا نام جویریہ اجمل ہے۔ چونکہ میرا نام ایسا ہے کہ جو بگڑ نہیں سکتا، اس لیے سب مجھے جویریہ ہی کہتے ہیں۔ میں سیکنڈ ایر کی طالبہ ہوں۔ 23 دسمبر

1996ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ میرا ایک ہی بھائی ہے جو چار سال کا ہے۔ ابو میرے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ہوتے ہیں۔"

"والد کی وجہ سے اس فیلڈ میں آنے میں آسانی ہو گئی ہو گی؟"

"ابو کے اس فیلڈ میں کافی کانٹیکٹ ہیں لیکن مجھے ان کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایک آدھ کو فون کر کے صرف یہ مدد لی کہ مجھے کمرشل میں کام کرنا ہے تو میں کس سے رابطہ کروں۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں ناکہ پرچی پہ آئی ہے تو ایسا کچھ نہیں ہے اور میں ابو کی وجہ سے تو ڈراموں میں آئی بھی نہیں ہوں۔ مجھے تو بس وی جے بننے اور کمرشل میں آنے کا شوق تھا تو ابو کے ایک دوست نے ایک ایجنسی کے بارے میں بتایا میں وہاں گئی اور اس کے بعد سب کچھ خود بخود ہی ہوا۔"

"وی جے بننے کا شوق کیوں ہوا اور کس چینل پہ تھیں تم؟"

"آکسیجن چینل پہ کرتی تھی پروگرام اور جب میں پندرہ سال کی تھی تو "وی جے" بن گئی تھی اور میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی کم عمر وی جے ہوں۔"

"تو کوئی پلاننگ نہیں تھی کہ اس فیلڈ میں ہی آنا ہے؟"

"نہیں میری کوئی پلاننگ نہیں تھی۔ بس تھوڑا بہت شوق تھا کہ کوئی کمرشل کروں کیونکہ جب میں کمرشل دیکھتی تھی تو سوچتی تھی کہ اس طرح تو میں بھی کر سکتی ہوں۔ مگر مجھے یہی کہا جاتا کہ آپ ابھی چھوٹی ہیں۔ بس ابو کے ایک دوست کے تھرو گئی تو انہوں نے میرا آڈیشن لیا اور اگلے دن فون آگیا کہ آپ آکسیجن چینل چلی جائیں اور آڈیشن دے دیں۔ میں نے آڈیشن دیا اور دو تین دن کے بعد کال آگئی کہ آپ کام شروع کر دیں۔ شو کا نام تھا "دمادم" اور وہ بھی لائیو تھا۔ شروع میں مشکل ہوئی تھی پھر آہستہ آہستہ خود اعتمادی آتی گئی۔ میں نے تین ماہ پروگرام کیا پھر مجھے ڈراموں کی آفرز آنے لگیں تو مجھے ہوسٹنگ چھوڑنی پڑی۔ کیونکہ ڈرامے اور ہوسٹنگ ایک ساتھ جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ پھر جب ایک ڈراما کیا تو دوسرے کی آفر آگئی اور بس پھر کرتی ہی چلی گئی۔"

"پہلا ڈراما کون سا تھا؟"

"میرا سب سے پہلا ڈراما "عکس" تھا پھر "باندی" کیا اور پھر مزید کیے۔ یوں سمجھئے کہ بہت کم وقت میں میں نے بہت کام کیا اور اب تھوڑی بڑی ہو گئی ہوں تو چبھن میں مجھے لیڈ رول ملا۔"

"پیسے خرچ کہاں کرتی ہو؟"

"خرچ تو اپنے اوپر ہی کرتی ہوں اور میں نے بہت گروم کیا ہے اپنے آپ کو، مگر صرف اپنے آپ پر ہی خرچ نہیں کرتی ہوں بلکہ اپنے گھر والوں پہ بھی خرچ کرتی ہوں۔"

"ابھی تو سیکنڈ ایر کی طالبہ ہو۔ پڑھ لکھ کر کیا بننے کا ارادہ ہے؟"

"جی میرا ارادہ ہے کہ میں اسی لائن میں آگے بڑھوں۔ میڈیا کی سائیڈ ہی جاؤں گی۔"

"اداکاری مشکل لگتی ہے؟ اتنی کم عمری میں رومانٹک رول تو نہیں کر سکو گی؟"

"پہلے تو کافی لگتی تھی۔ مگر اب تو عادت ہو گئی ہے اب جھجک نہیں ہوتی۔۔۔ اور میرے تو پہلے ہی سیریل میں میرا رومانٹک رول تھا اور 'سچ' میں اس کام میں بہت بری ہوں۔ مجھ سے نہیں ہوتے ایسے سین۔ بہت ری ٹیکس دیتی ہوں۔ کوئی ہاتھ پکڑ لے یا پاس بیٹھنے کا سین ہو مجھے بہت مشکل ہوتی ہے۔"

"اپنا کردار پسند سے لیتی ہو یا گھر والوں سے مشورہ کرتی ہو؟"

"اپنا کردار خود منتخب کرتی ہوں۔ ویسے ڈائریکٹر بھی بتا دیتے ہیں اور میں اس بات کو اہمیت نہیں دیتی کہ نیگیٹو رول ہے یا پوزیٹو یا سائیڈ رول ہے کیونکہ ابھی مجھے کام کرنا ہے اور بہت کچھ سیکھنا ہے۔ پھر جب میں انیس بیس سال کی ہو جاؤں گی تو پھر یہی تجربہ میرے کام آئے گا۔ امی کو اسکرپٹ ضرور پڑھاتی ہوں اور ان سے مشورہ بھی ضرور لیتی ہوں۔"

"بڑی ہو جاؤ گی تو کون سے رول کرنا پسند کرو گی؟"

"میں ایک ماڈرن لڑکی ہوں تو میری خواہش ہو گی کہ میں ماڈرن رول کروں لیکن ایسے ماڈرن نہیں کہ جس سے میرے گھر والوں کو شرمندگی ہو اور بولڈ کردار تو بالکل بھی نہیں کروں گی۔"

"لوگ تعریف کرتے ہیں؟"

"جی بہت زیادہ کرتے ہیں۔ بہت پسند کرتے ہیں۔ بہت حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں اور پھر میں بھی سب سے بہت اچھی طرح ملتی ہوں۔ کیونکہ میں اچھی طرح ملوں گی تو پھر لوگ بھی مجھ سے اچھی طرح ملیں گے۔"

"تم بتا رہی تھیں کہ تمہیں فلم میں بھی کام کرنے کی پیشکش ہوئی ہے؟"

"جی مجھے فلم میں کام کرنے کی بھی آفر آئی ہے۔ بہن کا رول تھا مگر میں نے سوچا کہ ابھی مناسب نہیں ہے ابھی ڈراموں میں کام کر لوں پھر فلم کے بارے میں سوچوں گی۔"

"اداکاری ماڈلنگ ہر چیز میں اپنے آپ کو پرفیکٹ کرنا چاہتی ہو۔ یہ بتاؤ امور خانہ داری میں کیسی ہو؟"

"کوئی خاص نہیں اور امور خانہ داری کے وہ کام جو کبھی گھر میں نہیں کیے وہ میں نے ڈراموں میں کیے ہیں۔ مثلاً" گھر میں کبھی برتن نہیں دھوئے مگر ڈراموں میں دھوئے۔ آٹا کبھی گھر میں نہیں گوندھا' ڈراموں میں گوندھا۔۔۔"

"کوکنگ آتی ہے؟"

"نہیں کوکنگ نہیں آتی مجھے اور نہ ہی میرا دل کرتا ہے کوکنگ کا۔ یہ کام امی کا ہے یا کک کا اور ابھی مجھے سیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"شاپنگ پہ جاتی ہو تو پیسہ خرچ کرتے وقت سوچتی ہو یا جو دل چاہتا ہے خرید لیتی ہو؟"

"پہلے سوچتی تھی مگر اب نہیں۔ اب میں خود کماتی ہوں اس لیے پیسہ خرچ کرتے وقت کچھ نہیں سوچتی بلکہ جو دل میں آتا ہے' خرید لیتی ہوں۔ میری زیادہ شاپنگ کپڑوں کی ہوتی ہے' کیونکہ مجھے کپڑوں کا بہت شوق ہے اور میرے پاس اتنے کپڑے ہو گئے ہیں کہ امی کہتی ہیں کچھ کپڑے لنڈا بازار میں جا کر بیچ دو۔"

"ملک سے باہر گھومنے پھرنے کا موقع ملا؟"

"موقع تو کئی بار ملا مگر جانے کی اجازت نہیں ملی کمرشلز کی شوٹ کے لیے آفرز ہوئیں کہ فلاں ملک میں کرنا ہے مگر امی ابو نے اجازت نہیں دی۔"

"شام کو جب ریکارڈنگ کروا کے گھر آتی ہو تو کیا دل چاہتا ہے' سو جاؤں یا گھر والوں کے ساتھ وقت گزاروں؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ بس گھر میں آؤں اور سو جاؤں۔ کوئی کام نہ کروں کوئی بات نہ کروں۔"

"کھانے پینے میں کیا پسند ہے؟"

"کھانے پینے میں میرے کوئی نخرے نہیں ہیں۔ جو مل جاتا ہے کھا لیتی ہوں اور اس بات پر میری نانی اور امی بہت خوش ہوتی ہیں۔"

"نوجوان لڑکیوں کے لیے تو شوبز کا ماحول اچھا نہیں ہے۔ پھر کس طرح اپنے آپ کو بچا کر رکھتی ہو؟"

"میں جب شوٹ پہ جاتی ہوں تو میری امی میرے ساتھ ہوتی ہیں اور میں کسی سے زیادہ بات نہیں کرتی۔ جب تک شوٹ نہیں شروع ہوتی میں ایک سائیڈ پہ بیٹھی رہتی ہوں اور شوٹ ختم ہونے کے بعد گھر آجاتی ہوں۔"

"غصے کی تیز ہو اور غصے میں کیا کرتی ہو؟"

"جی غصے کی بہت تیز ہوں اور جب اس فیلڈ میں نہیں تھی تو بہت غصہ آتا تھا۔ مگر جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں غصہ کم ہو گیا ہے' اور صبر کا مادہ پیدا ہو گیا ہے ویسے غصے میں بہت بدتمیز ہو جاتی ہوں اور امی بہت ڈانٹتی ہیں کہ غصہ کم کیا کرو۔"

"موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"

"امی اگر کوئی بات بول دیں مذاق میں یا ویسے تو سہہ لیتی ہوں لیکن اگر ابو مذاق میں بھی کچھ بول دیں تو برا لگ جاتی ہے مجھے' حالانکہ میں ابو کے ساتھ بہت فرینڈلی بھی ہوں۔"

"اور کچھ کہنا چاہو گی کسی سے؟"

"نہیں جی مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ ابھی تک تو سب ہی اچھے ہیں اور میرا خیال رکھتے ہیں۔ مجھ سے پیار کرتے ہیں' میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔"

☆

نصیب

علی ظفر کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ بھارت میں بھی اداکاری و گلوکاری کے جھنڈے گاڑھنے کے بعد اب ذرا ان کی باتیں سنیں۔ فرماتے ہیں۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کو اب شاید ہی کبھی عروج نصیب ہو (ہاں جب آپ جیسے لوگ اپنی صلاحیتیں کو غیروں کو بیچ دیں گے تو یہی ہوگا۔) یہاں ٹیلنٹ کی کمی نہیں وسائل کی کمی ہے جس کی وجہ سے بین الاقوامی معیار کی فلمیں نہیں بن رہیں۔ فلم انڈسٹری میں اگر بھاری سرمایہ کاری کی جائے تو صورتحال میں تبدیلی آسکتی ہے (تو پھر آپ کب لگا رہے ہیں سرمایہ؟) علی ظفر کا مزید کہنا تھا کہ وہ ان دنوں اپنے ایک نئے میوزک البم کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ البم پاکستان میں تیار ہوگا اور ریلیز بھارت کی ایک کمپنی کرے گی (یعنی میڈ ان پاکستان پر میڈ ان انڈیا)۔

خبریں وبگیں

واصفہ سہیل

اعزاز

پاکستان میں جب بھی اچھی فلم بنی سراہی گئی اور یہ پذیرائی ملک میں ہی نہیں بعض اوقات دوسرے ممالک میں بھی ملی۔ اسی طرح کی ایک فلم جس میں آمنہ شیخ نے لیڈنگ رول کیا ہے "زندہ بھاگ" ہے یہ نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ دنیا بھر میں بھی بہترین کارکردگی کی وجہ سے مقبول ہوئی ہے۔ اس فلم نے گزشتہ دنوں متعدد ملکوں میں ایوارڈ حاصل کیے ہیں۔ بھارت کے شہر جے پور میں ہونے والے انٹرنیشنل فلم فیسٹیول میں بھی اسے شامل کیا گیا تھا جس میں دنیا بھر کی فلمیں شامل تھیں اس فیسٹیول میں "زندہ بھاگ" کو اسپیشل جیوری ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مافیا

عثمان پیرزادہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "جب پورا معاشرہ زوال پذیر ہو تو صرف کسی ایک شعبے اور وہ بھی فلم انڈسٹری سے بہتری کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کو "غیر نصابی" سرگرمیوں نے تباہ کیا ہے انڈسٹری کے حالات بدلنے کے لیے نئی سوچ کی ضرورت ہے (بول' خدا کے لیے' وار' زندہ بھاگ اس کی مثال ہیں) عثمان پیرزادہ نے مزید کہا کہ "ان کی فلموں کو بیرون ملک فلمی میلوں میں پذیرائی ملی مگر لکشمی چوک کی جاہل مافیا نے یہاں ان کی فلمیں نہ چلنے دیں۔" (بھئی سمجھ میں نہیں آئی ہوں گی نا۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ آپ پاکستانی فلم انڈسٹری کی ترقی میں اچھی فلمیں بنا کر اپنا حصہ ڈال دیں اور باقی قسمت پر چھوڑ دیں۔ فلم انڈسٹری کی قسمت پر)

وجہ

ڈائریکٹر پرویز کلیم کے صاحبزادے عدیل نے فلم انڈسٹری کی بحالی کے لیے سینئر ٹیکنیشنز کے ساتھ جدید ٹیکنالوجی کو لے کر فلم بنانے کا آغاز کیا فلم عشق پازیٹو (بھلا عشق بھی پازیٹو ہوتا ہے؟) میں اداکارہ نور کے ساتھ حامد علی خان کے صاحبزادے ولی حامد علی خان کو لے کر شوٹنگ کا آغاز بھی کردیا۔ نور کو تین سال کے بعد کوئی فلم ملی ہے نور کا کہنا ہے کہ "انڈسٹری میں اچھی فلمیں نہ بننے کے سبب وہ لولی ووڈ چھوڑ گئی تھیں (ہم سمجھے ہندو لڑکے سے دبئی میں شادی کی وجہ سے۔) لیکن اب پھر سے معیاری فلمیں بننے لگی ہیں تو وہ واپس آگئی ہیں (اچھا شادی ختم ہونے کی وجہ سے نہیں؟) اس انڈسٹری نے ہی مجھے نور بنایا ہے (ورنہ کیا اندھیرا تھیں؟) ولی حامد کے بارے میں نور کا کہنا ہے کہ جس طرح ولی حامد خان کے گھرانے کا پوری دنیا میں نام ہے اسی طرح اب اداکاری میں بھی ان کا نام ہوگا کیوں کہ ولی حامد باقاعدہ طور پر اداکار ہے اس کو ایکٹنگ کی سوجھ بوجھ ہے (بھئی ولی حامد کی وڈیو میں کام کرنے کا حق ادا تو کرنا ہے نا۔)

محنت

اداکارہ ریما نے اداکاری کی ہدایت کاری کی پھر

اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اب ذرا دیکھیں ون پاؤنڈ فش فیم شاہد نذیر کی خواہش کہ وہ ون پاؤنڈ فش کے نام سے فلم بنائیں یہ ان کے اختیار میں ہے، لیکن بطور ہیروئن وہ سوناکشی سنہا کو لینا چاہ رہے ہیں کیوں کہ وہ بہت اچھی اداکارہ ہیں (اس میں شک نہیں، لیکن کیا وہ بھی شاہد نذیر کے ساتھ کام کرنا چاہیں گی۔۔؟) شاہد نذیر نے اپنا نیا پنجابی وڈیو "مچھی اک پاؤنڈ دی" ریلیز کردیا ہے۔ اس سلسلے میں شاہد نذیر کا کہنا ہے کہ پچھلے سال میں نے اپنے پرستاروں سے وعدہ کیا تھا کہ میں ون پاؤنڈ فش گانے کو پنجابی میں تیار کروں گا اور میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اس کا سارا میوزک انگلینڈ میں تیار ہوا ہے اور اس میں پانچ لڑکیوں نے شاہد کے ساتھ پرفارم کیا ہے اور اس وڈیو کو شوٹ لاہور میں کیا گیا۔ شاعری ان کی اپنی ہے اور وڈیو انگلینڈ، جرمنی، آسٹریلیا اور انڈیا میں بھی ریلیز کیا گیا ہے۔

شادی کی اب کیا کریں تو انہوں نے ورجینا کی ایک یونی ورسٹی میں فلم میکنگ اور ڈائریکشن کی کلاس میں داخلہ لے لیا (دیکھا پڑھا لکھا میاں ملنے کا فائدہ) اس کے علاوہ ریما فیچر فلم، شارٹ فلم اور دستاویزی فلموں کی میکنگ ڈائریکشن اور اسکرپٹ رائٹنگ کے کورسز بھی کررہی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ امریکا کے مختلف شہروں میں فلم کے حوالے سے ہونے والی ورکشاپس بھی اٹینڈ کررہی ہیں (پاکستان میں فلم بنانے کے لیے اتنی محنت۔۔؟) سننے میں آیا ہے کہ ریما اپنی نئی فلم جدید ٹیکنالوجی کے مطابق بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں اور ان دنوں اپنی نئی فلم کے اسکرپٹ کو بھی دیکھ رہی ہیں (کیوں پڑھا نہیں جارہا؟) جس کی شوٹنگ وہ پاکستان اور امریکا میں کریں گی۔

خواہش

خواہشات پر پابندی تو کوئی لگا ہی نہیں سکتا کیوں کہ خواہش کرنا انسان کے اختیار میں ہے اور پوری ہونا

باتیں ان کی یاد رہیں گی

قانتہ رابعہ

شیخ سعدی یا رومی کی حکایت ہے کہ ایک لڑکا ڈاکوؤں کی صحبت میں شامل ہوگیا ڈاکوؤں کے سردار نے شمولیت کے لیے یہ شرط عائد کی کہ اپنی ماں کا سر کاٹ کر لاؤ تاکہ ہمیں تمہاری وفاداری کا یقین ہو سکے۔ ماں باپ کے اکلوتے بچے نے ماں کا سر کاٹا، کاٹ کر تھیلے میں ڈالا اور تھیلا ہاتھ میں لے کر ڈاکوؤں کے سردار کے پاس چل پڑا۔ راستے میں زور کی ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گرا۔۔۔ قارئین اس سے آگے کا واقعہ بہت ہی موثر ہے سننے اور پڑھنے کے لیے "جگرا" چاہیے۔۔۔ میری مرحومہ ماں ہمیشہ اگلا حصہ اپنے درس میں شعر کی صورت میں پڑھا کرتی تھیں۔

بیٹا جو گرا تو تھیلے سے ندا یہ آئی
بیٹا چوٹ تو کہیں نہیں آئی!

آج یہ لکھتے ہوئے میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔۔۔ بچپن میں امی کی زبانی یہ واقعہ اتنا سنا کہ منہ پھاڑ کے سوال کرتی۔۔۔ افوہ۔۔۔ آپ یہ کیا ایک ہی واقعہ سناتی رہتی ہیں۔ امی اپنے مخصوص لہجے میں کہتیں۔۔۔ ابھی نہیں بیٹا اس کی کچھ عرصہ بعد میں سمجھ آئے گی۔۔۔

میری پیاری امی۔۔۔ آج آپ کی بیٹی کو اس واقعے کی بہت اچھی طرح سمجھ آچکی ہے اس کا لوں لوں بوٹی بوٹی گواہی دے رہی ہے کہ یہ واقعہ سو فیصد سچا ہے۔۔۔ لیکن امی۔۔۔ میری پیاری امی آج آپ کو اپنے پیارے اللہ کے پاس گئے دو ہفتے ہوچکے ہیں۔۔۔ آپ وہ سب مراحل طے کرچکی ہیں جن کے خوف سے آپ کی نیندیں اڑ جایا کرتی تھیں۔ آپ کی مناجات اور رونے بلکنے سے آپ کی جائے نماز بھیگ جایا کرتی تھی جس اللہ سے ملنے کا شوق آپ پر اس قدر غالب تھا کہ کپڑے لتے کھانے پینے پہننے اوڑھنے کی رغبت ہی نہ رہی۔۔۔ جو ملا کھالیا، جو دیا پہن اوڑھ لیا۔۔۔!

بچوں کی تربیت کے لیے اتنی فکرمند رہتیں کہ جب بچوں کی فرمائش پر نانی اماں قلفی والا آیا ہے، نانی اماں گول گپے لے دیں، نانی اماں ان کی خواہشیں سب پوری کرتی تھیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آیت الکرسی کون سنائے گا؟ سب سے اچھی نعت کون پڑھے گا؟ درود ابراہیمی کس کس کو آتا ہے؟ کسی لالچ میں ہی سہی بچے ان کی شرط اکثر و بیشتر پوری کردیا کرتے تھے۔

صبر سہ حرفی لفظ ہے لیکن اس پر پورا اترنا اور اس کے تقاضے پورے کرنا ہر کس و ناکس کی پہنچ میں نہیں اور بالعموم لوگ میت پر بین نہ ڈالنے کو بھی صبر گردانتے ہیں، میری ماں نے بچپن سے صبر کو اپنا ساتھی بنایا اور اللہ نے ان کو اپنا ساتھی بنالیا۔

ساڑھے چار سال کی عمر تھی جب ان کی ماں رخصت ہوگئی۔ بہت چھوٹی عمر تھی۔ صبر کیا ہے اس کا پتا ہی نہیں ہوتا لیکن آج میں قطعی طور پر کہہ سکتی ہوں کہ جن کو صبر کی بلند چوٹیوں پر چڑھنا ہوتا ہے اللہ بچپن میں ہی ان کی مائیں لے لیتا ہے۔ وہ خود کہا کرتی تھیں کہ میں نے اپنے بچپن میں ہر کسی کے چہرے میں اپنی ماں کو ڈھونڈا جب وہ نہ ملی تو میں نے سوچا جن کی ماں نہیں ہے میں ان کی ماں بن جاتی ہوں یوں جب ان کی دوسری امی کا بھی انتقال ہوگیا تو ماموں اور خالاؤں سے اتنا لاڈ پیار کیا ایسی ایسی خواہشیں، فرمائشیں اور ضد پوری کرتی تھیں کہ سگی ماں بھی ہو تو ٹال دے۔۔۔ ممتا کی محبتوں کے چشمے تو بچپن سے بہہ نکلے تھے۔ ان کے

مرنے کے بعد بھی درجنوں لڑکیاں اور عورتیں اس غم میں رو رہی تھیں کہ یہ تو ہماری ماں تھیں ان کے پاس آ کر غم غلط ہو جاتے تھے۔

صبر کی اس سے بھی بڑی شکل جوان بچے کی جدائی ہے۔۔۔ پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے۔۔۔ ان میں سے ایک بیٹے کی شادی کو محض تین سال کا عرصہ گزرا تھا دو سال کی بچی اور ایک سال کا بیٹا وہ سال سے زائد عرصہ بیمار رہنے کے بعد ابدی گھر روانہ ہو گیا۔ ماں نے یہ عرصہ اتنے صبر سے گزارا کہ مثال دی جا سکتی ہے۔۔۔ تین عیدیں اس کی بیماری کے دوران مسلسل سی ایم ایچ میں گزاریں۔

شوال میں نفلی روزہ رکھا ہوا تھا جب بیٹے کا دم واپس کا مرحلہ آیا کھجور ہاتھ میں تھی۔ روزہ کھول کے انا اللہ پڑھی۔ بیٹے کی کھلی آنکھیں بند کر کے مغرب کی نماز کے تین فرض ادا کیے پھر اپنے بڑے بیٹے کو اس کی وفات کی اطلاع دی۔ رات اور وہ بھی سردیوں کی رب سے شکوہ شکایت نہ بین ڈالے۔۔۔ رب کی رضا پہ راضی ہونے کا زبانی اقرار ہم جیسے کج فہموں کو حیران کرتا رہا۔

پھر جب بیٹے کی میت اٹھانے کا مرحلہ آیا تو ظہر کے فرض ادا کرنے چلی گئیں کہ اسی وقت بے صبری ہوتی ہے۔۔۔ جنازہ اٹھنے کے بعد تمام خواتین کو جو صف پر موجود تھیں دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کا کہا۔۔۔ پھر اپنے بیٹے کی مغفرت کے لیے اس قدر عمدہ اور موثر دعا کی کہ ہماری ہچکیوں کے آگے بند باندھنے والا کوئی نہ تھا۔ بھائی کی جدائی سے زیادہ یہ چیز رلا رہی تھی کہ ایسے صبر والی ماں کہاں مل سکتی ہے!

یہ صبر، یہ رتبہ انہیں ایسے ہی نہیں مل گیا تھا۔ کچھ تو فطرت نیک تھی کچھ صالح والدین کی اولاد تھیں لیکن حق سچ بات یہ ہے کہ اس کے لیے بڑی مشقتیں، ریاضتیں کیں۔۔۔ بن آہ سحر گاہی کچھ نہیں ملتا۔ میں نے بچپن کا جب بھی تصور کیا ہے تو میری آنکھ کھلنے کا سبب ان کی مناجات ہوتی تھیں۔ اس قدر دل سوزی سے دعا مانگتیں کہ میں دس پندرہ منٹ کروٹیں بدل بدل کر تنگ آ کر اٹھ جاتی۔ ان کی مناجات کا اپنا ہی انداز تھا۔

زندگی کے آخری دنوں میں بڑی عاجزی کے ساتھ بتایا کہ میں فخریہ نہیں تحدیث نعمت کے طور پر بتا رہی ہوں کہ میں نے ساری زندگی قرآن کو چاند کے طلوع کے ساتھ مشروط رکھا ہے۔ پہلی تاریخ کو قرآن شروع کرتی ہوں اور اگلے چاند پہ دوسرا شروع ہو جاتا ہے سوائے رمضان کے۔ (اس میں بس ای قرآن ہی میں گم رہتیں) اس کے علاوہ سورۃ البقرہ، دخان، ملک، یاسین، رحمان اور سورۃ مزمل بھی روزانہ پڑھتی ہوں۔

اپنی اٹھتر سالہ زندگی کے پچاس سال انہوں نے بچیوں کو ناظرہ قرآن پڑھایا، دور دراز سے بچیاں قرآن پڑھنے آتیں۔ باعمل تھیں تو زبان میں اللہ نے تاثیر اتنی دے رکھی تھی کہ جہانیاں جیسے قصبے میں انہوں نے عورتوں کو قرآن سے شعوری طور پر منسلک کرنے کے لیے ہفتہ وار درس قرآن کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ بھی پانچ دہائیوں سے زائد جاری رکھا۔

مشکل سے مشکل موضوع پر اتنی عمدگی سے مثالیں دے کر بات کرتیں کہ پڑھے لکھے بھی منہ دیکھتے رہ جاتے۔ میمونہ خالہ بتاتی ہیں کہ 1971ء کے الیکشن میں جماعتی امیدوار کے لیے پروگرامز میں سوشلزم جیسے موضوع کو یوں لے کر چلتیں کہ اسلام بطور نعمت کا احساس جوش مارنے لگتا۔ اپنے درس قرآن میں روزمرہ مثالیں دینے کے ساتھ ساتھ انداز بیان سادہ رکھتیں۔ کتاب سے شوق گھٹی میں ملا تھا۔ ان کے والد حکیم محمد عبداللہ کی کتاب دوستی پورے برصغیر میں مشہور تھی۔ ان کے والد انتہا درجے کے عاشق رسولﷺ تھے۔ یکم دسمبر 1974ء کی رات کو انہوں نے نعت کہی۔

میرا اس طرح سے حساب ہو
میرے لب پہ نعت جناب ہو

اگلے دن دو دسمبر کی سہ پہر اپنی نعت سناتے سناتے دائیں جانب دیکھا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پڑھا اور مالک حقیقی سے جا ملے۔

میری والدہ کو کتاب دوستی ہی نہیں عشق رسولﷺ بھی ورثے میں ملا۔۔۔ صبح تلاوت کے بعد رو رو کر دعا مانگتیں۔۔۔ ان کی دعا کا اپنا ہی اسلوب تھا۔ اسمائے حسنیٰ کو لے کر چلتیں۔۔۔ ہر اسم الٰہی کے ساتھ دعا کرتیں۔ بچپن سے ہی میں نے یا فتاح افتح لنا ابواب رحمتک، یا ستار استر عوراتنا و امر روعاتنا، انک ستار العیوب تک پہنچ کر ہچکیوں سے روتے پایا۔

آپ خود سوچیں جو عورت ننانوے ناموں کو دعاؤں میں شامل کر کے مانگنے کا ہنر جانتی ہو گی دعا مانگنے کا قرینہ آتا ہو گا اس کی دعا کس قدر محبوب و مقبول نہ ہو گی۔

دعا مانگتے ہوئے وہ بالعموم امت مسلمہ سے شروع کرتیں۔ میں اکثر حیران ہو جاتی کہ ایسے تو کوئی بیمار بچے کے لیے بھی بلک بلک کر دعا نہیں مانگتا جیسے یہ پاکستان اور امت مسلمہ کے لیے مانگتی ہیں۔ کوئی حج عمرے پر جاتا یا باجی سعودیہ واپس جاتیں۔ اپنی ذات کے لیے کچھ نہ مانگنا بس یہی کہتیں۔

"پاکستان کے حالات بہت نازک ہیں خاص دعا کرنا۔"

ہندو یہود کی سازشوں سے آگاہ رہتیں اور اپنے دروس میں حالات حاضرہ سے ضرور آگاہ کرتیں۔

اکثر کہا کرتیں "ہم آتش فشاں کے منہ پر قالین بچھا کر پکنک منانے میں مصروف ہیں کوئی ہم پاکستانیوں سا بے خبر بھی ہو گا۔"

میں نے پاکستان کی محبت میں بہت سے لوگوں کو تقریریں کرتے سنا ہے لیکن وہ اپنی ہر دعا میں اپنے ملک کو ضرور شامل کرتیں سنتوں کا بہت خیال رکھتی تھیں مثلاً "جمعہ کے روز نہانا، نئے کپڑے پہننا، ناخن تراشنا۔

ان کی ان گنت خوبیوں میں ایک خوبی دوسروں کی حوصلہ افزائی تھی۔ اور میں سمجھتی ہوں یہ بھی صبر کی بنا پر ہی ممکن ہے۔ کسی نے اچھا پکایا ہے، اچھی سلائی کی ہے، اچھا لکھا ہے، خوب تعریف کرتیں انعام دیتیں۔۔۔ ہاں اپنے بارے میں بے حد محتاط تھیں۔۔۔ اپنے متعلق ایک تعریفی لفظ بھی گوارا نہیں تھا۔۔۔ آخری دنوں میں جب میں اپنی لکھاری بہنوں فرزانہ چیمہ، ڈاکٹر شگفتہ نقوی، عابدہ عباس وغیرہ کو بتانے لگی کہ امی پچھلے بیس سال سے باوضو ہیں تو فوراً" انگلی کے اشارے سے منع کر دیا۔

یہ راز کہ وہ پچھلے بیس سالوں سے ہمہ وقت باوضو ہم پر کبھی آشکار نہ ہوتا اگر ان کو پھیپھڑوں کی بیماری کی وجہ سے ہم تیمم پر مجبور نہ کرتے۔۔۔ دکھ سے میری طرف دیکھتیں مجھے وضو کرواؤ۔۔۔

عصر کے بعد کا وقت حدیث مبارکہ میں ہے کہ تسبیحات کا وقت ہوتا ہے۔ وہ عصر کے بعد بہت غم زدہ ہو جاتیں۔ شروع عمر سے اخیر عمر تک یہ وقت گزارنا ان کے لیے بہت مشکل ہوتا روتے روتے اکثر

دل غم کو کھا رہا ہے
غم دل کو کھا رہا ہے

پڑھا کرتیں۔۔۔

ان کے غموں کی فہرست بہت عجیب تھی۔۔۔ امت کی بیٹیوں کی بے حیائی کا غم حکمرانوں کی عیش کوشی کا غم عوام الناس کا دین سے دوری اور بدعتوں میں مبتلا ہو جانے کا غم۔۔۔ آخر میں جامعہ حفصہ کے غم نے تو انہیں لاچار کر دیا تھا۔

ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ ایک دفعہ میری قرآنی کلاس میں اتنی طویل دعائے حاجت کروائی کہ سبھی شرکاء نے پوچھا آپ نے یہ دعا کہاں سے یاد کی؟

جواب دیا "رمضان میں عمرے کی توفیق ملی تو ختم قرآن کے موقع پر امام صاحب نے یہ دعا کروائی تھی میں نے پیچھے دہرا کر یاد کر لی۔"

یادداشت کا یہ عالم تھی کہ چار ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنی ماں کے منہ سے اشعار سن سن کر یاد کیے ہوئے تھے۔۔۔ وفات سے ایک ہفتہ پہلے جب اپنے موذی مرض (جگر، پھیپھڑوں، ریڑھ کی ہڈی کا آخری مراحل میں کینسر) گردے فیل ہونا، تین دن قبل سے

بلڈ پریشر Error پر ہی رہتا' دائیں جانب فالج کا اٹیک) میں باربار "یا اللہ۔۔۔ انا اللہ۔۔۔ رب یسر ولا تعسر سے تقویت لے رہی تھیں تو باجی سے وہ اشعار دہرانے کو کہا۔۔۔ باجی نے چند اشعار پڑھے لیکن وہ شعر جو ان کی والدہ پڑھا کرتی تھیں وہ یاد نہ آیا۔۔۔ حمیدہ خالہ نے آکر مشکل آسان کی اور وہ شعر سنایا۔ باجی نے حیرانی سے کہا۔

"امی! آپ تو اس وقت چار سوا چار سال کی تھیں وہ اشعار آپ کو کیسے یاد ہوگئے؟"

کہنے لگیں "سن سن کر۔۔۔"

اچھا حافظہ اور شوق جمع ہو جائے تو کیا عالم ہوتا ہو گا کہ پہلے حج پر گئیں تو واپسی میں عربی کے ساتھ ترکی بول سکتی تھیں۔

کہنے لگیں "ہمارے ساتھ والے کمرے میں ترک عورت تھی میں اپنی کوئی بھی چیز اس کے کمرے میں لے جا کر پوچھتی تو وہ ترکی میں اس کا نام بتاتی جو میں فوراً" یاد کر لیتی تھی۔"

زلزلہ ہو یا سیلاب' جنگ ہو یا کوئی غیر معمولی واقعہ خدمت خلق میں سب سے آگے ہوتیں ہر جگہ سے سامان ہمارے ہاں جمع ہوتا اور امی ابو دونوں بنڈل بناتے امانت کے بارے میں اتنے حساس تھے کہ 1978ء یا 1979ء میں جب بدترین سیلاب آیا تو جن رسیوں سے سامان بندھا ہمارے گھر میں پہنچا وہ رسیاں بھی بنڈلوں میں ڈال کر بھجوا دی جاتیں۔

کہتے ہیں کہ بندہ یہ جب کوئی پریشانی آتی ہے وہ کیسے جانے کہ یہ پریشانی اس کے گناہوں کی سزا ہے یا آزمائش۔۔۔ اس کا آسان سا طریقہ سلف صالحین نے یہ بتایا ہے کہ اگر اس پریشانی کے بعد دل بے سکون رہنے لگے اور تعلق باللہ (نماز ذکر اذکار صدقہ خیرات) کم ہو جائے تو وہ سزا ہوتی ہے آزمائش کی صورت میں نفل ذکر اذکار صدقہ خیرات بڑھ جاتا ہے اور دل مطمئن رہتا ہے۔

اس فارمولے کو آگے رکھا جائے تو ہم نے انھیں ان کی زندگی میں سدا ابھار آزمائشوں میں ہی پایا۔

سب سے مزے کی صورت حال اس وقت ہوئی جب میں اپنے پانچوں بچوں کو ان کے پاس بھجوا کر دو سال قبل حج پر گئی تھی۔ بچوں کی ہمیشہ سب اچھا ہے کی رپورٹ دیتی رہیں لیکن جب منیٰ جانے لگے تو ان کا فون آیا۔

"قانتہ بیٹے! تم نے رمی نہیں کرنی بہت رش ہوتا ہے۔"

ان کی آواز میں ممتا کی التجا تھی کہ کچلی نہ جاؤ۔ میں نے کھٹ سے جواب دیا "اچھا"

ان کو شبہ سا ہوا یہ اچھا ڈنگ ٹپاؤ والا اچھا ہے فوراً" میرے میاں کو فون کیا۔

"اشتیاق بیٹا! کمزور جان ہے قانتہ کی۔ اس کی طرف سے تم کنکریاں مار لینا۔"

اب ان کو کیا خبر ان کی بیٹی شیطان مردود کی خاطر تواضع کے لیے کس قدر پرجوش ہے' میں نے اشتیاق کے ہاتھ سے سیل فون لے کر کہا۔

"اچھا جی داماد کی جان کی کوئی فکر نہیں۔۔۔"

فوراً" صفائی پیش کی "نہیں نہیں مجھے تو دونوں کی جان بڑی پیاری ہے۔" ساتھ ہی آواز بھرا گئی۔ "قانتہ بیٹے میں نے تو منت مانی ہوئی ہے تم لوگ خیریت سے پہنچو میں سو نفل ادا کروں گی دو روزے رکھوں گی اور ایک ہزار روپیہ فی سبیل اللہ دوں گی۔"

جب ہم فیصل آباد ایئرپورٹ پر پہنچے بھی نہیں تھے جہاز میں سگنل آن ہوئے پہلی کال امی کی تھی۔

"پہنچ گئی ہو بیٹے۔"

"ابھی پانچ سات منٹ ہیں امی۔" میں نے جواب دیا۔

بہت پریشانی سے کہنے لگیں "قانتہ بیٹے! یہ تین گھنٹے جب تم دونوں میاں بیوی ہوا میں معلق تھے مجھ پر اتنے مشکل گزرے کہ ہر دو چار منٹ کے بعد تعداد بڑھاتی چلی گئی۔ میں نے سو سے دو سو نفل دو سے چار

روزے اور ایک سے دو ہزار رقم بڑھا دی ہے۔"

ماء نی میں کیہنوں آکھاں۔
درد وچھوڑے دا حال نیں۔۔۔

میں کس کو بتاؤں میری ماں شب زندہ دار تھی صائم الدھر تھی۔ تہجد گزار تھی' باعمل تھی صابرہ اور شاکرہ تھی۔۔۔ شکر کے معاملے میں ان کا یہ معاملہ تھا کہ اکثر کہتیں میں دن کا آغاز شکرانے کے ان دو نوافل سے کرتی ہوں جو میں اپنے مسلمان ہونے پر روزانہ پڑھتی ہوں۔۔۔ پھر زبیر (بڑے بیٹے) کے لیے دو نفل پھر کلثوم کے لیے۔۔۔ اس طرح آخری چھوٹی بیٹی شافعہ کے لیے دو نفل پڑھ کر کام مکمل نہیں کرلیتی تھیں بلکہ پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں تک کے لیے روزانہ نفل پڑھ کر دعا کرتیں۔

جب وہ ناقابل بیان حد تک اذیت میں تھیں۔۔۔ ہم نے ان کے منہ سے "ہائے" کا لفظ نہیں سنا "اللہ سے رحم کی التجا" آسانی اور مدد کی دعا ہی مانگتی رہیں۔ ایک دفعہ تھوڑا سا تکلیف کا اظہار کیا ساتھ ہی اللہ سے معافی مانگی۔

"میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ بیٹا ہر وقت میرے پاس رہتا ہے' ایک بیٹی ایک طرف سے منہ میں نوالہ ڈال رہی ہے دوسری بیٹی دوسری طرف سے۔۔۔ بہو' پوتے پوتیاں میرے پاس موجود رہتے ہیں۔"

اگر کبھی رسالے میں میری تحریر شامل نہ ہوتی تو بس یہی کہتیں۔

"اس دفعہ تم نے کچھ نہیں لکھا رسالا تمہاری تحریر کے بغیر سونا سونا سا لگتا ہے۔"

بیٹی کی تحریروں کی لمبی چوڑی تعریف شاید اس لیے نہیں کرتی تھیں کہ اس کا نفس نہ پھول جائے' ہاں ایک بات کا وہ اکثر شرما کر ذکر کرتیں کہ تمہاری تحریر اپنی جگہ پر لیکن تمہارے درس مجھے زیادہ پسند ہیں۔

جہانیاں کا سالانہ چکر لگتا تو آنے بہانے میرے درس کا اہتمام کر لیتیں۔۔۔ پھر مجھے بہت خوشی سے بتاتیں کہ تم نے فلاں بات کا ذکر کیا تھا اپنے درس میں'

اس وقت سے میں نے اس پر عمل شروع کردیا ہے۔

میں نے اپنی تمام زندگی میں ان کو بس وضو اور نماز کا اہتمام کرتے پایا۔ جب ان کے دونوں پھیپھڑے جواب دے چکے تھے تب بھی انتہائی مشقت کے ساتھ وضو کرتیں اور جھک کر انگلیوں (پاؤں کی) خلال کرتیں۔۔۔ میں نے ان کو نماز کا وقت شروع ہونے سے قبل ہی جائے نماز پر پایا۔۔۔ وہ اس حدیث کا مصداق تھیں۔

"جن کے دل مسجدوں میں کیلوں کی طرح گڑے ہوتے ہیں' وہ سفر پر چلے جائیں یا بیمار ہو جائیں تو اللہ ان کے لیے فرشتوں سے دعا کراتا ہے۔"

نماز نہ پڑھنے والا سگا نواسا ہی کیوں نہ ہو انہیں تڑپاتا تھا۔

تمام اولادوں' آل اولادوں کی نمازوں کے بارے میں فکر مند رہتیں فون پر استفسار کرتیں نماز کے متعلق کئی نظمیں زبانی ازبر تھیں۔۔۔ بہت عرصہ پہلے ایک حدیث نظر سے گزری تھی کہ جو اول وقت پر نماز ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے ملک الموت سے کہہ رکھا ہے کہ ان کی جان نکالنے میں تنگی نہ کرنا۔

اس چیز کی میں گواہ ہوں کہ ڈیڑھ ماہ کی تکلیفوں کے بعد ان کی موت کا اسی پلنگ پر بیٹھی بیٹی کو بھی پتا چلا۔ یاسین پڑھتے ہوئے میں امی کو دیکھتی جا رہی ہوں بس سانس کی آواز نہ آنے پر شبہ سا ہوا۔ ہچکی آئی نہ گردن ڈھلکی۔۔۔ سلام قولا من رب الرحیم پڑھ کر پھونک مارتے مارتے۔۔۔ میں نے دیکھا امی نے سانس لیا ہے۔

سورۃ یاسین کے ختم ہونے پر کچھ بھی نہ رہا۔۔۔ اللہ اکبر۔ بس لمحے بھر میں جھریاں ختم' مسکراتا چہرہ اور اذیت کا نام و نشان نہیں۔

امی کو پورے خاندان میں "فیملی نیٹ ورک" کا اعزاز ملا ہوا تھا۔ پوری فیملی سے مضبوط رابطے میں تھیں۔ جب تک ٹانگوں نے ساتھ دیا ہر کسی کی غمی خوشی میں شامل ہوتی تھیں۔

جب ٹانگوں نے چلنے سے جواب دے دیا تو خاندان کے ہر فرد سے بذریعہ فون رابطہ تھا۔ ہر اولاد کے لیے

ٹائم مخصوص تھا۔ مجھے بالعموم صبح کے پونے دس سے دس بجے تک فون کرتیں۔

میری دوست نے ان کی وفات کے بعد نہیں تین سال پہلے خواب میں جنت میں سونے کا محل دیکھا استفسار پر پتا چلتا ہے کہ یہ قانتہ کی امی کو ان کے صبر کی بنا پر دیا گیا ہے۔ میں نے خواب ان کو سنایا۔ فون پر چہرے کے تاثرات تو نہیں پتا چلے آواز میں حسرت ہی حسرت تھی۔

میری دادی کا انتقال ہوا تو ابو بہت دکھی رہتے۔۔۔ ایک دن مجھے اپنی ڈائری دکھائی جس میں پنجابی کا شعر لکھا ہوا تھا۔

چار دناں دا اڈی ٹلیا دو دن کھانا پینا
ماں موئی تے مک گئے میکے کیہ کڑیاں دا جینا

دیکھا تو پاس کھڑی امی رو رہی ہیں۔

مجھ سے خواب دیکھنے والی دوست نے پوچھا۔

”قانتہ! تمہاری امی کس قسم کا صبر کرتی ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”صبر کی ایک قسم ایسی ہے جس کا عورت تصور بھی نہیں کر سکتی میرے والد صاحب نے چالیس سال کی عمر میں آکر چلتا کاروبار چھوڑ دیا کہ چالیس سال تک دنیا کمالی ہے‘ اب گھر میں رہ کر اللہ اللہ کروں گا۔“

امی نے پانچ بیٹیوں کے رشتے ڈھونڈے‘ ان کے علاوہ بیٹوں کی شادیاں کیں ہر غمی خوشی میں سب سے آگے ہوتی تھیں۔ مردوں کی ساری ذمہ داریاں گھر میں عبادت کرتے ہوئے شوہر کو جتلائے بغیر اپنے سر پر لے لیں۔۔۔ کہنے لکھنے میں یہ آسان ”عملاً“ بے حد مشکل ہے۔

ابو کے انتقال کے بعد یتیم پوتے‘ پوتی اور بہو کے لیے چھپر چھاؤں بن گئیں۔

اپنی بیوگی کے دکھ کو ایک طرف کر کے بیوہ بہو کے لیے بلند مینار اور سہارا بن گئیں۔ یہ ان کی دعائیں ہی تھیں کہ ان کا پوتا میٹرک میں پوزیشن ہولڈرز میں شامل تھا۔۔۔

صبح آٹھ نو بجے سے سب رشتہ داروں کے حال احوال دریافت کرنے کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا۔ خاندان کی ہر خبر‘ ہر فرد تک پہنچانا ان کی ذمہ داری تھی اور یہ وصف اتنا زیادہ تھا کہ 2001ء میں ماموں احمد سعید نے زبردستی بلدیاتی الیکشن کے لیے نامزد کر دیا۔ اپنے بھائی کو تو انکار نہ کر سکیں البتہ شرط رکھی کہ میں اپنی کنوینسنگ کے لیے گھر سے نہیں نکلوں گی۔ اپنے لیے ووٹ مانگا نہ مانگنے دیا لیکن جب رزلٹ آیا تو جج انگلیاں منہ میں دبائے بیٹھا تھا کہ یہ خاتون کون ہیں جن کے دھڑا دھڑ ووٹ نکلے جا رہے ہیں ان کو تو ناظم کی سیٹ پر کھڑے ہونا چاہیے تھا۔

تقویٰ اور ورع میں ان کے مقابلے کا کون ہوگا کہ حرام سے تو ہر کوئی بھاگتا ہے وہ مشکوک اور مشتبہ سے بھی دور رہتیں۔۔۔ مشتاق ڈار کی کتاب ”شرک ہمارا سنگین مسئلہ“ چھپ کر آئی تو پڑھنے کے بعد فون پر زار و قطار روتی رہیں۔۔۔ کہنے لگیں میں تو بڑی غفلت میں رہی میں ہمیشہ دعا مانگا کرتی تھی کہ یا اللہ مجھے اور میری آل اولاد کو حرام موت اور حرام رزق سے بچانا۔۔۔ یہ کتاب پڑھ کر پتا چلا کہ شرک کے ایک ذرے کی بھی صورت شامل ہو جائے تو حلال رزق بخشواتا ہے نہ حلال موت۔۔۔

اب میں یہ دعا مانگوں گی کہ اللہ شرک سے حرام موت سے اور حرام رزق سے بچا۔

کسی اجنبی گھر سے آیا کھانا بغیر استغفار کے نہیں کھاتی تھیں کہ حرام نہ ہو۔۔۔ بڑے سے بڑا چوٹی کا عمل کر کے بھی اپنے آپ کو بے عمل سمجھتی تھیں۔ میں اکثر چڑ کر کہتی۔

”یہ کیا ہوا جس کے لیے کیا ہے وہ قبول بھی نہ کرے گا؟“ آرام سے جواب دیتیں۔

”کیا پتا اس تکیہ عمل کس حال میں پہنچا ہو گا۔“

شروع سے ادبی ذوق تھا میں اکثر چھیڑتی اندر سے خود ادیبہ ہیں اور مجھے قلم تھما دیا بس مسکراتی تھیں اور کچھ نہیں آخری دنوں میں بہت رقیق القلب ہو گئی تھیں ردیف قافیے کے ذریعے گفتگو کرتیں۔ مجھے دائیں طرف اور شافعہ کو بائیں طرف بٹھا کر پہلے تو دعا دی پھر کہنے لگیں۔

”اک میری چھوٹی ایک میرا موتی۔“

دو دفعہ یہ کہا تو میری چھوٹی بہن شافعہ نے کھٹاک سے کہا۔

”امی چھوٹے ہونے میں کیا کمال ہے؟ وہ تو اللہ نے ہی بنا دیا‘ کمال تو موتی بننے میں ہے۔“

مسکرا کر جواب دیا کہ ”موتی ہونا بھی اللہ کی طرف سے ہے کیا وہ انسان خود بن جاتا ہے۔“

آخری دنوں میں جو ڈاکٹر معائنے کے لیے آتا وہ بس ان کے صبر کی داد دیتا۔۔۔ اور فرمائش کرتا کہ آپ ہمارے لیے دعا کریں جو اس حالت میں بھی اللہ کو پکار رہا ہے اس کی پکار سیدھی عرش تک پہنچے گی۔

آج ان کی عرش تک پہنچنے والی دعائیں ہیں نال نہ ان کی گریہ زاری ان کے وجود سے پھوٹتی برکتیں رحمتیں جو سب کو محسوس ہوتی تھیں آج کہاں سے ڈھونڈیں؟

لوگ کہتے ہیں آپ نیک ماں کی اولاد ہیں آپ ہمارے لیے دعا کریں میں کم مایہ ان سے کیا کہوں؟ مجھے تو اپنے لیے مانگنے کا سلیقہ نہ آیا میں کسی کے لیے کیا مانگ سکتی ہوں سوائے اس دعا کے جو میری مرحومہ ماں اکثر مانگتی تھیں اللہ مجھے سارے پیاروں سے عرش کے سائے تلے ملانا آمین۔ اللھم اغفرلھا وارحمھا۔

☼ ☼ ☼

ہم لوگ عام طور پر دین صرف نماز روزے تہجد اشراق کو سمجھتے ہیں جبکہ ان کی نظر اس سے ہٹ کر بھی تھی۔ اکثر کہتی تھیں کہ اپنے ابو کے ورثہ کو جلد تقسیم کر لو جب تک ورثہ تقسیم نہ ہو۔

مرنے والا صاحب جائیداد قبر میں بے سکون رہتا ہے۔ وفات سے ڈیڑھ سال قبل اپنا سارا زیور‘ سامان‘ کپڑے‘ بہوؤں بیٹیوں میں تقسیم کر کے ہلکی ہو گئیں۔ گھر میں برتن مشینری بستر فرنیچر رہ گیا تو حسرت سے کہتیں اللہ میرا حساب نہ لیتا یہ تو اس لیے رکھا ہے کہ میری اولاد چھٹیوں میں جمع ہوتی ہے بھائی نے ان کی وفات کے تیسرے روز وہ بھی تقسیم کر کے ان کو ہلکا کر دیا۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

☼

آپ کا باورچی خانہ

صفیہ عباس

کچن گھر کا وہ حصہ ہے کہ جس کی مکمل صفائی کے بغیر جسمانی اور ذہنی صحت کا تصور ناممکن ہے۔ اگر دیکھنا ہو کہ کسی گھر کی خواتین کتنی سلیقہ شعار ہیں تو میرے خیال میں اس گھر کا کچن اور باتھ روم دیکھیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

1 ۔ میں کھانا پکاتے ہوئے گھر والوں کی پسند کا بہت خیال رکھتی ہوں کہ وہ کون سی چیز، کس طرح کھانا پسند کرتے ہیں۔ خاص طور پر میرے ابو بہت اہتمام سے کھانا کھانے کے عادی ہیں تو ان کی پسند کا بہت خیال رکھتی ہوں کہ جو بھی بناؤں، کم از کم ابو کو پسند آئے۔ کیونکہ اگر بادشاہ وقت کو کھانا پسند نہ آئے تو فوراً کہہ دیتے ہیں۔ گو تعریف بھی دل کھول کر کرتے ہیں۔ مگر چکھنے کی حس بھی بہت تیز ہے۔ اگر کسی دن ہم بہنیں سالن میں کوئی ایک بھی چیز ڈالنا بھول جائیں تو کسی شیف کی طرح فوراً" کہتے ہیں۔ آج فلاں چیز نہیں ڈالی؟

2 ۔ پہلے اگر اچانک مہمان آتے تھے تو مجھے تھوڑا سا غصہ آتا تھا کہ یہ کیا بتائے بغیر کسی کے گھر آجاتے ہیں کہ اگلا پریشان ہی ہو جائے۔ مگر میں نے ایک جگہ پڑھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "جب میں کسی سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہوں تو ان کے گھر مہمان بھیج دیتا ہوں۔" بس اب اگر مہمان کسی بھی وقت آئیں تو غصہ نہیں آتا اور ہم بہنیں مل کر سب سنبھال لیتے ہیں۔ مہمان کسی بھی وقت آئیں، کھانا ہم گھر میں ہی بناتے ہیں۔ مہمانوں کے لیے پلاؤ کے ساتھ پیش کرنے کے لیے کبھی کبھی چنے کی ٹکیاں بھی شامی کباب کی جگہ بنا لیتے ہیں۔ جو مہمانوں کو پسند آتی ہیں۔ بنانے کا طریقہ بھی آسان ہے۔

چنے کی ٹکیاں

اجزا :

سفید چنے	تین پیالی
بیسن	ایک پیالی
لال مرچ	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
سوکھا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ (پسا ہوا)
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	دو گٹھی

ترکیب :

سفید چنے ابال کر اچھی طرح پیس لیں اور اس میں بیسن اور تمام مسالاجات شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔ اگر ضرورت پڑے تو تھوڑا سا پانی ملا کر آمیزہ تیار کریں۔ ہرا دھنیا باریک کاٹ کر شامل کریں اور چھوٹی چھوٹی گول ٹکیاں بنا کے گھی میں تل لیں۔ (ہرا دھنیا کافی مقدار میں ڈالیں کہ تلنے کے بعد ٹکیاں خوب صورت لگتی ہیں۔) تلنے کے بعد پلیٹ میں نکال کے پیش کریں۔

3 کچن صحیح معنوں میں عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ ہے۔ کچن گندا اور بکھرا ہوا ہو تو خود بھی الجھن ہوتی ہے اور اگر کوئی اور دیکھ لے تو شرمندگی الگ۔ مگر میرے خیال میں گھر کی صفائی کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو صفائی پسند ہے۔ اس طرح وہ کام جو ہم روز کرتے ہیں، اس کا ثواب بھی ہوگا۔

4 ۔ صبح کے ناشتے کا انحصار موڈ پر ہے۔ کبھی پراٹھے، حلوہ پوری، چاول چنے اور کبھی آملیٹ وغیرہ۔ سردیوں میں ہم گاجر کا حلوہ اور حلوہ پوری بہت شوق سے کھاتے ہیں۔

5 ۔ باہر جا کر کبھی کھانا نہیں کھاتے۔ ویسے بھی ہماری طرف یہ رواج نہیں۔ اکثر بڑے بھیا کسی ڈش کی فرمائش کرتے ہیں۔ ہم گھر میں ہی سب مل کر اہتمام کرتے ہیں۔ بڑی دونوں شادی شدہ بہنوں کو بھی بلا لیتے ہیں تو کافی رونق ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پلاؤ کا موڈ ہو یا کوئی تہوار ہو، ہم سب مل کر ہلا گلا کرتے ہیں۔

6 ۔ بارش کے موسم میں گھر میں چاٹ، دہی بڑے یا پکوڑے بنا کر انجوائے کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر میٹھا کھانے کا موڈ ہو تو موٹی سویاں یا ملیدے کے لڈو بناتے ہیں، جو مجھے بہت پسند ہیں۔

ملیدہ کے لڈو

اجزا :

آٹا	آدھا کلو
شکر، چینی	حسب منشا
دیسی گھی	ایک پیالی
مونگ پھلی	دو چمچے (پسی ہوئی)
الائچی (چھوٹی)	تین یا چار عدد (پسی ہوئی)

بادام اور دوسرے میوہ جات حسب منشا

ترکیب :

پرات میں آٹے کو کم پانی سے گوندھیں۔ زیادہ پانی نہیں ڈالیں۔ کیونکہ یہ آٹا عام روٹی کے آٹے سے تھوڑا سخت ہونا چاہیے۔ آٹا گوندھنے کے تھوڑی دیر بعد درمیانی آنچ پر دو یا تین موٹی موٹی روٹیاں پکائیں اور گرم گرم روٹیوں کو خوب اچھی طرح مسل کر چورا بنائیں اور اس کو چھلنی سے چھان لیں۔ روٹیوں کا پکا ہوا آٹا چھلنی سے چھاننے کے بعد اس میں شکر اور دیسی گھی شامل کریں۔ نیز باقی میوہ جات شامل کر کے اس ملیدہ کے لڈو بنائیں اور جتنے دن تک چاہیں، رکھ لیں اور کھائیں۔ یہ خراب نہیں ہوں گے۔

7 ۔ اچھا کھانا پکانے کے لیے کھانے میں دلچسپی ہونا ضروری ہے۔ اگر پکانے کا موڈ ہی نہ ہو تو کیسے اچھا پکا سکتے ہیں؟ میں کھانا پکاتے وقت موڈ اچھا رکھتی ہوں۔ ساتھ ساتھ درود شریف کا ورد جاری رکھتی ہوں، تاکہ کھانا اچھا بنے۔

8 ۔ اکثر جب گھر میں فرش دھوتے ہیں یا کسی تہوار پر بہت میٹھا پکا ہو تو چیونٹیاں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر اس جگہ پر تھوڑی سی چینی ڈال دیں تو چیونٹیاں غائب ہو جاتی ہیں۔

(صفیہ عباس کا یہ ٹوٹکا ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔ لیکن چونکہ یہ ان کا آزمودہ ہے۔ اس لیے ہم شائع کر رہے ہیں۔)

اگر آپ سبزیاں نہیں کھاتے

صبا ساحر

سبزیاں اکثر گھروں میں زیادہ رغبت سے نہیں کھائی جاتیں۔ عموماً" بچے اور مرد حضرات سبزیوں پر دیگر کھانوں کو فوقیت دیتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سبزیاں گوشت کے مقابلے میں زیادہ غذائیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس ماہ ہم اپنی قارئین بہنوں کو سبزیوں کی آسان اور منفرد ڈشز سے متعارف کروا رہے ہیں۔ ہمارا دعوا ہے کہ اب آپ کے گھر سبزیاں فرمائش کرکے پکوائی جائیں گی۔

نورتن قورمہ

ضروری اجزا :۔

پھول گوبھی — ایک کپ
شملہ، گاجر — ایک ایک کپ
مٹر، پھلیاں — آدھا آدھا کپ
پنیر — آدھا کپ
ٹماٹر، پیاز — دو، دو عدد
نمک، تیل — حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:۔

پیاز سنہری کرکے ادرک لہسن پیسٹ، ٹماٹو پیسٹ اور نمک ڈالیں۔ پھر کیوبز میں کٹی سبزیاں ڈال کر زیرہ، پسا دھنیا اور سرخ مرچ شامل کریں۔ آدھا کپ پانی ملا کر دس منٹ تک ڈھک کر پکائیں۔ سبزیاں گل جائیں تو ابلے ہوئے مٹر ڈال دیں۔ دو چمچے فریش کریم میں پنیر پھینٹ کر قورمے میں مکس کریں۔ پسا گرم مسالا اور کترا ہوا ہرا دھنیا چھڑک کر گرم گرم پیش کریں۔

پھول گوبھی کے کباب

ضروری اجزا:۔

پھول گوبھی — دو بڑے پھول
آلو — چار عدد
بریڈ کرمبز — چار کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا، مرچ — حسب ضرورت
نمک، تیل — حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:۔

آلو اور گوبھی ابال کر کدو کش کرلیں۔ پھر اس میں نمک، چاٹ مسالا اور سرخ مرچ کے ساتھ بریڈ کرمبز اور ہری مرچ دھنیا کتر کر شامل کریں اور دس منٹ رکھ کر کباب بنالیں۔ ٹھہرے گرم تیل میں سنہری کریں اور کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

ویجی ٹیبل جلفریزی

ضروری اجزا:۔

مکھن — چار کھانے کے چمچے
شملہ، پیاز — دو، دو عدد
ٹماٹر، آلو — دو، دو عدد
پھول گوبھی — ڈیڑھ پاؤ
سرکہ، ٹماٹو پیسٹ — دو، دو کھانے کے چمچے
نمک، تیل — حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:۔

مکھن پگھلا کر کیوبز میں کٹی سبزیاں فرائی کریں۔ دو چمچے تیل میں پیاز سنہری کرکے سبزیوں میں شامل کریں۔ سرکے سمیت تمام پسے مسالے ڈال کر سبزیاں نرم ہونے تک فرائی کریں۔ آخر میں ٹماٹو پیسٹ ڈال کر روغن آنے تک بھونیں۔ ڈش میں نکال کر لیموں کا رس چھڑک دیں۔

سبزیوں کا پلاؤ

ضروری اجزا:۔

گاجر، شملہ — ایک ایک کپ
مٹر، گوبھی — ایک ایک کپ
چاول ابلے ہوئے — تین کپ
لہسن ادرک پیسٹ — ایک کھانے کا چمچہ
نمک، تیل — حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:۔

زیرہ اور پیاز سنہری کرکے لہسن ادرک پیسٹ بھونیں۔ پھر سبزیاں ڈال کر گلنے تک فرائی کریں۔ نمک، سویا ساس اور کٹی سیاہ مرچ ڈال کر ابلے ہوئے چاول مکس کریں۔ (اگر مرچ پسند کریں تو ہری مرچ پیس کر ڈال دیں) دس منٹ تک دم پر رکھ کر گرم گرم سرو کریں۔

سبزیوں کے کٹلس

ضروری اجزا:۔

بند گوبھی، گاجر — آدھا آدھا کپ
شملہ، آلو — آدھا آدھا کپ
ابلے چھولے — دو کپ
ڈبل روٹی — چار سلائس
لیموں کا رس — چار چائے کے چمچے
نمک، تیل — حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:۔

ہرا دھنیا، ہری مرچ، ہری پیاز، گوبھی اور شملہ مرچ چوپ کرکے لیموں کا رس ملالیں۔ ڈبل روٹی، چھولے، نمک، زیرہ، ثابت دھنیا، گرم مسالا اور دو کھانے کے چمچے تل پیس کر اس میں ملادیں۔ چاہیں تو انڈا ملالیں۔ آدھا گھنٹہ آمیزہ رکھ کر کٹلٹس بنائیں۔ گرم تیل میں سنہری کریں اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ویجی ٹیبل سوپ

ضروری اجزا :۔

ابلے ہوئے مٹر، گاجر — ایک ایک کپ
مکئی کے دانے — آدھا کپ
کارن فلور — دو کھانے کے چمچے
انڈا — ایک عدد

چکن ایک پاؤ
نمک، کالی مرچ حسب ذائقہ

ترکیب:

یخنی کے ساتھ مٹر بھی ابال لیں۔ چکن گل جائے تو ریشے کر کے پھر یخنی میں شامل کر دیں۔ گاجر، مکئی کے دانے، نمک، سیاہ مرچ اور سویا ساس بھی ڈال دیں۔ ذرا سے پانی میں کارن فلور گھول کر ملا دیں۔ گاڑھا ہونے لگے تو انڈا پھینٹ کر ڈال دیں اور تیزی سے چمچہ چلائیں۔ دو تین منٹ بعد اتار لیں۔ مزے دار سوپ تیار ہے۔

ٹنڈوں کے کوفتے

ضروری اجزاء:

ٹنڈے ایک کلو
بیسن، دہی ایک ایک کپ
خشخاش پیسٹ ایک چائے کا چمچہ
نمک، تیل حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:

ٹنڈوں کے بیج نکال کر کدوکش کریں اور پانی اچھی طرح نکال کر بیسن، پسا گرم مسالا، زیرہ، نمک، لال مرچ، خشخاش اور بادام کا پیسٹ ملا لیں۔ آمیزے کو تھوڑی دیر فریج میں رکھ کر کوفتے بنا لیں اور گہرے تیل میں تل کر الگ رکھ لیں۔ ایک پیاز کو براؤن کر کے دہی میں بلینڈ کر لیں۔ اسی تیل میں لہسن ادرک پیسٹ، ہلدی، نمک اور دہی ڈال کر تھوڑا بھونیں۔ پھر آہستہ سے کوفتے رکھ کر پتیلی ہلائیں۔ پسا گرم مسالا اور ہرا دھنیا چھڑک کر دس منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔

بند گوبھی کے رول

ضروری اجزاء:

گوبھی کے پتے چھ عدد
قیمہ آدھا پاؤ
ابلے ہوئے چاول آدھا کپ
لہسن پیسٹ ایک کھانے کا چمچہ
نمک، تیل حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:

گرم تیل میں قیمہ، لہسن پیسٹ، نمک، سیاہ مرچ اور ایک پیاز ڈال کر بھونیں۔ قیمہ گل کر خشک ہو جائے تو ابلے ہوئے چاول ڈال کر مکس کریں اور ہرا دھنیا چھڑک کر الگ رکھ دیں۔ گوبھی کے پتوں کو بھاپ پر نرم کر لیں۔ پھر ان پر قیمہ کا آمیزہ رکھ کر رول کی طرح لپیٹ دیں۔ کھلنے لگے تو دھاگا باندھ دیں۔ کیچپ کے ساتھ شام کی چائے پر پیش کریں۔

ویجی ٹیبل پزا

ضروری اجزاء:

میدہ دو کپ
خمیر ایک ماشے
شملہ، گاجر دو دو عدد
موزریلا، چیڈر چیز آدھا آدھا کپ
نمک، تیل حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب

میدے میں خمیر، نمک اور ایک چمچہ چینی شامل کر کے نیم گرم پانی سے گوندھ لیں اور بڑا سا پیڑا بنا کر شاپر میں ڈال کر کسی گرم جگہ پر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے گاجر، ہری پیاز، نمک، کٹی لال مرچ اور سیاہ مرچ ڈال کر فرائی کریں اور پلیٹ میں نکال لیں۔ خمیر کو شاپر سے نکال کر روٹی بنا لیں اور سانچے میں ڈال دیں۔ اس کے اوپر فرائیڈ سبزیاں ڈال لیں۔ شملہ اور پیاز کے رنگ اوپر رکھیں۔ موزریلا اور چیڈر چیز اوپر ڈال کر پہلے سے خوب گرم توے پر رکھ دیں۔ آنچ ہلکی کر دیں۔ دس منٹ بعد چھری ڈال کر چیک کریں۔ اگر چھری صاف آئے تو سمجھیں آپ کا پزا تیار ہے۔

مومل...... نامعلوم شہر

اچھی بہن! کسی سے بھی مشورہ لینے سے پہلے اور مذہب اور شریعت کے احکامات جاننے سے پہلے آپ خود چند سوالوں کے جواب دیں۔

آپ کو اعتراف ہے۔

(1) سوائے ایک کمی کے آپ کے شوہر میں کوئی کمی نہیں۔ وہ ہر لحاظ سے آپ کے لیے بہترین شوہر ہیں۔

(2) انہوں نے آپ کو اعتماد دیا' آزادی دی۔ آگے پڑھنے کی اجازت دی' آپ کو اعلا تعلیم دلائی' خاندان میں عزت مان دیا۔ سب آپ کی زندگی پر رشک کرتے ہیں۔ کوئی روک ٹوک' تنگی' کمی یا پریشانی نہیں ہے۔ عید بقر عید' برتھ ڈے' ویلنٹائن ڈے پر تحفے تحائف بھی دیتے ہیں۔ بچوں کا خیال رکھتے ہیں۔

کیا آپ یہ سب آسائشیں چھوڑ سکتی ہیں؟ اور چھوڑ کر خوش رہ سکتی ہیں؟

آپ نے لکھا ہے "میں اپنی زندگی جینا چاہتی ہوں۔ شوہر رویہ تبدیل نہ کریں تو کیا کروں' مذہب اور شریعت ایسے مسئلوں میں کیا راستہ بتاتی ہے۔ میں اپنی زندگی کو یوں سزا کی طرح نہیں کاٹ سکتی۔"

جس "کمی" کے بارے میں آپ نے لکھا ہے۔ وہ زندگی کا ایک حصہ ہے پوری زندگی نہیں۔ آپ اپنی زندگی کو "سزا" کہہ کر زیادتی کر رہی ہیں۔

اپنی زندگی جینے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا علیحدگی کا راستہ؟ اس صورت میں بچوں کے بغیر آپ اپنی زندگی جی سکیں گی؟

شوہر کو چھوڑ کر معاشرے میں جو درجہ ہوگا اسے برداشت کر سکیں گی؟ کسی دوسرے کا ہاتھ تھامیں گی تو کچھ مسائل وہاں بھی ہوں گے۔ اگر آپ کہیں اور متوجہ ہونے لگی ہیں تو سوچ لیجئے' پھر آپ اپنا موجودہ مقام و مرتبہ کھو دیں گی اور اتنا تو آپ سمجھتی ہی ہوں گی کہ آسائشات دوبارہ حاصل کی جا سکتی ہیں مگر کھوئی ہوئی عزت و احترام نہیں۔ اور کسی غلط یا چور راستہ تلاش کرنے میں دین و دنیا کا خسارہ ہے کیونکہ برائی کبھی نہیں چھپتی۔

کہتے ہیں کہ جس کے ہاتھ سے سو میٹھے نوالے کھائے ہوں' ایک کڑوا نوالہ بھی بخوشی کھا لینا چاہیے۔ آپ اس کڑوے نوالے کو کھانے کا حوصلہ کر لیں۔ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کے حق میں یہی بہتر نظر آتا ہے کہ آپ اپنے شوہر کے مسائل کو سمجھیں اور ان کا ساتھ دیں۔

سلطانہ شفیع...... ملتان

زندگی کچھ لوگوں کے لیے عذاب کیوں ہوتی ہے۔ ان کا کیا قصور ہوتا ہے۔ بچپن سے ہی جب ذرا سا ہوش سنبھالا' خود کو ذمہ داریوں میں گھرا پایا۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ سب سے چھوٹا بھائی دنیا میں آیا تو امی بیمار ہو گئیں۔ میں اس وقت چھٹی کلاس میں پڑھتی تھی۔ سب بہن بھائی چھوٹے تھے۔ امی نے بستر سنبھال لیا۔ محدود آمدنی تھی ابا کسی مل میں سپروائزر تھے۔ ملازم رکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ گھر کی صفائی' کھانا پکانا اور بہن بھائیوں کی دیکھ

بھال' جس طرح بھی بن پڑتا کرتی رہی۔ اسکول سے چھٹیاں زیادہ ہوئیں تو نام خارج کر دیا گیا۔ امی تھوڑی بہتر ہوئیں تو میں نے چاہا کہ میں دوبارہ اسکول میں داخلہ لے لوں لیکن امی نے کہا پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہی ہنڈیا روٹی کرنی ہے۔ گھر بیٹھو میں اکیلے سارے کام نہیں کر سکتی۔ چھوٹی بہنیں اسکول جاتی ہیں۔

باقی بہن بھائیوں نے کبھی گھر کے کسی کام میں حصہ لینے یا ہاتھ بٹانے کی کوشش نہیں کی۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ امی نے انہیں کبھی ٹوکا بھی نہیں نہ کوئی کام کرنے کو کہا۔ انہوں نے جیسے طے کر لیا تھا کہ گھر کے یہ سارے کام میری ذمہ داری ہیں۔ میں تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ چھوٹی بہنیں صورت شکل میں بھی مجھ سے بہتر تھیں۔ پھر تعلیم یافتہ بھی۔ گھر میں جو بھی رشتہ آتا۔ ان کو پسند کر لیتا۔ یکے بعد دیگرے دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ تیسری کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ اب امی مجھے بوجھ سمجھنے لگی ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے یہی کہتی ہیں تمہارا رشتہ ہو جائے تو میں سکون کی سانس لوں۔ تمہاری فکر میں میری نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔ ابا شروع سے ہی گھر کے مسائل سے لاتعلق تھے۔ انہوں نے کبھی گھر کے معاملات میں دلچسپی نہیں لی۔ مجھے بتائیے اگر میری صورت اچھی نہیں تو کیا یہ میرا قصور ہے؟ میں تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ کیا یہ میری غلطی تھی؟

ج۔ اچھی بہن! آپ نے جو حالات لکھے ہیں۔ یہ ہمارے اکثر گھروں کا مسئلہ ہے۔ عموماً گھروں میں بڑی اولاد پر والدین خصوصاً "مائیں" چھوٹے بچوں کی ذمہ داری ڈال دیتی ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن میرے حساب سے وقت ابھی نکلا نہیں ہے۔ آپ کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے۔ چھٹی کلاس تک آپ پڑھ چکی ہیں آپ کتابیں منگوائیں اور آگے پڑھائی کا سلسلہ شروع کریں۔ پرائیویٹ میٹرک اور پھر آگے بھی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ اس سے آپ کو دو فائدے ہوں گے۔ آپ کی تعلیمی استعداد بڑھے گی دوسرے ذہن مصروف رہے گا تو فضول سوچوں سے نجات ملے گی۔ ہو سکتا ہے اس عمر میں تعلیم شروع کرنے پر آپ کو لوگوں کی' گھر والوں کی باتیں بھی سننا پڑیں لیکن آپ بالکل پروا نہ کریں۔ تھوڑا حوصلہ کریں ان شاءاللہ ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔

جہاں تک صورت اچھی نہ ہونے کا سوال ہے تو اچھی صورت سے زیادہ اچھی قسمت اہم ہے۔ ہو سکتا ہے آنے والے وقت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے کچھ بہت اچھا رکھا ہو۔ اس لیے مایوسی کو ذہن سے نکال دیں۔

ایک بات بہت ضروری ہے کہ خود پر' اپنے لباس پر توجہ دیں۔

یقین رکھیں' اپنا خیال رکھیں گی۔ خوش رہیں گی تو خود بخود خوب صورت نظر آنے لگیں گی۔

ی...... نامعلوم شہر

بہن! اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز کاموں میں سب سے برا فعل طلاق ہے۔ میں خود بھی طلاق لینے کا کسی کو مشورہ نہیں دیتا۔ میں اسے بہت برا سمجھتا ہوں مگر آپ کا مسئلہ جاننے کے بعد میں یہی کہوں گا کہ آپ فوراً "طلاق لے لیں۔ کیونکہ ابھی صرف آپ کا نکاح ہوا ہے۔ رخصتی نہیں۔ ابھی معاملہ ایک منگنی کی طرح ہے۔ اگر ٹوٹ جائے تو آپ کی زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں ہوگا۔

جس شخص سے آپ کا نکاح ہوا ہے' وہ بہت متلون مزاج ہے۔ پہلے اس نے آپ سے منگنی کی' پھر آپ سے منگنی توڑ کر دوسری جگہ نکاح کر لیا۔ پھر آپ کو دیکھا تو اسے طلاق دے دی اور آپ سے نکاح کر لیا۔ کام کاج بھی کوئی نہیں کرتا۔ مستزاد یہ کہ وہ اور اس کا خاندان لالچی بھی ہے۔

میرے نزدیک اس نکاح کو قائم رکھنے کے حق میں کوئی ایک دلیل بھی نظر نہیں آتی۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ پہلی فرصت میں اس سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ البتہ اپنے والدین سے بھی ضرور مشورہ کر لیں۔

☼

بیوٹی بکس

امت الصبور

کترینہ حسین... نامعلوم شہر

س۔ باجی! میری عمر 25 سال ہے اور اللہ کے فضل سے میری ایک بیٹی ہے۔ جس کی پیدائش آپریشن سے ہوئی ہے۔ وہ اب ماشاء اللہ 10 ماہ کی ہو گئی ہے اور وہ مکمل ماں کے دودھ پر انحصار کرتی ہے۔ شادی سے پہلے میں بہت اسمارٹ تھی اور اب شادی کے بعد میرا وزن 61 kg ہے اور قد 5 فٹ 2 انچ ہے۔ میں بہت زیادہ کھاتی ہوں۔ کیوں کہ مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔ میرا پیٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ بچی کو فیڈ کرتی ہوں' اگر کم کھاؤں تو دودھ نہیں آئے گا اور اگر زیادہ کھاؤں تو مزید موٹی ہو جاؤں گی۔ اس لیے کوئی ایسا طریقہ بتائیے کہ میرا وزن بھی کنٹرول ہو جائے اور بچے کے دودھ پر بھی اثر نہ پڑے۔

ج۔ وزن کی زیادتی کی وجہ تو آپ نے خود ہی لکھ دی ہے کہ آپ زیادہ کھاتی ہیں۔ آپ کھانے سے پہلے ایک پلیٹ کھیرا' ککڑی' سلاد کی کھائیں۔ اس سے آپ کا پیٹ بھر جائے گا اور کھانا کم کھایا جائے گا۔ اگر دودھ کم اترے تو کوئی حرج نہیں۔ آپ کی بچی اب دس ماہ کی ہے اسے دلیہ' کھچڑی' سوجی کا حلوہ' چاول' کیلا اور دوسرے نرم پھل بھی کھلائے جا سکتے ہیں۔ اوپر کا دودھ بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ نے اپنا وزن کنٹرول نہ کیا تو آگے چل کر آپ کو پریشانی ہو سکتی ہے۔ آپ کم از کم 5 kg وزن ضرور کم کریں۔

کھانے میں آپ بیکری کی اشیا' مٹھائیاں اور چینی کا استعمال بند کر دیں۔ روزانہ صبح ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچہ شہد ڈال کر پئیں۔

سب سے اچھی ورزش پیدل چلنا ہے۔ روزانہ کم از کم آدھا گھنٹہ پیدل چلیں۔ آپ کا وزن کم ہو جائے گا۔

زاہرہ یونس... حافظ آباد

س۔ میری عمر 27 سال ہے دو تین ماہ بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ پہلے میری جلد خشک تھی' کیل اور دانے نکلتے تھے۔ پھر بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر کی دوائی کافی عرصہ استعمال کی۔ اس کے بعد میری جلد چکنی ہو گئی۔ دو سال پہلے مجھے ٹائیفائیڈ ہوا اور اس کے آٹھ ماہ بعد مجھے نمونیہ ہو گیا۔ جس کے بعد میرے ساتھ یہ مسئلہ ہوا کہ میرے ماہانہ نظام میں کمی ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی میرے بال بھی سفید ہونے لگے لیکن زیادہ پریشانی مجھے اس وقت ہوئی جب میرے چہرے پر گول گول دھبے بننے شروع ہوئے۔ جو کناروں سے کالے پھر بعد میں براؤن ہو جاتے ہیں۔ بیوٹی پارلر والی نے کہا کہ یہ چھائیاں ہیں۔ ہومیوپیتھک سے دوائی لی۔ بیسن' ہلدی' لیموں' شہد کے نسخے آزمائے' لیکن کم ہونے کے بجائے داغ بڑھ رہے ہیں۔ جس کے ڈر سے دوائی اور نسخے چھوڑ دیے۔ مہربانی کر کے مجھے مفید مشورے سے نوازیں تاکہ میرا چہرہ ان چھائیوں یا دھبوں سے صاف ہو جائے۔ نیز مجھے اپنی مجموعی صحت کو بہتر بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اگر میں وٹامنز لوں تو کون سے لوں؟ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا پیٹ اور کولہے بڑھ گئے ہیں۔

ج۔ زاہرہ بہن! آپ کے تمام مسائل کی جڑ آپ کے ماہانہ نظام کی خرابی اور بے قاعدگی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر یا طبیبہ سے مل کر مشورہ کر لیں۔ وزن کا بڑھنا بھی ایام کی کمی کی وجہ سے ہے۔

چہرے پر چھائیاں پیٹ کی خرابی کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہیں۔ آپ چائے' کافی اور گرم اشیا کا استعمال ترک کر دیں۔ صبح نہار منہ آدھے لیموں میں ایک چمچہ شہد نیم گرم پانی میں ملا کر پئیں۔ رات کو سونے سے قبل دودھ پینا بھی مفید ہے۔ پھل اور سبزیاں اپنی غذا میں مستقل شامل کر لیں۔

☼